دیوان سوم

اعجازِ نوح

از تصنیف

عالی جناب ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر منشی و مولوی محمد نوح صاحب نوح
مصنف دیوان اول سفینۂ نوح و دیوان دوم طوفان نوح خلف مولوی محمد عبدالمجید صاحب
مرحوم مغفور ساکن قصبہ نارہ ضلع الہ آباد شاگرد و جانشین فصیح الملک حضرت داغ دہلوی رح

بحسن اہتمام

مجید احمد صاحب مجید و سہیل احمد صاحب سہیل ناروی
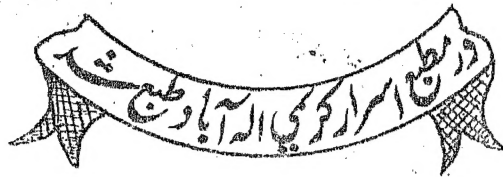
اعجازِ نوح

تیرے چھپنے میں بھی طوفانِ نوح کی طرح بڑی تاخیر ہوگئی پہلے کتابت کرنے والے نے پریشان کیا پھر مطبع والوں نے حسبِ وعدہ تیری طرف خاص توجہ نہ کی ہمیشہ وعدہ کرتے رہے اور ہر وعدۂ امروز وعدۂ فردا پر ٹلتا رہا اسی طرح اتنا زمانہ گذر گیا مجھے تجھ سے ندامت اور اُن حضرات سے نہایت شرمندگی ہے جو تیری آرزو لئے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے اور تیری تمنا کے ساتھ ملکِ عدم کو سدھارے ہیں کس توقع پر اپنے دوستوں سے معافی کا طالب ہوں خدا کے فضل وکرم سے جو زندہ ہیں وہ تو اس فروگذاشت کو معاف بھی کر دیں گے لیکن جو دنیا سے اُٹھ گئے وہ کیونکر معاف کر سکتے ہیں۔

سفینۂ نوح دیوانِ اول اور طوفانِ نوح دیوانِ دوم دو دو بار چھپے اور سب جلدیں ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں آج تلاش کرنے پر کوئی دیوان کہیں نہیں ملتا اس مقبولیت کی مجھے قطعی امید نہ تھی میں اس کو خدا کا فضل اور اپنے اُستاد حضرت داغ دہلوی کا روحانی فیض سمجھتا ہوں اگرچہ تیری غزلیں بیشتر ملک کے مشہور رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئیں اور اچھے اچھے شاعروں میں مختلف اور متعدد مقاموں پر میں نے خود پڑھیں مگر اب کتابی صورت میں تو منظرِ عام پر آ رہا ہے خدا جانے دنیا تیرے ساتھ کیا برتاؤ کرے امید تو یہی ہے کہ تو بھی پہلے دیوانوں کی طرح زمانے میں مقبولیت حاصل کریگا اس میں کوئی شک نہیں کہ فی زمانہ قدیم تغزل کے قدرداں بہت کم اور ادبِ جدید کے پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن خدا کا نام لیکر تو سب کے سامنے آ اور اپنی خوبیوں سے ساری دنیا کو تسخیر کرلے۔

اس کا افسوس ضرور ہے کہ غزلوں کے ساتھ تاریخی قطعات سہرے مختلف اور متعدد نظمیں مخمس مسدس ترجیع و ترکیب بند وغیرہ وغیرہ شامل نہ ہو سکے اگر زندگی ہے تو یہ سب چیزیں بھی عنقریب طبع ہو جائیں گی خدا خدا کرکے تیری ہی اشاعت کی نوبت آئی اب چوتھا دیوان جو قریب قریب مکمل ہے اور ابھی جس کا نام بھی تجویز نہیں کیا گیا اُس کا خدا حافظ ہے دیکھوں میری زندگی میں شائع ہوتا ہے یا نہیں فقط

نوح ناروی

اے نوح آس پاس مرے فرخ و سعید
بائیں طرف سہیل ہیں دہنی طرف مجید

عالی جناب ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب جج فیڈرل کورٹ دہلی مرحوم مغفور

جناب نوح ناروی سے مجھ کو عرصہ سے نیاز حاصل ہے آپ کو فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم سے تلمذ حاصل تھا اور آپ حضرت داغ کے مشہور معروف شاگرد ہیں۔

جناب نوح کے کلام میں لطف بیان اور دلکش زبان کی خصوصیات امتیاز کے ساتھ نمایاں ہیں اور آپ کے اشعار پاکیزہ پرلطف اور بلند پایہ ہیں۔

اپنے استاد کی تقلید میں جناب نوح نے سلاست طرز ادا، سوز و گداز کے لوازم اور ضروریات کو قائم رکھا ہے اور بدرجۂ خود کہنہ مشق اُستاد ہیں۔

آپ کے شاگرد بکثرت ہیں آپ کے معتقدین کا حلقہ بہت وسیع ہے

آپ کی اکثر نظمیں و بالخصوص غزلیں مقبول عام ہو چکی ہیں آپ نے زبان اُردو کو پاک و صاف رکھا ہے اور اس کے خالص بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں نظم میں جو بڑی خدمت اُردو زبان کی آپ انجام دے رہے ہیں اُردو زبان اُس کی ہمیشہ ممنون احسان رہے گی اور آپ اپنے حسن بیان کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز شعرا کے زمرہ میں شمار کئے جائیں گے۔

آپ کا سابق مطبوعہ کلام نہایت پرلطف تسلیم کیا جا چکا ہے اور نہایت مسرت ہے کہ آپ کا جدید مجموعہ کلام شائع ہو رہا ہے مجھے امید ہے کہ اس کی قدر دانی بھی ویسی ہی ہو گی فقط۔

جناب خواجہ محمد نور صاحب جسٹس ہائی کورٹ پٹنہ صوبہ بہار مدظلہٗ

بنام حکیم سخن آفریں

میں سخن سنج نہیں ہوں احباب مجھے سخن فہم سمجھتے ہیں مجھے اس کا بھی دعوےٰ نہیں حضرت نوح سے میرے قدیمی تعلقات ہیں اِن تعلقات کے لحاظ سے میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُن کے تیسرے دیوان کے لئے ایک تقریظ لکھ دوں گو یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میری کوشش کے باوجود اِن کے محاسن شاعری و خصوصیات شعری تشنہ بیان رہ جائیں گی۔ آج کل کی دنیا جو مادّی ترقی کی دنیا ہے اِس فن لطیف یعنی شاعری اور خصوصاً گل و بلبل کی شاعری کو ایک فعلِ عبث اور تضیعِ اوقات کا ذریعہ سمجھتی ہے مگر غلط سمجھتی ہے۔

انسان کو جب اپنی قوت ذہنی اور احساسِ باطنی کا شعور ہوا تو اُس نے اپنے کو یک سر جذبات کا بندہ پایا۔ انھیں جذبات اور واردات قلبی کا اظہار و بیان شاعری ہے محورِ اعمال انسانی جذبۂ محبت ہے اور محبت کی ہر نوع میں محبت جنسی قوی ترین ہے اور محبت جنسی کے اظہار کا بہترین طریقہ متمدن اور تعلیم یافتہ اقوام میں شاعری ہے۔ دنیا بہت کچھ بدل گئی زمانے نے نیا روپ بدل لیا لیکن عشق و محبت کے جذبات اور حسن کے دل ربا جلوے نہ بدلے ہیں اور نہ بدلیں گے اثرات حسن اور جذبات عشق نہ محدود زماں ہیں اور نہ مخصوص مکاں نہ منحصر ارتقام ہیں اور نہ موقوف ممالک انھیں جذبات کا بیان اور انھیں واقعات کا ذکر غزل کی جان ہے اور اسی لئے جو شاعر ان جذبات کی مصوری اور اِن حالات کی نقّاشی میں کمال رکھتا ہے اسی کی فطرت انسانی کا بزرگ ترین ترجمان کہتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ شاعری سے براہ راست دنیا کی دولت میں ترقی اور اسباب معاشرت کی فراہمی میں آسانی پیدا نہیں ہوتی۔ مگر کیا اور فنونِ لطیفہ سے دنیا کی اقتصادی اور معاشی صورت سنورتی ہے ہرگز نہیں اِس لحاظ سے پھر فنونِ لطیفہ کے اس خاص شعبہ سے غیر فطری نفرت کی کیا وجہ ہے۔ فلپ سڈنی کا قول ہے کہ شاعری ایسا عالمگیر فن ہے جس سے نہ تو کوئی وحشی قوم بے نیاز رہی اور نہ کوئی متمدن قوم کو احتراز رہا سائنس نے جسمانی آرام و عافیت کے لئے لاکھوں سامان مہیا کر دئے ہیں مگر افکار و آلام سے بچنے کے لئے اُس کے پاس کوئی شے موجود نہیں غم و رنج سے رہائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ شعر کہنا شعر سننا اور شعر پڑھنا ہے۔ کسی بات کو موثر ترین طریقہ سے بیان کرنا ہوتا ہے تو اشعار میں بیان کرتے ہیں کسی لطیف ترین جذبہ کا اظہار کرنا منظور ہو تو شاعری کی مدد سے حصول مدعا میں کامیابی ہو سکتی ہے کسی نازک معاملہ کو مجمل ترین انداز میں کہنا ہو تو الفاظ شعر ہی اس کے لئے موزوں ہیں۔ بزم سوز و سرور کی رونق اور مجلس ماتم و عزا کی گرمی شاعری ہی کے طفیل سے حاصل ہوتی ہے مصوری و موسیقی کے دل کش مجموعہ کا نام شاعری ہے۔ ورڈسورتھ کہتا ہے

کہ شاعری نفاست قلبی کی بے ساختہ آواز اور سرچشمۂ لذت ہے کیا شاعری سے دست بردار ہو کر کاروباری دنیا سرچشمۂ مسرت و لذت روحانی و سرور سرمدی سے محروم رہنا پسند کرے گی رسکن کہتا ہے کہ شاعری جذبات عالیہ کے دل نواز نغمہ کا نام ہے کیا موسیقی کی دل دادہ دنیا اس ترانۂ روح افزا کو نہیں سننا چاہتی کیا زر و مال کا حریص عالم جذبات عالیہ کے اظہار کا بہترین طریقہ نہیں جاننا چاہتا۔ شبلی کا قول ہے کہ شاعری خدا کی خاص نعمت ہے کیا اس نعمت سے محروم رہنے میں کوئی خاص مصلحت ہے۔

سلیقۂ بیان اور طرزِ ادا ادب کا ضروری عنصر ہے اور شاعری میں اس کا کافی خیال رکھا جاتا ہے معترضین شاعری کہیں گے کہ خیر شاعری میں زیادہ مضائقہ نہیں مگر گل و بلبل کی شاعری میں بہ اوقات عزیز کا صرف کرنا مستحسن نہیں ہیں جواباً عرض کرنے کے لئے تیار ہوں کہ گل و بلبل کی شاعری درحقیقت جذبۂ محبت کی شاعری ہے اور جذبۂ محبت تمام جذباتِ انسانی سے زیادہ قوی ہے اور پھر بقول مشہور فرانسیسی انشاپرداز وکٹر ہیوگو شاعری کے لئے کوئی مضمون اچھا یا بُرا نہیں ہوتا بلکہ اچھے اور بڑے شاعر ہوتے ہیں جام جہاں نما دامانِ خیال یار چشم غمّاز زلف شب گوں اضطراب بسمل غمزۂ خوں ریز نگاہ ہوش ربا حسنِ زاہد فریب الطاف پیر مغاں بوئے گل نالۂ نے وغیرہ وغیرہ مضامین پر قریب قریب ہر اُردو زبان کے شاعر نے خیال آرائیاں کی ہیں مگر نوح صاحب کی طرز خاص بے حد دل پسند ہے سیدھے سادے الفاظ میں یہ ایسی نادر تصویر کھینچتے ہیں جو دل میں بغیر گھر کئے نہیں رہتی اور جس سے ان کے معاصرین ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کسی معتبر ادیب کا قول ہے کہ شاعری کسی قوم کی زبان کو زندہ اور شگفتہ رکھنے کا نہایت طاقت ور ذریعہ ہے میرے خیال میں انھوں نے بڑی حد تک زبان اُردو کی اچھی خدمت کی ہے صحتِ زبان کا خیال ان کو غالب کی طرح چیستاں سرائی سے پرہیز ان کو فارسی اور عربی الفاظ کی بے جا بھرمار سے نفرت ان کو غیر مانوس ترکیبوں سے گریز ان کو شیریں بیانی کا ذوق اِن کو جذبات کی معنی آفرینی کا شوق اِن کو بہر حال جو خوبیاں ایک شاعرِ اعظم میں ہونی چاہئیں وہ سب ان میں قدرت نے ودیعت کی ہیں زبان اور طرز بیان وہ ضروری اجزا ہیں جن کے بغیر دنیا کی کسی زبان میں ادبی کارناموں کو اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جناب نوح نے اِن دونوں باتوں کا لحاظ اپنی شاعری میں خاص طور سے رکھا ہے اسی لئے ان کے اشعار ادب اُردو کے شہ پارے سمجھے جاتے ہیں ان کے بیشتر اشعار لوگوں کی زبانوں پر ہیں اور جنھیں بقائے ابدی حاصل ہو چکی ہے میں نے بیشتر اِن کا کلام متعدد رسالوں میں بھی دیکھا ہے اور اِن کی زبان سے بھی سُنا اِن وجوہ پر جو میں نے رائے قائم کی ہے وہ ہرگز ہرگز غلط نہیں ہو سکتی اُردو کی زیادہ تر شاعری اگرچہ بحیثیت مضمون ایک گونہ ایک ہی ہے لیکن اگر مشہور و مستند شعرا کا کلام بالاستیعاب پڑھا جائے تو اُن میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی قسم کی مابہ الامتیاز خصوصیت اور انفرادیت ضرور پائی جائے گی اسلوب بیان انداز زبان طریقۂ اظہار خیالات طرزِ ادا انتخاب الفاظ اور تنظیم اشعار سے بخوبی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ اِن کا لکھنے والا کون ہے جناب نوح کے کلام میں بھی یہ خصوصیتیں جامع کمالاتِ شخصیت

کی ترجمان ہیں ان کا ایک خاص رنگ ہے بعض بعض ترکیبیں ایسی ہیں جو خاص ان کی اختراع اور انھیں کے حصّہ کی ہیں ۔

عشق اُن سے کر کے غم سہنے کے قابل ہو گیا　　پہلے دل ہی دل تھا اب دل بن گیا دل ہو گیا
دیر و مسجد میں بسر کرتے ہیں اپنی کس طرح　　اُس طرف ہم اس طرح اور اس طرف ہم اس طرح
فکرِ تشویش غور عشق میں کیا　　فکرِ تشویش غور کچھ بھی نہیں
اب وفورِ ناتوانی سے یہ میرا حال ہے　　جس جگہ میں گر پڑا مجھ کو پڑا رہنا پڑا

جو شاعر اپنے باطنی تجربہ اور واردات قلبی کو اس طرح لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ وہ بھی یہی سمجھنے لگے کہ یہ تو ہمارے دل میں ہے اُس کا پایہ بہ حیثیت ایک صاحب کمال اور ماہر فن کے بہت اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے ان کے جذبات سوز دل اس خوبی کے ساتھ ان کے باطنی خیالات اور احساسات کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ہم یہ باور کر لیتے ہیں کہ یہ تو خاص ہمارے ہی خیالات و جذبات و احساسات ہیں ۔

عیش کے بدلے ہمیشہ غم مجھے سہنا پڑا　　جس طرح قسمت نے رکھا اُس طرح رہنا پڑا
مدت ہوئی ترکِ الفت کو اب ذہن میں وہ روداد نہیں　　کیا تم نے کہا کیا میں نے سُنا کیا دل نے کہا کچھ یاد نہیں
یہ حُسن یہ جوانی یہ ناز یہ ادائیں　　کیوں تم کو دیکھ کر ہم بے موت مر نہ جائیں
اُن کا یہ خوف ہے کہ زباں کھولتے نہیں　　میرے رقیق میری طرف بولتے نہیں

سوز و گداز و اثر شاعری کے لئے ضروری ہیں میرے خیال میں ان کا کلام ان خوبیوں میں کسی طرح ان کے استاد فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے کلام سے کم نہیں اور یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ہم انھیں اُردو زبان کا بہت بڑا شاعر سمجھنے اور کہنے پر مجبور ہیں جہاں انھوں نے زبان کے جوہر دکھائے ہیں وہاں یہ معلوم ہوتا ہے ان کے پردے میں ان کے اُستاد بول رہے ہیں یہ کمال بہت دنوں کی مشاقی سے پیدا ہوتا ہے کوئی آسان بات نہیں ایک ایک شعر آتشِ محبت کے دل جلوں کے لئے جوشِ وفا کے سامان سوزِ شعلہ فشانیوں سے مجسم آتشِ بے دود بن گیا ہے ۔

میرے جینے کا طور کچھ بھی نہیں　　سانس چلتی ہے اور کچھ بھی نہیں
زندگی دیکھنے میں سب کچھ ہے　　جب سمجھئے بغور کچھ بھی نہیں
گیا جو وقت تو پھر کر کے غور کیا ہو گا　　نہ ہو سکا کچھ بھی یہی ہو گا اور کیا ہو گا
یہ اگر سچ ہے کہ مجھ کو عشق کرنا آ گیا　　تو سمجھ لو روز مرنا روز جینا آ گیا
ربط اگر ہو آپس میں تو نہ اذیت پائیں ہم　　جائیں ہم بلوائیں وہ آئیں وہ بلوائیں ہم
ابھی بس میں زباں ہے آپ سُن لیں داستاں میری　　خدا جانے نظامِ زندگی کس وقت برہم ہو
بنا صحیفۂ عبرت ورق ورق اُس کا　　جو کھی بیاض مرے آخری زمانے کی

خیالات کو بہترین اور سہل طریقے سے ادا کرنا ایک شاعر باکمال ہی جانتا ہے جذبات کو مسخ شدہ شکل میں پیش کرنا یا خیالات کو الفاظ کے گورکھ دھندوں سے ایک معمّہ یا چیستاں بنا کر شاعری کو

پرشکوہ بنانے کی کوشش میں کوئی خوبی نہیں ہے تو اس کو نقصِ فن کی کھلی ہوئی دلیل سمجھتا ہوں اگر انسان کا دماغ بجائے سرور و انبساط حاصل کرنے کے پیچیدگیوں کی گتھیاں سلجھانے میں خستہ و پریشان ہوگیا تو شاعری کا مقصد ہی جاتا رہا حضرت نوحؔ اس راز سے اچھی طرح واقف ہیں اور انھیں اصول پر کاربند بھی ہیں بیمشکل سے مشکل مطالب اور لمبے چوڑے مضامین کو نہایت ہی سہل مختصر الفاظ اور روزمرّہ کی بول چال میں ادا کر جاتے ہیں یہ خاص جناب داغؔ کا رنگ ہے اور اسی وجہ سے ان کے کلام میں محاوروں کی بندش زبان کی فصاحت بیان کی سلاست سے ایک شگفتگی پیدا ہوگئی ہے چوں کہ زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے اعلےٰ سے اعلےٰ جذبات اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات کا اظہار اس صفائی اور صداقت سے کر جاتے ہیں کہ وہ اپنی تمام کیفیات کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے بڑی آسانی سے آجاتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں آؤ مری انجمن میں مگر میں وہاں اب نہیں جانے والا
کہ اکثر بلایا بلا کر بٹھایا بٹھا کر اٹھایا اٹھا کر نکالا

دل کے مٹ جانے کی صورت یوں مصور کھینچ دے
کچھ دبا پہلو رہے بایاں مری تصویر کا

بحرِ الفت میں کیا موجوں نے عالم کو تباہ
جس طرف دریا کا رخ تھا اس طرف بہنا پڑا

آفتابِ حسن کے جلووں نے ہلچل ڈال دی
ذرّہ ذرّہ کائناتِ عشق کا خاموش تھا

ناوکِ بے داد پر بھی کھل گئے اسرارِ عشق
کیوں سلامِ شوق جھک کر حسرتِ دل نے کیا

سرزمینِ کوئے جاناں اور اس پر پائے شوق
مجھ کو منزل سے الگ تو قیدِ منزل نے کیا

چند حوں آ او وہ آنسو جذبِ دامن ہوگئے
پیکرِ سادہ میں غم کو رنگ بھرنا آگیا

روزِ اول ہی ظہورِ عشق کامل ہوگیا
خون کے دو چار قطرے جم گئے دل ہوگیا

گو ساتھ اٹھا ساتھ چلا ساتھ پھرا میں
سایہ کی طرح پھر بھی رہا ان سے جدا میں

حضرتِ داغؔ اور جنابِ نوحؔ کی دوسری مشترک خصوصیت شوخی و رنگینی ہے جس طرح داغؔ رنگینی و شوخی کے جویا ہیں اسی طرح نوحؔ بھی شوخی و رعنائی کے شائق ہیں۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ٹھہرو رات ابھی گذری نہیں
وہ یہ کہتے ہیں کہ جانے دو سویرا ہوگیا

اگر میں پوچھتا ہوں آپ میرے گھر کب آئیں گے
تو وہ کہتے ہیں آئیں گے مگر اس کب سے کیا مطلب

میں کیا بتاؤں کب ہو اگر اب جفا نہ ہو
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں جفا اب نہ ہو تو کب

یہ کیا غمزہ سازی یہ کیا پیش بندی یہ کیسا کنایہ کیسا اشارہ
ابھی ناوک آیا نہیں میرے دل تک صدا ناوک انداز نے دی وہ مارا

کبھی عشق میں انقلاب ایسا آئے محبت کبھی یہ تغیر دکھائے
بدل جائے دل اور دل ہو بدل کر ہمارا تمھارا تمھارا ہمارا

جس طرح داغؔ کے اشعار بزمِ راز و نیاز کی بے تکلف گفتگو اور عاشق و معشوق کے پر اسرار مکالمے ہوتے ہیں اسی طرح نوحؔ کے کلام میں بھی یہ معاملہ بندی کی صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ان کے اس قسم کے اشعار میں ایک خاص بے ساختگی اور عجیب طرح کی دل آویزی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے پڑھتے جاتے ہیں اور سننے والے سنتے جاتے ہیں اور ان کا لطف بڑھتا ہی جاتا ہے۔

اب حیا پرور نگاہیں مجھ سے اٹھ کر مل چکیں
سر جھکا کر کہہ دیا اس نے کہ شرماتا ہوں میں

اٹھا کے ہاتھ جو اک نگاہ پھیر کے منھ — عجب ادا سے کسی نے مجھے سلام کیا

کھڑے ہیں وہ جھکی جاتی ہیں آنکھیں — اسی طرزِ حیا نے مار ڈالا

تری سیدھی نظر سے بچ گیا ہیں — مگر بانکی ادا نے مار ڈالا

اے دستِ شوق دامنِ محبوب تھام لے — ٹوٹے گا سلسلہ نہ سوال و جواب کا

یہ ایک عام خیال ہے کہ غیر مردف زمینوں میں بہ نسبت مردف زمینوں کے زور کم ہوتا ہے میں بھی اس سے کسی حد تک اتفاق کرتا ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ایک مشاق اور خوش گو شاعر کے لئے ان خشک زمینوں میں بھی تر و تازہ گل کھلا دینا کوئی مشکل نہیں جن کی بہار کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔

نشاط و الم کے سفید و سیہ نے ہماری نگاہوں کو حیرت میں ڈالا
ادھر تیرگی ہے اُدھر روشنی ہے کہیں ہے اندھیرا کہیں ہے اجالا
قراین سے ہوتا ہے معلوم ہم کو کسی روز لٹ جائے گا دل ہمارا

نگاہیں بھی اس عشوہ گر کی نگاہیں اشارہ بھی اس فتنہ گر کا اشارہ
کبھی پردہ داری کبھی خود نمائی کبھی کچھ رکاوٹ کبھی کچھ لگاوٹ
تمھاری یہ چاروں ادائیں غضب ہیں یہ چاروں کریں گی ہزاروں کو چوٹ

فروغ حسن میں کیا ہے ثبات دل کا وجود — وہ آفتاب یہ شبنم وہ آگ یہ بارود

ہمیشہ تمنا و حسرت کا جھگڑا ہمیشہ وفا و محبت کا جھگڑا
تھمے کیا طبیعت رکے کس طرح دل یہ آفت وہ فتنہ یہ آندھی وہ جھکڑ

عشق کے واسطے ہے دل کی آڑ — کوئی دیکھے یہ تل کی اوٹ پہاڑ

سب کی سمجھ میں آ سکے کیوں کر محبت کا سبق — انشا بلند املا گراں مضموں اہم معنی ادق

چوں کہ فطرتاً ان کی طبیعت جدت پسند ہے اس لئے انھوں نے حتے الوسع اُن زمینوں میں بہت کم غزلیں کہی ہیں جن میں اور شعرا کہہ چکے تھے مشاعروں کی طرحوں سے تو مجبوری تھی ورنہ بیشتر خود زمینیں نکالیں اور اُن میں جو کچھ کہنا ہوا کہا۔

عدم سے ہاتھ خالی آئے خالی ہاتھ جائیں گے — فقط اچھے برے اعمال اپنے ساتھ جائیں گے

میں غم کا فسانہ کس سے کہوں غم خواروں سے گھر خالی ہے — کون آنے جانے والا ہے سانس آنے جانے والی ہے

مری ایک ایک سانس اب موردِ غم ہوتی جاتی ہے — چراغ زندگی کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے

اور نہ ہم نے کچھ بھی جانا لیکن اتنا جان گئے — دنیا میں نادان آئے نادان رہے نادان گئے

سامان مرے دل میں کچھ بھی چھوڑا نہ کسی کی یاری نے — چمکی تو بالآخر چھین لیا گھر پھونک کر اس چنگاری نے

آپ ہیں ہم ہیں مے ہے ساقی ہے — یہ بھی اک امر اتفاقی ہے

جا بلا سے نہ پوچھ بات مری — کیا ترے ہاتھ ہے نجات مری

اور شعرا کسی غزل میں ایک قافیے پر دو چار شعر کہتے ہوں گے انھوں نے بیشتر صرف ایک ہی قافیے میں پوری پوری غزلیں لکھی ہیں اس سے قوتِ فکر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے وہی ایک قافیہ اور

مختلف مضامین یہ کوئی آسان بات نہیں ۔

بادۂ سرجوش کا عالم یہ مے خانے میں ہے
جس کے پیمانے میں دیکھو اُس کے پیمانے میں ہے

قابلِ تعریف یہ تقسیم مے خانے میں ہے
جس کو جتنی پیاس اُتنی اُس کے پیمانے میں ہے

خنجرِ خوں خوار چل کر اب نئی مشکل میں ہے
کچھ تمھارے ہاتھ میں ہے کچھ ہمارے دل میں ہے

اِس طرح اور اُس طرح دم ہر طرح مشکل میں ہے
تیر میں دل ہے مرا یا تیر میرے دل میں ہے

جو میری آستیں سے دست کش وحشت کہیں ہوتی
یقیں تھا خود گریباں گیرِ وحشت آستیں ہوتی

ہجومِ رنج و غم میں اشک شوئی بالیقیں ہوتی
ہمارے دامنِ تر پر جو اُن کی آستیں ہوتی

اِسی طرح اور بہت سی غزلیں ہیں جن میں صرف ایک ہی قافیہ سے از ابتدا تا انتہا کام لیا گیا ہے یہ علی العموم دیکھا گیا ہے کہ ہر غزل میں دو چار مطلع مشکل سے لوگ کہتے ہیں مگر انھوں نے اکثر ایسی غزلیں کہی ہیں جن میں سب شعر شروع سے اخیر تک مطلع ہیں پھر وہ زمین بھی آسان نہیں ذیل کی زمینوں میں جو غزلیں ہیں اُن کے سب اشعار بقیدِ مطلع اور قابلِ دید ہیں ۔

بے داد کا شکوہ حشر کے دن اک حشر انوکھا ڈھائے گا
یعنی جو سنیں گے وہ اس کو تو اور اُنھیں غصہ آئے گا

کسی کے عشق میں یوں خضر کی تردید کرتا ہوں
جو وہ جینے پہ مرتے ہیں تو میں مرنے پہ مرتا ہوں

کب چرخ کا شکوہ کرتے ہیں قسمت کو بُرا کب کہتے ہیں
غم ہو کہ خوشی ہو کچھ بھی ہو ہر حال میں ہم خوش رہتے ہیں

یہ میں تسلیم کرتا ہوں تمھیں مجھ سے عداوت ہے
مگر اِتنا سمجھ رکھو محبت پھر محبت ہے

شاعر ایسے نئے شعر کہتے وقت غزل میں بڑی ردیفوں کا سنبھال کر نظم کرنا نہایت مشکل ہے لیکن اِنھیں بہت آسان ہے یہ اس خوبی سے چسپاں کر دیتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے ۔

محبت میں ہو کر سراپا تمنا خبر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا
نشاں میرے دل کا اثر میرے غم کا اگر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا

واہ یہ لطفِ سوزِ الفت کس کی بدولت دل کی بدولت
دوزخ بھی ہے مجھ کو جنت کس کی بدولت دل کی بدولت

مانا کہ مرا دل بھی جگر بھی ہے کوئی چیز
لیکن وہ نظر تیرِ نظر بھی ہے کوئی چیز

اُس بتِ کافر کو اِن کا دھیان کیا ہے کچھ نہیں
دین کیا ہے کچھ نہیں ایمان کیا ہے کچھ نہیں

مری فغاں میں اثر ہے بھی اور ہے بھی نہیں
اِدھر کسی کی نظر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

بہکانے والے بہکاتیں شوق سے اکثر ہم کو تم کو
آنا جانا ملنا جلنا چھپ کر کھل کر ہم کو تم کو

تیرے گھر سے مرے ٹل جانے کی بھی خوب رہی
یہ نکلوانے نکل جانے کی بھی خوب رہی

اپنے اپنے رنگ میں یکتا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے
حسن کی مورت عشق کا پتلا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

صبح دم آہِ رسا دیکھیے کیا کرتی ہے
یہ سویرے کی ہوا دیکھیے کیا کرتی ہے

رہِ طلب میں بنے وہ نشتر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے
چبھے جو کانٹے قدم قدم پر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

اِن کا جو خاص رنگ ہے اس میں تو یہ کامل کیا بلکہ اکمل ہیں لیکن اپنے رنگ سے بالکل ہٹ کر بھی اُنھوں نے دوستوں کے کہنے سے بعض تو ایسے اشعار کہے ہیں جن کو سن کر یہ کوئی امتیاز نہیں کر سکتا کہ یہ اشعار نوح صاحب کے ہیں اس سے یقین ہوتا ہے کہ ہر رنگ پر قدرتِ مشق ہے اور سب طرح کے اشعار ان کے

قلم سے نکل سکتے ہیں۔

زہے مدارجِ عرفان و لطفِ بزمِ شہود — ہمیں ہیں عبد ہمیں عبدیت ہمیں معبود
سوادِ شامِ محبت ہے دودِ بے آتش — طلوعِ صبحِ تمنا ہے آتشِ بے دود
اُٹھی گھٹا کی طرح چھا گئی فضا کی طرح — حدودِ حسن میں تاثیرِ عشق نا محدود
فروغِ حسنِ تغیر پسند کچھ بھی نہیں — ضیائے کرمکِ شب تاب کی ہے کوئی نمود
جمالِ شاہدِ مطلق سے جس کو مطلب ہے — وہ دل سعید نظر اسعد آرزو مسعود
کیوں کر ہو مرا دل نہ پریشانِ تمنا — یہ جوششِ غمِ عشق یہ ہیجانِ تمنا
چلتے ہیں ہوائے ستم و جور کے جھونکے — اُڑ جاتے ہیں نہ اوراقِ پریشانِ تمنا
دیکھو تم انھیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھو — آنسو بھی ہیں منجملۂ سامانِ تمنا
ہر زخمِ جگر ایک گلِ باغِ وفا ہے — ہر داغِ دل اک شمعِ شبستانِ تمنا
جو طالبِ الفت ہو وہ مضبوط کرے دل — اُٹھے گا اسی نیو پہ ایوانِ تمنا

لطفِ زبان حضرت داغ مرحوم اور اُن کے تلامذہ کی نمایاں خصوصیت ہے مگر یہ جوہر ناخدائے سخن جناب نوح کے کلام میں بہت زیادہ پاتا ہوں اِن کو ہر طرح جانشین داغ بننے کا حق تھا کیوں کہ تقلید کی خوبی ہی ایک ایسی چیز ہے جو جانشین بنا سکتی ہے میں پہلے بھی کہہ چکا اور اب بھی لکھتا ہوں کہ اِن کے کلام میں وہی فصاحت وہی سہل ممتنع اور لطف زبان ہے جو ان کے استاد کا حصہ تھا۔

ایک شعر سنئے شانِ تغزل یہی ہے۔

بڑی سیدھی نگاہِ شرمگیں معلوم ہوتی ہے — یہ ظالم ہے مگر ظالم نہیں معلوم ہوتی ہے

ایک اور شعر سنئے اور محاورے کا برمحل استعمال اور شاعرانہ اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ جناب داغ کے رنگ کا بانکپن بھی ملاحظہ ہو۔

چھوڑ کر طرزِ تغافل تیغ سے خنجر اُٹھا — تو نہ مجھ سے ہاتھ اُٹھا تو ہاتھ اب مجھ پر اُٹھا

اس شعر کی شوخی بھی دیکھئے۔

غنچۂ آرزو ہے کھلنے پر — مسکرائے جا مسکرائے جا

چار ٹکڑوں کا شعر سنئے اور سلاست کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی کا کمال بھی دیکھئے۔

تری تند خوئی تری کینہ جوئی تری کج ادائی تری بے وفائی — بلا ہے ستم ہے غضب ہے قیامت دہائی دہائی دہائی دہائی

زورِ بیان روانی مصوری اور فطرت نگاری کا بہترین نمونہ ایک ہی شعر میں دیکھنا ہو تو یہ شعر حاضر ہے

دمِ نظارہ مے خانہ یہ معلوم ہوتا ہے — سمٹ کر بوتلوں میں ساری دنیا کی بہار آئی

محض الفاظ کے الٹ پھیر اور خفیف رد و بدل سے ایک مضمون پیدا کرنا اور پھر شاعری کے تمام قیود کے ساتھ رنگ تغزل کو قائم رکھنا انھیں کا کام ہے۔

جو کچھ بھی ملے گا وہ خدا ہی سے ملے گا — جو کچھ بھی ملا ہے وہ خدا ہی سے ملا ہے
فکرِ تشویش غورِ عشق میں کیا — فکرِ تشویش غور کچھ بھی نہیں

الفاظ کی نشست و ترتیب سے شعر میں ترنم پیدا کرنا بھی ایک کمال ہے اِن کی اکثر غزلوں میں موسیقیت پائی جاتی ہے دیکھیے اِن شعروں میں تغزل کے ساتھ کس قدر موسیقیت ہے۔

مدت ہوئی ترک الفت کو اب ذہن میں وہ روداد نہیں
کیا تم نے کہا کیا میں نے سنا کیا دل نے کہا کچھ یاد نہیں

پھر نکلی خزاں پھر آئی بہار اب گلشن میں خوش حالی ہے
آراستہ پتی پتی ہے پیراستہ ڈالی ڈالی ہے

مشکل اور محدود قوافی میں خوب خوب شعر نکالتے ہیں۔

یہ ہم سمجھتے ہیں ہم سے پوچھو کہ دونوں چیزوں میں فرق کیا ہے
نگاہ کو برق کہتے ہو تم نگاہ کے آگے برق کیا ہے

یہ سنتا ہوں نگاہِ یار ایسی اور ویسی ہے
مگر مجھ سے نہیں ملتی نہیں معلوم کیسی ہے

گلِ مقصد ریاضِ دہر سے کیوں چن نہیں سکتے
ہم اِس کو کہہ نہیں سکتے تم اِس کو سن نہیں سکتے

وہ گھر سے چلے راہ میں رک گئے
اِدھر آتے آتے کدھر جھک گئے

دیدۂ اہلِ خرد میں کیا بساطِ دہر ہے
یہ بھی دریائے فنا کی مٹنے والی لہر ہے

خلق ہو کر آپ پر شیدا ہوئے
ہم اسی کے واسطے پیدا ہوئے

طریقِ عشق میں کب خضر کو ہم ساتھ لیتے ہیں
وہ کوئی اور رہرو ہیں جو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں

کیوں کر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھیے
سب مجھ سے پوچھیے یہ حقیقت نہ پوچھیے

منہ کسی کے رشتۂ الفت سے کب موڑا گیا
اِس طرف توڑا گیا اور اُس طرف جوڑا گیا

شکووں پہ ستم آہوں پہ جفا سو بار ہوئی سو بار ہوا
ہر بات مجھے ہر کام مجھے دشوار ہوئی دشوار ہوا

جہاں لکھا ہوا لفظِ گریباں دیکھ لیتا ہے
وہیں دستِ جنوں بڑھ کر سیاہی پھیر دیتا ہے

اِن کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جو مومن کے علاوہ دوسرے شاعروں میں بہت کم دیکھی گئی ہے وہ تخلص کی رعایت ہے بیشتر مقطعوں میں تخلص کی رعایت رکھتے ہوئے کمال خوبی سے مضمون نظم کر جاتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حضرتِ نوح آپ کا طوفاں
فتنۂ حشر کے مطابق ہے

زمانہ ہو گیا اب اس کے گذرے زمانے کو
فقط اک نوح باقی ہیں نہ کشتی ہے نہ طوفاں ہے

پھیل کر طوفان بحرِ غم بنیں
نوح کے اشکوں میں یہ اعجاز ہے

نوح کیوں طوفاں اٹھائیں ضبطِ غم سے کام لیں
اشک باری عشق کے آداب میں داخل نہیں

عبورِ بحرِ محبت سے ہو گئے محروم
وہ نوح جن کو یہ دعوے تھا ناخدا ہوں میں

نوح طوفانِ بحرِ الفت میں
کوہِ جودی کی ڈھونڈتے ہیں آڑ

اے نوح اثر اتنا تو کیا تم پہ بھی چمن کے منظر نے
طوفان اُٹھانا بھول گئے لے بیٹھے فسانہ پھولوں کا

تکرارِ الفاظ کو وہ لوگ جو بُرا کہتے ہیں ذرا اس شعر کو بھی پڑھیں۔

اب وفورِ ناتوانی سے یہ میرا حال ہے
جس جگہ میں گر پڑا مجھ کو پڑا رہنا پڑا

علاوہ غزلوں کے سہرے ظرافت آمیز اشعار تاریخی قطعات جیسے مسدس ملکی قومی اخلاقی رسالوں کے سال ناموں کے لئے مدحیہ نظمیں طویل و مختصر بھی انھوں نے لکھی ہیں طوالت کے خیال سے

نمونے نہیں پیش کئے جاتے لیکن نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فکر رسا کسی میں عاجز و مجبور نہیں پھر بہت سے الفاظ بھی ترک کر کے انھوں نے بہت سی خاص پابندیاں بھی اپنے ذمہ عاید کر لی ہیں جن کے متعلق سوانح حیات میں کافی روشنی ڈالی گئی ہے اِن سب قیود کے ساتھ اچھا شعر کہنا انھیں کا کام ہے۔

اِن کے اشعار پڑھنے کا انداز بھی نہایت دلکش مگر سنجیدہ ہے میں نے اکثر خود اِن کی زبان سے اِن کا کلام سُنا نہ نغمہ سرائی نہ ترنم لیکن اِس انداز سے تحت لفظ میں شعر کو ادا کرتے ہیں کہ طبیعت پھڑک جاتی ہے کوئی بھی بزم یا محفل بے تکلف احباب کی ایسی نہیں جہاں اِن کے اشعار اظہار جذبات یا بیان واقعات کے لئے کسی نہ کسی زبان سے نہ نکل جاتے ہوں غرض نوحؔ صاحب اُن شاعروں میں سے ہیں جن کا نام تاریخ ادب میں ہمیشہ درخشاں رہے گا اور کوئی قوت اِن کے وقار کو نوحؔ دل سے نہیں مٹا سکتی مجھے یقین ہے کہ اس دور میں جب کہ صحیح شاعری کا مذاق روز بروز کم ہو رہا ہے اور موجودہ بے راہ روی نقوش سخن کو مٹا رہی ہے یعنی زبان بے قاعدہ ترکیبوں اور بے اصول بندشوں اور نامانوس الفاظ سے خراب کی جا رہی ہے اِن کا کلام ملک میں صحیح ذوقِ سخن پیدا کرے گا اور زبان کے لئے سفینۂ نجات ثابت ہوگا پہلا اور دوسرا دیوان اصحابِ نظر اور سخن فہموں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہزاروں کاپیاں چھپیں اور آن کی آن میں نکل گئیں جنھوں نے سفینۂ نوحؔ اور طوفان نوحؔ پڑھا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں کہ یہ تیسرا دیوان اُن تمام خوبیوں کا مجموعہ ہے یا نہیں جن کو میں نے بسبیل اختصار لکھا ہے۔

"کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے"

فقط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولوی عبدالمجید صاحب کے حالاتِ زندگی سے ظاہر ہے کہ خدا نے اُن کو سب کچھ دیا تھا مال و دولت خدم و حشم عزت و ثروت اقبال مراتب غرض دنیا کی ساری نعمیں عطا ہوئی تھیں مگر اولادِ ذکور کی بے بہا نعمت سے وہ محروم تھے اور یہ نعمت اُن کی عمر کے بہت بڑے حصہ تک ان کو نصیب نہ ہوئی اس محرومی سے وہ نہایت افسردہ دل رہتے اور تمام خوشی اُن کو بے لطف معلوم ہوتی آخر آخر خدا نے اُن کی خوش نصیبی کی تکمیل کے لئے یہ تمنا بھی پوری کی یعنی یکم شوال بروز عید سنہ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۷۹ء موافق ۱۸ کنوار سمت ۱۹۳۶ بکرمی یوم جمعہ کو صبح صادق کے وقت نوح صاحب کی ولادت جناب موصوف کے ننہال نہوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی میں ہوئی مولوی عبدالمجید صاحب نے سجدۂ شکر ادا کرنے کے بعد منعم ازلی کے اس گراں مایہ عطیہ کا رئیسانہ خیر مقدم کیا محمد نوح صاحب نوح کی پرورش و پرداخت تعلیم و تربیت کے متعلق جو خیالات یا ارادے مولوی عبدالمجید صاحب کے دل میں پیدا ہوئے ہوں گے حالات و واقعات کے اعتبار سے ان کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ موت کے نہ ٹلنے والے حکم نے ان ارادوں کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی اور ابھی نوح صاحب نے ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ مولوی صاحب کو سفر آخرت درپیش آگیا یعنی ۲۶ جون سنہ ۱۸۸۳ء مطابق ۲۰ شعبان سنہ ۱۳۰۰ھ یوم سہ شنبہ کو وفات فرما گئے۔

مولوی عبدالمجید صاحب کے وفات فرماتے ہی اُن کے ورثا کے دلوں میں تقسیم ترکہ و میراث کے خیالات پیدا ہوئے مولوی صاحب مرحوم نے دو بی بیاں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں چھ وارث چھوڑے تھے چالیسویں تک تو ان سب کا کاروبار بدستور سابق کسی طرح یک جائی رہا اور فتنے فساد صرف قالب وجودی اختیار کرتے رہے مگر چالیسواں ہوتے ہی ان میں جان آگئی ایک طوفان بدتمیزی اٹھا اور نااتفاقی و نزاعات کی گھٹاؤں نے مولوی عبدالمجید صاحب کی ریاست کے پرامن و شفاف انتظامی مطلع کو پرآشوب و تاریک کر دیا اس بدنظمی میں جو کچھ جس کے ہاتھ آیا وہ اُس کا ہو گیا اور جہاں چھپا کر رکھا گیا وہیں کا ہو رہا فوجداری کے اندیشے سے دیہاتی سپاہی فریقین نے بڑی تعداد میں ملازم رکھے اور وہ دولت جو مولوی عبدالمجید صاحب نے نہایت عرق ریزی و کفایت شعاری سے جمع کی تھی نہایت بے دردی کے ساتھ انھیں گنواروں کے حلوہ پوری کے سامان کی نذر ہونے لگی ادھر خانہ جنگیوں کا یہ حال تھا اُدھر نوح صاحب بہت صغر سن تھے اور جدی قرابت داروں سے موافقت نہ تھی اس لئے مجبور ہو کر نوح صاحب کی والدہ نے اپنے والدین کے قرابت داروں کی حمایت اختیار فرمائی ابتدا میں شیخ نور الہدیٰ صاحب مرحوم جو نوح صاحب کے چچیرے نانا ہوتے تھے اور پرانی وضع کے بزرگ تھے کاروبار ریاست کے منتظم رہے اُن کی وفات کے

بعد عنانِ حکومت شیخ سید حسن صاحب کے ہاتھ آئی جو نوح صاحب کی والدہ کے حقیقی ماموں تھے روپیہ وافر تھا اور شیخ صاحب موصوف بڑے من چلے تھے اس مہم میں انھوں نے خوب خوب معرکہ آرائیاں کیں اور حریفوں کو اپنی قوت کا خوب خوب مزا چکھایا غرض کئی سال تک یہی معرکے ہوتے رہے آخر جب نقد روپیہ ختم ہوگیا اور قرض لینے کی نوبت آئی تو مخالفین کی آنکھیں کھلیں اور آپس میں صلح کی بات چیت شروع ہوئی اور ورثا کے درمیان میں ایک اقرارنامہ ثالثی لکھوا کر رجسٹری کرائی گئی اور اس کے ذریعہ سے حاجی محمد شریف صاحب مرحوم جو اپنے وقت کے ایک نہایت محترم بزرگ اور بستی کے پیشوا تھے ثالث مقرر ہوئے حاجی صاحب موصوف نے بحیثیت ثالث یہ فیصلہ کیا کہ جو جائداد مولوی عبدالمجید صاحب نے اپنی حیات میں جس وارث کے نام حاصل کی تھی اُس خاص جائداد کا اُس خاص وارث کو بلا شرکت غیرے مالک مستقل قرار دیا اور جو جائداد مولوی صاحب مرحوم نے خاص اپنے نام حاصل کی تھی اُس کو ثالث صاحب نے سولہ آنہ قرار دے کر دس آنہ نوح صاحب کو اور چھ آنہ تینوں بہنوں کو دلا دیا لیکن بی بیوں کو اس سولہ آنہ میں کوئی حصہ نہ دیا بالغ ورثا اور نابالغ ورثا کے ولیوں نے اس فیصلہ کو منظور کیا اور منظوری پر باضابطہ رجسٹری بھی ہوئی اور تکملۂ فیصلہ کے مطابق داخل خارج کی کارروائی عمل میں آگئی مگر کچھ دنوں کے بعد ایک وارث نے اس سے ناراضی ظاہر کی اور کل جائداد کو متروکہ مورث بقدر ۱۰۰ اسہام قرار دے کر دعوئ منسوخی فیصلہ ثالثی اور دلا پانے ۱۴ اسہام شرعی حصۂ دختری اس بیان کے ساتھ عدالت سب ججی الہ آباد میں دایر کیا کہ کارروائی فیصلہ ثالثی اُن کے ولی کے ذریعہ سے نابالغی کے زمانے میں جو ہوئی ہے اس میں اُن کے حقوق کی پوری نگہداشت نہیں کی گئی لہذا فیصلہ ثالثی ان کے مقابلے میں کالعدم و بے اثر ہے پنڈت بنسی دھر صاحب سب جج الہ آباد نے یہ دعوے ۱۳ مئی ۱۸۸۶ء کو ڈگری کیا اور نوح صاحب اور اُن کی والدہ کی طرف سے سب جج صاحب کے اس فیصلہ کا اپیل ہائی کورٹ الہ آباد میں داخل ہوا۔

اس دعوے کے بعد دوسرا دعوے مولوی عبدالمجید صاحب کی بڑی بی بی صاحبہ نے منجملہ ایک لاکھ پچیس ہزار اپنے دین مہر کے مبلغ دس ہزار روپیہ چھوڑ کر بقیہ ایک لاکھ پندرہ ہزار کا بمقابلہ جملہ ورثائے مورث عدالت سب ججی الہ آباد میں دایر کر دیا یہ دعوے بابو پرمودہ چرن بنرجی صاحب جج خفیفہ نے (جو آخر آنریبل مسٹر جسٹس پرمودہ چرن بنرجی الہ آباد ہوگئے تھے) باختیار سب ججی ۵ ستمبر ۱۸۸۷ء کو بوجوہ ڈسمس فرمایا چونکہ بڑی بی بی صاحبہ دورانِ مقدمہ میں فوت ہو چکی تھیں اس سبب سے اُن کے جانشین ورثا نے اس فیصلے کا اپیل ہائی کورٹ الہ آباد میں رجوع کیا۔

جس روز بڑی بی بی صاحبہ کا دعوے دین مہر عدالت سب ججی الہ آباد میں دایر ہوا اُسی روز نوح صاحب کی والدہ نے بھی اپنے دین مہر ایک لاکھ پچیس ہزار میں سے مبلغ پچاسی ہزار خاص بیانات کے ساتھ مجرا دے کر بقیہ مبلغ چالیس ہزار روپیہ کا تیسرا دعوے عدالت سب ججی رائے بریلی میں بمقابلہ جملہ ورثائے مورث دایر کر دیا مولوی سمیع اللہ صاحب بہادر جج نے نوح صاحب کی والدہ کا بھی دعوے حسب وجوہ مندرجہ تجویز جج خفیفہ الہ آباد ڈسمس کیا آخر کار نوح صاحب کی والدہ کی طرف سے بھی اس فیصلے کا اپیل عدالت جوڈیشل کمشنر لکھنؤ میں کیا گیا۔

جب دونوں اپیل متعلق ڈگری دعوے حصہ دختری و ناکام یابی دعوے دین مہر حکام عظام ہائی کورٹ کی پیشی میں گئے تو چوں کہ حکام ممدوحین مولوی عبدالمجید صاحب سب جج مرحوم سے واقف تھے اس لئے انھوں نے بالاتفاق مولوی صاحب مرحوم کی ملکیت و ورثا کی بربادی کو نظر ترحم سے دیکھا اور ورثائے متخاصمین کو صلح کی ہدایت فرمائی چنانچہ بموجب ہدایت حکام ذی احتشام بعد از خرابی بسیار صلح ہو گئی اور شرائط صلح نامہ کے مطابق کل علاقہ ایک علاقہ کے علاوہ ۸۰ سہام پر تقسیم ہوا جن میں سے ۴۰ سہام نوح صاحب اور ان کی والدہ اور ۲۸ سہام بڑی بی بی صاحبہ کی دونوں لڑکیوں اور ۱۲ سہام چھوٹی صاحب زادی کو جو منجھلی بی بی کے بطن سے تھیں ملے باقی ماندہ ایک علاقہ ۳۲۰ سہام پر تقسیم ہوا اس میں سے نوح صاحب نے ۶۰ سہام اور بڑی بی بی صاحبہ کے اور ورثا یعنی بھائی بہن وغیرہ نے ۱۲ سہام اور پھر چھوٹی صاحب زادی نے ۴۸ سہام پائے دست اویزات بھی اس حساب سے ورثا کے درمیان میں تقسیم ہوئیں صرف مکانات و ضلع وغیرہ مع ملحقات کے تنہا بلا شرکت غیرے نوح صاحب کو ملے جب یہ صلح نامہ ہائی کورٹ میں تصدیق ہو گیا تو نوح صاحب کی والدہ نے اپنا اپیل مقدمہ دین مہر جو جوڈیشل کمشنر لکھنؤ کی عدالت میں دایر تھا خارج کرا دیا اس طرح پانچ برس کی مسلسل لڑائیوں کے بعد اصل نزاع کا خاتمہ ہوا مگر فروعی نزاعات کا سلسلہ مدت تک قائم رہا۔

خانہ جنگیوں کے وہی خانہ برانداز نتائج ہوئے جو بالعموم ہوا کرتے ہیں نمونے کے طور پر چند باتیں درج ذیل کی جاتی ہیں جن سے پورا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) مولوی عبدالمجید صاحب کے نقدی سرمایہ میں سے کچھ تو مقدمہ بازی کے نذر ہوا اور کچھ مفت ضایع ہوا میں نے نوح صاحب سے سُنا ہے کہ لڑائی کے درمیان میں اُن کی والدہ ماجدہ نے ایک ڈبہ جس میں تین لاکھ روپیہ کے بیش قیمت کرنسی نوٹس بھرے ہوئے تھے اپنے ایک عزیز خاص جن کا مکان رائے بریلی میں تھا امانتاً سپرد کیا کچھ دنوں کے بعد اُن عزیز کا انتقال ہو گیا اُن کے انتقال کے بعد اس رقم پر اُن کے اعزا قابض ہو گئے چوں کہ نوٹوں کے نمبر وغیرہ بطور یادداشت کے لکھے ہوئے موجود نہ تھے اس باعث سے کوئی کارروائی نہ ہو سکی اور علاوہ تاسف کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

(۲) اور ورثا اس حد تک قرض دار ہو گئے کہ بار قرض کے متحمل نہ ہو سکے مجبوراً وہ جائدادیں جو ترکے میں ملی تھیں مختلف اوقات میں منتقل کرنی پڑیں جن میں سے بیشتر نوح صاحب کی والدہ نے کچھ تو براہ راست بیع نامہ کے ذریعہ سے اور کچھ بذریعہ حق شفع عدالت سے لڑ کر خریدیں اس میں کوئی شک نہیں کہ نوح صاحب کی والدہ کے پاس علاوہ کرنسی نوٹوں کے نقدی سرمایہ بھی بہت کچھ تھا مگر وہ عورت تھیں اور باوصف فہم و فراست کے عدالتی مصارف و تعداد زرِ ثمن وغیرہ کا حال انھیں اچھی طرح معلوم نہ ہوتا تھا نوح صاحب صغیر سِن تھے اس لئے سُنے ہوئے تخمینوں پر ایک کی جگہ چار اور چار کی جگہ دس خرچ کرنے پڑے اس مجبورانہ مصارف کے بدولت کل نقدی سرمایہ خرچ ہو گیا اور آخر آخر وہ بھی لالہ درباری لال مہاجن الہ آباد کی قرض دار ہو گئیں۔

(۳) ان میں سب سے زیادہ قابل افسوس یہ بات ہوئی کہ نوح صاحب کی انگریزی و عربی کی اعلےٰ تعلیم

نہ ہوسکی۔ نوح صاحب کے بچپن اور طفولیت اور خاندانی نزاعات کا زمانہ ساتھ ساتھ تھا علاوہ اس کے یہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے اور اپنے خاندان کی یادگار تھے اس لیئے ان کے بچپن میں ان کی والدہ کو بہت کچھ حفاظت اور نگاہ بانی کرنی پڑی کبھی قتل کی دھمکی دی جاتی تھی کبھی کنوئیں میں ڈالنے کا خیال ظاہر کیا جاتا تھا۔ رنجش اور نا اتفاقیوں کے اندیشے میں مرحومہ نے اپنی آنکھوں سے ان کا اوجھل ہونا کبھی گوارا نہیں کیا اس طرح ان کے بچپن اور طفولیت کا زمانہ مکان کی چاردیواری کے اندر گذرا فقط محل سرا کا احاطہ ان کے لئے دنیا تھی اندر سے جب باہر نکلتے تو کبوتروں اور چڑیوں کا تماشا دیکھتے اور انھیں سے جی بہلاتے کبھی پائیں باغ میں تفریح کرتے اور کبھی گیند بلا کھیل لیتے بستی میں جب اعزا کی کوئی خاص تقریب ہوتی تو شرکت کے لئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے چلے جاتے تھے۔

ولادت کے ساتویں سال ۲۴ محرم ۱۳۰۳ھ مطابق ۲ نومبر ۱۸۸۵ء دوشنبہ کو نوح صاحب کی تسمیہ خوانی نہایت تزک و احتشام سے عمل میں آئی پہلے چند شریر بدخواں نے چاہا تھا کہ یہ تقریب بخیر و خوبی نہ انجام پائے مگر جب نوح صاحب کی والدہ کی درخواست پر مجسٹریٹ نے تھانہ دار صاحب کو مع بہت سے کانسٹبلوں کے انسداد نقص امن کے لئے مقرر فرما دیا تو سب اپنے خیالات سے باز رہے اور انھیں اپنے ارادے میں پشیمانی اٹھانی پڑی بعد بسم اللہ نوح صاحب نے حافظ قدرت علی صاحب مرحوم سے کلام اللہ پڑھنا شروع کیا حافظ صاحب موصوف نارے کے ایک مشہور حافظ تھے اور ان کو جناب حافظ عبدالوہاب صاحب مرحوم کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

مولوی عبدالمجید صاحب کی فہم و ذہانت کا ترکہ نوح صاحب کو حصہ شرعی سے بہت زیادہ ملا تھا بچپن کا زمانہ اور دماغی قوتوں کا وفور تھا چھوٹے سے تنگ جام میں سے ذہانت چھلک چھلک جاتی تھی کلام اللہ کا ناظرہ پڑھ لینا مشکل ہی کیا تھا سال ڈیڑھ سال میں خدا کی نعمت سے مالا مال ہوگئے بعد ختم کلام مجید فارسی شروع کی چند دنوں تک مولوی محمد یوسف صاحب ساکن نارہ سے پڑھتے رہے جب کچھ مناسبت پیدا ہوگئی اور طبیعت جولانیاں دکھانے لگی تو قصبہ مچھلی شہر ضلع جونپور کے بزرگ مولوی عبدالفتاح صاحب فارسی اور ایک پرائیوٹ ٹیوٹر ماسٹر محمد علی صاحب ساکن الہ آباد انگریزی پڑھانے کے واسطے مقرر کیئے گئے انگریزی تعلیم کا سلسلہ تو کچھ دنوں کے بعد جاتا رہا مگر فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی صاحب سے نوح صاحب نے دو تین سال میں ختم کرلیں اور کسی حد تک خوشنویسی میں بھی مشق بہم پہنچائی اس کے بعد مولوی صاحب موصوف اپنی خانگی ضروریات سے مچھلی شہر واپس چلے گئے اور حاجی عبدالرحمن صاحب جائسی کو اپنا جانشین مقرر کر کے بھیج دیا حاجی صاحب سے نوح صاحب نے فارسی کی درمیانی کتابیں چند سال میں تمام کیں اور فارسی ادب و اخلاق کی انتہائی کتابیں شروع فرمائیں کچھ دنوں کے بعد اب وہ زمانہ آگیا کہ انھوں نے فارسی اچھی خاصی پڑھ لی اور شراب فارسی کے کیفیات سے بخوبی واقف ہوگئے یا یوں کہیئے کہ شراب قدرت شراب علم سے مل کر دو آتشہ اب جودت کا وہ سرور ہے کہ طبیعت روکے نہیں رکتی شباب کی آمد ہے زمانہ رنگین نظر آتا ہے حسن و عشق کے دل فریب مضامین پیش نظر ہیں شاہد علم و فن کی چاہ ہے ادھر ان کی طبیعت کا یہ رنگ تھا ادھر حاجی صاحب ان کے استاد ایک پرانی روش کے مقطع بزرگ جہاں دیدہ شخص سیکڑوں

لڑکوں کو پڑھا چکے تھے شاگرد کی آن بان دیکھ کر خود ہی کنارہ کش ہو گئے اور رخصت لے کر جو گئے تو پھر پلٹ کر نہ آئے۔

اب نوح صاحب میر نجف علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے میر صاحب موصوف کا نام نامی کے علمی حلقے میں ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا جائے گا کیوں کہ وہ علمی چمن جو ابھی ابھی فضائے زمانہ میں لہلہا رہا تھا انھیں کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا تھا تعلیمی احساسات کے لحاظ سے ان کے حالات کا اس علمی تذکرے میں جگہ دینا ضروری اور نہایت ضروری ہے۔ میر نجف علی صاحب سادات ہنسوہ پور ضلع فتح پور سے تھے فارسی میں ادیب کامل کی شخصیت تھی شعر و سخن سے بھی مذاق تھا نجف تخلص فرماتے تھے مزاج میں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ شوخی و لطافت کا بھی بہت کچھ حصہ تھا اس قصبہ میں آپ اوّل اوّل مولوی عبدالمجیب صاحب وکیل کی تعلیم کے لئے تشریف لائے مگر تھوڑے ہی دنوں میں سارے سکے کل طالب علم ان کے حلقۂ درس میں داخل ہو گئے اور بعد تکمیل سب کے سب فائز المرام ہو کر نکلے مدت تک درس و تدریس کا یہی سلسلہ رہا آخر میں آپ حکیم احسان علی صاحب کی ریاست میں مختار عام ہوئے اور یہیں اپنے قیام کا بقیہ زمانہ ختم کیا۔

میر صاحب کی زندہ دلی اور کمال علمیت نے نوح صاحب کی بہت کچھ دل جمعی کی اور نہایت لطف کے ساتھ سلسلۂ درس جاری ہوا۔ استاد کے فیضانِ تعلیم سے انھوں نے بہت جلد فارسی ادب اور فلسفۂ اخلاق کی مروجہ کتابیں پڑھ لیں اور عربی صرف و نحو کی طرف متوجہ ہوئے علمیت اور ذہانت نے ان کے دل میں ذوق و سرور پیدا کیا اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اس کیفیت میں اب روز افزوں ترقی ہونے لگی محسنی اور جلالی کے حکیمانہ مضامین نے ایسی صیقل گری کی کہ جوہر طبع کی آب خود آئینہ دار بن گئی حافظ و سعدی کی نغمہ سنجیاں سن سن کر دل حسن و عشق کا جیتا جاگتا مرقع بن گیا بادۂ شیراز کے دور چلنے لگے تصورات عرش بریں پر پہنچے نا و نوش کی پیہم صدائیں بلند ہونے سے شاعری کی وہ مخصوص قوت جو اب تک بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی ایک انگڑائی لے کر دفعتاً بیدار ہو گئی قطع مسافت کے بعد بہارستانِ سخن کا عظیم الشان پھاٹک نظر آیا اور یہ اس میں بے تامل داخل ہو گئے وہاں ایک باغ سدا بہار دیکھا مناسبت طبعی سے روش روش کی سیر کی اور شاخ شاخ پتی پتی پر نگاہ ڈالی اور اپنے دامنِ شوق کو نظم کے رنگا رنگ پھولوں سے بھر لیا۔

قبل اس کے کہ شاعری کے مفصل واقعات لکھے جائیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اور ضروری خانگی حالات جو رہ گئے ہیں اُن کی تفصیل بھی بیان کر دی جائے ورنہ پھر اُن کا لکھنا بے محل ہوگا اور سلسلہ منقطع ہو جائے گا موضع بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی (اودھ) میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے وہاں کی مردم شماری پہلے جو کچھ بھی رہی ہو اب تخمیناً زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو ہو گی نوح صاحب کے نانا شیخ علم الہدے صاحب کا مکان وہیں تھا اور ملازمت پر ان کی بسر اوقات تھی اُس زمانے میں کلکٹری فتح پور کا عہدۂ امانت سے ان کا تعلق تھا سارے کے شرفا گھرانوں کا تحفظ نسل کے لحاظ سے اب تک یہ مقررہ قاعدہ ہے کہ جن مقاموں سے ہمیشہ قرابت ہوتی آئی ہے وہیں ہوتی ہے چوں کہ بھوانی پور سے برابر قرابت کا سلسلہ رہ چکا تھا اس لئے مولوی عبدالمجید صاحب نے اپنی چوتھی شادی وہاں کی شیخ علم الہدے صاحب موصوف کی کوئی اولاد ذکور یا اناث نوح صاحب کی والدہ کے علاوہ نہ تھی مگر ان کے بھائی اور خاندان کے بیشتر افراد

موجود تھے جب ان کا انتقال ہوگیا تو اُن کی بی بی یعنی نوح صاحب کی نانی صاحبہ اپنی لڑکی کے پاس چلی آئیں اور تمام عمر انھیں کی رفاقت میں انھیں کے مکان پر رہیں اور انتقال کے بعد نارے ہی میں دفن ہوئیں شیخ نور الہدے صاحب جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے وہ نوح صاحب کے نانا شیخ علم الہدے صاحب کے حقیقی بھائی اور شیخ سید حسن صاحب جن کے مفصل حالات آگے آئیں گے وہ شیخ علم الہدے صاحب کے سالے اور نوح صاحب کی والدہ صاحبہ کے حقیقی ماموں تھے۔

شیخ سید حسن صاحب پہلے نظارت دیوانی الہ آباد میں ملازم تھے اور ناظر شیخ عبد الصمد صاحب مرحوم مغفور ساکن نارہ کے سایۂ عاطفت میں رہتے تھے، چوں کہ قرابت قریبہ تھی اس باعث سے ناظر صاحب کی نگاہوں میں بہت کچھ ان کا وقار تھا اور جو بات یہ کہہ دیتے تھے اس پر وہ خاص توجہ فرماتے تھے جب مولوی عبد المجید صاحب کا انتقال ہوگیا تو یہ اور شیخ نور الہدے صاحب ساتھ ساتھ نارہ تشریف لائے اور یہاں کے تباہ کن واقعات دیکھ کر کچھ تو یہ دونو حضرات خود ٹھہر گئے اور کچھ نوح صاحب کی والدہ صاحبہ نے بھی کہہ سن کر روک لیا پہلے عنانِ حکومت شیخ نور الہدے صاحب نے اپنے ہاتھوں میں لی اور ماتحت کے طور سے اُن کے ساتھ شیخ سید حسن صاحب بھی تین چار سال تک کام کرتے رہے لیکن جب نور الہدے صاحب کا بھی انتقال ہوگیا تو پورے پورے سفید و سیاہ کے اختیارات شیخ سید حسن صاحب کو تفویض ہوئے اس میں کوئی کلام نہیں کہ شروع شروع انھوں نے بڑی مدت تک نہایت جواں مردی سے ریاست کی دیکھ بھال کی اور تحفظ جائداد کا خاص طور سے خیال رکھا اچھے اچھے انتظامات کئے اور بڑے بڑے زبردست نبرد آزما حریفوں کو نیچا دکھایا اپنے دور میں نوح صاحب کی شادی اس شان سے انھوں نے کی جس کی نظیر اب تک نارے کی تاریخ میں نہیں ملتی مگر ان سب خوبیوں کے باوجود ان میں خامیاں بھی بہت کچھ تھیں آخر میں نادر علی جو اس ریاست میں ایک چلتا ہوا خود پرست کارندہ تھا اُس کے قبضۂ قدرت میں یہ آگئے اور اُس کا رسوخ یہاں تک بڑھا کہ اُس کی ہر بات کو یہ بغیر سوچے سمجھے مان لیتے تھے جن جن ملازموں سے اُس کو کھٹکا تھا سب سے پہلے چن چن کر ان کو اس نے نکلوایا میر بنیاد علی اور لالہ تیواری پر بھی اس نے ہاتھ صاف کرنا چاہا مگر کچھ پیش نہ چل سکی اور یہ بدستور قائم رہے شیخ عبد الحفیظ صاحب جو مولوی عبد المجید صاحب کے وقت کے ایک نہایت دیانت دار اور تجربے کار مختار عام تھے ان بے عنوانیوں کی تاب نہ لا کر مستعفی ہوگئے ان کے چلے جانے پر شیخ صاحب نے اور بھی ہاتھ پاؤں نکالے یعنی لالہ دربار ی لال وغیرہ مہاجن الہ آباد سے نوح صاحب کی جائداد پر سودی قرض لے لے کر تجارت کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ چھیڑ دیا کرانہ پرچون، جوتہ کپڑا لکڑی وغیرہ کی متعدد دکانیں ایک ہی وقت میں کھول دیں اور ایک ہی مد میں کئی کئی ملازم مقرر ہوئے کچھ تو ان لوگوں نے خود اچھی طرح کھایا پیا اور کچھ قرب و جوار کے لوگ ادھار لے گئے جس کو ضرورت بھی نہ تھی اس نے لٹتی ہوئی دولت دیکھ کر کوئی نہ کوئی چیز خرید کر لی جب وصولی کا وقت آیا تو کسی نے کوئی حیلہ کسی نے کوئی عذر کر دیا غرض ہزاروں روپئے برباد ہو گئے اور نفع کی جگہ بہت بڑا خسارہ اٹھانا پڑا انھیں چلتی ہوئی دوکانوں کے دوران میں شیخ صاحب کی نگاہیں بے ساختہ بازار حسن پر بھی اٹھیں اور یہاں کی بھی بہت کچھ سیر فرمائی۔ نادر علی جب ان کو واجد علی شاہ کے رنگ میں اچھی طرح رنگ چکا اور بخوبی اطمینان ہوگیا کہ اب انھیں نشۂ عیش عشرت میں اس قدر ہوش

و حواس نہیں کہ یہ کچھ کر سکیں تو رعیت پر کھلم کھلا طرح طرح کے ظلم کر کے رقم ناجائز وصول کرنے لگا جو روپیہ لگان میں کاشتکار دیتے تھے نہ اس کا کوئی حساب تھا نہ وہ کسی کاغذ میں درج ہوتا تھا نہ بہی تھی نہ کھتونی نہ جمع خرچ نہ واصل باقی جس کو چاہا بیباق کیا جس کو چاہا باقی دار رکھا اپنے اختیار کی بات تھی۔ نذرانہ تاوان کا کیا پوچھنا جس کو دبایا اسی سے اچھی خاصی رقم وصول کر لی رعیت فریاد کرنے کے لئے ڈیوڑھی پر آتی تھی اور ان غریبوں کی کوئی سننے والا نہ تھا۔

ان بدنظمیوں کو نوح صاحب اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور نوح صاحب کی والدہ اپنے کانوں سے سنتی تھیں مگر لحاظ و ادب کے خیال سے کوئی لفظ زبان پر نہ آتا تھا آخر کار کچھ تو پرانے خیر خواہوں نے جو دو ایک مثلاً میر بنیاد علی ساکن باجہ پور شیخ عبدالعلی صاحب مرحوم لالہ تیواری وغیرہ رہ گئے تھے نوح صاحب کو نصیحت کرنی شروع کی کہ اب تم کو اپنا کاروبار سنبھالنا چاہئے اور کچھ خود نوح صاحب کو بھی محسوس ہوا ایک دن سیر و تفریح کے بہانے سے یہ پر سکھی جو ایک گانو دریا کے کنارے نارہ سے چھ کوس فاصلے پر ہے اور نادر علی کی خاص جولان گاہ تھا تشریف لے گئے اتفاق وقت سے نادر علی کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس موقع کو کاشتکار غنیمت سمجھ کر تحصیدہ من بودہ ملازمان مقامی کی وساطت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو کچھ ان پر مصائب گذر چکے تھے اور گذر رہے تھے اُن سے پوری پوری انھیں اطلاع دی انھوں نے سب شکایتیں سن کر اسامیوں کو بہت کچھ اطمینان دلایا اور واپس ہو کر اپنی والدہ صاحبہ سے تنہائی میں ساری باتیں عرض کیں اور کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ریاست کا کام کرنا شروع کروں ماں کو اس سے بڑھ کر اس موقع پر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی کہ لڑکا سن تمیز کو پہنچ کر اپنا کام خود کرنے کے لئے تیار ہے انھوں نے بخوشی اجازت مرحمت فرمائی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنی کریمی سے خدا خدا کر کے یہ مبارک ساعت تو دکھائی اجازت ملنے کے بعد یہ شیخ سید حسن صاحب کے دربار میں حاضر ہوئے اور نہایت مہذب الفاظ میں گذارش کی کہ آپ نے اب تک میری ریاست کے ہر کام کو بہت ہی جواں مردی اور شفقت سے انجام دیا جب میں آپ کی دعا سے اس قابل ہو گیا ہوں کہ اپنا بار خود اٹھا سکوں تو مجھے شرم آتی ہے کہ میرے ہوتے ہوئے آپ کسی قسم کی تکلیف اٹھائیں لہذا میری سعادت مندی کا اقتضا یہ ہونا چاہیے کہ آپ کو میں اس عمر میں آرام پہنچاؤں آپ بزرگوں کی طرح اپنا چھوٹا مجھے سمجھ کر اپنی ہر خدمت مجھ سے لیجئے اور جس کام میں میری ناواقفیت یا ناتجربہ کاری سے کچھ خرابیاں پیش آئیں اُن کے متعلق مجھے ہدایت فرمایئے شیخ صاحب موصوف ایسے نادان نہ تھے جو ان باتوں کو نہ سمجھتے اور زمانے کی ہوا کا رخ نہ پہچانتے فوراً تہ تک پہنچ کر خاموش ہو گئے نوح صاحب نے فوراً خاص آدمی بھیج کر شیخ عبدالحفیظ صاحب کو بلا بھیجا وہ قدیمی نمک خوار تھے فوراً حاضر ہو گئے اب اُن کی رائے سے انھوں نے اپنا کاروبار کرنا شروع کر دیا شیخ سید حسن صاحب دو تین سال تک یہ تماشے دیکھتے رہے اور پھر اپنے گھر چلے گئے لیکن جو ان کی تنخواہ تھی وہ اُن کی زندگی تک برابر اُن کو ملتی رہی سال چھ مہینے میں جب وہ تشریف لاتے تو اُن کا پورا پورا احترام کیا جاتا اور جاتے وقت ایک مقررہ رقم ان کو دی جاتی جب ان کا انتقال ۱۹۲[illegible]ء میں ہو گیا تو یہ تنخواہ بند کر دی گئی مگر اب بھی جب ان کے لڑکوں میں سے کوئی آ نکلتا ہے تو کچھ نہ کچھ دیا جاتا ہے۔

عنانِ حکومت لیتے ہی نوح صاحب نے اپنے قرض کی فہرست دیکھی اُس وقت تک پینتیس ۳۵ ہزار قرض ہو چکا تھا اس تعداد کے معلوم ہونے پر یہ سخت پریشان ہوئے مگر بسم اللہ کرکے ادائی کی تدابیر سوچنے لگے اور اپنے دل کو ہر طرح سمجھایا اور جی میں ٹھان لی کہ انشا اللہ میں بغیر کسی گانو کے الگ کئے ہوئے اپنے حسنِ انتظام سے دام دام ادا کروں گا چنانچہ خداوند تعالیٰ نے یہ خیال ان کا پورا کیا نادر علی کے ذمہ حساب و کتاب کے بعد کئی ہزار روپیہ نکلے مگر اس کے ساتھ اس پر بھی انھوں نے کوئی سختی نہیں برتی اگرچہ وہ ہر امکانی سزا کا مستحق تھا صرف یہی کیا کہ اس کو موقوف کرکے اپنی ریاست سے نکال دیا یوں تو بعد موقوفی کے بھی وہ کبھی کبھی سلام کرنے کے لیے آجاتا تھا مگر پھر اس کی زندگی تک کوئی جگہ اس کو نہ دی گئی قرض ادا کرنے کے لئے یہ ضرورت سختی سے محسوس ہوئی کہ بچت کی صورتیں نکالی جائیں چنانچہ ضرورت سے زیادہ جس قدر نئے ملازم درمیان میں رکھ لئے گئے تھے ان میں بڑی حد تک تخفیف ہوئی اور جو جانور یا سامان بے کار تھا یا جن کے رکھنے سے مصارف بڑھ جانے کا خیال ہو سکتا تھا وہ کچھ فروخت کر ڈالے گئے اور کچھ لوگوں کو یونہیں دے دیئے گئے صرف ایک چھوٹا سا گھوڑا جس کی انتہائی قیمت تیس چالیس روپیہ رہی ہوگی سواری کے لئے رکھ لیا گیا اس پر کبھی شیخ عبد الحفیظ صاحب کبھی نوح صاحب خود سوار ہو کر تحصیل اور گانو پر جاتے تھے اور قریب قریب ہر گانو کی وصول تحصیل دونوں صاحب مل کر کرتے تھے اس جفاکشی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہر کام پر انھیں اچھا خاصہ عبور ہو گیا اور معاملے کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو گئی کسی گانو پر کوئی خاص کارندہ نہ تھا صرف دو دو مقامی پیادے ضلع میں رہتے تھے انھیں کے تعلق ہر قسم کی نگرانی تھی معمولی کام ہوتا تو خود وہ انجام دیتے اور جن میں اہمیت سمجھتے ان کی اطلاع ڈیوڑھی پر کرتے وصول تحصیل کے لئے ہر گانوں کے ہفتے مقرر تھے جس گانو کا ہفتہ آجاتا تھا اس میں اُس کی وصول تحصیل ہوتی تھی اب وہ سرکاری مطالبے علاقے ہی سے ادا ہونے لگے جن کا انتظام ہر قسط پر قرض سے کیا جاتا تھا اور جن کے متعلق اکثر کارندے تحصیل کی حوالات میں بند کئے جاتے تھے پہلے چھوٹی چھوٹی تعداد کے قرضے ادا کئے گئے ان کی ادائی کے بعد وارثان لالہ درباری لال صاحب مہاجن الہ آباد کو اس بات پر رضامند کیا گیا کہ وہ اپنی بڑی دست آویز کا سود آیندہ سے بند کر دیں اور موجودہ رقم کی قسط کر دیں چنانچہ لالہ بچو لال ٹھاکر پرشاد بدری پرشاد صاحبان وارث مابعد لالہ درباری لال صاحب نے جناب مولوی محمد مہدی صاحب وکیل کے فرمانے اور شیخ عبد السلام صاحب کے دوڑ دھوپ سے اس کو منظور کر لیا اور مبلغ اٹھارہ ہزار کی نئی دست آویز بطور قسط بندی اس شرط کے ساتھ نوح صاحب نے لکھ کر رجسٹری کرا دی کہ ہر قسط میں وہ مبلغ ایک ہزار روپیہ یعنی ایک سال میں دو ہزار روپیہ ادا کریں گے اور وارثان لالہ درباری لال صاحب نے بھی ایک اقرار نامہ لکھ دیا کہ آیندہ سے انھیں سود کے متعلق کوئی دعوے نہ ہوگا اس تکملہ کے بعد براہ راست بالا بالا دو ہزار روپیہ سالانہ مہاجنوں کے پاس بھیج دیا جاتا تھا اور اُن سے باضابطہ رسید لے لی جاتی تھی غرض نو برس میں یہ قرض بھی ادا و بیباق ہو گیا اور گھر میں بھی اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی کیونکہ قسط کی تعداد کم تھی اور منافع اس سے بہت زیادہ تھا۔

جب ان جھگڑوں سے نجات مل گئی تو تزک احتشام کے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا ہوئے فرنیچر خرید کئے گئے کچھ ملازم بڑھائے گئے جانور گائے بھینس گاڑیوں کے واسطے بیل سواری کے لئے اعلے اعلے قسم

کے گھوڑے مول لئے گئے مکان کی آرائش ہونے لگی مسجد جو ناتمام پڑی تھی اس پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جانے لگا کمرے کے آگے ایک نیا سائبان بہت خوب صورت بنوایا گیا اکثر بڑی بڑی زمین داریوں کے بیع نامے لکھوائے گئے الغرض اس وقت وہ جملہ سامان موجود ہیں جو ایک بڑے سے بڑے تعلقہ دار کے دولت خانے پر ہونے چاہئیں اور خدا کا شکر ہے کہ نہایت آرام، بے فکری اطمینان فارغ البالی کے ساتھ زندگی گذر رہی ہے تخمیناً دس ہزار سالانہ کے علاقوں کا منافع ہوگا۔

نوح صاحب آغاز میں چار یا پنچ سال برابر خود وصول تحصیل کے لئے علاقوں پر منشی عبدالحفیظ صاحب مختار عام کے ساتھ جاتے رہے مگر جب ایک ایک بات سے بخوبی واقفیت ہوگئی تو مسلسل طور سے انھوں نے جانا چھوڑ دیا اور جملہ کاروبار کے انتظامات انھیں کے سپرد کردئے صرف سال میں دو بار یا ایک بار بقایا رقم کی جانچ کے لئے جانے لگے چنانچہ یہی قاعدہ اب تک ہے اسامیوں کی شکایت پر ڈیوڑھی پر بلوا کر بیانوں سے واقعات پوچھے جاتے ہیں اور جانچ کی جاتی ہے جن معاملات میں موقع پر جانے کی ضرورت ہوتی ہے تو مختار عام صاحب بھیجے جاتے ہیں یا بذات خاص خود پہنچتے ہیں غرض کوئی معاملہ فیصلہ طلب ایسا نہیں ہوتا جس میں انصاف اور مستعدی سے کام نہ لیا جاتا ہو یہی وجہ ہے کہ ان کے اسامی ان سے بہت خوش رہتے ہیں اور ہر شخص کو ان پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے۔

جب ۵۲ برس تک شیخ عبدالحفیظ صاحب مرحوم مختار عام اس ریاست کا کام کرتے کرتے بہت ہی پیرانہ سال ہو گئے تو حقوق پر نگاہ کرتے ہوئے قدر دانی کے لحاظ سے بقیہ زندگی تک کے لئے ان کی پوری تنخواہ بطور پنشن کے نوح صاحب نے منظور فرماکر ان کی جگہ پر منشی اوصاف علی صاحب کو جو ان کے حقیقی پوتے ہیں انھیں اختیارات کے ساتھ اپنا مختار عام مقرر کردیا اس وقت قریب قریب تمام ریاست کی وصول تحصیل اور مقدموں کی پیروی انھیں کے تعلق ہے یہ نہایت بردبار عقلمند متین مہذب دیانت دار ہر کام سے واقفیت رکھنے والے آدمی ہیں ان کے طریق عمل اور وضع قطع سے تمام رعیت بھی خوش ہے اور نوح صاحب کو بھی بہت کچھ اطمینان رہتا ہے۔

نوح صاحب کی والدہ نے اپنی والدہ کے مشورے سے پہلے نوح صاحب کی نسبت شیخ سید حسن صاحب اُن کے بھائی کی صاحب زادی کے ساتھ کی تھی جب شادی ہونے سے پہلے اس لڑکی کا انتقال ہوگیا تو نارے کے اکثر گھرانوں سے سلام پیام ہوئے مگر کہیں کے لئے ادھر سے رضامندی نہ ظاہر کی گئی آخر میں شیخ محمد شاکر صاحب وغیرہ کے اصرار سے منشی حب الحق صاحب ساکن نگیامئی کے ساتھ اِن کی نسبت قرار پائی۔

نگیامئی تحصیل سراتھو کے قریب واقع ہے اس گانو کے گھرانوں سے نارے کے شرفا خاندانوں کے قدیم تعلقات شادی بیاہ کے چلے آتے ہیں چنانچہ خود نوح صاحب کی دو مختلف البطن بڑی بہنوں کی شادیاں اسی گانو میں ہوئیں یہاں کے لوگوں کا پہلے یہ دستور تھا کہ جو تقریب اعلٰے پیمانے پر کرتے تھے وہ نارے میں آکر کرتے تھے اور جملہ رسمیں یہیں سے ادا ہوتی تھیں کھانا پینا یہیں سے ہوتا تھا اب کچھ زمانے سے یہ دستور بدل گیا ہے نارے کے بجائے خود نگیامئی سے شادیاں وغیرہ ہوجاتی

ہیں نارے کے جن گھرانوں سے جن کے قریبی تعلقات ہیں انھیں وہ وہیں بلوا لیتے ہیں۔

منشی حبیب الحق صاحب بھی اسی گاؤں کے رہنے والے تھے متعدد گاؤں میں ان کی زمیں داری ہے اُس زمانے میں یہ کلکٹری بارہ بنکی اودھ میں ملازم تھے اور نہایت الوالعزمی اور فارغ البالی کے ساتھ اپنی بسر کرتے تھے۔ انھوں نے قدیم دستور کے مطابق شیخ محمد شاکر صاحب ساکن نارہ کے گھر سے جن کے بہنوئی ہوتے تھے اپنی لڑکی کی شادی نہایت حوصلے سے ۱۲ر شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۲۷ر مارچ ۱۸۹۶ء جمعہ کو کی اور کھانا وغیرہ کے پکوانے میں اور تقسیم میں بہت کچھ اہتمام سے کام لیا صاحبان برادری کے علاوہ ان کے بیرونی خاص احباب میں سے حافظ عبدالرؤف صاحب و منشی حشمت علی صاحب بھی بارہ بنکی سے تشریف لاکر شریک تقریب ہوئے۔

نوح صاحب اپنی ماں کے بہت پیارے لاڈلے اکلوتے بیٹے تھے اس لئے ان کی والدہ نے اپنے ماموں شیخ سید حسن صاحب کے اہتمام سے اس موقع پر خرچ کرنے میں کوئی کمی نہ کی اور اپنے دل کے خوب خوب حوصلے نکالے روپئے کی تھیلیوں کا منھ کھول دیا تمام علاقے کے لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں عام طور سے دعوت دی گئی کئی دن تک برادری میں طرح طرح پر تکلف اور لذیذ کھانے تقسیم ہوا کئے اعزا اور خدمتی رعیت اور ملازموں کو حسب مراتب اندر باہر مردانہ زنانہ جوڑا عطا کیا گیا برات کے جلوس میں مختلف قسم کے باجے تھے روشنی کا خاص انتظام تھا سیکڑوں روپیوں کی آتش بازی اور پھلواری ساتھ تھی تین شبانہ روز تک رقص و سرود کی محفلیں گرم رہیں خدا نے بہزار خرابی یہ دن دکھایا تھا جو کچھ کیا جاتا وہ کم تھا پہلے زمانے کے متعلق تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا مگر بیس تیس برس کی مدت میں کوئی اور ایسی شادی نارے میں نہیں ہوئی۔

شادی کے دوسرے سال اللہ تعالیٰ نے نوح صاحب کو بیٹا دیا پھر ایک لڑکی ہوئی پھر ایک اور لڑکا پیدا ہوا بڑے لڑکے کا ابوالحسن اور صاحب زادی کا سایرہ بی بی عرف چندن بی بی اور چھوٹے لڑکے کا نام محمد خضر رکھا گیا ابوالحسن کی پیدائش کے وقت نوح صاحب کی والدہ زندہ تھیں انھوں نے عقیقے میں بہت کچھ مصارف کئے کھانے پینے کے علاوہ رعیت کو بہت کچھ انعام واکرام دیا رقص و سرود کی محفلیں قریب قریب ہر حلقے میں قائم ہوئیں اور ہر ضلع سے شیرینی تقسیم کی گئی غرض یہ تقریب بھی نہایت دھوم دھام سے عمل میں آئی کچھ زمانے کے بعد بسم اللہ کے موقع پر نوح صاحب نے بھی بہت کچھ حوصلے اور فراخ دلی سے کام لیا سایرہ بی بی اور محمد خضر کے بھی عقیقے ہوئے مگر ان تقریبوں میں کوئی خاص نمایاں بات نہیں ہوئی افسوس ہے کہ دونوں بچوں نے پانچ مہینوں کے دوران میں انتقال کیا اب صرف سایرہ بی عرف چندن بی بی اولاد اناث میں ہیں انھیں کے نام نوح صاحب نے اپنا کل علاقہ وقف علے الاولاد کر دیا ہے ان کی شادی نہایت تزک واحتشام سے حافظ ریاض احمد صاحب کے ساتھ جو خاندانی لحاظ سے بھتیجے ہوتے ہیں کی گئی ہے تقریب کے موقع پر ایک جنرل مشاعرہ ہوا تھا جس کا حال دیوان دوم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اس مشاعرے میں قریب قریب تمام ہندوستان کے مشاہیر شعرا شریک ہوئے تھے مجید احمد عرف مجن میاں سہیل احمد عرف میکن میاں دو نواسے اور حمیدہ بی بی عرف چھدن بی بی اور سعیدہ دو نواسیاں موجود ہیں خداوند تعالیٰ ان کی عمر میں

برکت اور اقبال میں ترقی عطا فرمائے وحید احمد عرف عدن میاں اعجاز احمد عرف ببن میاں اور کندن بی بی کا انتقال صغر سنی میں ہو گیا۔

یوں تو بڑے گھرانے میں جتنے حضرات ہیں وہ سب قریبی عزیز اور خاندانی لوگ ہیں مگر جو فوقیت منشی عبد الحمید صاحب کو حاصل تھی وہ اور کسی کو نہیں یہ نوح صاحب کے حقیقی چچا کے بیٹے یعنی مولوی عبد المجید صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ عبد الرشید صاحب مرحوم مغفور کے اکلوتے صاحب زادے تھے دونوں صاحبوں کی عمر میں دو تین سال کی کمی بیشی تھی نوح صاحب ان سے عمر میں بڑے اور یہ ان سے عمر میں اگرچہ کم تھے لیکن اصابت رائے اور تجربہ کاری اور قابلیت وغیرہ میں علاوہ شاعرانہ کمالات کے کسی طرح کم بھی نہ تھے دونوں بھائیوں میں بے حد خلوص تھا اور طریق عمل سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حقیقی بھائی نہیں بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ نوح صاحب نے اپنی رائے پر ان کی رائے کو مقدم سمجھا اور انھیں کی رائے پر کاربند رہے انھیں وجوہ پر ریاست کے بڑے بڑے اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا تھا اور انھیں کی نگرانی میں اکثر مقدمات کی پیروی ہوتی تھی چوں کہ کلکٹری الہ آباد میں یہ نائب منصرم نقل تھے اس لئے جب کوئی مختار عام وغیرہ نہیں پہنچتا تھا یا جس مقدمہ میں کوئی خاص بات پیش آجاتی تو یہ خود بذات خاص موجود رہ کر اس کا تکملہ کر لیتے غرض اس اتحاد کی نظیر دنیا میں مشکل سے ملے گی یہ تمام دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ حقیقی بھائیوں میں خانگی جھگڑوں سے خوش گوار تعلقات قائم نہیں رہتے پھر چچیرے بھائیوں میں تو روز طرح طرح کے ہنگامے ہوتے ہی رہتے ہیں اس وقت چشم بد دور ان کی اولاد میں ایک لڑکی اور ایک لڑکا غلام مصطفےٰ اسلمہ ہے غلام مصطفےٰ الہ آباد میں ملازم ہیں افسوس ہے کہ منشی عبد الحمید صاحب کا انتقال ۱۳۵۴ھ میں ہو گیا اور لڑکی بھی انتقال کر گئی۔

نارے میں جب پہلی بار طاعونی شکایت شروع ہوئی تو جس کا جہاں باہر ٹھکانا تھا وہ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر وہاں چلا گیا نوح صاحب کو بھی ان کے بہی خواہوں نے مکان چھوڑ دینے کی رائے دی یہ بھی جملہ متعلقین کو لے کر نگیامئی منشی حبیب الحق صاحب کے مکان پر اس خیال سے چلے گئے کہ تحصیل اور اسٹیشن قریب ہے عمال سے اور مقامی اعزا سے دل بستگی رہے گی اور اپنے علاقے پر اس سبب سے نہ گئے کہ رعیت میں تبادلۂ خیالات کا موقع نہ ملے گا ان کے جانے کے بعد نارے میں بہت سی موتیں ہوئیں اور اس شکایت کا سلسلہ کئی مہینے تک قائم رہا جب یہ وبا اچھی طرح مٹ گئی اور دس بارہ روز واپسی میں رہ گئے تو دفعتاً ان کی والدہ صاحبہ کو زکام ہوا اور بخار بھی آنے لگا چوں کہ دو تین سال سے وہ متواتر بیمار رہتی تھیں اس لئے اس بخار میں ان کا حال بہت جلد غیر ہو گیا جو کچھ امکانی تدبیر ممکن تھی وہ کی گئی مگر کسی طرح طبیعت نہ سنبھلی اور ایک ہفتہ بیمار رہ کر بعد نماز جمعہ کے انتقال فرما گئیں حسب وصیت لاش نارے آئی اور مقبرہ میں دفن ہوئی افسوس ہے کہ انھوں نے شروع میں کچھ دنوں تک آرام اٹھانے کے بعد عمر بھر مقدمہ بازی طرح طرح کی زیر باری انواع انواع اقسام کے تردد و افکار میں بسر کی اور جب سکون ہوا یعنی نوح صاحب خود کام کرنے لگے اور اطمینان کا زمانہ آیا تو خود زمانے سے چل بسیں سایہ مادری اٹھ جانے سے نوح صاحب

کو نہایت صدمہ ہوا اور ان کی نانی صاحبہ نے اپنی اکلوتی لڑکی کا بہت کچھ ماتم کیا لیکن مشیت خدا میں کیا اختیار تھا رو دھو کر راضی برضا شاکر بقضا ہو گئیں۔

غم کی چوٹ بری ہوتی ہے اس سانحہ کے بعد نوح صاحب کی نانی صاحبہ کی بصارت روتے روتے بالکل زائل ہو گئی اور صرف دو تین سال تک کسی نہ کسی طرح زندہ رہیں کہ وہ بھی اس کو فت میں بیمار ہوئیں حالاں کہ بہت کچھ علاج کیا گیا مگر انھوں نے بھی انتقال فرمایا۔

وہ مکان فی الحقیقت بہت خوش نصیب ہیں جن میں کوئی نہ کوئی بزرگ موجود ہے گھر میں بڑے بوڑھوں کا وجود باعث برکت ہوتا ہے افسوس ہے کہ ایسی مقدس ہستیوں سے یہ گھر صاف ہو گیا اب نوح صاحب جدھر اپنی آنکھیں اٹھا کر دیکھتے ہیں ان کو اپنے سوا کوئی بزرگ نظر نہیں آتا انھوں نے اپنی زندگی کے اتنے دن انھیں میں بسر کئے تھے آنکھیں کھول کر انھیں کو دیکھا تھا والد صاحب کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا ان کی صورت بھی ان کو اچھی طرح یاد نہ تھی مگر کرتے تو کیا کرتے ہر طرح مجبور تھے آخر کار جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا یہ غم بھی کم ہوتے گئے لوگ ایسے موقع پر صبر کی ہدایت کرتے ہیں میرے خیال میں صبر مجبوری کا دوسرا نام ہے ادھر احباب تسکین دے رہے تھے ادھر چپکے چپکے تقدیر کہہ رہی تھی کہ ابھی دو اور صدمے اٹھانے پڑیں گے

ایک زمانہ وہ تھا کہ ان بچوں کے پیدا ہونے پر خوشیاں منائی گئیں احباب کی دھوم دھام سے دعوت ہوئی مبارک سلامت کے ترانے گائے گئے اظہار مسرت میں جلسہ کیا گیا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ اعزا و اقربا مصروف ماتم ہیں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے گریہ و زاری کی پر درد صدائیں بلند ہو ہو کر کلیجے کو ٹکڑے ٹکڑے کئے دیتی ہیں بھرا پُرا گھر اجڑ گیا آیندہ کی امیدیں مٹ گئیں ارمانوں کی دنیا تباہ ہو گئی جو کچھ خدا نے دکھایا دیکھنا پڑا شادی کے سہروں کی جگہ انتقال کی تاریخیں اور وفات کے مرثیے لکھے گئے ایسے موقع پر سمجھانا بے کار ہے مگر رسم دنیا ہے لوگ سمجھاتے ہیں اثر ہو یا نہ ہو ایک طرف کسی کا کلیجہ پھٹ جائے دوسرے طرف اطمینان کوئی دے تو کس خیال سے دے دل پتھر یا فولاد کا نہیں جو صدمات اٹھائے اور آہ نہ کرے بسیط عالم کے یہی واقعات ہیں اسے ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے کوئی نہیں آیا جو آیا ہے وہ جائے گا جو پیدا ہوا کسی نہ کسی دن ناپید ہوگا اوّل موت آخر موت اس سے چھٹکارا نہیں لیکن طبیعت نہیں مانتی کسی قدر بھی کوئی ضبط سے کام لے آنسو آنکھوں سے نکل ہی آتے ہیں آہ بے ساختہ لب پر آ ہی جاتی ہے بہت دن گذر جانے پر رنج و الم میں وہ شدت اگرچہ باقی نہیں رہتی تاہم جب کبھی خیال آ جاتا ہے تو گذرے ہوؤں کی یاد میں دل چین نہیں لیتا۔

نومبر یا دسمبر ۱۹۱۵ء میں دفعتاً بارہ بجے رات کو سوتے سوتے محمد خضر روتا ہوا جاگ اٹھا بدن پر ہاتھ رکھنے سے معلوم ہوا کہ بخار ہے چوں کہ سردی کا زمانہ تھا اس لئے اوپر سے اور لحاف وغیرہ ڈال دئے گئے مگر اس کو کرب کے سبب سے نیند نہ آئی اور جاگ کر اس نے صبح کی ہنوز وہ کچھ بول نہ سکتا تھا اس باعث سے اچھی طرح یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کو کیا تکلیف ہے مقامی حکیم صاحبان اپنی رائے سے علاج کرتے رہے مگر تین دنوں تک بیمار رہ کر چار برس کے سن میں انتقال کر گیا اور اعزا ماتم کرتے رہ گئے اس سانحہ کی

پر درد تاریخ جو باپ نے لکھی وہ دیوان دوم طوفان میں درج ہے۔

ابوالحسن پہلے مکان پر بسم اللہ کے بعد مولوی محمد ہارون و مولوی نجم الدین ہر دو صاحبان سے فارسی اور ماسٹر فخر الدین صاحب سے انگریزی پڑھتے رہے جب فارسی کی تکمیل قریب قریب ہو چکی تو جناب مولوی شفیع الزماں صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل ہائی کورٹ کی نگرانی میں الہ آباد گئے اور انھیں کے مکان پر ٹھہر کر شیو راکھن اسکول انگریزی میں نام لکھوایا سات آٹھ مہینے تک وہاں تعلیم پائی کہ اپنے نانا منشی حبیب الحق صاحب کے ساتھ بارہ بنکی چلے گئے اور مستقل طور سے وہاں پڑھنا شروع کیا اگرچہ یہاں اور وہاں کے کورس میں اختلاف تھا مگر پانچ چھ مہینے کی محنت میں یہ کمی پوری کر کے سالانہ امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب بھی ہو گئے اس خوشی کی خبر دینے کو گرمی کی چھٹیوں میں مکان آئے تھے کہ آنے کے تیسرے روز قے اور دست کی شکایت شروع ہوئی بہت کچھ تدبیریں کی گئیں مگر کچھ فائدہ نہ ہوا آخر میں حکیم عبدالقوی صاحب نے قے اور دست روکنے کی دوا دی اس سے رکاوٹ تو ہو گئی لیکن ہذیان بکنے لگے اور دو چار گھنٹے کے بعد زبان ایسی بند ہوئی کہ پھر نہ کھلی دو شبانہ روز یہی حال رہا تیسرے دن بعد ظہر چودہ برس کی عمر میں یہ ماہ کامل چودہ منزلیں طے کر کے ۲ مئی ۱۹۱۱ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا اور ایک ایک باتیں یاد کرنے کو رہ گئیں۔

نوح صاحب کے لئے محمد خضر ہی کا صدمہ کیا کم تھا کہ ایک اور تازہ صدمہ ابوالحسن کا بھی ان کے دل کو پہنچا ایک اولاد کا داغ ستم ہوتا ہے پھر دو اولاد کا داغ تو اور قیامت ہے دیوانہ وار پھرتے تھے اور در و دیوار پر سر پٹکتے تھے اور ہائے ابوالحسن ہائے ابوالحسن کہہ کر بے ہوش ہو جاتے تھے نہ سمجھانے کی جگہ تھی نہ کچھ کہنے کا محل تھا اگر اور کوئی لڑکا ہوتا تو اسی سے تسکین خاطر ہوتی دو بچے تھے دونوں کے دونوں پانچ مہینے میں جاتے رہے یہ سب جانتے ہیں کہ گریہ وزاری سے کوئی دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا مگر طبیعت نہیں مانتی دل نہیں سنبھلتا آنسو نہیں رکتے جی چاہتا ہے روؤ اور خوب روؤ اور کچھ نہ ہوگا بھڑاس تو کم سے کم نکل جائے گی اتنا زمانہ گذر گیا مگر یہ غم اس وقت بھی تازہ ہے جب یہ بچے یاد آ جاتے ہیں تو بے ساختہ دل میں درد اٹھ کر ایک ہیجانی عالم پیدا کر دیتا ہے یہ تو خیر مرد تھے چار چھ جگہ اٹھ بیٹھ کر ان کا غم غلط ہو سکتا تھا مگر ان کی بی بی کے صدمہ کا اندازہ کیجئے کہ ان کا حال زار کیا ہوا ہوگا۔ ان صدموں کے سبب سے کئی برس تک زندہ رہ کر وہ بھی انتقال کر گئیں۔ اس سانحہ پر جو مرثیہ نوح صاحب نے لکھ کر اپنے دیوان دوم طوفان نوح میں شامل کر دیا ہے اس میں الفاظ نہیں بلکہ غم کی جیتی جاگتی ایسی تصویریں ہیں جو پڑھنے والے کو بغیر مغموم کئے نہیں رہ سکتیں دل کا خون قلم کی نوک سے کاغذ پر ٹپک گیا ہے

میر نجف علی صاحب نجف جن سے آخری کتابیں پڑھنے کو نوح صاحب جاتے تھے ان کے ہاں بیشتر شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا کبھی کبھی لوگ کلام سننے کے لئے یا اصلاح لینے کو آ جاتے تھے ایک روز رات کو انھوں نے نئی زمین میں نئی غزل کہی اور صبح کو جب نوح صاحب سبق پڑھنے کو گئے تو نہیں معلوم کیا سمجھ کر انھوں نے ان کو وہ غزل سنائی چونکہ غزل لاجواب تھی اس کے سننے سے ان کے دل پر خاص اثر ہوا اور مکان پر آ کر یہ سوچنے لگے کہ اگر میں شعر کہنا چاہوں تو کیا نہیں کہہ سکتا ہوں طبیعت

نے جواب دیا کہ ممکن ہے نا ممکن نہیں اسی دن سے یہ شعر کہنے لگے اور سب سے پہلے ان کی زبان سے یہ مطلع نکلا۔

کیوں جائے بار بار نہ قاتل کے سامنے   پھرتی ہے شکل موت کی بسمل کے سامنے

دو تین دن میں غزل پوری کرلی اسی طرح رفتہ رفتہ دس بارہ غزلیں ہوگئیں مگر لحاظ کے سبب سے یہ میر صاحب کی خدمت میں نہ پیش کرسکے نہ اس کا ذکر کسی سے کیا منشی اکبر حسین صاحب اکبر ناروی ان دنوں مونگیر یا جمال پور میں ریلوے گارڈ تھے اتفاق سے چھٹی لے کر اپنے وطن نارہ آئے ان کو بہت زمانے سے شعر و سخن کا مذاق تھا شعر بھی کہتے تھے اور نثر کے مضامین بھی لکھتے تھے اور متعدد اخباروں کے نامہ نگار بھی تھے اور نوح صاحب سے مراسم بھی تھے شرماتے شرماتے انھوں نے اپنی غزلیں سنائیں انھوں نے سن کر بے ساختہ کہا کہ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ابتدا میں اکثر شعر لوگ ناموزوں کہہ جاتے ہیں مگر ان شعروں میں کوئی ناموزوں نہیں ہاں اور غلطیاں ضرور ہیں جو اصلاح سے مٹ جائیں گی ایک دن اس کا ذکر انھوں نے میر صاحب سے کردیا میر صاحب نے اصرار کرکے نوح صاحب سے غزلیں مانگ کر دیکھیں اور اصلاح فرمائی اب جو کچھ لحاظ تھا وہ جاتا رہا برابر غزلیں کہتے رہے اور وہ برابر اصلاح دیتے رہے کچھ دنوں کے بعد مولوی رمضان علی صاحب مدرس کا تبادلہ مدرسہ سرکاری نارہ سے ہوگیا اور ان کی جگہ منشی میراں بخش صاحب سخن جھنجھن پوری تبدیل ہوکر آئے انھیں شاہ زادہ مرزا قیصر بخت صاحب فروغ دہلوی سے تلمذ تھا اور اچھا کہتے تھے ان کے آنے سے ان کے شوق میں بہت کچھ اضافہ ہوا تین چار برس تک سخن صاحب یہاں کے مدرسہ میں مدرس رہے اور قریب قریب روزانہ ایک کو دوسرے سے تبادلۂ خیالات کا موقع مل جاتا تھا اور فکر سخن بھی ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔

اگرچہ نارے کے شعرا میں سے مثلاً منشی محمد سرور صاحب مولوی محمد بشیر صاحب مولوی بخشش علی صاحب بابو جگناتھ رائے صاحب وغیرہ انتقال فرما چکے تھے مگر پھر بھی موجودہ لوگوں میں جناب میر نجف علی صاحب نجف حکیم عبدالقوی صاحب قوی منشی علی حسین صاحب صبر مولوی محمد مہدی صاحب مہدی محمد سلیم صاحب سلیم وکیل منشی جمال الدین صاحب مطلب منشی وہاج الدین صاحب وہاج منشی نظام الدین صاحب نظام منشی عبدالحیٔ صاحب گستاخ منشی امیر حسن صاحب امیر۔ اور منشی اکبر حسین صاحب اکبر منشی گور نراین صاحب دل وغیرہ موجود تھے اس لئے نوح صاحب نے ایک مقامی مشاعرے کی بنیاد ڈالی چنانچہ کئی مشاعرے مختلف طرحوں پر ہوئے قریب قریب اور تو سب لوگوں نے ان مشاعروں میں غزلیں پڑھیں مگر منشی علی حسین صاحب اور مولوی محمد سلیم صاحب کو کبھی موقع شرکت کا نہیں ملا آخر کار سخن صاحب اور اکبر صاحب میں چوٹیں چلنے لگیں اس باعث سے یہ مشاعرے بند کر دئے گئے مگر جب مولوی شفیع الزماں صاحب وکیل تعطیل میں تشریف لاتے تھے تو ان کے دولت خانے پر غیر طرح کی دو ایک صحبتیں ہو جاتی تھیں۔

یہ واقعات گذر رہے تھے اور نوح صاحب کی مشق یوں ہی جاری تھی کہ میر صاحب نے ان کو حکم دیا

اگر تمھیں فی الحقیقت شاعری کا شوق ہے اور اس فن میں ترقی کرنا چاہتے ہو تو کسی مسلم الثبوت اہل زبان استاد کامل کو شاگرد ہو جانا چاہیئے چنانچہ اُن کے ارشاد پر سب سے پہلے انھوں نے ایک غزل جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کے پاس رام پور بھیجی منشی صاحب نے اصلاح تو دے دی مگر یہ لکھا کہ میں بہت عدیم الفرصت رہتا ہوں دوسرے تیسرے مہینے ایک غزل دیکھ لیا کروں گا اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکتا یہ بات ان کو اس خیال سے پسند نہ آئی کہ اگر دوسرے تیسرے مہینے صرف ایک غزل کی اصلاح ہوئی تو کیا نتیجہ ہو سکتا ہے جب تک ایک غزل کی اصلاح ہو گی یہاں بہت سی غزلیں تیار ہو جائیں گی اس صورت میں تمام و کمال کلام کا درست ہونا اگر نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے مگر اپنے اطمینان کے خیال سے انھوں نے وہی غزل اصلاح شدہ اور ایک غزل اور جناب حکیم میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی کی خدمت میں منصور نگر لکھنو بھیج دی حضرت جلال نے اس غزل میں بھی نئی غزل کے ساتھ کئی جگہ ترمیم فرمائی اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ میں اصلاح کا معاوضہ فی غزل ایک روپیہ لوں گا یہ بار ایسا تھا کہ موجودہ زیر باری کے لحاظ سے یہ متحمل نہ ہو سکتے تھے اس لئے انھوں نے کوئی صاف جواب نہ دیا لیکن جو نئی غزل جناب جلال نے اصلاح فرمائی تھی اس کو پھر جناب امیر مینائی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا انھوں نے بھی اس اصلاح شدہ غزل میں بہت کچھ تبدیلیاں کیں ان اصلاحوں کو دیکھ کر تو یہ تو یہ دونوں صاحبوں سے کچھ بدعقیدگی سی ہو گئی آخر میں انھوں نے ڈرتے ڈرتے اس خیال سے کہ نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی حضور نظام حیدر آباد دکن کے استاد ہیں توجہ فرمائیں یا نہ فرمائیں ایک نئی غزل اصلاح کے لئے ان کی خدمت میں روانہ کی جب یہ غزل اصلاح ہو کر واپس آئی تو اس اصلاح شدہ غزل کی دو نقلیں کر کے پھر ایک نقل جناب امیر مینائی اور ایک نقل جناب جلال کی خدمت میں بھیج دی لیکن اس پر دونوں صاحبوں نے کوئی نقطہ نہ رکھا جب اچھی طرح تجربہ اور اطمینان ہو گیا تو نوح صاحب مستقل طور سے حضرت داغ کے شاگرد ہو گئے اور انھیں سے اصلاح لینے لگے یہاں نہ نذرانہ تھا نہ کسی قسم کا معاوضہ صرف چند بزرگوں کی فاتحہ دلوائی جاتی تھی وہ دے دی گئی قریب قریب ایک ہفتہ میں ایک غزل دیکھ لی جاتی تھی اور جب کوئی سرکاری کام انھیں پیش آ جاتا تھا تو زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روز میں اصلاح طلب کلام واپس ہوتا تھا افسوس ہے کہ یہ غزلیں گم ہو گئیں ورنہ ناظرین ان تینوں غزلوں کی اصلاحوں کا لطف اٹھاتے اور یہ اندازہ کرتے کہ کن صاحب نے کیسی اصلاح دی۔

اصلاح کی تین صورتیں تھیں اوّل یہ کہ جس شعر میں جو عیب ہوتا تھا وہ مٹا دیا جاتا تھا اور حاشیہ پر اس کی وجہ لکھ دی جاتی تھی دوسرے یہ کہ جو اشعار بندش یا ترکیب کے لحاظ سے سست ہوتے تھے وہ چست کر دئے جاتے تھے مگر ان پر کوئی حاشیہ نہ ہوتا تھا تیسرے یہ کہ اکثر اشعار بغیر کسی اصلاح کے یک قلم قلم زد کر دئے جاتے تھے۔

یہ سب باتیں نوح صاحب کے پیش نظر رہتی تھیں اور اطمینان کے وقت اصلاحی الفاظ پر یہ غور کرتے تھے اور اپنے دل میں سوچتے تھے کہ اس ترمیم میں کیا بات ہے یعنی اس لفظ کی جگہ یہ لفظ کیوں رکھا گیا اور لفظی تغیر و تبدل سے کون سی امتیازی شان شعر میں پیدا ہو گئی جس لغزش پر ایک بار انھیں استاد نے ٹوکا پھر وہ تمام عمر ان سے نہیں ہوئی اس اطمینان پر کبھی نہیں رہے کہ جو کچھ چاہو لکھ دو

حضرت داغ تو درست ہی کر دیں گے بلکہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ اصلاح میں استاد کو زیادہ دقت نہ اٹھانی پڑے اور جلد ترقی کے زینے اپنے بل بوتے پر بغیر کسی کی امداد کے طے کر لئے جائیں یہ رات دن کا تجربہ ہے کہ استاد بار بار شاگردوں کو بتاتا ہے اور شاگرد فکر سخن کے وقت کچھ خیال نہیں کرتے بار بار وہی غلطیاں کرتے ہیں اور استاد ہی کی اصلاح کے بھروسے پر رہتے ہیں ایسے لوگوں کا ترقی کرنا بہت مشکل ہے جہاں آج انھیں دیکھئے وہیں دس برس کے بعد بھی انھیں دیکھئے گا یہ نہ کوئی اصلاح لینے کا قاعدہ ہے نہ اس سے کوئی فائدہ ہی ہے۔

اب حضرت داغ سے اصلاح لیتے ہوئے نوح صاحب کو دو تین سال ہو گئے بہت سی باتیں شاعری کے متعلق انھیں معلوم ہو چکیں رات دن استاد کے دواوین سامنے رہنے لگے اور فرصت کے وقت بیشتر اشعار پر نگاہ ڈالی جانے لگی بیٹھے بیٹھے ایک دن ان کو خیال آیا کہ جس شاعر کے رنگ کلام کی تقلید کی جائے اس کا کلام تقلید کرنے والے کو بہت کچھ یاد ہونا چاہئے اس کے علاوہ میں اہل زبان نہیں زیادہ سے زیادہ زبان دان بن سکتا ہوں ممکن ہے کسی محاورے یا کسی لفظ کے متعلق کوئی اعتراض کر بیٹھا تو سند دینے کے لئے دیوانوں کی ورق گردانی کرنی پڑے گی وقت پر اگر سند نہ پیش کی گئی تو ذلت ہے اس خیال میں گلزار داغ - آفتاب داغ - فریاد داغ - مہتاب داغ کو انھوں نے زبانی یاد کرنا شروع کیا یادگار داغ اس وقت تک شائع نہ ہوا تھا اسی یاد کرنے کے دوران میں جب اس مطلع پر نگاہ پڑی۔

کون غم خوار الٰہی شب غم ہوتا ہے   اب تو پہلو میں مرے درد بھی کم ہوتا ہے

تو ان کی عجیب کیفیت ہوئی بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور تمام دن اور تمام رات بے چین رہے بار بار مطلع کو پڑھتے تھے اور عالم وجد میں جھومتے تھے ممکن ہے اور لوگوں کے دلوں پر یہ کچھ اثر نہ کرے لیکن یہ بہت کچھ متاثر ہوئے اُس وقت سے دل میں ٹھن گئی کہ میں ضرور استاد کو دیکھوں گا یہ لگی ایسی نہ تھی جو بجھانے سے بجھ جاتی مگر خیال ہوتا تھا کہ والدہ صاحبہ اجازت نہ دیں گی اور اعزا بھی ایسے طولانی سفر کو پسند نہ کریں گے لہذا یہ کسی موقع کے منتظر رہے کچھ دنوں کے بعد ایک حیلہ انھیں مل گیا اور یہ بغیر کسی پر اپنے قصد کو ظاہر کئے ہوئے الہ آباد پہنچے اور وہاں سے جو آدمی ہم راہ تھا اُس کے ہاتھ اس مضمون کا ایک خط اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں لکھ کر بھیج دیا کہ میں باہر جا رہا ہوں یہ ابھی عرض نہیں کر سکتا کہ کہاں جاؤں گا اور کب تک واپسی ہوگی میرے بدخواہوں کی طرف سے کوئی خیال آپ قائم نہ کریں یہ سفر میں اپنی خوشی سے کر رہا ہوں اور میں زندہ ہوں اگر میں آپ سے کھلے ہوئے لفظوں میں اجازت مانگتا تو یقینی آپ اجازت نہ دیتیں میری اس گستاخی کو معاف فرمائیے گا ادھر یہ خط روانہ کیا اور ادھر خود تنہا حیدرآباد دکن روانہ ہو گئے۔

منماڑ اسٹیشن پر پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ اورنگ آباد کے قرنطینے میں دس روز تک حیدرآباد کے جانے والوں کو رہنا پڑتا ہے اور طرح طرح کی تکلیفیں ہوتی ہیں اس خبر سے ان کو بہت کچھ پریشانی ہوئی لیکن اُسی درجہ میں یہ جس میں سفر کر رہے تھے ایک صاحب اور حیدرآباد جا رہے تھے انھوں نے از راہ ہم دردی ان کا تردد دیکھ کر ان کا حال پوچھا اور بہت کچھ اطمینان دیا اور کہا میرے پاس ڈاکٹری سارٹیفکٹ

موجود ہے اس کے سبب سے ہیں تم کو بھی قرنطینہ جانے سے بچاؤں گا چنانچہ اورنگ آباد پہنچ کر اسی سارٹیفکٹ کے دکھانے سے کسی نے ان لوگوں کو نہ روکا صرف یہ ہدایت کی گئی کہ حیدرآباد پہنچ کر کسی قریبی شفاخانے میں اپنی نبض دکھا دینا غرض الہ آباد کی روانگی سے کئی روز کے بعد یہ استاد کے درِ دولت پر دس بجے دن کو بخیریت پہنچ گئے اور اپنی آمد کی اطلاع ایک ملازم کے ذریعہ سے حضرت داغ کو دی نواب فصیح الملک بہادر ان دنوں محبوب گنج کی منڈی میں قیام پذیر تھے نیچے کے مکان میں اصطبل تھا اور ملازم رہتے تھے بالا خانے پر ان کا قیام تھا اس اطلاع پر جناب سید علی احسن صاحب احسن دوڑے ہوئے آئے اور اپنے ساتھ اوپر لے گئے یہ جا کر اپنے استاد کے قدم بوس ہوئے اور انھوں نے اپنے گلے سے لگایا سب سے پہلے یہ ارشاد ہوا تم نے اپنی آمد کی اطلاع بھی نہ کوئی تار بھیجا نہ خط لکھا تمھیں یقینی اورنگ آباد کے قرنطینے میں دس روز تک سخت تکلیف اٹھانی پڑی ہوگی انھوں نے سب مفصل حالات عرض کئے پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں تھوڑی دیر میں سب لوگوں نے ایک ہی ساتھ کھانا کھایا تکان رفع کرنے کے خیال سے حکم ہوا کہ تم کئی روز کا سفر کر کے آئے ہو جا کر آرام کرلو پھر اطمینان سے ملاقات ہوگی ایک ملازم کو ہدایت کی گئی کہ جس مکان میں جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم ٹھہرے تھے وہیں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا جائے اور ہر وقت ان کے آرام و آسائش کا خیال رہے یہ مکان بالکل مکان سے ملا ہوا تھا ایک مسہری ڈال دی گئی چند کرسیاں آگئیں فرش وغیرہ بچھا دیا گیا اور یہ اسباب وغیرہ رکھ کر مستقل طور سے وہیں مقیم ہوگئے اگرچہ کئی روز تک سفر کر کے یہ آئے تھے مگر اس خوشی میں قطعی انھیں نیند نہ آئی کہ جو حسرت تھی خدا کے فضل سے نکل گئی یعنی استاد کو دیکھ لیا دوسرے وقت غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر یہ پھر استاد کی خدمت میں پہنچے اس وقت اور بہت سے لوگ وہاں موجود تھے سب سے تعارف ہوا اور لطف سے دن گذرنے لگے۔

ملازموں کو چھوڑ کر ہر وقت موجود رہنے والے لوگوں میں احسن صاحب سید افتخار عالم صاحب مارہروی نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر حیدرآبادی امراؤ مرزا صاحب ناداں برادر زادہ نواب مرزا خورشید برادر خورد حضرت داغ دہلوی شاہزادہ مرزا مجاہد الدین صاحب شاہی دہلوی تھے ان کے علاوہ میر مردان علی صاحب داروغہ شاہی محمد ابراہیم صاحب نواب عزیز یار جنگ صاحب عزیز ناظم صرف خاص ابوالحمید صاحب آزاد وکیل ہائی کورٹ نظام نواب عزیز جنگ صاحب ولا حیدرآبادی منشی ضیاء الحق صاحب ساکن نگیامئی مرزا مظفر حسین صاحب بارق علی گڑھی آغا شاعر صاحب شاہزادہ مرزا منیر الدین صاحب ضیا دہلوی وغیرہ کا اکثر روزانہ اور اکثر تیسرے چوتھے دن جمگھٹ ہو جاتا تھا کبھی کبھی سلام کرنے کے لئے جناب حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانک پوری جانشین اور منشی لطیف احمد صاحب اختر مینائی خلف حضرت امیر مینائی لکھنوی بھی حاضر خدمت ہوتے رہتے تھے اس زمانے میں ان دونوں صاحبوں کا قیام عالی جناب یمین السلطنت سر مہاراجہ کشن پرشاد صاحب بہادر مدار المہام کے دولت خانے پر تھا افتخار عالم صاحب کے قیام کی وجہ تو معلوم نہیں ہوئی مگر حافظ سید علی احسن صاحب فصیح اللغات کو ترتیب دے رہے تھے جن الفاظ کی سند ان کو مطبوعہ کلام سے مل چکی تھی وہ تو مل چکی تھی لیکن جن الفاظ یا محاوروں کی سند نہ ملی تھی اُن کے لئے نئے اشعار استاد سے کہلوا کر لغت میں داخل کرتے تھے یادگارِ داغ جو تھے دیوان میں

جو متفرق اشعار نظر آتے ہیں یہ وہی ہیں جو سند کے لئے کہے گئے تھے بہشس ترایسے موقع پر پیش آئے کہ کسی لفظ کے متعلق سند کی تلاش ہوئی چوں کہ نوح صاحب کو اپنے استاد کا کلام بہت زیادہ یاد تھا انھوں نے فوراً شعر پڑھ دیا اور وہی شعر سند میں لکھ دیا گیا یہ حال دیکھ کر حضرت داغ نے ایک بار فرمایا کہ دیوان حافظ تو پہلے دیکھا تھا مگر حافظ دیوان اب نظر آیا ایسے ہی ایک غزل کی اصلاح کے وقت نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ جب تک میں نے انھیں نہ دیکھا تھا غزل سن کر یہ سمجھتا رہا کہ نوح کوئی نوح علیہ السلام کی عمر کے آدمی ہوں گے لیکن دیکھنے سے یہ بہت کم عمر نکلے مجھے ان کی ذہانت اور ذکاوت پر تعجب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انھیں نگاہِ بد سے بچائے اور عمر میں برکت عطا فرمائے یہ کسی وقت اچھے خاصے شاعر ہوں گے خدا جانے یہ لفظ کس مبارک وقت میں اُن کی زبان مبارک سے نکلے تھے کہ وہ مقبول بارگاہ ایزدی ہو کر سب درست اور صحیح آج ثابت ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس وقت جتنے شاگرد حضرت داغ کے وہاں تھے وہ باعتبار مشق و خوش گوئی و تحقیقات فن سب نوح صاحب سے بہت زیادہ تھے اور کسی کی بھی نگاہوں میں ان کی خاص عزت تھی نہ کچھ وقار تھا جو کچھ آؤ بھگت تھی وہ صرف اخلاقاً تھی اور یہ بھی اسے اچھی طرح محسوس کر کے یہ کوشش کرتے تھے کہ میری غزل اگر کسی سے اچھی نہ ہو تو بری بھی نہ ہو پھر بھی وہ لوگ آگے نکل جاتے تھے اور یہ اپنی کم مشقی سے پیچھے رہ جاتے تھے غزلیں کہی جاتی تھیں اصلاح برابر لی جاتی تھی اگر اپنی ایک غزل دکھاتے تو بہت سی دوسروں کی غزلوں کی اصلاح دیکھتے اور اپنے دل میں غور کرتے اور باریکیوں پر نگاہ رکھتے اور بعض بعض باتیں استاد سے پوچھتے۔

وہ خط جو الہ آباد سے لکھ کر انھوں نے اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں بھیجا تھا جب پہنچا تو یہاں قیامت برپا ہو گئی چوں کہ ان کے ہزاروں جانی دشمن تھے اس باعث سے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے کوئی کچھ کوئی کچھ کہتا تھا ان کی والدہ صاحبہ سخت پریشان ہوئیں اول تو اکلوتے لڑکے کا اس طرح گم ہو جانا دوسرے یہ کہ واقعات گذشتہ پر ان کی نظر تھی رات دن گریہ و زاری کے سوا اُن کے لئے کوئی کام نہ رہ گیا اعزا سمجھاتے تھے مگر دل نہ ٹھہرتا تھا اکثر مقامات پر انھوں نے تار بھیجے جہاں جہاں کے متعلق خیال تھا وہاں وہاں خطوط لکھوائے متعدد اخباروں میں گم شدگی کی اطلاعیں شایع ہوئیں منشی اکبر حسین صاحب اکبر نادری کا اعلان نہایت ہی دل چسپ رہا اُن کے الفاظ یہ تھے کہ ہمارے حضرت نوح کو اگر کوئی پری لے اڑی ہو تو اسے حضرت سلیمان کی قسم وہ فوراً ان کے پتہ سے اطلاع دے اتفاق وقت سے یہ مضمون بھی حضرت داغ کی نظر سے گذرا اور پھر یہاں سے جوابی تار بھی بھیجا وہ ان کی والدہ صاحبہ کی پریشانیوں کا اندازہ کر کے تڑپ اٹھے اور اُسی وقت انھوں نے ان کی آمد و خیریت سے اطلاع دی اور خط میں بہت کچھ تسلی آمیز اس قسم کے الفاظ لکھے کہ وہ یہاں بہت آرام سے ہیں میں ان کو اپنے بچے کی طرح رکھتا ہوں انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں تم اطمینان رکھو۔

اس مفصل خط کے پہنچنے پر ان کے بُلانے کے لئے منشی عبدالحمید صاحب برادر عم زادہ منشی

عبدالحفیظ صاحب مختار عام کو ان کی والدہ صاحبہ نے روانہ کیا مگر یہ دس روز کے واسطے اورنگ آباد کے قرنطینے میں روک لئے گئے جب اس کی خبر حضرت داغ کو ملی تو فوراً انھوں نے منشی ضیاءالحق صاحب کو بھیج کر بغیر دس یوم کی میعاد پوری کئے ہوئے حیدرآباد بلوا لیا اور جب تک یہ لوگ رہے ان کو اپنا مہمان عزیز رکھا اپنے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلاتے تھے اور بہت کچھ خاطر مدارات کرتے تھے بعض بعض وقت تفریحاً الہ آباد اور اطراف الہ آباد کے حالات پوچھتے تھے اور منشی عبدالحفیظ صاحب کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ قوال کے گانے میں تو کوئی بات نہ تھی مگر جب ارباب نشاط کا گانا ہوتا تھا تو نوح صاحب سے اشارہ کر دیتے یہ کسی نہ کسی حیلے سے انھیں اٹھا لے جاتے تھے منشی عبدالحمید صاحب کے بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا ان صاحبوں کے قیام کے لئے بھی وہی مکان تجویز ہوا جس میں نوح صاحب پہلے سے ٹھہرے ہوئے تھے بالاخانے پر نواب مرزا خورشید عالم صاحب کا قیام تھا۔

حضرت داغ اگرچہ شباب کی منزلیں طے کر کے اچھی طرح پیرانہ سالی میں قدم رکھ چکے تھے مگر خیر سے ان کی طبیعت جوان تھی اور دل ویسا ہی رنگین تھا الٰہی جان خدا حافظ کہہ چکیں حجاب کے معاملات طے ہو گئے اختر جان کا کوکب اقبال چمک رہا تھا جدّن بائی امانی کی لڑکی امیدواروں میں تھی چھمی کے چکر چوتھے پانچویں اب بھی ہو جاتے تھے۔

ان جلسوں سے ابھی اچھی طرح سیری نہ ہوئی تھی کہ تار سے طلبی ہیں تاکیدی خط پر خط جانے لگے ناچار ہو کر با دل ناخواستہ نوح صاحب نے استاد سے روانگی کی اجازت مانگی انھوں نے بمشکل تمام نہایت افسوس کے ساتھ اس شرط پر رخصت کیا کہ جہاں تک ممکن ہو جلد آنا ریلوے اسٹیشن تک بہت سے احباب پہنچانے کو آئے اور یہ لوگ وہاں سے روانہ ہو کر کئی دن کے بعد اپنے وطن آ گئے نوح صاحب کی والدہ بے حد خوش ہوئیں خدا کا شکر ادا کیا اور منتوں کے اتارنے میں کئی ہفتے تک مشغولی رہی جو بد خواہ اس واقعہ سے اپنے اپنے دل میں خوش تھے وہ بدستور پھیر مغموم ہو گئے۔

اپنے مکان پر پہنچ کر نوح صاحب نے اپنے علاقے کے کاروبار کے ساتھ شاعری میں سخت محنت کرنی شروع کی روزانہ نہیں تو دوسرے دن ضرور ایک غزل پوری کر لیتے تھے ایک ایک مصرع پر بارہ بارہ تیرہ تیرہ مصرعے لگاتے تھے اور کوئی غزل ایسی نہ ہوتی تھی جس میں چالیس پینتالیس شعر نہ رہتے رہے ہوں بیشتر ایک ایک قافیے پر مشق بڑھانے کے خیال سے دو دو غزلیں کہیں یہ مشغلہ بہت زمانے تک رہا اور اب اصلاح کی یہ صورت رہ گئی کہ بعض لفظ شعر میں بدل جاتا تھا اور نہ وہی الفاظ رہ جاتے تھے کئی بار استاد نے لکھا بھی کہ اب اصلاح کی چنداں ضرورت نہیں مگر یہ اس پر کچھ خیال نہ کرتے تھے اور برابر اصلاح کے لئے غزلیں روانہ کئے جاتے تھے۔

جناب منشی غلام غوث صاحب بے خبر میر منشی لفٹیننٹی الہ آباد شاگرد رشید حضرت غالبؔ دہلوی کا قیام الہ آباد میں رہتا تھا اور ان سے نوح صاحب کے والد سے کسی زمانے میں مراسم رہ چکے تھے اس خیال سے کبھی کبھی ان کی حاضری اُن کی خدمت میں ہو جاتی تھی یہ وہی منشی غلام غوث صاحب بے خبر تھے جن کے نام بیشتر خطوط عود ہندی و اردوئے معلیٰ میں حضرت غالبؔ کے لکھے ہوئے موجود

ہیں ایک دن شعر و سخن کا تذکرہ آگیا موجودہ لوگوں میں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ منشی صاحب کبھی آپ نے نوح صاحب کے شعر بھی سنے ہیں اس پر وہ ہنس دیئے اور بزرگانہ لہجے سے پوچھا کہ کیا نوح شعر بھی کہتے ہیں آج تک انھوں نے کبھی ذکر نہیں کیا ہاں اکثر یہ ہم نے دیکھا ہے کہ جب یہاں کچھ شعر پڑھے گئے تو ادب کے خیال سے یہ کھل کر واہ واہ تو نہیں کر سکے لیکن ایک خاص کیفیت ان کے چہرے سے ضرور نمایاں ہو جاتی تھی یہ کہتے ہوئے وہ ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ ایک شعر میں ہم ایک لفظ بدلے دیتے ہیں تم آج سے کل تک سوچ کر بتاؤ کہ ہم نے کون سا لفظ بدل دیا ہے اور پہلے کیا لفظ تھا۔

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے ڈرتا ہے جی　　اب مناسب تو یہ ہے کچھ میں پڑھوں کچھ تم پڑھو

یہ سن کر پہلے انھیں بہت پریشانی ہوئی پھر خیال آیا کہ اگر اسی جگہ نہیں بتاتا ہوں تو بات جاتی ہے کل بتاؤں گا تو یہ دل میں کہیں گے کسی سے پوچھ لیا ہوگا انھوں نے جسارت کر کے کہا ایک بار اور شعر پڑھ دیجئے وہ کہنے لگے سُن لینے سے کچھ نہ ہوگا لکھ لو اور غور کر و بہرحال انھوں نے دوسری بار پھر شعر پڑھا خدا کو لاج رکھنی تھی فوراً ان کا خیال پہنچ گیا دو منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ انھوں نے گذارش کی کہ ڈرتا ہے کی جگہ رُکتا ہے رہا ہوگا۔ یعنی

بعد رنجش گلے ملتے ہوئے رُکتا ہے جی

اب مناسب تو یہ ہے کچھ میں پڑھوں کچھ تم پڑھو

یہ برجستہ جواب سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور اس امتحان کی کامیابی کی تعریف فرماتے ہوئے فرمانے لگے ضرور تم شعر کہہ لیتے ہوگے اچھا اب کوئی غزل سناؤ انھوں نے غزل بھی سنائی اس کی بھی بہت کچھ داد دی۔

یہ واقعہ نہ کوئی غیر معمولی تھا نہ اس کی ایسی کوئی خاص ضرورت تھی لیکن ابتدائے مشق کا زمانہ تھا اور منشی غلام غوث صاحب کے سامنے کی بات تھی ایسے ایسے لوگوں کے ادنا ادنا واقعات بھی لکھنے کے قابل ہوتے ہیں اور آنے والی نسلیں فائدہ اٹھاتی ہیں علاوہ اس کے اس سے نوح صاحب کی ذہانت کا اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے کہ آغاز ہی میں ان کی طبیعت کس قدر رسا تھی۔

کچھ دنوں کے بعد ہندوستان کے مشہور مشہور متعدد رسالوں گل دستوں اخباروں میں ان کا کلام شایع ہو ہو کر خراج تحسین و آفریں وصول کرنے لگا بے ساختہ ان کی طرف دنیا کی امتیازی نگاہیں اٹھیں اور رفتہ رفتہ یہ بھی اچھے کہنے والوں میں شمار ہونے لگے اُس وقت گل دستوں میں سب سے پرانا اور مستند گل دستہ پیام یار لکھنؤ تھا اس کی دیکھا دیکھی بہت سے مقامات سے اور بھی انھیں مقاصد کے لئے پرچے نکلے مگر اس کی مقبولیت اور کوئی پرچہ نہ حاصل کر سکا منشی نثار حسین صاحب ایڈیٹر ہر مہینے اپنے رسالے میں ان کی غزل درج کرتے تھے چوں کہ وہ طرحی رسالہ تھا اس لئے ان کو یہ سمجھنے میں بہت مدد ملتی تھی کہ کس قافیے کو کس نے کس طرح نظم کیا ہے ان کی عادت ہمیشہ سے یہ ہے کہ کتاب کو دیکھنے کی طرح دیکھتے ہیں اور سمجھنے کی طرح سمجھتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ سرخیوں پر نظر ڈال گئے تصویریں دیکھ لیں اِدھر اُدھر ورق گردانی

کے ساتھ کہیں سے چند صفحے پڑھ لئے پہلے تو یہ معلوم تھا کہ جس دیوان یا جس کتاب کو دیکھتے تھے غلطیوں پر × اور بہترین مضامین یا شعر پر ~ نشان بنا دیتے تھے مگر اب کچھ دنوں سے یہ طریقہ بند کر دیا ہے۔ اکثر لوگوں کی کتابیں جو دیکھنے کو مستعار منگوائیں وہ ان نشانوں کے سبب سے قریب قریب خراب ہو کر واپس گئیں احباب کی شکایت نے یہ عادت چھڑا دی حالاں کہ اس صورت میں جس کی کتاب ہوتی تھی اس کے لئے واقفیت و معلومات کا ایک کافی ذخیرہ پہنچ جاتا تھا۔

الٰہ آباد کے مشاعرے

ابھی تک کہیں دور دراز مقامات کے مشاعروں میں انھیں شریک ہونے کا موقع نہ ملا تھا مگر الٰہ آباد میں جو مشاعرے ہوئے ان میں اکثر میں یہ شریک ہوئے اس وقت یہاں شاہ امین الدین صاحب قیصر میر علی عباد صاحب نیساں شاہ محمد بشیر صاحب بشیر مولوی عبد العزیز صاحب افسر کا طوطی بول رہا تھا مقامی شعرا انھیں حضرات کے شاگرد تھے آپس میں خوب خوب نبرد آزمائیاں ہوتی تھیں ان سب سے الگ تنہا نوح صاحب تھے نہ ان کی کوئی جماعت تھی نہ کوئی طرف دار تھا مگر یہ اپنے اشعار پر داد لے ہی لیتے تھے

حیدرآباد کا دوسرا سفر اور وہاں کا قیام

جب طبیعت خوب جولانیاں دکھانے لگی یعنی مشق بھی بہت بڑھ گئی اور فکرِ سخن پر بھی اچھی طرح قابو پا لیا تو پھر حیدرآباد کی سوجھی کچھ تو حضرتِ داغ کا ارشاد کچھ اپنا ذاتی شوق یہ دونوں باتیں ایسی نہ تھیں جو ان کو چین سے گھر میں بیٹھنے دیتیں یہ اس بار اپنے ہاں کا معقول انتظام کر کے اور اپنی والدہ صاحبہ سے اجازت لے کر نہایت اطمینان کے ساتھ دکن پہنچے اس زمانے میں استاد منڈی والے مکان کو چھوڑ کر ترپ بازار عابد شاپ کے پاس ایک عالی شان کوٹھی میں اٹھ آئے تھے احسن صاحب وافتخار عالم کو پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اپنے وطن مارہرہ چلے گئے نئے لوگوں میں سید حامد حسین صاحب بے دل شاہ جہاں پوری اور عالی جناب نواب مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی و مرزا ناصر الدین احمد خاں صاحب (حضرت داغ کے نواسے) کا اضافہ ہو گیا تھا دو چار دن میں ان حضرات سے بھی بے تکلفی بڑھ گئی بقیہ لوگوں سے تو پہلے ہی تعارف ہو چکا تھا اس لئے اب کے میل جول میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔

ان کے پہنچنے پر شفیق استاد نے بہت کچھ خوشی ظاہر فرمائی اور نہایت عزت و احتشام کے ساتھ لیا اور جب تک قیام رہا ان کے جملہ مصارف ان ہی کے ذمہ رہے جو مقامی شاگرد تھے وہ تو خود اپنی غزلوں کی اصلاح خود آ کر سنا کر لے لیتے تھے جو ڈاک پر مختلف مقامات سے اصلاح طلب کلام آتا تھا ان کی اصلاح ان کے تعلق تھی یہ استاد کو سناتے اور جو کچھ وہ ترمیم فرماتے یہ اسے لکھ کر واپس کر دیتے خطوں کے جواب کی بھی یہی صورت تھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ داغ صاحب اپنے کثیر التعداد شاگردوں کا کلام خود نہ دیکھتے تھے بلکہ جو اُن کے اچھے اچھے شاگرد تھے یہ کام اُن کی سپردگی میں تھا مگر اتنے زمانہ قیام میں ان کے سامنے کبھی ایسا موقع نہیں پیش آیا جو غزل وہاں پہنچ جاتی تھی اس کو استاد خود سنتے اور خود ترمیم فرماتے تھے یہ ضرور تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے اصلاحی الفاظ نہ لکھتے تھے دورانِ اصلاح میں اگر کسی نے کوئی ترمیمی لفظ پیش کیا اور وہ اچھا ہوا تو لکھ دیا جاتا تھا چوں کہ کچھ اصلاحیں تو انھیں کے ہاتھ کی لکھی ہوتی تھیں اور کچھ ان کے سامنے ہوتی تھیں اس سبب سے انھیں بہت کچھ فائدہ پہنچا اصلاح دینے کا طریقہ ترمیم کے

اصول وضوابط تغیر و تبدل سے ترقی شعر یہ سب باتیں روز بروز ذہن نشین ہونے لگیں اور معلومات میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی اب ان شاگردوں کے مقابلے میں جو پہلی بار ان سے مراتب میں بہت زیادہ تھے یہ اگر ان سے زیادہ نہ ثابت ہوئے تو میزان میں کم بھی نہ اترے۔

ظہیر دہلوی

جناب سید ظہیر الدین صاحب ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت ذوق دہلوی یعنی خواجہ تاش جناب داغ دہلوی مع اپنے نواسے سید اشتیاق حسین شوق کے مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر شاد یمین السلطنت دام اقبالہ کے وابستگانِ دولت میں تھے ان کے فضل و کمال کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں بڑے بڑے لوگوں کی صحبتیں اٹھا چکے تھے دہلی کا بننا بگڑنا ان کی نگاہوں کے سامنے ہوا ان مشاعروں میں شریک رہے جن میں ذوق۔ مومن۔ غالب۔ آشفتہ و ذوق صہبائی وغیرہ جیسی شخصیت کے حضرات موجود رہتے تھے شہرت دوسری چیز ہے ورنہ باعتبار مشق اور معلومات فن کے ان کا درجہ کسی طرح داغ صاحب سے کم نہ تھا وہ جس دن یہاں تشریف لاتے عجب لطف رہتا آپس میں اکثر غزل خوانیاں ہوتیں دہلی کے قدیم زمانے کے تذکرے چھڑتے گذشتہ دور پر اظہار تاسف کیا جاتا مگر اس بے تکلفی پر بھی اتنا لحاظ تھا کہ اختر جان وغیرہ ان کے سامنے نہ آسکتی تھیں۔

ان کی خدمت میں بھی نوح صاحب کبھی کبھی وقت نکال کر پہنچ جاتے تھے اور بہت دیر بیٹھ کر واپسی ہوتی تھی وہاں بھی شعرا کا مجمع رہتا تھا اور زیادہ تر لوگ شعر و سخن کے مباحثے کرتے تھے اکثر ان کی بھی اصلاحیں ان کی نظر سے گذریں اور بہت نہیں تو کچھ نہ کچھ فیض ان سے بھی انھیں پہنچا جس کا یہ خود اعتراف کرتے ہیں ایک موقع پر چند غزلوں میں چند لفظوں کی ترمیم ظہیر صاحب نے فرمائی مگر یہ بھی تاکید کی کہ بھائی صاحب یعنی حضرت داغ سے پوچھ کر کتاب میں درج کرنا چنانچہ انھوں سے جب داغ صاحب سے پوچھا تو اکثر لفظ انھوں نے قائم رکھے اور اکثر کو مسترد کر دیا اس واقعہ سے توازن مقصود نہیں مگر ایک خاص واقعہ تھا اس سبب سے لکھنے کو جی چاہا ورنہ اس میں کیا شک ہے کہ اپنی اپنی جگہ دونوں استاد تھے۔

نادان دہلوی

ایک بار امراؤ مرزا صاحب نادان دہلوی برادر زادہ حضرت داغ دہلوی مطلع ذیل کہہ کر داد لینے کے خیال سے سب کو سناتے پھرتے تھے۔

دل تو کیا تو جان بھی مانگے تو جی چھوٹے نہیں
عاشقِ صادق ہیں میری جان ہم جھوٹے نہیں

ان کے پاس بھی آئے اور لمبی چوڑی تمہید کے بعد مطلع سنا کر داد طلب ہوئے نوح صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ آپ نادان تھے نادانی کیوں نہ کرتے یہ مطلع غلط ہے چوں کہ وہ اپنے کو دہلوی اور انھیں پوربی سمجھتے تھے اس لئے بہت ناراض ہوئے اور جا کر حضرت داغ کی خدمت میں بہت کچھ شکایت کی یہ سامنے بلائے گئے انھوں نے کہا میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی یہ کہنے کو تیار ہوں کہ مطلع غلط ہے داغ صاحب نے مطلع سنا اور فرمایا کہ فی الحقیقت اس میں شترگربہ ہے اور یوں ترمیم فرمائی۔

دل تو کیا تو جان بھی مانگے تو جی چھوٹے نہیں
عاشقِ صادق ہیں ہم جھوٹے نہیں جھوٹے نہیں

یہ واقعہ تو پیش آیا مگر طرفین میں کسی قسم کی کشیدگی نہیں پیدا ہوئی یہ اُن سے وہ اِن سے برابر ملتے رہے رات دن کی یکجائی تھی ہر وقت کا ساتھ تھا لطف و اخلاص کی باتیں تھیں افسوس ہے کہ نادان صاحب انتقال فرما گئے اور اُن کی باتیں یاد کرنے کو رہ گئیں۔

بڑا مشاعرہ

سید رضی الدین صاحب کیفی حیدر آبادی پہلے جناب مے کش کے شاگرد تھے پھر حضرت داغ کے ہوئے انھوں نے اپنے اہتمام میں ایک بڑا مشاعرہ قرار دے کر یہ طرح تجویز کی۔

ماجرائے درد و غم مجھ سے بیاں ہوتا نہیں

شرکت کے لئے انھوں نے سب کو مجبور کیا اس سے پہلے نوح صاحب نے کبھی اتنے بڑے مشاعرے کی شرکت نہ کی تھی مگر اصرار سے یہ تیار ہو گئے اور غزل کہہ کر اصلاح بھی لے لی حضرت داغ نے بھی دو تین گھنٹے کی فکر میں دو غزلہ فرمایا چوں کہ وہ بغیر سرکاری اجازت کے شریک نہ ہو سکتے تھے اس لئے خود نہیں جا سکے لیکن اپنی غزلیں پڑھنے کے لئے جناب سائل صاحب دہلوی کو مرحمت فرمادیں جناب مرزا عاشق حسین صاحب بزم اکبر آبادی جن کا قیام عارضی اُس زمانے میں وہیں تھا مولانا شبلی نعمانی جناب مے کش حضرت ظہیر دہلوی وغیرہ پہلے سے پہنچ چکے تھے داغ صاحب نے چلتے وقت یہ سب کو ہدایت کر دی تھی کہ ایک ہی جگہ سب لوگ نہ بیٹھیں مختلف مقامات پر بیٹھیں۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں ایک تو یہ کہ اگر آپس میں ایک پر دوسرے کی غزل چمکی تو کیا چمکی لطف تو جب ہے کہ غیروں کی جماعت پر اپنی جماعت کا کلام فوقیت لے جائے دوسرے یہ کہ سب کی غزلیں قریب قریب ایک ہی رنگ کی تھیں اگر ایک ہی سلسلے میں پڑھی جاتیں تو وہ بات ہرگز نہ پیدا ہوتی جو درمیان درمیان میں اوروں کے مختلف رنگ کے کلاموں سے ہوئی فی الحقیقت تبدیل ذائقہ بھی دنیا میں عجب چیز ہے مشاعرے کا رنگ پہچاننا اور اسی اعتبار سے اپنا کلام سنانا اور موقع موقع سے سامعین و شعرا کو مخاطب کرنا بغیر تجربہ کے دو چار بار میں ہر کسی کو نہیں آتا حضرت داغ کی یہ وقتی تعلیم کس قدر اصول پر مبنی تھی مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہو کر ۸ بجے دن کو ختم ہوا مشاہیر لوگوں میں سے پہلے مولانا شبلی صاحب نے اپنا فارسی کلام سنایا بہت سی غزلوں کے بعد دو بجے رات کو بیشتر حضرت ظہیر دہلوی کی غزلیں مولانا نادر علی صاحب برتر نے جو ان کے شاگرد رشید تھے پڑھیں ایک ایک مصرعہ سے شانِ استادی ٹپکتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک بحرِ ذخار موج زن ہے سامعین نے بہت کچھ داد دی جب یہ غزلیں ختم ہوئیں تو جناب سائل دہلوی نے اپنے خاص ترنم میں داغ صاحب کی غزلیں سنائیں مشاعرہ تہ و بالا ہو گیا حاضرین پہلو بدلنے لگے واہ واہ میں لوگ محو تھے ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا گیا بہت سے شائقین نے اسی وقت دونوں غزلیں لکھ لیں دو شعر مجھے یاد ہیں اور یہ دونوں شعر غیر مطبوعہ ہیں۔

وہ تو ہو ہم پر اگر یہ مہرباں ہوتا نہیں — آسماں پر دوسرا کیا آسماں ہوتا نہیں
ہم وہاں پہنچیں نہ پہنچیں یہ تو پہنچے گا ضرور — ناتوانوں کا تصور ناتواں ہوتا نہیں

دکن کے مشاعروں کا یہ طریقہ نہیں کہ جو استاد ہو وہ اپنا کلام آخر میں پڑھے بلکہ دور میں جب جس کے

سامنے شمع آجائے تو اس کو اپنے مقام پر اپنی غزل پڑھ دینی چاہیئے ہاں ظہیر صاحب و حضرت داغ صاحب ان قواعد و ضوابط سے مستثنےٰ تھے یہ حضرات جب چاہیں جس موقع کو پسند فرمائیں بلا تامل اپنی اپنی غزلیں پڑھ دیں یا پڑھوا دیں مقدم و موخر کا جھگڑا اسی طرف اور بالخصوص صاحبان لکھنؤ میں زیادہ پایا جاتا ہے اور اب دو چار سال سے تو یہ بات سختی کے ساتھ محسوس ہونے لگی کوئی مختصر سی صحبت بھی ایسی نہیں ہوتی جس میں اس کے تماشے نظر نہ آتے ہوں یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اکثر مشاعرے اسی ضد میں خراب ہو گئے اور بانیِ مشاعرہ کا دل کچھ اس طرح ٹوٹا کہ پھر اسے مشاعرے کی تمنا باقی نہ رہی۔

کچھ دنوں کے بعد دوسرا مشاعرہ فیض صاحب رح کے عرس میں نواب عزیز یار جنگ صاحب عزیز کے اہتمام سے طرح ذیل پر قرار پایا

بے ساختہ ایک آہ نکلتی ہے جگر سے

یہ وہ زمین تھی جسے اکثر اساتذہ طبع آزمائی کر کے اچھی طرح پامال کر چکے تھے حضرت ذوق دہلوی کا مشہور مطلع ہے

گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے تو سمجھو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

مقامی شاگردوں نے خوب خوب زور لگایا اچھے اچھے شعر نکالے پھر استاد کی اصلاحیں سونے پر سہاگا ہو گئیں مگر کیا مجال کہ کسی کا خیال کسی کے خیال سے یا کسی کے مصرع سے کوئی کسی کا مصرع لڑنے پائے میرے خیال میں جن غزلوں پر اصلاحیں دی گئیں ان کی مجموعی تعداد کسی طرح ستر یا اسّی سے کم نہ تھی اس پر طرہ یہ کہ دو غزلہ داغ صاحب نے بھی کہا اور سب سے بچا کر کہا۔

مشاعرہ تاریخ مقررہ پر دو بجے دن سے شروع ہوا قریب قریب وہاں کے مقامی لوگوں میں جن کو مذاقِ سخن تھا سب موجود تھے پچاس ساٹھ غزلوں کے بعد جناب حافظ جلیل حسن صاحب جلیل نے کہا کہ میں جانا چاہتا ہوں میری غزل سن لی جائے لوگوں نے بہت کچھ کہا کہ آپ ابھی غزل نہ پڑھیں مگر جب انھوں نے معذوری ظاہر کی تو بانیِ مشاعرہ نے غزل پڑھنے کی اجازت دے دی وہ جب پڑھ چکے تو حضرت ظہیر دہلوی نے بھی ارشاد فرمایا کہ اسی سلسلے میں ہماری غزل بھی ہو جانی چاہیئے کیوں کہ پیرانہ سالی کے سبب سے مجھ کو دیر تک بیٹھنے میں تکلیف ہے اب حاضرین کو خیال ہوا کہ اگر یہ بھی پڑھے لیتے ہیں تو حضرت داغ کی غزلیں بھی ان غزلوں کے بعد پڑھ دی جائیں گی پھر مشاعرے میں کیا رہ جائے گا لہٰذا لوگوں نے بہت کچھ کہا سنا کہ ابھی آپ اپنی غزلیں نہ پڑھوائیں لیکن اس گذارش پر خدا جانے کیا خیال کیا کہ غصہ میں اپنی دونوں غزلیں چاک کر کے وہیں پھینک دیں اور باوجود منت سماجت کے مشاعرے سے اٹھ کر چلے گئے ان کے تشریف لے جانے کے بعد ایک قسم کی افسردگی سی حاضرین پر چھا گئی اور ہر شخص برداشتہ خاطر ہو گیا تھوڑی دیر گذرنے پر جس سے غزل پڑھنے کو کہا جاتا تھا وہ حیلہ حوالہ کر کے ٹال دیتا تھا کیوں کہ رنگ اکھڑ چکا تھا اب فوراً جمنا مشکل تھا اتنے میں نواب میر حسن علی خاں صاحب کے کہنے سے نوح صاحب نے اپنی غزل پڑھنی شروع کر دی ایک تو اشعار اچھے دوسرے پڑھنے کے انداز نے اور بھی لوگوں کو تڑپا دیا کئی شعر کئی کئی بار پڑھوائے گئے اور خوب خوب سامعین نے داد دی پھر کیا تھا غزل خوانی کا سلسلہ شروع ہو گیا اچھے اچھے شعر سننے میں آئے حضرت داغ کی غزلوں کو سائل صاحب

نے یہ کہہ کر پڑھنا منظور نہ کیا کہ جب ظہیر صاحب خفا ہو کر چلے گئے تو مجھے آپس کے مراسم کے لحاظ سے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ میں داغ صاحب کی غزلیں پڑھ دوں ان باتوں کو سن کر بہت سے لوگ اس خیال سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ جب حضرت داغ ہی کی غزل نہ سننے میں آئے گی تو بیٹھنا بے کار ہے یہ بے لطفی دیکھ کر نواب عزیز یار جنگ صاحب کو مشاعرہ ہی ختم کر دینا پڑا کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

جلیل — اے شمع مری طرح تجھے چاہئے جلنا — اٹھے جو دھواں دل سے تو اونچا ہو نہ سر سے

کیفی — زخمی ہے جو دل ناوکِ دل دوز نظر سے — مرہم بھی لگاتا ہوں تو میں تیر کے پر سے

ظہیر — قاصد تنِ لاغر ہے مرا خط سے سبک تر — نامے کے عوض باندھ لے تو مجھ کو کمر سے

عزیز — عرصہ ہوا موقوف ہوئے نامہ و پیغام — آیا نہ اُدھر سے نہ گیا کوئی ادھر سے

نوح — بہتے رہے آنسو جو یونہیں دیدۂ تر سے — اک روز گذر جائے گا پانی مرے سر سے

لو اور سنو کہتے ہیں وہ مجھ سے بگڑ کر — دیکھو ہمیں دیکھو نہ محبت کی نظر سے

مے خانے پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہے بے کار — کھلتا ہو تو کھل جائے برستا ہو تو برسے

اب دیکھئے ملتی ہے گناہوں کی سزا کیا — دوزخ بھی ہوئی سرد مرے دامنِ تر سے

ملنے کا نہیں ہے کبھی لڑنے کی نہیں ہے — وہ دل مرے دل سے وہ نظر میری نظر سے

پوری غزل سفینۂ نوح دیوان اول میں موجود ہے۔

حضرت داغ — اس چوٹ کو پوچھے کوئی اُس خستہ جگر سے — اُترا جو ترے دل سے گرا تیری نظر سے

پروانوں نے گھیرا ہے شبِ غم مجھے آکر — لو شمع کی اُٹھتی ہے مرے داغِ جگر سے

میری نہ بجھی پیاس تو جھنجلا کے سرِ بزم — ساقی نے سبو کھینچ کے مارا مرے سر سے

دیکھی کہ سوا کس میں ہے نرمی و نزاکت — رخسار ملے آج انھوں نے گل تر سے

اُس انجمنِ ناز سے آیا ہوں بہت خوش — اللہ بچائے مجھے اپنی بھی نظر سے

نقشِ قدمِ یار کی مٹی نہ ہو برباد — تر رکھتے ہیں اس واسطے ہم دیدۂ تر سے

یہ دو غزلہ یادگار داغ مرتبہ احسن صاحب مارہروی میں درج ہے زبانی جو شعر یاد تھے وہی لکھ دئے گئے رات کا واقعہ صبح کو حضرتِ داغ سن کر اپنے جملہ شاگردوں سے بہت ناخوش ہوئے اُن کا فرمانا تھا کہ جب جناب ظہیر دہلوی نے اپنی غزلیں نہ پڑھی تھیں تو ان لوگوں کو بھی ان کی تقلید میں اپنا کلام نہ پڑھنا تھا اس برہمی میں سب سے زیادہ نوح صاحب اور نواب میر حسن علی خاں صاحب پر آفت یوں آئی کہ اُن کے اشارے سے انھوں نے مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی تھی غرض یہ پر لطف عتاب کئی دن تک رہا نواب عزیز یار جنگ صاحب تین چار روز ندامت کے سبب سے حاضر خدمت نہ ہو سکے۔

سید امیر حسن صاحب فروغ لکھنوی وکیل ہائی کورٹ نظام سے جناب مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی کے غیر معمولی مراسم تھے ایک بار انھوں نے دل گیا مل گیا ان قوافی و ردیف میں طرح دے کر منتخب حضرات کو مشاعرے کی دعوت دی سائل صاحب کی تاکید اور فروغ صاحب

کے اصرار سے امراؤ مرزا صاحب نادآں اور نواب میر حسن علی خاں صاحب اور نوح صاحب نے غزلیں کہیں اور لوگوں نے تو اپنے اپنے اشعار استاد کو دکھلائے لیکن کچھ ایسا اتفاق پیش آیا کہ انھیں اصلاح لینے کی نوبت نہ آئی اور مشاعرے کا وقت آگیا یہ تینوں حضرات چلے گئے اور وہاں جاکر اپنی اپنی غزلیں پڑھیں ہر جگہ ہر شخص کے کچھ موافق کچھ مخالف لوگ ہوا کرتے ہیں دو تین صاحب ایسے تھے جو نوح صاحب سے بظاہر تو نہیں لیکن باطن میں ان کی ترقیوں کو دیکھ کر جلتے تھے لیکن ان پر حضرتِ داغ کی کچھ ایسی شفقت بزرگانہ تھی کہ کچھ بس نہ چلتا تھا اس موقع پر انھوں نے داغ صاحب سے کہا کہ نوح صاحب کی اس جسارت کو دیکھئے کہ اپنی غزل بغیر آپ کے دکھائے ہوئے مشاعرے میں پڑھ دی اس کے علاوہ اور طرح سے بھی اُن کے مزاج کو برہم کرنا چاہا مگر حضرت داغ بخوبی سمجھ گئے تھے کہ اب نوح صاحب کا کلام چنداں اصلاح طلب نہیں اگر کہیں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو اس پر معمولی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں اس سبب سے اُس وقت تو یہ باتیں سن کر وہ خاموش رہے دوسرے موقع پر انھیں لوگوں کے سامنے انھوں نے نوح صاحب سے فرمایا کہ ذرا کل کے مشاعرے کی غزل ہمیں تو سُناؤ انھوں نے غزل سنائی جب غزل ختم ہو چکی تو انھوں نے کہا کہ بتائیے اس غزل میں کیا غلطی ہے اور یہ کہتے ہوئے غزل کی بہت کچھ داد دی اور فرمایا نوح تو ناخدائے سخن ہے شعر کیوں نہ اچھے ہوتے اس دن سے یہی کہہ کر اکثر پکارتے اور مخاطب کرتے تھے۔

اب کا حال معلوم نہیں پہلے حیدرآباد میں بیشتر دسویں بیسیوں دن برابر مشاعرے ہوتے رہتے تھے اپنے زمانۂ قیام میں نوح صاحب کو بہت زیادہ شرکت کا موقع ملا لیکن ان تین خاص واقعات کے علاوہ اور کہیں کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی جس کا ذکر ضروری سمجھا جائے لہذا زائد باتوں کا لکھنا نہ لکھنا دونوں برابر ہے۔

مرزا خورشید عالم صاحب

جناب مرزا خورشید عالم صاحب خورشید برادر خرد حضرت داغ کو صاحب عالم بھی اس خیال سے کہتے تھے کہ ان کا تعلق شاہی خاندان دہلی سے تھا دکن سے سو روپیہ ماہوار منصب پاتے تھے اور داغ صاحب ہی کے ساتھ اپنے مصارف سے الگ رہتے تھے کبھی چلتے پھرتے کوئی غزل کہہ لی تو کہہ لی ورنہ بالالتزام یہ مشغلہ نہ تھا لیکن اہل زبان تھے اور اپنی زبان پر انھیں بہت کچھ ناز تھا مزاج بھی ذرا سخت واقع ہوا تھا اس باعث سے کسی کو اپنے خیال میں نہ لاتے تھے اور بات بات پر برس پڑتے تھے چوں کہ ان کی زبان مستند تھی اس لئے نوح صاحب وقت بےکال کر ان کی خدمت میں بیشتر حاضر ہو جاتے تھے اور جو غزلیں اصلاح ہوتی تھیں ان کا سنا دینا بھی معمول تھا دو چار شعروں پر زبان کے متعلق انھوں نے بعد اصلاح بھی اعتراض کیا اور مکرر اُن اعتراضات کو حضرت داغ نے رفع فرمایا یا سمجھا دیا کبوتروں کے شوق کے علاوہ بادہ پرستی اور رنگین مزاجی سے بہت ذوق رکھتے تھے رات کو دل بستگی کے لئے کوئی نہ کوئی آہی جاتی تھی پہلے کبرا بیگم سے تعلق تھا وہ جب قتل ہو گئی تو پھر پابندی کے ساتھ کسی کو ملازم نہیں رکھا شام کے دور میں یہ حکم تھا کہ نوح صاحب بلا لیا کریں چنانچہ زبان سیکھنے کے شوق میں یہ ذلیل کام بھی نہایت

سلہ دو رُخ مختلف قبیہ مذکر مؤنث دونوں ہے۔ صفحہ ۱۳ سے متعلق

خوشی کے ساتھ یہ انجام دیتے تھے وہاں سے بچھڑنے کے بعد ریاست رام پور میں ایک بار ملاقات ہوئی گلے لگا کر رونے لگے بہت دیر تک حیدرآباد کی باتوں کا ذکر رہا اشعار سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے اب تو تم خوب کہنے ہو پھر ملنے کی نوبت نہ آئی کچھ دنوں میں معلوم ہوا کہ انتقال فرما گئے۔

حضرت داغ کے مشاغل

حضرت داغ نماز صبح پڑھنے کے بعد آفتاب نکلتے نکلتے گرمی کے زمانے میں معمولاً اپنی کوٹھی کے پھاٹک کے قریب اندرونی جانب آرام کرسی پر آکر بیٹھ جاتے تھے پندرہ بیس کرسیاں اٹھنے بیٹھنے والوں کے لئے اور ڈال دی جاتی تھیں چھوٹی سی میز پر قلم دوات لفافہ سادہ کاغذ رکھ دیا جاتا تھا اکثر نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر و سید حامد حسین صاحب بے دل شاہ جہاں پوری اور زیادہ تر نوح صاحب اُن غزلوں کو سنا کر اصلاح لیتے جو باہر سے ڈاک پر آتیں پڑھنے والا پڑھتا تھا اور استاد اسی وقت برجستہ اصلاح دیتے جاتے تھے دوران اصلاح میں اگر کوئی لفظ یا مصرع سنانے والے کے ذہن میں آتا تو وہ بلا تامل عرض کرتا پسند ہوتا تو وہی رکھ دیا جاتا ورنہ خود درست فرماتے جب غزل ختم ہوتی تو لفافے میں بند کر کے روانہ کر دی جاتی ان غزلوں کا اوسط روزانہ کسی طرح سولہ سترہ سے کم نہ تھا اور یہ شغل بغیر ناغہ دس بجے تک رہتا تھا اسی دوران میں جو مقامی شاگرد آجاتے تھے اُن کی غزلیں بھی دیکھ لی جاتی تھیں اس کام سے فراغت کرنے کے بعد کوٹھی کے اندرونی حصے میں فرش پر دستر خوان بچھتا جو لوگ موجود ہوتے سب کھانے میں شریک کئے جاتے کھانے میں ہر قسم کی چیزیں ہوتیں بعض بعض دن فرمائش کر دینے سے وہ چیز بھی پکتی جس کے لئے حکم دیا جاتا تناول طعام کے بعد حقہ نوشی ہوتی حضرت داغ کے سامنے پیچوان لگا دیا جاتا نواب میر حسن علی خاں صاحب کے لئے گڑگڑی حاضر کی جاتی نوح صاحب کا حقہ بھی رکھ دیا جاتا پھر استاد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ استراحت فرماتے پھر اٹھ کر نماز ظہر ادا کرتے اور شطرنج کی دو ایک بازی کھیلتے یا احباب جمع ہو جاتے تو اُن سے گفتگو کرتے یا کسی کی غزل سن کر اصلاح دیتے عصر کی نماز کے بعد دسویں پندرہویں ہوا خوری کے لئے جوڑی پر سوار ہو کر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے اور بیشتر سکندرآباد حسین ساگر یا باغ عام کی طرف تشریف لے جاتے جوڑی پر داہنے طرف صدر میں خود بیٹھتے بائیں طرف اپنے برابر میں نواب میر حسن علی خاں صاحب کو بٹھاتے اور سامنے کی نشست گاہ میں بیدل صاحب شاہ جہاں پوری اور نوح صاحب ہوتے جمال صاحب حقہ لئے ہوئے کوچ بان کے پاس کوچ بکس پر بیٹھتے حقہ کی نے داغ صاحب کے ہاتھ میں ہوتی حقہ برابر پیتے جاتے پیچھے ایک تانگہ ہوتا اس پر منشی عبد الغنی صاحب رہتے اور اُن کے ساتھ کچھ دو ایک ہوتیں کچھ دیر تک تفریح فرما کر واپس تشریف لاتے اور مغرب کی نماز پڑھتے فریضہ ادا کرنے کے بعد کبھی رحمت اللہ قوال کبھی اور کسی سے کبھی اختر جان سے گانا سنتے پھر رات کا کھانا تناول فرماتے عشا کی نماز کے بعد خود شعر کہتے اشعار کہنے کی یہ صورت تھی کہ وہ بولتے جاتے تھے اور ایک آدمی مسودہ میں لکھتا جاتا تھا لکھنے والا ایک شعر نہ لکھ چکتا تھا کہ دوسرا شعر موزوں ہو جاتا تھا اسی طرح بہت جلد غزل تیار ہو جاتی تھی ایک مصرع کبھی اُن کی زبان مبارک سے نہیں سنا گیا جب کہا پورا شعر کہا یہ بھی معمول تھا کہ پہلے مطلع فرماتے تھے اور نئی زمین نکالتے تھے جس قدر شعر کہنے ہوتے وہ کہہ کر سوتے بعض دن تھوڑی دیر سو کر جاگ اٹھتے تھے چوں کہ نوح صاحب

کا کمرہ قریب تھا اس باعث سے ان کو فوراً جگواتے اور ان کے جگانے سے اور لوگ بھی جاگ اٹھتے حقہ بھرا جاتا اور بڑی دیر تک دلّی وغیرہ کے واقعات بیان فرماتے یا کسی کی غزل خود اس کی زبان سے سن کر اصلاح دیتے پھر سو رہتے اور علی الصباح بیدار ہوتے۔

حضرتِ داغ اگرچہ معقول تنخواہ پاتے تھے مگر مہینے میں کچھ پس انداز نہ ہوتا تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ داد و دہش میں ان کا ہاتھ کبھی نہ رکتا تھا بہت سے اعزا اور مساکین کو پابندی کے ساتھ منی آرڈر کے ذریعہ سے مختلف مقامات پر روپئے روانہ فرماتے تھے علاوہ اس کے باورچی خانہ اور روزمرّہ کا خرچ آنے جانے والوں کی امداد مہمانوں کی خاطر و مدارات خیرات مبرات میں سب صرف ہو جاتا تھا باورچی خانے میں انّا سجن چمپا صاحب جان چار عورتیں ملازم تھیں جمال صاحب چھوٹے بڑے محبوب راجا عبدالحمید وغیرہ دس بارہ خدمت گار رحمت اللہ قوال غلام رسول کاتب دیوان منشی عبدالغنی صاحب منیجر عبدالعزیز اسسٹنٹ منیجر وغیرہ اچھی اچھی تنخواہیں پاتے کپڑا بدلنے کا روزانہ معمول تھا عطر وغیرہ سے خاص رغبت تھی چار گھوڑے دو گاڑیاں پھر اس کے سائیس اور کوچ بان دانہ گھاس کے مصارف تھے غرض بچت کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ اکثر مہینوں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب روپیہ نہیں رہا تو نواب میر حسن علی خاں صاحب کے ہاں سے آیا اور تنخواہ آنے پر سب سے پہلے ان کا مطالبہ ادا کر دیا گیا۔

یوں تو مقامی شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی تھی لیکن خصوصیت کے ساتھ اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف بادشاہ دکن اعلی اللہ مقامہ عالی جناب مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب شاد وزیر سلطنت نواب عزیز یار جنگ صاحب عزیز نواب عزیز جنگ صاحب ولا نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر نواب ابوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل امراؤ مرزا صاحب نادان شاہزادہ مرزا منیر الدین احمد صاحب ضیا دہلوی مولوی عبدالحمید صاحب آزاد مرزا مظفر حسین صاحب بارق ڈاکٹر مہدی حسن صاحب الم حافظ محی الدین صاحب محفوظ مستجاب خاں صاحب خلق سید رضی الدین صاحب کیفی سید حامد حسین صاحب بیدل شاہجہان پوری نوح صاحب ناروی قابل لحاظ تھے ان میں سب کے حالات اگر لکھتا ہوں تو مکمل ایک اور کتاب ہو جانے کا اندیشہ ہے لہٰذا چند حضرات کے نہایت مختصر حالات درج کئے جاتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی کیواں خدم دارا حشم سکندر شوکت نوشیرواں معدلت سپہ سالار فتح جنگ مظفر الممالک ہز ہائنس حضور پرنور نواب میر محبوب علی خاں صاحب بہادر آصف جاہ نظام الملک آصف تخلص سلطان دکن نور اللہ مرقدہ کے کلام بلاغت نظام کے متعلق کیا لکھوں کلام الملوک ملوک الکلام مشہور بات ہے علاوہ سخن سنجی اور قدردانی کے بڑے زود گو اور قادر الکلام تھے باوجود مصروفی امور سلطنت کے بیشتر یہ دیکھا گیا ہے ایک ایک دن میں کئی کئی غزلیں کہہ ڈالی ہیں جس دن وہ شعر کہنے کو بیٹھتے تھے شاہی چوب دار متعدد بار آتا تھا جب غزل ختم ہو چکتی فوراً اس کی معرفت استاد کے پاس اصلاح کے لئے سربمہر لفافے میں روانہ فرماتے اور یہ سو کام چھوڑ کر اپنے دست خاص سے اصلاح فرما کر پھر

پھر سر بمہر لفافے میں واپس کرتے اُس زمانے کے اکثر رسالوں میں اُن کا کلام نظر آتا تھا اور اب تک لوگوں کی زبانوں پر اُن کے اشعار ہیں

وزیر دکن

مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر شاد وزیر سلطنت فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں خوب فرماتے ہیں بیشتر اشعار میں علاوہ عاشقانہ رنگ کے تصوف کی خاص جھلک بھی پائی جاتی ہے اُس وقت کے تمام بہترین رسالوں میں کلام شایع ہوتا تھا جس انہماک سے آپ زبان کی خدمت کر رہے تھے وہ اِن اہم ذمہ داریوں پر کوئی بھی نہیں کر سکتا ہمیشہ درِ دولت پر دو چار اہلِ کمال موجود رہے ہمرکی (فارسی گو) حضرت ظہیر دہلوی جلیل القدر جناب جلیل و جناب اختر خلف حضرت امیر لکھنوی جیسے بلند پایہ لوگ آپ کے ابر گہر بار سے ایک مدت تک فیض یاب ہو چکے ہیں۔

نواب عزیز یار جنگ صاحب

نواب عزیز یار جنگ صاحب عزیز ناظم صرف خاص خاص حیدرآباد کے رہنے والے ہیں دکن والوں میں جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اِن سے بہتر داغ صاحب کے رنگ کا تقلید کرنے والا کوئی شاگرد نہیں دو دیوان ارمغان عزیز کے نام سے شایع ہو چکے ہیں دیوان دوم کے متعلق نوح صاحب کا لکھا ہوا ایک مکمل تبصرہ رسالہ نمائے تعلیم لاہور کے جوبلی نمبر میں شایع ہو چکا ہے استاد کی نگاہ شفقت ہمیشہ اِن پر رہی اور اِن کا بھی معمول تھا کہ روزمرہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور فیض اٹھاتے تھے۔

نواب میر حسن علی خان صاحب

نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر برائے نام امیر نہیں بلکہ فی الحقیقت امیر تھے اچھی خاصی جاگیر تھی سب اعزا و اقربا معزز عہدوں پر سرفراز ہیں اِن سے زیادہ کسی کو استاد کی خدمت میں رہنے کا موقع نہیں ملا جب سے حضرت داغ کا قیام ہوا یہ ہر جلوت و ہر خلوت میں ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے انھوں نے بھی اُن کی رفاقت میں اپنا گھر بار چھوڑ دیا اور رات دن یہیں رہتے تھے استاد کی بھی یہ کیفیت تھی کہ دس بیس روز میں اتفاق سے اگر یہ گھنٹے دو گھنٹے کو اپنے مکان جاتے تو یہ پریشان ہو جاتے تھے جب تک وہ نہ آجاتے یہ کھانا بھی نہ کھاتے انتظار کیا جاتا آدمی پر آدمی بلانے کو بھیجے جاتے اچھی بری کوئی بات ان سے نہ چھپائی جاتی سب سے پہلے انھیں سے مشورہ لیا جاتا شعر کہنے میں بند نہ تھے لیکن عادتاً کم کہتے تھے کوئی خاص موقع آیا یا مجبور کئے گئے یا کسی کا اصرار ہوا تو غزل کہہ لی یہی سبب ہے کہ اب تک کوئی دیوان طبع نہیں ہوا حالاں کہ ذخیرہ کافی ہوگا افسوس ہے کہ اب انتقال فرما گئے۔

حضرت سائل

نواب ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب دہلوی کو کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں ان کے کمال ان کے محاسن شاعری سے سارا ہندوستان خود ہی واقف ہے علاوہ دہلوی ہونے کے یہ ریاست لوہارو کے ایک رکن خاص ہیں چوں کہ استاد کی صاحب زادی کا عقد ان کے ساتھ ہوا تھا اس باعث سے کوٹھی کے بالاخانے پر مع مرزا ناصر الدین احمد خاں صاحب اور بیگم صاحبہ کے مقیم تھے ناصر میاں کی تعلیم اُس وقت ہوتی تھی سائل صاحب اپنے گھر سے بھی خوش حال تھے اور پھر اُن کی اہلیہ کو داغ صاحب کی لڑکی ہونے کے خیال سے سرکار نظام سے ایک معقول وظیفہ ملتا تھا اس لئے نہایت شان و شوکت سے بسر ہوتی تھی اسی زمانے میں انھوں نے ایک رسالہ معیار الانشاد نکالا اس میں بیشتر داغ صاحب کے شاگردوں کی طرحی غزلیں بعد اصلاح کے شایع ہوتی تھیں لیکن کچھ دنوں تک جاری رہ کر بند ہو گیا۔ یہ اُردو فارسی دونو

زبانوں میں خوب شعر فرماتے تھے اردو میں پہلے مرزا عبدالغنی صاحب اؔرشد دہلوی سے بھی اصلاح لی ہے پھر استاد سے اصلاح لینے لگے۔ غزل پڑھنے کا خاص انداز تھا اول تو کلام بہت اچھا پھر اس کے ساتھ کسی حد تک ترنم یہ دونوں باتیں مل کر ایک خاص بات پیدا کر دیتی تھیں آخر زمانے کے مشاعروں میں حضرت داؔغ کی غزلیں بھی پڑھتے تھے تواضع خلق انکسار مودت محبت کس کس خوبی کو بیان کروں جو خوبیاں اچھے سے اچھے انسان میں چاہئیں وہ سب ان میں موجود تھیں ہندوستان کے ہر بڑے مشاعرے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ نوحؔ صاحب پر خاص شفقت برادرانہ فرماتے تھے اور نوحؔ صاحب بھی انھیں اپنا بزرگ جان کر دل سے احترام کرتے تھے دہلی جب کبھی جانے کا اتفاق ہوا مہینوں انھیں کے دولت خانے پر رہے کوئی تقریب ایسی نہیں ہوتی جس میں ایک دوسرے کو نہ پوچھے چوں کہ حیدرآباد میں بہت دنوں تک ساتھ رہا اس باعث سے بیگم صاحبہ کو بھی کوئی مغایرت نہیں تھی وہ نوحؔ صاحب کو اپنا بھائی جان کر اظہار مسرت کرتی ہیں جی تو یہی چاہتا تھا کہ مفصل حالات لکھے جاتے لیکن ایسی بڑی ہستی کے لئے چند ورق کافی نہیں۔

جناب ناداں

امراؤ مرزا صاحب ناداؔں حضرت شاغل دہلوی برادر خرد حضرت داؔغ دہلوی کے صاحب زادے تھے ان کا قیام بھی اس زمانے میں وہیں تھا اردو میں غزلیں کہتے تھے اور اپنے کو استاد کا خلیفہ جانتے تھے شعر کہنے کی اچھی خاصی مشق تھی لیکن سرشار رہنے کے سبب سے اپنے چچا کے سامنے جانے میں تامل ہوتا تھا بہت کم جاتے تھے استاد کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک زندہ رہے اور پھر دکن ہی میں انتقال فرما گئے دیوان نہیں شایع ہوا۔

بیدلؔ حامد

سید حامد حسین صاحب بیدؔل شاہ جہاں پوری قریب قریب نوحؔ صاحب کے ہم عمر ہیں یہ اور وہ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے حضرت داؔغ نے چاہا تھا کہ وکالت کا امتحان پاس کر لیں لیکن مصروفیت اور شاعرانہ شوق کے سبب سے نہ پاس کر سکے استاد کے انتقال تک وہیں رہے پھر کچھ دنوں تک پتہ نہ چلا کہ کہاں ہیں ایک مدت کے بعد ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے جنرل مشاعرے میں نوحؔ صاحب سے ملاقات ہوئی تھی کہتے تھے کہ جے پور میں وکالت کرتا ہوں اب کا حال معلوم نہیں خدا کرے بخیریت ہوں۔

پہلے دیوان کی تدوین اور نوحؔ صاحب کی غزلوں پر طرز نو اصلاح

نوحؔ صاحب کا کلام اسی زمانے میں اس قدر جمع ہو گیا تھا کہ انھیں اپنے دیوان چھپوانے کی فکر تھی لیکن مجموعہ میں کم غزلیں اصلاح شدہ اور زیادہ تر بے اصلاح تھیں اس لئے حضرت داؔغ کو روزانہ دو دو غزلیں سناتے تھے اور اصلاح کے بعد درج دیوان کر لیتے تھے نوحؔ صاحب نے اپنی غزلوں کی اصلاح کے لئے انھوں نے عجب طریقہ رکھا تھا کہ دو ایک الفاظ کی ترمیم شعر میں یا مصرع میں ہوتی تو ہو گئی ورنہ پورے مصرعہ کے لئے انھوں نے استاد سے کہہ دیا تھا کہ پہلے مجھ کو بتا دیا جائے کہ ان الفاظ کی ضرورت ہے یا مضمون اچھا نہیں یا مصرعہ نہیں لگا یا قافیہ اچھا نہیں بندھا میں خود کوشش کر کے درست کر لوں گا اور جب میں درست نہ کر سکوں تو آپ اصلاح فرما دیجئے گا چنانچہ ایسا ہی ہوتا تھا کہ بتا دینے پر خود غور کر کے الفاظ کو تبدیل کرتے تھے اور قدیم مصرعہ پر جدید مصرعہ لگاتے تھے اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ایک مصرعہ پر انھوں نے پندرہ پندرہ سولہ سولہ مصرعے لگائے ہیں پہلے تو اتنے مصرعوں میں کوئی نہ کوئی مصرعہ ٹھیک ہی ہو جاتا تھا اور اگر نہیں درست

ہوتا تھا اور یہ پریشان ہو جاتے تھے تو استاد مصرعہ لگا دیتے تھے اس صورتِ خاص سے روز بروز شوق بڑھتی جاتی تھی اور معلومات وغیرہ میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

دیوان اوّل کا نام خود حضرت داغ نے سفینۂ نوح رکھا جو نوح صاحب کی نسبت سے کس قدر موزوں ہے اس سے بڑھ کر دوسرا نام اس خوبی کا کہاں مل سکتا تھا چوں کہ بہت جلد اشاعت کی امید تھی اس خیال سے انھوں نے اُسی زمانے میں از راہِ شفقت بزرگانہ یہ تاریخ بھی دیوان کے لئے فرمادی جو سفینۂ نوح میں درج ہے مگر افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں یہ دیوان طبع نہ ہو سکا انتقال کے بعد ہوا۔

میرے پیارے نوح کا دیواں مرتب ہو گیا — ابتدا سے انتہا تک خوب لکھا نوح نے
نوح نے غرقابِ خجلت حاسدوں کو یوں کیا — کافروں کو جس طرح پہلے ڈبویا نوح نے
ایک سے ہوتا ہے حاصل ایک کو فیضِ سخن — ذوق سے سیکھا ہے میں نے مجھ سے سیکھا نوح نے
جو کہی ہے نوح نے بہتر سے بہتر وہ غزل — جو کہا ہے شعر وہ اچھے سے اچھا نوح نے
اس بہارِ جاوداں کو کچھ نہیں خوفِ خزاں — گل کھلائے صفحۂ کاغذ پہ کیا کیا نوح نے
کہتے ہیں سب جلوۂ نورِ مضامیں دیکھ کر — کر دیا ہے نام روشن شاعری کا نوح نے

داغ نے خوش ہو کے لکھا سال یہ ترتیب کا
آپ مضموں کا بہایا آج دریا نوح نے

۱۳۲۴ھ

اس کو دیکھ کر لوگ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ قطعہ نہیں بلکہ اُس خصوصیت کا روشن آئینہ ہے جو حضرت داغ کو نوح صاحب سے تھی ایک ایک لفظ ایک ایک مصرعہ ایک ایک شعر سے استادانہ شفقت ٹپک رہی ہے اور خاص توجہ اور خاص خیال کا اظہار ہو رہا ہے اِنھیں باتوں کو یاد کر کے صاحب کمال ہونے پر بھی نوح صاحب اب تک روتے ہیں اور ہمیشہ روئیں گے نہ اب حضرتِ داغ مکرر پیدا ہوں گے نہ یہ باتیں مکرر نصیب ہوں گی۔

نوح صاحب کی دوسری واپسی

جب قیام کو بہت دن ہو گئے تو نوح صاحب کی والدہ نے ان کی طلبی میں خطوط بھیجنے شروع کئے اگرچہ حضرتِ داغ کی پر لطف حضوری ایسی نہ تھی جس کی قدر یہ نہ کرتے لیکن مجبور ہو کر انھوں نے استاد سے اجازت چاہی کئی بار کہنے سننے سے بمشکل اس شرط پر راضی ہوئے کہ جلد واپس آنا مگر اِس اجازت کو بھی کئی ہفتے گذر گئے نہ یہ آنا چاہتے تھے نہ اُنھیں اِن کا آنا منظور تھا آخر کار جب یہ یقین ہو گیا کہ اِن کے اعزا اور بالخصوص اِن کی والدہ سخت متردد اور پریشان ہیں تو روانگی سے دو روز پہلے تصویروں کا ایک گروپ سید رضی الدین صاحب کیفی کے اہتمام سے کھنچوایا گیا اس گروپ میں وہ لوگ سب موجود ہیں جن کا قیام وہاں تھا نوح صاحب کو حضرت داغ نے اپنے قریب جگہ دی ہے یہ تصویر نوح صاحب کے کمرے میں آج تک آویزاں ہے اور رخصتی کے وقت ایک سونے کی انگوٹھی اور ایک گھڑی اور ایک جوڑا نہایت عمدہ کپڑا مع اپنی ایک تحریری سند کے منشی امین الدین صاحب سے لکھوا کر

اپنے دست خاص سے مرحمت فرمائی اور بہت کچھ دعائیں دیں اور بازو پر خود انھوں نے اور نواب ابوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی مدظلہ کی بیگم صاحبہ نے روپیئے باندھے اور پھاٹک تک خود استاد اور ریلوے اسٹیشن تک بہت سے احباب پہنچانے آئے روانگی کے وقت یہ کب خیال تھا کہ اب استاد سے دوبارہ ملاقات نہ ہوگی اور آیندہ کے ارمان سب خاک میں مل جائیں گے اور یہ صحبتیں ہمیشہ کے لئے خواب و خیال ہو جائیں گی۔

اگرچہ اِس سند کی نقل پہلے دیوان کے پہلے صفحہ پر شایع ہو چکی ہے لیکن تسلسل واقعات کے خیال سے یہاں بھی درج کرنا نامناسب نہ ہوگا

سند عطیہ حضرت داغ

مہر بخط طغرا
فصیح الملک بہادر داغ دہلوی

اس وقت میرے اُن شاگردوں کی تعداد جن کے نام رجسٹر میں درج ہیں تخمیناً ایک ہزار سے زیادہ ہے لیکن اُن لوگوں میں کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی جگہ اچھا کہتے ہیں اور جن کے کلام کو میں پسند کرتا ہوں عزیزی منشی محمد نوح صاحب تخلص نوح سلمہٗ مجھ سے سات آٹھ برس سے اصلاح لیتے ہیں مگر اتنے ہی دنوں میں انھوں نے ایسی ترقی کی کہ میرے کلام میں اپنا کلام ملا دیا میں ان کو اپنے شاگردوں میں اچھا سمجھتا ہوں اور مثل اپنے خاص عزیزوں کے جانتا ہوں خدا ان کی عمر میں برکت اور اقبال میں ترقی عطا کرے ان کے کلام کی وقعت عین میرے کلام کی وقعت اور ان کی عزت عین میری عزت ہے میرے شاگرد اس بات کا لحاظ رکھیں اور وہ میرے احباب جو میرے کلام کو پسند فرماتے ہیں اِن کے کلام کو بھی اُسی نگاہ سے دیکھیں جس نگاہ سے میرے کلام کو دیکھتے ہیں یہی میرے دو چار شاگرد ہیں جو میرے نام کو میرے بعد دنیا میں نہایت آبرو کے ساتھ قائم رکھیں گے فقط المرقوم ۱۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء دستخط فصیح الملک داغ دہلوی۔

حضرت داغ کا انتقال اور نوح صاحب کا ماتم

ابھی نوح صاحب کو اپنے وطن آئے ہوئے بہت دن نہ ہوئے تھے کہ دفعتاً نواب ابوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی کا تار اس مضمون کا پہنچا کہ حضرت داغ کا انتقال ہو گیا یوں تو مرنے کے لئے سب ایک دن مریں گے مگر یہ موت معمولی شخص کی موت نہ تھی دہلی کی شاعری کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا اس خبر نے نوح صاحب کے ہوش و حواس کھو دئے یہ دیوانہ وار پھرتے تھے اور در و دیوار پر سر پٹکتے تھے اور گذرے ہوئے واقعات یاد کر کے روتے تھے بہت دنوں تک ان کا یہی حال رہا آخر کار جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا طبیعت سنبھلتی گئی مگر شعر و شاعری سے دل اچاٹ ہو گیا تھا کوئی ذکر بھی کرتا تو سننا گوارا نہ کرتے تھے کوئی فرمائش بھی ہوتی یا اصرار بھی کیا جاتا تو یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ اب شعر کہنا بے کار ہے نہ استاد ہیں نہ وہ اصلاحوں کا لطف ہے شعر کہوں تو خاک کہوں کون دیکھے گا کون اصلاح دے گا یہ تو یہ کہہ رہے تھے مگر قدرت کہتی تھی کہ شاعری دنیا میں ابھی تجھ سے بہت سے کام لینے ہیں ایک عالم تیرے چشمۂ فیض سے سیراب ہوگا چاروں طرف تیری شہرت ہوگی تیرا کلام خود تیرے استاد کا کلام ہو کر چمکے گا تجھ کو اہل کمال اپنے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے مشاعروں میں تیری صدارت کے لئے کرسیاں خالی ہوں گی۔

قریب ترین زمانے میں جب جوشِ غم کسی طرح نہ رُکا تو نوحؔ صاحب نے بے اختیار ہو کر سب سے پہلے اپنے استاد کا مرثیہ ترجیع بند میں لکھا اور انتقال کی کئی تاریخیں بھی کہیں جو دیوان دوم طوفان نوح میں درج ہیں اس کے بعد پھر خاموش ہو گئے رفتہ رفتہ اس خاموشی کی خبر جناب ظہیرؔ دہلوی کو معلوم ہوئی انھوں نے متعدد شفقت آمیز خطوط لکھے اور شعر کہنے کی تاکید فرمائی اُن کا ارشاد معمولی شخص کا حکم نہ تھا لہذا اُن کے کہنے سے انھوں نے پھر شعر کہنا شروع کیا اور دس بیس غزلیں کہہ کر انھیں کو دکھائیں ایک اصلاح مجھ کو یاد ہے نوحؔ صاحب نے لکھا تھا

میں عشق میں زچ ہوں صفتِ بازیِ شطرنج
چلنے کے لئے چال کوئی گھر نہیں ملتا

اس شعر میں بازی کی جگہ جناب ظہیرؔ دہلوی نے صرف مہرہ بنا دیا فی الحقیقت استادی اسی کا نام ہے ایک لفظ کی ترمیم سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا جب تک یہ اصلاحی لفظ نہ بتایا جائے کسی کی نظر میں اپنی جگہ نوحؔ صاحب کا شعر بھی ہر اعتبار سے قابلِ وقعت معلوم ہوتا ہے بعد اصلاح کے اس کو یوں پڑھنا چاہیے۔

میں عشق میں زچ ہوں صفتِ مہرۂ شطرنج
چلنے کے لئے چال کوئی گھر نہیں ملتا

لیکن خدا جانے کس سبب سے یہ شعر دیوان میں نہیں رکھا گیا کچھ دنوں تک ظہیرؔ صاحب نے بھی ان کی آزمائش کی اور آخر میں انھوں نے بھی ان کو سند عطا فرمائی جس کی نقل درج ذیل ہے۔

سخن گفتن دبکرِ جان سُفتن است
نہ ہر کس سزائے سخن گفتن است

میرے برادر معظم حضرت داغؔ مرحوم کے شاگردوں کی تعداد ہندوستان میں جس قدر ہے وہ تو اظہر من الشمس ہے اور ماشاءاللہ ان میں اکثر خوش گو اور بذلہ سنج ہیں مگر میرے خیال میں مولوی محمد نوحؔ صاحب نوحؔ ناروی کا مذاقِ سخن جس قدر بھائی صاحب مرحوم کے کلام سے ملتا ہے اور کسی کا نہیں زبان کی صفائی محاوروں کی ان کے موقع سے نشست ادا بندیوں کی خوبی اور وہ خاص رنگ جو بھائی صاحب مرحوم کی قادر الکلامی کا پورا نمونہ تھا سب نوحؔ صاحب میں پایا جاتا ہے اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ خداوند کریم ان کی عمر میں برکت اور کلام میں اثر بخشے فقط۔

افسوس ہے کہ یہ سند گم ہو گئی مگر اس کی تائید میں سید اشتیاق حسین سلمہٗ جو ظہیرؔ صاحب کے نواسے ہیں اور مولانا نادر علی صاحب برترؔ غازی پوری شاگرد رشید ظہیرؔ دہلوی خدا کے فضل سے ابھی زندہ ہیں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ دو تین سال کے بعد وہ رحلت فرما گئے اور اب ان کو صرف اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا پڑا۔

نوحؔ صاحب کی شہرت ان کے استاد ہی کی زندگی میں بہت کچھ ہو چکی تھی اور اُن کے انتقال کے بعد تو یہ اور چمکنے لگے سیدھے سادے اشعار روزمرہ بول چال سہل ممتنع کے پسند کرنے والے خاص نگاہوں سے ان کے کلام کو دیکھتے تھے اور ان کی زبان سے غزلیں سن سن کر یہ کہتے تھے کہ ہر شاگرد کو اپنے

استاد کی تقلید اتنی ہی کرنی چاہئیے فی الحقیقت نوح صاحب ا ... یتی جاگتی تصویر ہیں

اس زمانے میں پیام یار لکھنؤ کے علاوہ مختلف مقامات ... ار طرحی غزلوں

نکلتے تھے بالالتزام سب کا نام کسی کو یاد نہیں رہ سکتا لیکن دیوانو ... اسے معلوم ہوتا ہے

علاوہ اخباروں اور وقتی گل دستوں کے اِن گل دستوں میں ان کا کلام برابر شایع ہوتا تھا۔ ریاض خلیل مارہرہ
اصلاح سخن لاہور۔ معیار الانشاء حیدرآباد دکن۔ محبوب الکلام حیدرآباد دکن۔ بہار سخن نارہ۔ صحن چمن نگینہ۔ کمال دہلی
خدنگ نظر لکھنؤ۔ نہال سخن بانس بریلی۔ زبان اردو شاہجہاں پور۔ ارمغان شاہجہاں پور۔ مرصع آگرہ۔
ترقی سخن بمبئی۔ جلوۂ یار میرٹھ۔ الہدر دصولیہ افتخار جاورہ۔ خیال ہاپوڑ۔ بزم سخن ندرہ۔ غنچہ جاوید بمبئی۔ معیار لکھنؤ۔
سخن سنج لکھنؤ۔ تاج لاہور۔ خورشید میرٹھ وغیرہ اور اب تو ہندوستان کا کوئی ایسا مشہور رسالہ نہیں ہے
جس میں ان کی نظمیں خواہ غزلیں درج ہوتی ہوں اگر یہ کبھی نہیں بھیجتے تو مدیر صاحبان خود اصرار کرکے منگواتے
ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ شایع کرتے ہیں رسالۂ رہنمائے تعلیم جو لاہور اور ماسٹر جگت سنگھ صاحب کے اہتمام
سے ماہوار نکلتا ہے اور ایک قدیم اور موقر رسالہ ہے اس نے اپنی عزت افزائی کے خیال سے ان کو اپنا سرپرست
قرار دے کر ۲۵ سالہ جوبلی نمبر ایسا نکالا کہ جس کی نظیر میں کوئی رسالہ نہیں پیش کیا جا سکتا۔

اسی طرح یہ دور دراز مختلف مقامات کے بڑے بڑے مشاعروں میں بھی کئی کئی بار شریک ہوئے
اور شریک ہو کر صرف دادِ سخن ہی نہیں حاصل کی بلکہ بیشتر مشاعروں کی صدارت بھی فرمائی مفصل
حال ہر جگہ کا قریب قریب ہر غزل کی ابتدا میں درج کر دیا گیا ہے ان سب میں سے صرف چند معرکۃ الآرا مشاعروں
کے نام درج ذیل ہیں اس سے بخوبی ان کے احترام و وقار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد دکن۔ احمدآباد گجرات۔ سلطان پور۔ ہاپوڑ۔ لشکر گوالیار۔ بدایوں۔ دہلی۔ سندیلہ ضلع ہردوئی۔
گیا۔ فتح پور۔ الہ آباد۔ میرٹھ۔ مین پوری۔ شاہجہاں پور۔ پٹنہ۔ کان پور۔ بھوساول۔ لکھنؤ۔ گلاوٹھی۔ علی گڑھ۔
آرہ۔ غازی آباد۔ مظفر نگر۔ مظفر پور۔ فیض آباد۔ ڈبائی ضلع بلند شہر۔ بدایوں۔ سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ۔ بمبئی۔
مچھلی شہر۔ جون پور۔ دہلی کچھدری۔ سکندرآباد۔ کلکتہ۔ لائل پور۔ سہارن پور۔ ہردوئی۔ پیلی بھیت۔ گورکھپور
وغیرہ وغیرہ۔ اب کچھ دنوں سے بوجہ علالت کے اس کثرت سے کہیں نہیں آتے جاتے مگر تاہم احباب
کے اصرار سے چلے بھی جاتے ہیں صرف الہ آباد کے معمولی مشاعروں سے احتراز ہے لیکن اس کے
یہ معنی نہیں کہ شریک ہی نہ ہوتے ہوں جب کوئی اچھا مشاعرہ ہوتا ہے اور باہر کے اچھے اچھے
کہنے والے آجاتے ہیں تو کوئی عذر نہیں کرتے۔

یہ رات دن کا تجربہ ہے کہ ہر مہتمم مشاعرہ اپنے مشاعرے کو اہمیت دینے کے لئے عام اس سے
کہ بڑی بڑی ہستیاں شریک ہوں یا نہ ہوں اپنے پوسٹل اور اشتہارات میں ان کا نام درج کر دیتا ہے
چنانچہ اس وقت ہندوستان میں کوئی ایسا بڑا مشاعرہ نہیں ہوتا جس میں ان کا نام خصوصیت سے
نہ لکھا جاتا ہو اور اصرار کے ساتھ یہ نہ بلائے جاتے ہوں۔

مین پوری کے بہت سے معزز اور مقتدر مقامی قدردانِ سخن حضرات نے معیار الشعرا کے نام سے ایک
انجمن قائم کر رکھی تھی اور قریب قریب ہر سال ایک مشاعرہ بڑے پیمانے پر نہایت حوصلے کے ساتھ کرتے

تھے اس میں نوح صاحب اکثر شریک ہوئے چنانچہ ۲۰ اپریل ۱۹۱۸ء کے جنرل مشاعرہ میں جس کی طرح "اب جنوں مالک ہوا ہے خانۂ زنجیر کا" مقرر تھی حاجی عطا محمد صاحب عطا بدایونی کو ممتاز الشعرا، اور منشی رام دیال صاحب بے دل کو توقیر الشعرا، اور بے دم شاہ صاحب وارثی کو سراج الشعرا، اور انھیں تاج الشعرا کا خطاب انجمن کی طرف سے دیا گیا حضرت داغ کے فرمانے سے پہلے ناخدائے سخن ہو چکے تھے اب یہ تاج الشعرا بھی ہو گئے اس کی مبارک باد رسالۂ خیال میرٹھ میں بڑی دھوم دھام سے ایڈیٹر صاحب نے سرورق پر شایع کی اس مشاعرے میں کون کون صاحب شریک تھے اس کا پتہ غزل کے عنوان سے معلوم ہو سکتا ہے۔

جناب سید حامد حسین صاحب حامد سجادہ نشین درگاہ حضرت سید شاہ ارزاں صاحبؒ بانکی پور پٹنہ میں اکثر مشاعرے نہایت ذوق شوق سے کرتے ہیں قرب وجوار آرہ، گیا، عماد پور، چھپرہ، داناپور وغیرہ کے ممتاز شعرا کے علاوہ حضرات دہلی و لکھنؤ کو بھی دعوت دی جاتی ہے سب سے پہلی بار ۱۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو جس میں طرح "دم بخود ہیں اضطراب دل کا عالم دیکھ کر" نوح صاحب مع اپنے شاگرد رشید منشی اولاد حسین صاحب توبہ سیدہ سرائی کے شریک مشاعرہ ہوئے اس میں سید عباس حسن صاحب فصاحت لکھنوی مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی۔ صفدر مرزاپوری منشی بیکو لال صاحب عشرت لکھنوی وغیرہ نے بھی شرکت فرمائی تھی اور شعرا نے مختلف قوافی میں شعر کہے تھے اور اچھے اچھے شعر نکالے تھے لیکن انھوں نے صرف ایک قافیہ یعنی (ہم) میں غزل کہی تھی جس وقت یہ غزل پڑھی گئی مشاعرہ تہ وبالا ہو گیا کوئی شعر ایسا نہ تھا جو کئی کئی بار نہ پڑھوایا گیا ہو آخیر میں سب نے بالاتفاق یہی رائے قائم کی کہ مشاعرہ نوح صاحب کے ہاتھ رہا یاس صاحب تو اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اخبار میں ان کی تعریف میں ایک مضمون لکھ کر چھپوا دیا اس کو بھی بہت زمانہ نہ گذرا تھا کہ ۹ نومبر ۱۹۲۱ء کو جناب سید امیر حسن صاحب بدر آروی نے اس طرح پر (سر جھکا ہو پائے قاتل پر کھنچی تلوار ہو) ایک بزم سخن بڑے پیمانے پر منعقد کی اور بڑے بڑے شعرا کو طلبی میں مختلف مقامات پر خطوط لکھے انھوں نے ابھی شرکت کا قصد نہ کیا تھا کہ چند مخالفوں نے مل کر جن کو بانکی پور پٹنہ کے مشاعرے میں ان کے اشعار پر زیادہ داد ملنے سے بے وجہ خصومت ہو گئی تھی گم نام ایک خط اس مضمون کا ان کے پاس ڈاک پر بھیجا کہ اُس بار تو ایک قافیے پر آپ نے غزل کہی تھی اب اس بار دیکھیے کیا جدت آپ دکھاتے ہیں ہم لوگوں نے اس بار ایک ہی قوافی میں طرحی غزلیں کہی ہیں جنھیں مشاعرے میں خاص طور سے آپ کے سنانے کو پڑھیں گے پہلے تو انھیں اپنی شرکت میں احتمال تھا لیکن بانیِ مشاعرہ کے اصرار اور اس خط کے مضمون کو دیکھ کر یہ شرکت کے لئے آمادہ ہو گئے چنانچہ یہ شریک مشاعرہ ہوئے چند صاحبوں نے ایک قافیے میں اپنی اپنی غزلیں سنائیں جب ان کے پڑھنے کا وقت آیا تو انھوں نے خط کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا کہ میں نے اس التزام سے دو غزلیں کہی ہیں کہ ایک غزل میں قطعی عطف واضافت نہیں اور دوسری غزل کے ہر شعر میں عطف بھی اور اضافت بھی ہے اور یہ کہہ کر اپنی دونوں غزلوں کے

مخالفت

اشعار پڑھے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اِن کی قادر الکلامی پر حاضرین نے بے حد داد دی جب حریفوں کا یہ وار خالی گیا تو وہ اپنی اپنی جگہ بہت شرمندہ ہوئے اِس مشاعرے کے کچھ دن گذر جانے پر پھر جناب سید شاہ حامد حسین صاحب کے ہاں پٹنے ہی میں مشاعرہ ہوا اور یہ پھر بلائے گئے اِس بار اِسی مخالف جماعت نے آپس میں یہ اقرار کیا اور صرف زبانی ہی اقرار نہ تھا بلکہ قسم بھی کھائی کہ جب نوح صاحب اپنی غزل پڑھیں ہم لوگوں میں سے کوئی داد نہ دے بلکہ حتی الوسع اور لوگ بھی داد نہ دینے پائیں چنانچہ جب یہ غزل پڑھنے کو بیٹھے تو اُن لوگوں نے اپنے عہد وقول نباہنے کی بہت کچھ کوشش کی مگر اچھا شعر پھر بھی اچھا ہے تین شعروں تک تو ان کی خاموشی بھی چوتھے شعر پر تو یہ ٹوٹ گئی اور سب لوگوں کے ساتھ وہ لوگ بھی بے اختیار ہو کر داد دینے لگے مشاعرے کے ختم ہونے پر آپس میں ایک دوسرے کو یہ کہہ کہہ کر الزام دیتا تھا کہ تم نے کیوں تعریف کی انصاف پسند حضرات نے اِس زبردستی کی روک تھام کے واقعہ کو سن کر کہا کہ بہترین اشعار مجبور کر کے داد لے لیتے ہیں اِس میں کسی کا بس نہیں جناب نصیر صاحب عظیم آبادی اِس شعر پر بے تحمل رونے لگے تھے۔

اے دستِ شوق دامنِ محبوب تھام لے ٹوٹے گا سلسلہ نہ سوال و جواب کا

لوگ اُن کے بھی دامن گیر ہوئے مگر انھوں نے کہا کہ آپ لوگ خوش ہوں یا ناخوش ہوں مجھ سے تو اچھے شعر پر نہیں رہا جاتا اگر آپ لوگوں کو اپنی اپنی سخن آرائی پر دعوے ہے تو ایسا شعر کہہ کر سنائیے اِس کا جواب کیا تھا سب خاموش ہو کر رہ گئے اِسی طرح ایک بار اور ایک صاحب کو اِن کے بعد بالقصد غزل پڑھنے کے لئے بٹھایا اور انھیں یاروں نے اطمینان دلایا کہ آپ کے اشعار پر ہم لوگ بہت چیخیں چلائیں گے لیکن انھیں بھی ناکامی ہوئی اور ان کے مقابلے میں وہ باوجود گروہ بندی کے کبھی داد نہ حاصل کر سکے۔

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی سے دنیائے شاعری ناواقف نہیں اُن کے لئے کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی وہ بیشتر متعدد رسالوں میں ان کا کلام دیکھتے تھے اور اِن کی ایک غزل کی تعریف سن کر جس کو انھوں نے ۱۴ر نومبر ۱۹۱۲ء کے میور کالج الہ آباد کے مشاعرے میں پڑھا تھا بے حد مشتاق تھے ایک روز مولوی سید محمد فاخر صاحب عرف راشد میاں تخلص بیتے خود الہ آبادی سے دریافت کہا کہ نوح صاحب سے کیا آپ واقف ہیں یہ کون صاحب ہیں انھوں نے کہا کہ وہ تو آپ کے دوست مولوی عبد المجید صاحب سب جج کے بیٹے ہیں تعجب ہے کہ آپ انھیں نہیں جانتے مجھ سے اُن سے ملاقات ہے وہ بیشتر الہ آباد آتے رہتے ہیں اِس بار آئیں گے تو میں انھیں آپ کی خدمت میں لاؤں گا چنانچہ وہ انھیں لے کر ایک موقع پر اُن کے پاس گئے دونوں کو آپس میں ایک دوسرے کا اشتیاق تھا بڑی دیر تک شعر خوانیاں ہوتی رہیں اُس دن سے اِن کا معمول ہو گیا کہ جب تک یہ الہ آباد میں مقیم رہتے روزانہ اُن سے ملتے چار پانچ ملاقاتوں کے بعد اِس قدر بے تکلفی بڑھی کہ انھیں کے دولت خانہ یعنی عشرت منزل میں مستقل طور سے رہنے لگے حالاں کہ ان دنوں مولوی شفیع الزماں صاحب وکیل ہائی کورٹ کا قیام جو ان کے بزرگ خاص تھے بسلسلہ وکالت ہائی کورٹ الہ آباد ہی میں تھا مگر شاعرانہ تفریح کے خیال سے اِن کے ہاں ٹھہرنے پر اُن کے ہاں ٹھہرنے کو ترجیح دی اب کیا تھا رات دن

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی [illegible] جناب نوح ناروی

تبادلۂ خیالات اور شاعرانہ بحث کا بخوبی موقع ملنے لگا وہ بھی پنشن لے چکے تھے یہ بھی فارغ البال تھے نہ انھیں کوئی خاص کام تھا نہ انھیں کوئی خاص فکر تھی اگر کبھی اتفاق سے الہ آباد پہنچنے میں زیادہ تاخیر ہوتی تو وہ طلبی میں خطوط لکھنے شروع کر دیتے اور جب تک یہ نہ پہنچ لیتے برابر خطوں کا سلسلہ جاری رہتا میرے خیال میں ان کے خطوط کا مجموعہ جس قدر ان کے پاس تھا اور کسی کے پاس نہ رہا ہوگا لیکن ان سے اُن کے صاحب زادہ جناب سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر نے یہ کہہ کر لے لیا کہ چھپواؤں گا مگر اس وقت تک نہ شایع ہوے نہ انھیں واپس ملے اور وہ انتقال بھی کر گئے۔

الہ آباد کے مقامی مشاعروں میں بہت دنوں سے انھوں نے آنا جانا بند کر دیا تھا اگر کوئی بہت زیادہ اصرار کرتا تھا تو وہ انھیں بھیج دیتے تھے ان کے غزل پڑھنے پر اور بہت زیادہ داد ملنے سے اکثر لوگوں کا خیال ہوتا تھا کہ نوح صاحب کے حضرت اکبر سے بڑے مراسم ہیں لہٰذا وہ غزل کہہ کر انھیں دے دیتے ہیں اور یہ اپنے نام سے پڑھتے ہیں چنانچہ کئی حضرات نے خاص خاص موقعوں پر ان سے دریافت بھی کیا انھوں نے پوچھنے والوں سے اِن کی تعریف کرتے ہوئے ہر بار یہی فرمایا کہ وہ اپنی کہی ہوئی غزل پڑھتے ہیں اُن کے استاد حضرت داغ نے انھیں اِس قدر تیار کر دیا ہے کہ وہ اب دوسروں کی امداد کے محتاج نہیں جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میں اُنھیں شعر کہہ دیتا ہوں وہ غلطی پر ہیں مگر اس فرمانے پر بھی اِن کے متعلق اُن کی زندگی تک احباب کو برابر یہی بدگمانی رہی۔

کلیات اکبر حصہ اول و دوم وسوم کے تدوین و انتخاب میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا بلکہ جن اشعار کے داخلہ وخارجہ میں کوئی بحث پیش آئی تو ان کی رائے کو وہ ہمیشہ مان کر احترام کرتے رہے چنانچہ حصہ دوم کے پہلے ایڈیشن میں عنوان پر وہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ اس حصے کے انتخاب میں مولوی محمد نوح صاحب نوح تلمیذ حضرت داغ نے جن کا ذوقِ شاعری شعرا کے لئے بہت قابل مسرت ہے۔ اپنا وقت صرف کیا مصنف اِن کا ممنون ہے۔ اِسی طرح سفینۂ نوح دیوان اوّل وطوفان نوح دیوان دوم کی تقریظ میں بھی ان کے قلم سے بے اختیار چند فقرے ایسے نکل گئے ہیں جن کا ذیل میں درج کرنا ناموزوں نہ ہوگا۔

جنابِ داغ مرحوم کے شاگردوں میں حضرتِ نوح بہت ممتاز ہیں حسن زبان اور صفائیِ بندش میں اِن کا درجہ بلند ہے بہت سے لطیف اور معنی خیز اشعار اِن کی زبان سے میں نے سنے ہیں بڑی خوبی یہ ہے کہ اِن کو تحقیق زبان کا بہت شوق ہے اور اِن کی شاعری علمی مذاق کے ساتھ ہے

فصیح العصر

ایک روز نوح صاحب کے زمانۂ قیام الہ آباد میں پبلک کی طرف سے حضرتِ اکبر کو لسان العصر کے خطاب ملنے پر جناب شاہ محمد بشیر صاحب بشیر و سید محمد فاخر صاحب تجے خود الہ آبادی اور میر وارث حسین صاحب جو جناب اکبر کے بہنوئی رشتے میں تھے اظہار مسرت کے لئے جمع ہوئے انھوں نے سب لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ دنیا نے تو مجھے لسان العصر کا خطاب دیا اور میں نوح صاحب کو باعتبار ان کی شاعری کے فصیح العصر کا خطاب دیتا ہوں لہٰذا مجھے

مبارک باد دیتے ہوئے آپ لوگ انھیں بھی مبارک باد دیں چنانچہ سب موجودہ صاحبوں نے انھیں بھی مبارک باد دی اور انھوں نے بھی سب کا شکریہ ادا کیا۔

جانشینی

شاعر نہ کسی درگاہ یا خانقاہ کے متولی نہ کسی ریاست کے مالک ہوتے ہیں ان کا جانشین ہی کیسا اور جانشینی کیسی لیکن اس زمانے میں دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کسی مشہور شاعر نے انتقال کیا فوراً ہی اُس کے جانشین کوئی نہ کوئی صاحب بن گئے یہ وبا شاعرانہ طبقے میں جناب جلیل مانک پوری کے سبب سے پھیلی مصلحت وقت کے لحاظ سے بالخصوص اس خیال سے کہ دربار حضور نظام تک پہنچے ہیں اس اعزاز کے سبب سے اُنھیں آسانیاں ہوں شاگردانِ حضرت امیر مینائی لکھنوی رح نے جانشین بنادیا حالاں کہ اُن کے شاگردوں میں چند اور بھی ایسی ہستیاں موجود تھیں جن کو خود بھی جانشینی کا دعوےٰ ہو سکتا تھا مگر اِن حضرات نے خاموشی اختیار کی اور یہ بغیر کسی اختلاف کے آسانی سے جانشین ہو گئے چنانچہ جب حضرت داغ دہلوی کا انتقال ہوا تو ان کے شاگردوں میں بھی بہت سے لوگ جانشینی کے مدعی بن بیٹھے کسی کے سر پر مجمع میں دستار باندھی گئی کسی صاحب نے سند جانشینی پر بہت سی دستخطیں اپنے زیرِ اثر احباب سے بنوائیں کسی نے کچھ کارروائی اِس اعزاز کے حاصل کرنے میں کی مگر نوح صاحب اپنی جگہ خاموش اِس جنگ زرگری کا تماشا اِس لئے بے غوری سے دیکھ رہتے تھے کہ نہ انھیں اِس کا خیال تھا نہ اِس کی تمنا تھی جب کبھی ذکر آتا تو کہہ دیتے کہ میں اس کو شروع ہی سے لغو جانتا ہوں دنیا میں کوئی کسی کے بنانے سے کسی کا جانشین بن نہیں سکتا اگر شاگرد کا کلام اِس قابل ہے تو بغیر بنائے ہوئے لوگ اُسے اُس کے استاد کا جانشین سمجھنے لگیں گے مگر اِس پر بھی اِن کی اجان نہ بچی اور انھیں زبردستی نہیں نہیں کرنے پر بھی جانشین بنایا گیا اِس موقع پر بھی خاص اصرار ہے کہ اس کی تفصیل نہ کی جائے تاہم اِس کا لکھنا میرے خیال میں اس لئے بہت ضروری ہے کہ ہوتے ہوتے خواہ کچھ بھی ہو جانشینی بھی ایک خاص چیز ہو گئی ہے علاوہ اس کے جب سب واقعات لکھے جاتے ہیں تو یہ واقعہ جو اہم ترین ہے کیوں نہ لکھا جائے غرض اس تحریک کی ابتدا یوں ہوئی اور سب سے پہلے اخبار آفتاب لاہور مورخہ ۸ اگست ۱۹۱۹ء میں ذیل کا مضمون شایع ہوا۔

مسئلہ جانشینی حضرت داغ مرحوم

یہ بحث مدت سے مختلف رسالوں اور اخباروں میں چھڑ رہی ہے لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں جانشینی کا انتخاب اس لئے اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے کہ داغ مرحوم کے دریائے فیض سے سیراب ہونے والی کوئی مخصوص ہستی نہیں جس کو نظر انتخاب آسانی سے منتخب کرے بلکہ اس دریائے ناپیدا کنار کی موجیں قریب قریب ہندوستان کے ہر حصے اور ہر گوشے میں پہنچی ہیں اور ہر جگہ ایک نہ ایک ایسا نمونہ موجود ہے جس سے داغ مرحوم کی استادی کا ثبوت ملتا ہے جس طرح اردو زبان اپنے اصلی مرکز دہلی سے نمودار ہو کر رفتہ رفتہ عالم گیر ہوئی اسی طرح اس رطب اللسان معجز بیان اردو کے مستند استاد کی شیریں زبان سے بھی تمام دنیا لذت آشنا ہو گئی چنانچہ داغ مرحوم کے اکثر خوش گو شاگرد ایسے ہیں جو باعتبار کمالِ فن تمام ہندوستان کے لئے مایۂ ناز ہیں گو انداز سخن سب کا جدا جدا ہے لیکن سب اپنے

استاد کے متبع اور قدم بقدم ہیں میزانِ انتخاب میں سب کا پلہ برابر نظر آتا ہے اگر ایک کے کلام میں ادا بندی اور زبان کا لوچ ہے تو دوسرے کے کلام میں سادگی اور نزاکت مزا دے رہی ہے ایک فصاحت پر حاوی ہے تو دوسرا بلاغت پر غرض ایک کو دوسرے پر ترجیح آسان کام نہیں یہ تو چمنستانِ داغ کے وہ مختلف پھول ہیں جو اپنے نظر فریب رنگوں اور دل آویز خوشبوؤں کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہی ہیں اب عوام الناس سے تو یہ مرحلہ طے نہیں ہو سکتا البتہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کا فیصلہ عوام و خواص سب کے نزدیک مسلّم ہو چنانچہ ہم نے عالی جناب نواب مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی کی خدمت میں متعدد خطوط اِس مضمون کے روانہ کئے کہ آپ اِس جانشینی کے قضیے کو مٹائیں اور اپنا فرض منصبی ادا کریں اخلاف کے نزدیک آپ کا سایہ حضرت داغ کا سایہ ہے باعتبار کمالِ فن جو خصوصیت اور امتیاز آپ کو حاصل ہے اس سے کوئی منکر نہیں ہو سکتا دہلی تو آپ کا وطن ہے وہاں آپ کا جس قدر اثر ہو کم ہے لیکن ہندوستان کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں جہاں آپ کی خوش گوئی اور ہمہ دانی کا کلمہ پڑھنے والے نہ پائے جاتے ہوں داغ مرحوم کے دل میں بھی آپ کی قدر و منزلت بدرجۂ اتم گھر کئے ہوئے تھی علاوہ دیگر تعلقات کے آپ کو داغ مرحوم کے تمام شاگرد آپ کو انھیں نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن سے داغ مرحوم کو دیکھا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اُن کی طرف نہیں دیکھتے اور جس اعزاز کے وہ مستحق ہیں اُس سے اُن کو کیوں محروم رکھا جاتا ہے کیا مندرجہ ذیل حضرات جانشینی کے مستحق اور اہل نہیں۔

نواب عزیز یار جنگ عزیز حیدرآبادی۔ جناب نوح ناروی۔ جناب احسن مارہروی۔ جناب دلبیر مارہروی۔ جناب بیخود دہلوی (ایڈیٹر ہمدم)۔ جناب وجاہت جھنجھانوی (ایڈیٹر آفتاب) جناب باغ سنبھلی جناب محمود رام پوری۔ جناب بے باک شاہ جہاں پوری۔ جناب عطا بدایونی۔ جناب قمر گوالیاری۔

یہی وہ خلف شاگرد ہیں جن سے امید ہوتی ہے کہ اپنے استاد مرحوم کا نام زندہ رکھیں گے آپ کی خاموشی سے اِن کی حق تلفی ہو رہی ہے یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ ضرورت سے زیادہ منکسر المزاج ہیں اور آپ بادۂ عجز کے نشہ میں اپنی ہستی کو بھولے ہوئے ہیں لیکن ایسا انکسار کیا کہ دنیا کی نظر میں آپ کی طرف ہیں اور آپ مطلق توجہ نہیں فرماتے محض آپ کی خاموشی سے یہ اہم مسئلہ جس کے طے ہونے کی حد سے زیادہ ضرورت ہے معرضِ التوا میں پڑا ہوا ہے اور ان خلف شاگردوں کی جن کو داغ مرحوم اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے حق تلفی ہو رہی ہے موجودہ دور میں مندرجہ بالا حضرات کا شمار اُن شعرا میں ہے جن سے ریختہ گوئی زندہ ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ان کے کمال کی قدر نہ کی جائے اور سب کو جدا جدا جانشینی کی سندیں عطا فرما کر اعزاز نہ بخشا جائے آپ کے انتخاب سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا آپ جن شاگردوں کو جانشینی کی سند عنایت فرمائیں گے اُن کو ساری دنیا حضرت داغ کا جانشین مانے گی۔

ہم خطوط کے ذریعہ سے حضرت سائل کو اس طرف چند بار توجہ دلا چکے ہیں لیکن جواب نہیں ملا اب مجبوراً آفتاب کے ذریعہ سے یہ گذارش کرنے کی ضرورت ہوئی یا تو مندرجہ بالا حضرات کو بمصداق حق بحق دار رسید اسنادِ جانشینی مرحمت فرمائیں یا یہ لکھ دیں کہ مندرجہ بالا حضرات جانشینی کے مستحق اور اہل نہیں۔ حمید ایڈیٹر نظارہ میرٹھ

پھر اس مضمون کے بعد اسی اخبار مورخہ ۱۳ / اگست ۱۹۱۹ء میں حضرت سائل دہلوی
کی طرف سے یہ کھلا ہوا خط شایع ہوا

عطوفت فرمائے بندہ جناب ایڈیٹر صاحب نظارہ زاد الطافہم تسلیم ۸ / اگست سن رواں کے آفتاب میں (مسئلہ جانشینی داغ مرحوم) کی سرخی سے ایک مضمون طبع ہو کر میری نظر سے گذرا چونکہ اس مضمون کا روئے سخن میری جانب ہے مجھے گذارش واقعی میں درنگ و تامل زیبا نہیں مسئلہ جانشینی وفات حضرت داغ مرحوم مغفور کے دو تین ماہ بعد سے چھڑا ہے اور کم و بیش اب تک مسلسل جاری ہے حقیقتاً اس میں کوئی ایسی دلچسپی مکنون ہے کہ آئندہ بھی اس کا مسئلہ ٹوٹتا نظر نہیں آتا سب سے پہلے اس کے مدعی شاعر صاحب دہلوی ہوئے ان کے بعد ریاست بھوپال میں عیش نامی اسی ریاست کے متوطن دعوی دار بنے ازاں بعد سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی نے اعلان فرمایا جو تھا نمبر رسا مرحوم کا ہوا پانچویں باری نسیم ہسوی کی آئی اگرچہ یہ نسبت خوش کن ضرور ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ لوگوں نے اسے قبول کس حد تک کیا اس میں شک نہیں کہ فصیح الملک مرحوم اپنی یادگاریں اچھی اچھی چھوڑ گئے اور کم و بیش سب کو یہ عزت وراثتاً پہنچ سکتی ہے جن حضرات کے اسمائے گرامی آپ نے اپنی یاد سے درج مضمون کئے ہیں وہ اور ان کے علاوہ اور چند حضرات بھی اس کے مستحق ہیں مثلاً ڈاکٹر محمد اقبال صاحب مرزا مشرف یار خاں صاحب مشرف۔ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب الم۔ اختر صاحب نگینوی۔ ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ ابوالحمید صاحب آزاد۔ قاضی شوکت حسین صاحب شوکت۔ عبدالرحمن خاں صاحب فیروز۔ بہت ممکن ہے کہ یاد کرنے سے اور نام بھی قابل تلامذہ کے یاد آئیں۔ یہ سب مرحوم کی نسبت شاگردی سے مستحق اعزاز جانشینی ہیں پھر یہ حضرات کیوں اعلانِ جانشینی بجائے خود نہیں کرتے اب آپ کا یہ ارشاد کہ میں فیصلہ اس مسئلہ کا کروں ان نسبتوں سے جو مجھے بلبل ہندوستان داغ مرحوم سے ہیں چھوٹا منہ بڑی بات ہے مجھے تو معاف ہی فرمایا جائے تو میں ممنون ہوں جانشین بننے کی قابلیت جب میں اپنی ذات میں نہیں دیکھتا تو جانشین گر کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ اس امتحان، واقعی کو آپ یقیناً پھر میرے عجز و انکسار پر محمول فرمائیں گے لہٰذا میں اس مطول سے قطع نظر کر کے اس مختصر پر آپ کی عنان توجہ منعطف کرنے کو تیار ہوں کہ مندرجہ بالا حضرات اور اپنے مجوزہ اور پیش کردہ حضرات سے آپ تحریک کریں، جو صاحب مجھے حضرت داغ مرحوم کا عزیز جان کر میری حاضر کردہ سند جانشینی کو قبول فرمائیں گے میں اُن کو اپنی دستخطی اور مہری سند دے دوں گا اور آپ کے اس الزام بدگمانی کو اپنی جانب سے رفع کر دوں گا پھر بھی میں اپنی وضع خاص کو جو آپ کو ہمیشہ ناگوار ہوتی رہی ہے ترک نہ کروں گا یعنی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میری جانب سے جو سند دی جائے گی وہ باعتبار و قار نسبت دامادی حضرتِ داغ ہوگی نہ باعتبار شرف سخنوری اگر شرف سخنوری مجھے حاصل ہوتا تو میں بھی یہ دل خوش کن صفتی جملہ اپنے نام سے پہلے لکھنا شروع کر دیتا اور اپنے ہوا خواہوں اور دوستوں کو اس کے لکھنے کے لئے مجبور کرتا میری نسبت آپ کا حسن ظن شرطاً دوستی کے لباس میں بھی خاک مذلت میں ملانے کی کوشش کرتا ہے معاف فرمائے گا اس درجہ کی ستائش سے میں فی الواقع کوئی تعلق نہیں رکھتا مکرر عرض ہے کہ تلامذہ حضرت استادی مرحوم سے جو صاحب مجھ سے سند

لینی پسند کریں گے ہیں ان لوگوں میں سے بسر و چشم سند دے دوں گا اور اس کی ایک ایک نقل بغرض طمانیت خاطر آپ کی خدمت میں انشاء اللہ تعالیٰ بھیج دیا کروں گا جسے آپ نظارہ یا کسی اور کثیر الاشاعت موقت الشیوع اخبار میں چھپواتے رہیں زیادہ زیادہ۔ اثم ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائل، ۸ر اگست ۱۹۱۹ء

اس تحریر کے بعد پھر سید اشتیاق حسین صاحب شوق نبیرہ راقم الدولہ حضرت ظہیر دہلوی مرحوم مغفور کا خط اسی اخبار مورخہ ۹ر اگست ۱۹۱۹ء میں ایڈیٹر صاحب کے نام لفظ بلفظ یوں درج ہے

۱۳ر اگست کا آفتاب جس میں فخر داغ حضرت سائل صاحب دہلوی کا کھلا ہوا خط بنام ایڈیٹر صاحب نظارہ جو باگ طبع ہوا اخبار بینوں کی نظر سے گذرا۔ برادر محترم حضرت نوح ناروی چوں کہ دہلی میں ہی تشریف رکھتے تھے اپنی دلی عقیدت کا اظہار جو حضرت بلبل ہندوستان کی وجہ سے طوطی ہندوستان حضرت سائل سے ہے فوراً بذریعہ تحریر کر دیا اور میری وساطت سے حضرت مسبوق الذکر کی خدمت میں وہ تحریر بھیجی گئی جس کے جواب میں نہایت صاف باطنی سے جناب موصوف نے سند جانشینی حضرت نوح کو تحریری عنایت کر دی جس کی نقل بغرض طبع آپ کی خدمت میں حاضر کی جاتی ہے امید ہے کہ آپ جلد اسے طبع کر دیں کہ یہ تحریم دو نامور شعرا کی مزید نام وری کی موجب ہے۔ اس کے علاوہ خلوص جانبین کی روشن مثال ہے کاش حق پسند حضرات اس کی پیروی کریں اور مراسم خاص اس صورت سے باہم جاری رکھیں زیادہ شوق راقم سید اشتیاق حسین شوق نبیرہ راقم الدولہ حضرت ظہیر دہلوی مرحوم مغفور تلمیذ حضرت داغ نقل سند جانشینی حضرت داغ جو حضرت نوح رئیس نارہ کو طوطی ہندوستان فخر داغ حضرت سائل دہلوی نے عطا کی ہے۔ ۱۳ر اگست ۱۹۱۹ء

مہر

سائل

اعتقادی برادر سچاں برابر منشی محمد نوح صاحب نوح تخلص رئیس نارہ ضلع الہ آباد جانشین حضرت داغ ضاعف عمرہ و قدرہ آپ کی عقیدت جو حضرت استادی جہان استاد بلبل ہندوستان ناظم یار جنگ دبیر الدولہ نواب فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم نور اللہ مرقدہ کے ساتھ تھی اس کی نہایت قیمتی معیار یہ ہے کہ مجھے نسبت دامادی سے آپ بجائے ان کے زبان سے فرماتے قلم سے لکھتے دل سے سمجھتے ہیں اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نااہل ہونے کے باوجود اپنی نسبت ہزار اعزاز و وقار کے قول و عمل دیکھوں سنوں اور حق خدمت سے اپنی باز رہوں آج کل کی اخباری تحریک نے میری خیالی تائید کر کے میری ایسی ہمت بڑھا دی ہے کہ میں اس تحریر کے ملاحظہ کی آپ کو تکلیف دیتا ہوں جو عرصہ سے میرے دل میں مکنون تھی بنجواے کل امر مرہون باوقاتہ اس وقت آپ کے ملاحظہ سے گذر رہی ہے آپ کے محاسن شاعری کا معترف تو میرا رواں رواں ہے لیکن قبولیت عام نے آپ کی ایسی حمایت کی ہے جس کی وجہ سے جانشین حضرت داغ آپ کو کہنے

لکھنے اور سمجھنے میں مجھے ذرا تامل نہیں میری یہ تحریر کسی کثیر الاشاعت پرچہ کے ذریعہ سے نظر عام و خاص سے گذر جانے پر میرے دوست ہوا خواہ تلامذہ متعلقین آپ کو اس خطاب سے مخاطب کرنے پر اظہار مسرت کریں گے جو باعتبار صحیح پیروی مذاق سخن حضرت بلبل ہندوستان سے آپ کی نسبت دیکھ کر میں شاد ہوتا ہوں اور آپ کو جانشین حضرت داغ سمجھتے ہوئے مبارکباد دے کر مسرور ہوں اپنا قوت بازو جان کر اپنے جامے میں نہ سمانے سے معذور ہوں امید ہے کہ آئندہ اردو زبان کی خدمت آپ اسی انہماک سے جاری رکھیں گے جو آپ کو بلبل ہندوستان کے تلمذ کی حیثیت سے بطور ورثہ ملی ہے اور اب اُردو کی روزمرہ کے الفاظ کے ترک و اضافہ میں مجھے اور اپنے دوسرے مستند استاد بھائیوں کو شریک و سہیم کرتے رہیں گے میرے شاگرد آپ کی ذات کو آج سے اپنا حقیقی اُستاد سمجھیں گے اور ہر نا سعادت مندی کی سزا اُن کے لئے آپ وہ تجویز کر سکتے ہیں جس کا بروئے رواج ہیں مجاز ہوں۔

دستخط اثم ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

اس سند کے بعد جناب منشی نارائن پرشاد صاحب مہر گوالیاری اور جناب مولوی فضل رب صاحب باغ رئیس سنبھل ضلع مرادآباد کو بھی دو اور سندیں جدا جدا مختلف تاریخوں میں عطا کی گئیں اور نوح صاحب کی طرح اِن دونوں صاحبوں کو باعتبار کمال فن کے حضرت سائل دہلوی نے حضرت داغ کا صحیح جانشین تسلیم کر لیا خیال تھا کہ ان اسناد پر شاعری دنیا میں بہت کچھ لوگ موافقت اور مخالفت کریں گے لیکن موافقت تو قریب قریب سب صاحبوں نے کی مخالفت میں صرف تین مضمون ایک اخبار آفتاب لاہور مورخہ ۱۵ و ۱۶ / اکتوبر ۱۹۱۹ء میں حامد صابر صاحب الہ آبادی کا لکھا ہوا۔ دوسرا آفتاب لاہور مورخہ ۷ / اکتوبر ۱۹۱۹ء میں راج بہادر صاحب دہلوی کا لکھا ہوا تیسرا مظہر لکھنؤ بابت جولائی و اگست ۱۹۳۱ء میں ایڈیٹر صاحب کا لکھا ہوا نظر سے گذرے بہت ممکن ہے اور اخباروں یا رسالوں میں کچھ اور مضامین بھی شایع ہوئے ہوں جن کا علم مجھے نہ ہوا ان سب کے جوابات بھی اسی زمانے میں مختلف اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ سے غیر جانب دار لوگوں نے بغیر کسی اثر کے خوب خوب دئے مگر ان باتوں پر بھی میرے خیال میں عام طور سے کوئی شخص بھی صحیح جانشین نہیں مانا گیا انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ اختلاف اُس وقت بھی تھا اور اس وقت بھی ہے لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ان مضامین میں جو حضرت داغ دہلوی کے ممتاز منتخب شاگردوں کی فہرست درج ہے وہ سب کے سب ہر اعتبار سے اس قابل ہیں کہ جانشین تسلیم کئے جائیں کیوں کہ یہ لوگ خوب کہتے ہیں اور جس مشاعرے میں ان میں سے کوئی پہنچ جاتا ہے مشاعرہ اُسی کے ہاتھ رہتا ہے۔

زمانے میں جب کوئی مشہور ہو جاتا ہے یا اپنی شخصیت کوئی قائم کرتا ہے تو اس کے متعلق اُس طبقے میں موجودہ دور کے لوگ اپنی اپنی رائے قائم کرتے ہیں چنانچہ نوح صاحب پر بھی جو شاعری دنیا میں معاصرین نے رائے قائم کی اور مختلف ذرائع سے خیالات کا اظہار کیا گیا اُن کے شاہد بہت سے رسالے اور اکثر کتابیں ہیں طوالت کے خیال سے صرف چند اقتباس درج ذیل ہیں۔ ان سے اہل کمال خود اندازہ کر لیں گے کہ زمانے کی نگاہوں میں ان کی کس قدر وقعت ہے اور دنیا میں یہ کن نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

جلوہ داغ مرتبہ جناب احسن مارہروی مطبوعہ ۱۹۰۲ء

یہ حضرت داغ کی مکمل سوانح عمری ہے اور زمانہ قیام حیدرآباد دکن میں خود حضرت داغ سے پوچھ پوچھ کر سب حالات مولف نے لکھے ہیں اور سب واقعات لکھتے ہوئے جہاں شاگردان خاص کا ذکر آیا ہے وہاں بے شمار تعداد میں سے جن پر خاص توجہ کی نظر تھی اور جن کا کلام بیشتر اصلاح میں نظر سے گذرا تھا اُن کے متعلق یہ الفاظ ہیں۔

اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے بعد جو تلامذہ قابل ذکر ہیں اُن کے نام با تخلص بلا امتیاز نمبر یہاں لکھے جاتے ہیں اہل دکن میں نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ مرزا مظفر حسین صاحب بارقؔ مولوی ابوالحمید صاحب آزادؔ حافظ محی الدین صاحب محفوظؔ منشی سید عبدالصمد صاحب واصفیؔ منشی عبدالوارث صاحب وارثؔ۔ نواب مہر حسن علی خاں صاحب امیرؔ متفرق مقامات میں منشی وحید الدین صاحب بیخودؔ دہلوی شاہزادہ مرزا منیر الدین صاحب ضیاؔ۔ مولوی عبدالحئی صاحب بیخودؔ بدایونی منشی سید شبیر حسن صاحب نسیمؔ بھرت پوری۔ مولوی حسن رضا خاں صاحب حسنؔ بریلوی۔ منشی حیات بخش صاحب رساؔ منشی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہرؔ رام پوری منشی احسان علی خاں صاحب احسانؔ رام پوری منشی سید امیر حسن صاحب دلیرؔ مارہروی۔ آغا شاعر صاحب دہلوی مرزا مجاہد الدین صاحب شاہی گورگانی۔ اقبال احمد صاحب اقبالؔ ایم۔اے منشی امتیاز احمد صاحب وفاؔ مارہروی۔ جناب جالبؔ صاحب دہلوی منشی سید نذیر حسن صاحب نسیمؔ ہلسوی منشی ریاض حسن صاحب خیالؔ۔ رام چند ر صاحب عیشؔ۔ محمد امراؤ مرزا صاحب نادانؔ برادرزادہ مولوی سید محمد اسمٰعیل صاحب ذبیحؔ وکیل فتح گڑھ صاحب زادہ مشرف یار خاں صاحب شرفؔ منشی یوسف حسن صاحب ملیشؔ مارہروی منشی متین الدین احمد صاحب متینؔ مچھلی شہری۔ محمد نوح صاحب نوحؔ ناروی۔ محمد بشیر خاں صاحب بشیرؔ رام پوری۔

حیات داغ (سوانح عمری) مولفہ جناب اظہر صاحب ہاپوڑی مطبوعہ ۱۹۰۵ء

آپ (یعنی حضرت داغ) کے شاگردوں کی تعداد ہزار کے قریب ہے اور ان میں سے اکثر ہندوستان کے دور دراز شہروں کے رہنے والے ہیں جن میں سے بعض سر برآوردہ لوگوں کے نام یہ ہیں۔ آصفؔ حضور نظام دکن عزیزؔ۔ بارقؔ۔ آزادؔ۔ وارثؔ بیخودؔ۔ ضیاؔ۔ گوہرؔ رام پوری۔ آغا شاعرؔ دہلوی۔ محمد اقبال لاہوری متینؔ مچھلی شہری۔ نوحؔ ناروی۔ بشیرؔ رام پوری وغیرہ وغیرہ بہت سے نام ہیں جن کی تفصیل کرنا محالات سے ہے اور ہر ایک بجائے خود استاد کا نام روشن کرنے والا ہے اس بات کا اندازہ سخن فہم ناظرین ان لوگوں کا کلام مختلف گلدستوں میں دیکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں۔ فقط

یادگار داغ (سوانح عمری) مولفہ ابوالاعجاز منشی محمد اکبر علی خاں صاحب افسوںؔ

واکبر شاہ جہاں پوری مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ۔

جناب محمد نوح صاحب نوحؔ نارہ کے رہنے والے اور رئیس طبیعت نہایت تیز بذلہ گو اور خوش مذاق ہیں استاد کی خدمت میں عرصہ تک بمقام حیدرآباد رہے ہیں۔

اُردوئے معلی (رسالہ) علی گڑھ مرتبہ سید فضل الحسن صاحب حسرتؔ موہانی نمبر ۲ جلد ۱۲ بابت فروری ۱۹۱۱ء

بیان کی شوخی زبان کی صفائی محاوروں کی بے تکلفی اور الفاظ کی پسندیدہ اُلٹ پلٹ مرزا داؔغ کے کلام کی طرح نوؔح کے کلام کی بھی جان ہے البتہ تاثیر بیان اور بلندیٔ مضمون سے آپ کے اشعار بھی اُسی قدر بے گانہ ہیں جتنے داؔغ کے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند"

رو داد مشاعرہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۴ء

جناب منشی محمد نوح صاحب نوؔح رئیس نارہ ضلع الہ آباد نواب فصیح الملک بہادر کے دور دوم کے اُن قابل تلامذہ میں سے ہیں جنھوں نے مرحوم کے قدیم تلامذہ نسیم بھرت پوری بے خود بدایونی و حسن بریلوی و رسا گلاوٹھوی کے بعد نام وری حاصل کی ہے اور اُستاد مرحوم کا اس قدر تتبع کیا ہے کہ استاد و شاگرد کے رنگ میں کوئی امتیازی فرق نمایاں نہیں ہے۔

بزم سخن ندرہ ضلع گیا بابت جنوری و فروری ۱۹۱۷ء

منشی جگیشر پرشاد صاحب خلش مختصر سوانح عمری لکھتے ہوئے تصویر چھاپتے ہیں اور یہ الفاظ آخر میں درج کرتے ہیں۔ جناب نوؔح کا کلام استاد کی زندگی ہی میں استاد سے ملتا جلتا تھا آپ اکثر مشاعروں میں اچھی خاصی داد حاصل کر چکے ہیں انجمن بزم سخن گیا کے عظیم الشان مشاعرہ منعقدہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں بھی آپ کے کلام سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔

حسن ادب لکھنؤ مشاعرہ انجمن معین الادب فروری مارچ ۱۹۲۵ء

جناب نوؔح ناروی نے اپنی کہنہ مشقی تمام بزم پر آئینہ کر دی اور رنگ غزل کا حق ادا کیا

کالستھ سماچار الہ آباد بابت فروری ۱۹۲۶ء

اشعار پر ریویو کرتے ہوئے منشی کنھیا لال صاحب بی اے آخر میں لکھتے ہیں

نوؔح زبان کے بادشاہ ہیں داؔغ ان کے استاد تھے اور یہ انھیں کے جانشین ہیں اور اپنے گھرانے کے ایسے پکّے شاگرد اور جاننے والے ہیں کہ یہ موقع کبھی نہیں دیتے کہ ایسا کوئی کہہ سکے زبان میں ذرا بھی خرابی ہے یا یہ کہ لفظوں پر پورا اختیار نہیں زبان بالکل سلیس ہے مضمون بلند ہیں الفاظ چست ہیں اور مصرع تو ایسا لگاتے ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ اُستاد ہیں۔

ہجوم خیال کان پور

مسلم کلب کا سالانہ مشاعرہ

۹ فروری ۱۹۲۹ء

اس مشاعرے میں حضرت ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوؔح ناروی جانشین حضرت داؔغ دہلوی کی شرکت دراصل گوہر صاحب ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ جناب نوؔح صاحب نے باوجود اپنی انتہائی مشغولیت کے تشریف لا کر مشاعرے کی صدارت قبول فرمائی جس کے ہم جناب موصوف کے بھی بے حد ممنون ہیں۔

مشاعرہ ٹھیک ۹ بجے شب جناب نوؔح ناروی صدر مشاعرہ نے اپنے غیر طرح کلام سے شروع کیا اور تقریباً ۲ بجے صبح حضرت نوؔح ناروی پر ختم ہوا۔

رہنمائے تعلیم لاہور بابت مارچ ۱۹۲۹ء

حضرت نوح مدظلہ العالی کا اسم گرامی محتاجِ تعارف نہیں ہے ہندوستان بھر کے طول و عرض میں آپ کی شاعری کا ڈنکا بج رہا ہے ملک کا کوئی ادبی رسالہ ایسا نہیں جس میں آپ کا کلام نہ شایع ہوتا ہو آپ کے مفصل حالات رسالہ ہذا کی قریب ترین اشاعت میں شایع ہوں گے۔

جام جہاں نما لکھنؤ بابت فروری مارچ ۱۹۲۹ء

تاج الشعرا ناخدائے سخن جانشین داغ جناب مولانا مولوی محمد نوح صاحب نوح بالقابہ جناب داغ دہلوی مرحوم کے سب سے زیادہ صاحبِ تلامذہ شاگرد اور نارہ ضلع الہ آباد کے خاندانی و موقر رئیس ہیں علوم رسمیہ سے کافی آگہی ہے طبیعت خلیق و متواضع پائی ہے آپ کا کلام زبان دہلی کے آخری اور موجودہ دور کا دلچسپ نمونہ ہوتا ہے بندش پاک و صاف ہوتی ہے مضامین زبان اور محاوروں کی حدود میں نہایت سلاست اور فصاحت سے نظم کئے جاتے ہیں اکثر اصنافِ سخن پر قدرتِ کلام حاصل ہے وضع داری آپ کی جزو فطرت ہے۔

اکبر الہ آباد بابت اپریل ۱۹۲۶ء

تصویر چھاپتے ہوئے مدیر صاحب بہت بڑا مضمون لکھتے ہیں جس کے چند فقرے یہ ہیں

حضرت نوح ناروی زمانۂ حاضرہ کے ایک باکمال شاعر ہیں تغزل کا قدیم رنگ آج ہندوستان سے کب کا مٹ گیا ہوتا تلامذۂ داغ و امیر کو خدا خوش رکھے اُن کی بدولت اُردو کی روایات قدیمہ محفوظ ہیں اگرچہ نئی روشنی کے جاں نثاروں نے ان محترم ہستیوں کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا ان غریبوں کی قدامت پرستی ایک ایسا جرم ہے جو عفو کرم کی بندشوں سے آزاد ہے نوح صاحب کی شاعری خالص ایشیائی ہے وہ زمانے کی نیرنگی سے بے نیاز ایک مستقل دائرہ پر ہیں آج کل ملک کے نوجوانوں میں یہ وبا پھیلی ہوئی ہے کہ قدیم رنگ کا ہر شاعر فطرت سے معرّا اور مبالغہ وغیرہ کے پھندوں میں پھنسا ہوا ہے ان کے نزدیک تخیل ہی شاعری کا رکن اعظم ہے شوکت الفاظ توالیِ اضافات محاسن کلام میں سے ہیں لیکن غزل گوئی کا حقیقی دار و مدار محض حسن و عشق پر ہے بہرحال غزل گو شاعر کے لئے حسن و عشق کا مطالعہ بہت ضروری ہے ان سے اگر بے اعتنائی برتی جائے تو غزل غیر مکمل جذبات مفقود اور شاعر کی باتیں غیر مؤثر ہوں گی چنانچہ یہ بھی اسی خیال کے مؤید ہیں اور محبت کو بشرط پاک بازی ضروری سمجھتے ہیں میں مانتا ہوں کہ یہ خیالات فرسودہ ہیں ہر شاعر نے محبت کے مختلف مدارج کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اکثر کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن حسنِ بیان بھی کوئی چیز ہے ہر شخص ایک خاص لے اور طرز لے کر آیا ہے اور ہر ایک کے انداز بیان میں ایک امتیازی شان ضرور ہوتی ہے یہ بھی خدا کی دین ہے کہ کسی کے حسنِ بیان میں شوخی شگفتگی کافی ہو اشعار پرکیف سلیس تکلف اور آورد سے بری ہوں مگر ایسے کم ہیں کہ جو نوح کی طرح نغمہ سرائی کر سکیں گو حسنِ بیان و رفعتِ تخیل میں یہ میر کو نہیں پا سکے لیکن پھر بھی ان کی تائید میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اِن کی شاعری زمانے کی ہوا سے متاثر نہیں ہوئی قدما کی طرح کلام سادہ دلکش اور واقعات کا پہلو لئے رہتا ہے اساتذہ قدیم کی طرح یہ بھی انسانی زندگی کا خاکہ کھینچتے ہیں مگر اس حسن و خوبی کے ساتھ کہ فروعی اور عارضی

باتیں نہیں آنے پاتیں اور ایک عام اور ہمہ گیر حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے انھوں نے ہماری زندگی کا عمیق مطالعہ کیا ہے اظہارِ خیال میں قریب قریب وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جنھیں ہم اکثر ایسے موقعوں پر بولتے ہیں اِسی وجہ سے کلام میں زندہ دلی شوخی اور سادگی سب ہی کچھ موجود ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھے ہوئے کسی سے گفتگو کر رہے ہیں الفاظ کی نشست بندش کی چستی خصوصی امتیازات ہیں اور کیوں نہ ہو جب فصیح الملک داؔغ کے فیض یافتہ ہیں اس میں ہرگز کلام نہیں کیا جا سکتا کہ شاگردانِ داؔغ میں نوؔح ایک خاص درجہ رکھتے ہیں اور استاد کی جھلک شاگرد میں نمایاں ہے سادگی روزمرہ سلاست مغلق الفاظ سے احتراز معاملہ بندی بے تکلفی یہ سب باتیں نوؔح کے ہاں بالکل داؔغ صاحب کی طرح پائی جاتی ہیں اور اُستاد شاگرد کا امتیاز ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

منادی دہلی ۳۱ر جنوری ۱۹۳۰ء از خواجہ حسن نظامی صاحب

میں جناب نوؔح سے حضرت اکبر الہ آبادی کے ہاں مل چکا ہوں بہت اچھے اور اعلیٰ شعرا میں اُن کا شمار ہے اُن کا کلام استادانہ ہوتا ہے اور وہ ایک بڑی جماعت کے استاد ہیں میں اگر شاعر ہوتا تو اُن کے کلام کی خوب ہی تعریف کرتا۔

پھر بہی اخبار ۲ر فروری ۱۹۳۰ء خواجہ صاحب طوفان نوح کو دیکھ کر

ہم نے دوسرے کلام کا بالاستعیاب مطالعہ کیا واقعی بہت موثر کلام ہے حضرتِ داؔغ کا رنگ اندازِ بیان اور پاکیزگی ہر غزل میں نمایاں ہے۔ آپ اس دور کے باکمال شعرا میں خیال کئے جاتے ہیں اور اِس وقت طول وعرض ہند میں آپ کے تقریباً چار سو شاگرد ہیں۔

شاعر آگرہ ۱۵ر فروری ۱۹۳۰ء

ریاؔض خیر آبادی۔ جلیؔل مانک پوری۔ چکبسؔت لکھنوی۔ سائؔل دہلوی۔ بےؔخود دہلوی۔ ثاقؔب اکبر آبادی واصؔف اکبر آبادی۔ سرؔور جہان آبادی۔ رئیؔس اکبر آبادی۔ نظیؔر لکھنوی۔ نثاؔر اکبر آبادی۔ اکبر الہ آبادی۔ بزمؔ اکبر آبادی دلؔ گیر اکبر آبادی۔ فاؔنی بدایونی۔ سیماؔب اکبر آبادی۔ آزاؔد سہارن پوری۔ احسؔن مارہروی۔ نوؔح ناروی۔ حسرؔت موہانی۔ اخضؔر اکبر آبادی۔ شوکت میرٹھی۔ بیاؔن میرٹھی۔ راسؔخ دہلوی وغیرہ ادبا کا نام آج بھی ادبی خدمات کو نمایاں کر رہا ہے ان میں سے بعض ہم میں موجود نہیں اور باقی مشاہیر شعرا اب بھی خدمت ادب اُردو میں مصروف ہیں۔

مبصر لکھنؤ بابت جولائی اگست ۱۹۳۰ء

ناخدائے سخن جناب نوؔح ناروی ایک مسلم الثبوت استاد ہیں آپ کا گراں قدر کلام زبان اور محاورہ کا گنجینہ ہوتا ہے ہر ہر شعر تعریف سے مستغنی ہے۔

فانوس خیال یعنی روداد مشاعرہ بزم ادب ڈبائی منعقدہ دسمبر ۱۹۳۰ء نوشتہ جناب فاضلی

یہاں کے ۱۹۲۹ء کے سالانہ مشاعرے کی کامیابی دیکھ کر اراکین بزم ادب امسال بھی بدستور سابق ایک عظیم الشان مشاعرہ کا اعلان کرنے پر آمادہ ہو گئے صدارت کے لئے تاج الشعرا ناخدائے سخن فصیح العصر حضرت نوؔح ناروی جانشین حضرت داؔغ دہلوی مرحوم سے درخواست کی گئی یکایک حضرت نوؔح

کی جانب سے بوجہ علالت صدارت کی معذرت کا خط موصول ہوا ہرچند معذرت مایوس کن تھی مگر اس موقع پر حضرت احسن مارہروی کا ذریعہ بزم ادب کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ ہمیں اُس وقت بے حد مسرت ہوئی جب حضرت نوح نے شام کی ٹرین سے ڈبائی کو اپنے قدوم سے سرفراز فرمایا اسٹیشن پر بزم ادب کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر مسٹر اختر حسین صاحب انصاری اور چند ممبروں نے موصوف کا نہایت شاندار استقبال کیا ہم وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتے جب ہم نے حضرت نوح کو پھولوں کی بارش میں ٹرین سے اُترتے دیکھا مشاعرے میں سب سے پہلے استقبالیہ کمیٹی کے صدر مسٹر اختر حسین نے اپنا خطبہ پڑھا اس کے بعد حفظ الرحمٰن کی تحریک اور حاضرین محفل کی تائید پر حضرت نوح ناروی نہایت متانت کے ساتھ کرسیِ صدارت پر رونق افروز ہوئے جس وقت صدر موصوف اُٹھے پھولوں کی بارش نے اُن کا استقبال کیا اور تمام محفل نعرہ ہائے مسرت سے گونج اٹھی نوح صاحب نے بہ حیثیت برادرانہ احسن صاحب مارہروی کو بھی اپنے پاس بٹھالیا اس صورت سے معاصرانہ شان و شوکت دوبالا ہوگئی شعرائے ڈبائی کی جانب سے عاشق صاحب ذبیحی نے اور ہندو پبلک کی طرف سے بابو کانتی پرشاد صاحب نے نذر میں ایک ایک ہار صدر صاحب کو پیش کیا' مذکورہ بالا ضروری مراسم ادا ہو جانے کے بعد جناب صدر نے اپنا قابلانہ خطبہ ارشاد فرمایا جو تمام واقعات نگاری کا حاصل تھا۔

انٹرمیڈیٹ کالج میگزین علی گڑھ جلد ۳ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء مدیر اختر رضوی

عبدالعزیز صاحب ایم۔اے صفحہ ۶

دوسری رات ۱۵ مارچ کو ۸ بجے شب سے مشاعرہ شروع ہوا ابتدا میں چند طلبائے کالج نے طرحی غزلیں پڑھیں پھر بیرونی اور مہمان شعرا نے اپنا اپنا غیر طرح کلام سنایا اور یہ جلسہ بھی گذشتہ شب کی طرح ۱۲ بجے ختم ہوگیا جن معزز و موقر شعرا نے استدعائے حقیر پر کرم فرمائی سے ممنون فرمایا اُن سب کا اور خصوصاً حضرت نوح ناروی۔ حضرت فانی بدایونی۔ حضرت آنی جائسی حضرت جگر مرادآبادی۔ حضرت قمر بدایونی۔ حضرت اصغر مین پوری کا منت پذیر ہوں۔ پہلے تو نہیں تھا لیکن اب قریب قریب تمام مشاعروں میں دیکھا جاتا ہے کہ فی صدی نوے لوگ اپنی اپنی غزلیں ایسی خوش نوائی کے ساتھ پڑھتے ہیں جو نغمہ سنجی کے لگ بھگ پہنچ جاتی ہے اِس صورت خاص میں غزل اپنی جگہ چاہے جیسی ہو مگر نغمہ سرائی کے ذریعہ سے کچھ نہ کچھ سامعین کو لطف دے جاتی ہے لیکن صفحۂ کاغذ پر جب چھپتی ہے تو عالم بے کسی ہر شعر پر طاری ہوتا ہے ایسی غزل سرائی نہ انھوں نے کبھی کی نہ اب کرتے ہیں بہ تحت اللفظ میں شعر پڑھتے ہیں مگر ایسا پڑھتے ہیں کہ لوگ بدحواس ہو ہو کر بے ساختہ داد دیتے ہیں ان کا پڑھنا بھی حضرتِ داغ کا پڑھنا ہے جو لوگ اُن کا پڑھنا سُن چکے ہیں وہ ان کے پڑھنے کو سُن کر انھیں یاد کرتے ہیں میرے خیال میں ترنم آمیز لہجے میں پڑھنا سب سے پہلے حضرت سائل دہلوی نے اختیار کیا اور اُن کی یہ روش اس قدر مقبول ہوئی کہ آج سارا عالم انھیں کی تقلید کرتا ہے اگرچہ وہ لب و لہجہ نہ کسی کو نصیب ہوا نہ ہو سکتا ہے۔

غزل خوانی

بیشتر دیکھا گیا ہے کہ مشاعروں میں جب نامی نامی مشاہیر شعرا تشریف فرما ہوتے ہیں

مشاعرے کے اصول

تو اپنی ذاتی وجاہت اور اقتدار کو لیئے ہوئے خاموش بیٹھے رہتے ہیں نہ کسی کا مصرع اُٹھاتے ہیں نہ کسی کو کھل کر داد دیتے ہیں ہاں بعض بعض شعر پر جب پڑھنے والے کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہو جاتی ہیں یا نام لے کر مخاطب کیئے جاتے ہیں تو محض مروت یا شناسائی کے خیال سے صرف گردن ہلا دیتے ہیں۔ اور بہت ہوا تو یہ کہہ دیا کیا اچھا کہا ہے لیکن اس کے برعکس یہ جس مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں ہر شاعر کا مصرع اُٹھانا اور اچھے شعروں پر داد دینا اِن کا فرض اوّلین ہے ہاں اگر کوئی غلط شعر پڑھا جائے گا تو دو ایک منٹ کے لیئے یہ خاموش ہو جائیں گے مگر اس خموشی پر بھی پڑھنے والا یہ نہ سمجھے گا کہ مجھ سے کوئی فروگذاشت یا لغزش ہو گئی مبتدی شعر انھیں شعر سُناتے ہیں اور انھیں بھی یہ داد دیتے ہیں اکثر احباب نے اِس کا سبب پوچھا تو یہ کہا کہ اگر ابھی سے اِن کا دل نہ بڑھایا جائے گا تو اِن کی ترقیاں مسدود ہو جائیں گی اور اِن کی دل آزاری ہو گی جب تک اصرار کے ساتھ کوئی نہیں پوچھتا علاوہ شاگردوں کے یہ اُس کی غلطیاں بھی اُس پر نہیں ظاہر کرتے۔

شوق کی چیزیں

شروع زمانہ سے یہ دیکھا گیا ہے کہ اور رؤسا کی طرح نہ اِن کو تاش گنجفہ، چوسر یا شطرنج کھیلنے کا شوق رہا نہ اور کسی فضول مشغلے میں اِنھوں نے اپنے کو مبتلا کیا بچپن میں کرکٹ اور جوانی میں شکار وغیرہ سے کچھ دنوں تک دل چسپی رہی مگر اب یہ دونوں باتیں نہ ہونے کے برابر ہیں بندوق کا نشانہ تو اب بھی لگا لیتے ہیں لیکن پہلے کا انہماک قطعی نہیں ہاں دو چیزوں کا شوق ہمیشہ سے ہے اور یہ شوق بے انتہا ہے اوّل تو گھوڑے کی سواری سے خاص لگاؤ ہے ایک ایک بیش قیمت جانور ہمیشہ اصطبل میں موجود رہا اور اب بھی رہتا ہے کئی بار گھوڑے سے گرے بھی ہاتھ ٹوٹا ہنسلی کی ہڈی بھی جگہ سے سرک گئی مگر یہ شوق نہ کم ہونا تھا نہ کم ہوا جس طرح سوار ہوتے ہیں انھیں کمال حاصل ہے اسی طرح شناخت میں بھی خاص ملکہ ہے گھوڑے کی جانچ پرکھ خوب کرتے ہیں اور بال بھونری اچھائی بُرائی سے بخوبی واقف ہیں دوم کبوتر پالنا اور اُن کا اُڑانا نایاب اور کم یاب تحفہ پر انھیں اِس قدر مسرت نہ ہو گی جس قدر ایک جوڑا عمدہ کبوتر ملنے سے ہوتی ہے دوست احباب تلاش کر کے بہترین کبوتر ان کو دیتے ہیں اور خود بھی اپنی طرف سے فرمائش ہوتی رہتی ہے اگرچہ کافی تعداد موجود ہے مگر اور لاؤ اور لاؤ سے غفلت نہیں ہوتی یہ تجربہ ہے کہ کبوتر کے شائق دوسروں کے کبوتر تو لے لیتے ہیں مگر اپنے نہیں دیتے اِن میں یہ بات نہیں جس طرح لیتے ہیں اسی طرح اپنے ملنے والوں کو دے بھی دیتے ہیں چنانچہ بیشتر مقامات سے درآمد برآمد ہر وقت جاری رہتی ہے۔

وضع داری

جس سے یہ ملے ہمیشہ ایک طرح سے ملے مراسم بڑھانے کا خیال تو رہتا ہے لیکن گھٹانے کا گمان بھی نہیں ہوتا ایک بار جو شخص ان سے ملے گا ہمیشہ اِن کے اخلاق کا مداح رہے گا قرب و جوار کے ہندو مسلمان رؤسا سے برابر کے برتاؤ ہیں اور طرزِ عمل سے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کسی اور سے مراسم نہ ہوں گے برابر والوں کے علاوہ اپنی رعیت کے ساتھ بھی ان کے ایسے برتاؤ ہیں کہ آج تک کوئی شاکی نہ ہوا مذہبی تعصب ان کو چھو کر نہیں گیا مسلمان سے زیادہ ہندو ان کے دوست اور شاگرد ہیں اور کسی سے کسی طرح مغائرت نہیں جہاں اپنے مذہب کا سختی سے خیال ہے وہاں دوسروں کے مذہب کے احترام کا بھی احساس ہے اکثر ان کے وہ گاؤں جن میں تمام و کمال ہندو آباد ہیں وہاں انھوں نے رعیت

کی پرستش کے لئے اپنی طرف سے خاص خاص انتظامات کر دئے ہیں اور ہر تہوار کے موقع پر یعنی ہولی دسہرہ دیوالی وغیرہ میں روپیوں سے سالانہ امداد دیتے ہیں مگر اس پر بھی خاص ان کے وطن کے لوگ یعنی حضرات نارہ باستثنائے چند افراد کے ان سے مغائرت اور دل میں حسد و کینہ رکھتے ہیں اور بغیر کسی غرض کے نہیں ملتے اور یہ بھی اُن سے ملنے میں بہت احتیاط رکھتے ہیں کیوں کہ اکثر صدمے ان کو ایسے پہنچے ہیں جنھیں یہ مرکر بھی نہ بھولیں گے۔

مہمان داری

ریلوے اسٹیشن سراتھو سے ۹ میل خام سڑک طے کرنے کے بعد دکھن جانب نارہ ملتا ہے مگر اس پر بھی کوئی ہفتہ ایسا نہیں گذرتا کہ کوئی نہ کوئی مہمان نہ آ جائے اگر ان کو پہلے سے اطلاع ہو جاتی ہے تو سواری کا انتظام اپنے ہاں سے کر دیتے ہیں ورنہ یکّہ پر لوگ خود چلے آتے ہیں مگر جب کوئی شخص ان کے ہاں پہنچ جائے گا تو یکّہ کا کرایہ اپنے پاس سے ادا کریں گے بہت سے شاگرد اور احباب دور دراز مقامات سے آتے ہیں اور مہینوں قیام کرتے ہیں مگر کیا مجال کسی کی خاطر مدارات میں کسی طرح کی کمی ہو مسلمان صاحبان کے لئے تو کوئی دقت نہیں ہندو صاحبان کے لئے بھی ایک خاص ہندو اسی لئے ملازم ہے کہ وہ کھانا وغیرہ پکا کر کھلائے اور ہر وقت آرام پہنچانے کا خیال رکھے اسی طرح دورہ کے زمانے میں یا یوں نہیں جب حکام آ جاتے ہیں تو اُن کے لئے بھی حسبِ مراتب ہر قسم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

روزمرہ کے مشاغل

نماز صبح اور معمولی وظیفہ خوانی کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کبوتر بازی میں صرف ہوتا ہے اس کے بعد سردی کے زمانے میں چاء اور موسم گرما میں ناشتہ کرنے پر وہ غزلیں اور خطوط دیکھے جاتے ہیں جو باہر سے اصلاح کے لئے ڈاک پر احباب بھیجتے ہیں۔ اصلاح اور جواب خط کا سلسلہ گیارہ بجے تک رہتا ہے روزانہ غزلوں کی اصلاح سے فراغت کر کے کھانا کھاتے ہیں اور ۲ بجے تک سوتے ہیں پھر جاگ کر نماز ظہر ادا کرتے ہیں اور اپنے علاقے کا حساب و کتاب دیکھتے ہیں پھر عصر کی نماز پڑھ کر تفریح کے لئے کبھی بندوق لے کر پیدل اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر چلے جاتے ہیں واپس آ کر مغرب کی نماز اپنے دروازے کی مسجد ہی پر پڑھتے ہیں پھر عشا تک جو کہنا ہوتا ہے وہ خود کہتے ہیں کوئی خاص تعداد مقرر نہیں کبھی دو چار شعر کہہ لئے کبھی پوری غزل ہو گئی اس وقت کسی کا آنا اور ملنا ان کو سخت ناگوار ہوتا ہے جو لوگ واقف ہیں وہ خود ان سے ملنے کو اُس وقت نہیں آتے اور جب کوئی آ جاتا ہے تو پھر فکر سخن یہ اُس دن ملتوی کر دیتے ہیں عشا کی نماز پڑھ کر حقّہ پینے کے بعد سو جاتے ہیں چوں کہ روزے کی پابندی سختی سے یہ کرتے ہیں اس لئے رمضان شریف میں نہ یہ شعر خود کہتے ہیں نہ کسی کے کلام پر اصلاح دیتے ہیں پورا مہینہ تلاوت قرآن مجید میں گذرتا ہے یہی معمول محرم میں بھی دس روز تک رہتا ہے اور جب سفر میں ہوں گے تو مندرجہ بالا تعین اوقات کی پابندی سے معذوری رہتی ہے۔

تحقیقات الفاظ

تحقیقات الفاظ کا ہمیشہ بہت کچھ خیال رہتا ہے جس لفظ کے متعلق کوئی شک و شبہ ہوا یا کسی طرح معلوم ہوا کہ یہ لفظ یوں نہیں ہے یوں ہے اسی وقت سے اُس کا استعمال ترک کر دیں گے یا نئی تحقیقات کے اصول پر لکھیں گے لیکن جو مطبوعہ دیوانوں میں الفاظ نکل جا چکے ہیں اُن سے مجبوری ہے چنانچہ شمشیر کے متعلق جس وقت سے معلوم ہوا کہ زیر اور ڈھیر کا قافیہ ہے اُس وقت سے دل گیر اور

پنجر وغیرہ کے قوافی میں نہیں لکھا اگرچہ تمام اساتذہ کا کلام اس کی سند جواز میں پیش کیا جاسکتا ہے مگر ان کا خیال یہی رہتا ہے غلط ہر حال میں غلط ہے عام اس سے کسی بڑے شخص نے اُسے جائز ہی کیوں نہ رکھا ہو ایک بار دلی کے قیام میں انھوں نے ایک مجمع میں غزل پڑھی جب ان کے منھ سے یہ شعر نکلا

وہ آجائیں وہ من جائیں وہ من کر مجھ سے مل جائیں   ارے روٹھی ہوئی تقدیر کچھ تدبیر ہے اس کی

مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی نے کہا کیا آپ ارے کو صحیح جانتے ہیں دہلی والے تو نہیں بولتے اس پر انھوں نے فوراً حضرت داغ کا یہ شعر پڑھ دیا۔

قدموں پہ گرا ہیں تو جھجک کر وہ یہ بولے   اندھا ہے ارے تجھ کو دکھائی نہیں دیتا

چوں کہ نیک نیتی سے یہ شبہہ ظاہر کیا گیا تھا اس سبب سے برق صاحب پھڑک گئے اور کہنے لگے تحقیقات اتنی تو ہو آج مجھے ایک سند مل گئی اسی طرح حضرت سائل دہلوی نے ایک بار الہ آباد میں ساری کے متعلق بھی کچھ فرمایا تھا الفاظ تو مجھے یاد نہیں رہ گئے مگر مفہوم غالباً یہی تھا کہ اچھا نہیں معلوم ہوتا یا غلط ہے اس موقع پر بھی انھوں نے حضرت داغ کا یہ مطلع پڑھ دیا تھا۔

کس کی طاقت ہے کرے کوئی بُرائی آپ کی   ساری دنیا آپ کی ساری خدائی آپ کی

حضرت اکبر الہ آبادی کے دولت خانے پر چند لوگوں میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ تنبا کو کا املا نون اور بے سے یا میم سے صحیح اور درست ہے دو جماعتیں تھیں ہر جماعت دوسری جماعت کی تردید کرتی تھی آخر میں انھیں کی رائے پر اس کا فیصلہ ہوا اور اکبر صاحب نے بھی انھیں کی رائے پسند فرمائی انھوں نے فرمایا کہ وہ الفاظ عام اس سے کسی زبان کے ہوں جنھیں اہلِ فارس نے اپنے ہاں داخل کر لیا ہے اور جن کے تلفظ میں میم کا اشتباہ ہوتا ہے مثلاً عنبر، تنبول، شنبہ ہمیشہ نون اور بے سے لکھے جاتے ہیں اسی لحاظ سے تنبا کو کا املا بھی نون اور بے سے درست ہوگا ہاں اُردو کے الفاظ مثلاً کھمبا اور سبھی وغیرہ کا املا میم سے ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ اہل فارس کے ہاں یہ الفاظ مستعمل نہیں۔

نثری تالیف و تصنیف

نثر نویسی سے دلی لگاؤ انھیں کبھی نہیں رہا اگر یہ کہا جائے کہ نثر لکھی ہی نہیں تو یہ بھی غلط ہے کیوں کہ بیش تر تنقیدیں اور بہت سے علمی مضامین انھوں نے لکھے اور متعدد رسالوں میں شایع ہوئے لیکن نہ ان پر خاص توجہ رہی نہ کتابی صورت میں یہ ترتیب دیے گئے نہ یہ ان کے لئے باعث شہرت ہیں۔ اوائل عمری میں دو ناول ثریا اور ہائے ستم ان کے قلم سے نکلے پہلا تو چھپ گیا مگر دوسرے کے چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ چاک کر کے پھینک دیا ثریا کے متعلق جب ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں اُس کو مجھ سے نسبت ہی نہ دینی چاہیے کیوں کہ میں نے اُس کو ایسے وقت میں لکھا ہے جب مجھے اچھے بُرے کا امتیاز نہ تھا ان دونوں کے علاوہ ایک اور کتاب زیر تالیف ہے جس میں الفاظ متروک شدہ کی ایک طولانی فہرست اور ضروری ضروری علم قوافی کے متعلق بحثیں ہیں اس کی ضخامت قریب ۳۰۰ صفحوں کے پہنچ چکی ہے لیکن اب تک ناتمام ہے چوں کہ کثرتِ مشاغل سے فرصت نہیں ملتی اس لئے پوری نہ ہوسکی اگر یہی لیل و نہار رہیں تو آئندہ بھی پوری ہونے کی امید نہیں۔

پہلا دیوان

سفینۂ نوح یہ پہلا دیوان ہے اور تمام و کمال حضرت داغ و جناب ظہیر دہلوی کا دیکھا ہوا ہے اس کے

دو ایڈیشن نکلے اور کل جلدیں ہاتھوں ہاتھ بہت جلد نکل گئیں اِس وقت تلاش سے نہیں ملتا اُس وقت اِس کی قیمت ایک روپیہ تھی مگر اب دس روپیہ پر لوگ خریدکرنے کو آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہ بارہا کا تجربہ ہے کہ لوگ دیوان چھپواتے ہیں لیکن کوئی نہیں پوچھتا آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عطاروں کے ہاں دواؤں کی پڑیا میں اُن کے اوراق صرف ہوتے ہیں یہ مقبولیت دیکھ کر اب اِس دیوان کے تیسرے ایڈیشن کے نکالنے پر بے حد احباب زور دے رہے ہیں کیا عجب جلد تیسرا ایڈیشن بھی نکلے۔

دوسرا دیوان

طوفانِ نوح یہ دوسرا دیوان ہے اس کے متعلق کچھ لکھنا بے کار ہے کیوں کہ جیسے جیسے شاعر کی مشق بڑھتی ہے ویسے ویسے اُس کے کلام میں خوبیاں پیدا ہوتی ہیں جن احباب نے پہلا دیوان دیکھ کر دوسرا دیوان دیکھا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ نقشِ اوّل و نقشِ ثانی میں بہت کچھ فرق ہے ابھی اِس کا پہلا ایڈیشن نکلا ہے اور کافی تعداد میں اِس کی جلدیں تھیں لیکن اب اِس کی بھی کوئی جلد باقی نہیں۔

تیسرا دیوان

تیسرا دیوان اب یہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے آپ خود ملاحظہ فرمائیے جانچئے پرکھئے کہ یہ کیا چیز ہے اصنافِ سخن میں سے کوئی صنف نہیں جس میں انھوں نے طبع آزمائی کرکے چار چاند نہ لگائے ہوں جس وقت پہلا دیوان سفینۂ نوح شایع ہوا تھا چوں کہ اس میں صرف غزلیں تھیں اِس باعث سے بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ نوح صاحب صرف غزل کہہ سکتے ہیں اور اصنافِ سخن سے عاجز ہیں مگر دیوان دوم کو دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل گئیں اور ہر شخص کو ماننا پڑا کہ ہر صنفِ سخن پر یہ قدرت رکھتے ہیں۔

بہارِ سخن

بہت زمانہ ہوتا ہے انھوں نے اور منشی رکن الدین صاحب عاصی ناروی نے ایک ماہوار گلدستہ بہارِ سخن نکالا تھا اِس میں ہر طرح لوگوں کی غزلیں ہوتی تھیں اور طرح پہلے سے شایع کردی جاتی تھی سلطان پور میں چھپتا تھا اور نارہ سے روانہ ہوتا تھا جب اِن کے مشاغل بے حد بڑھ گئے اور وقت کم ملنے لگا تو مجبوراً تین چار برس نکال کر بند کردینا پڑا حالاں کہ خریداروں کی تعداد بہت کچھ پہنچ چکی تھی اور روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

حلیہ

لمبا قد۔ اکہرا بدن۔ گورا رنگ۔ گول چہرہ۔ آنکھیں روشن۔ سر کے بال سیاہ۔ مونچھیں کسی قدر بڑی اور اِدھر اُدھر کچھ نکلی ہوئیں۔ ڈاڑھی نہیں۔

پوشش

علی العموم کرتہ شیروانی۔ اکثر چھنٹا ہوا اور اکثر چوڑی موری کا پائے جامہ۔ گرمی میں دوپلی لکھنؤ کی کاڑھی ہوئی اور جاڑے میں ترکی ٹوپی، پاتابہ۔ کبھی پمپ۔ کبھی شو۔ کبھی سلیپر۔ کبھی دہلی کا وصلی جوتہ۔ گھوڑے کی سواری یا شکار میں ہیٹ۔ شرٹ۔ ٹائی۔ نیکر۔ لمبا پاتابہ۔ کوٹ۔ فل بوٹ۔ لکھنے پڑھنے کے وقت عینک کی ضرورت نہیں تفریح وغیرہ کے اوقات میں عینک۔ کیوں کہ دور کی نگاہ ہمیشہ سے کم زور ہے۔

ذاتی خصائل

گفتگو نہایت متانت کے ساتھ مزاج میں کسی قدر عجلت۔ ذرا دیر آشنا۔ غصہ بہت کم۔ درگذر بہت زیادہ رفتار معمول سے بہت زیادہ تیز۔ صاف گو۔ حلیم و صابر۔ فکر و غور کی بیشتر عادت۔

غذا

بہت سادی۔ پلاؤ۔ فیرنی۔ زردہ۔ پراٹھا وغیرہ سے خاص رغبت نہیں گوشت چپاتی کسی قسم کا کباب سادہ چاول نہایت شوق سے کھاتے ہیں۔ چائے کے ساتھ بسکٹ۔ انڈہ۔ حلوہ۔ کیک وغیرہ کا بھی مضائقہ نہیں۔ جو گھر میں پکا کھالیا اپنی طرف سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتے۔ ہاں آنے والے مہمانوں کے لئے اور

دعوتوں کے موقعوں پر ہر قسم کے تکلفات سے کام لئے جاتے ہیں ۔

معلومات اور تجربہ

یہ صرف شاعر اور زمیں دار ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک ہمہ گیر طبیعت عطا کی ہے دنیا کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جس میں ان کو دخل نہ ہو اپنی معلومات اور وسیع تجربہ کے لحاظ سے، جس معاملے میں یہ کوئی اپنی اچھی بری رائے قائم کر دیں گے وہ اٹل ہوگی قرب وجوار کے بیشتر لوگ ان سے رائے پوچھنے کو آتے ہیں اور اس پر کاربند ہو کر فائدہ اٹھاتے ہیں اکثر اہم اہم مقدموں میں انھوں نے رائے دی اور وہ مفید ثابت ہوئی ۔

حسن پرستی

حسن کسی کا ہو لیکن ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر تھوڑا بہت ہر شخص کے دل پر ہوتا ہے میرے خیال میں وہ حسن ہی نہیں جس میں قدرتی جاذبیت نہ ہو شاعر کے لئے اس سے متاثر ہونا یقینی اور لازمی ہے چنانچہ یہ بھی اس سے اکثر متاثر ہوئے اور بہت ہوئے مگر جوانی دیوانی کے زمانے میں بھی انھوں نے ہمیشہ تحفظ مراتب واعزاز و ریاست کا خیال رکھا جو کچھ کیا وہ اسی اعتدال تک کیا کہ کوئی خراب نتیجہ یا بار جائداد وغیرہ پر نہ پڑے اور نہ کسی حاسد یا بداندیش کو سننے کا موقع ملے ۔

شعر کہنا

یوں تو ہر وقت بلا تامل شعر کہہ سکتے ہیں اور بیشتر موقعوں پر ایسا ہوا بھی ہے مگر معمولاً مغرب اور عشا کے درمیان میں شعر کہتے ہیں پلنگ یا آرام کرسی پر لیٹے رہتے ہیں سامنے حقہ بھرا ہوا رہتا ہے (کیونکہ حقہ بہت پیتے ہیں سفر حضر میں کبھی ساتھ نہیں چھٹتا) قریب ہی ایک چھوٹی میز پر قلم دوات کاپی رکھی ہوتی ہے جب شعر مکمل ہو گیا خود ہی اٹھ کر لکھ لیا کسی دن پوری غزل لکھ ڈالی کسی دن دو چار ہی شعر کہے الغرض مکان پر جب تک رہیں گے بلاناغہ کچھ نہ کچھ ضرور کہیں گے اور شاعروں کی طرح ہر وقت یہ فکر سخن میں نہ منہمک رہتے ہیں اور نہ فکر شعر میں یا مصرع لگانے میں پریشان ہوتے ہیں یہ ضرور ہے کہ شعر بڑی فکر وغور سے کہتے ہیں ۔

خصوصیت لفظی

شعر کہتے وقت بیشتر یہ خیال رہتا ہے کہ مطلب صاف لفظوں میں ادا ہو جائے محاورے برمحل ہوں زبان کا چٹخارہ ضرور رہے سننے والا فوراً سمجھ لے فارسی تراکیب دور کے استعارے لغو تشبیہات قطعی نہ ہوں پوری کوشش کی جاتی ہے کہ ہر شعر سہل ممتنع کی جیتی جاگتی تصویر ہو مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ علاوہ اپنے اس خاص رنگ کے اور دوسرا رنگ مرغوب خاطر ہی نہیں مرغوب خاطر تو ہے لیکن خود اس رنگ سے احتراز کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج ان کے کلام پر خود ان کے استاد حضرت داغ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ بعض بعض مقامات پر یہ ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں مگر میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ ادب مانع ہے ۔

متروکات

یہ ایک طولانی داستان ہے نہ میں اس کو مفصل لکھ سکتا ہوں نہ کوئی دیکھنا گوارا کرے گا اس کے متعلق خود انھوں نے ایک جداگانہ کتاب لکھی ہے جس کا ذکر مسلہ تصنیف وتالیف میں آچکا ہے مگر کچھ بھی نہ لکھنے سے یہ مد خالی رہتی لہٰذا مشتے نمونہ از خروارے عرض کرتا ہوں ۔

اور اساتذہ نے وقتاً فوقتاً اپنے عہد میں چند الفاظ متروک کئے خود حضرت داغ دہلوی نے بھی اپنے تیسرے دیوان مہتاب داغ کی تدوین میں چند الفاظ ذیل ترک کر دئے ہیں اور ان میں اپنے تلامذہ کو یہ سوچ کر کہ ان کا نباہنا مشکل ہے یہ اختیار دیا ہے کہ ترک کریں یا نہ کریں اکثر تلامذہ نے پابندی کی بیشتر شاگرد پابند نہ رہ سکے ۔

الفاظ متروک شدہ	تمثیل الفاظ متروک شدہ	الفاظ جو متروک شدہ کی جگہ قائم ہوئے	تمثیل الفاظ قائم شدہ
پہ اور پر بمعنی لیکن و مگر =	ہیں وہ خوش رو پہ وفادار نہیں وہ ہم سے کہتے ہیں آنے کو پر نہیں آتے	مگر یا لیکن	توبہ کرتے ہیں مگر بادہ پئے جاتے ہیں لیکن اقرارِ محبت وہ بھلا دیتا ہے
یاں، واں =	یاں نہ آئے گا اُسے ہم نہ بلائیں گے کبھی سیکڑوں آزار و غم سہنے کو واں ہم جائیں کیوں	یہاں وہاں باظہار (ہ)	مرے دل میں یہاں رکھا ہی کیا ہے دل کے کہنے سے وہاں جاتا ہوں میں
میں متکلم (ی) دبی ہوئی =	میں کچھ سنتا نہیں تم سے میں کچھ کہتا نہیں تم کو	میں باظہار (ی)	شکوۂ آزار و غم میں نے کیا
اور بروزن ار =	اس قدر بات ہے اور کچھ بھی نہیں	اور باظہار (و)	اور سے اور ہو گیا کوئی
مت بمعنی نہ =	آہ عشقِ یار میں مت کیجئے	نہ	دلِ زار شکوہ نہ کر دل لگی کا
وصلت =	شبِ وصلت وہ برہم ہو گئے ہیں	وصل	وصل کا ذکر کیا کروں تم سے
دکھلانا وغیرہ جن الفاظ میں (ل) زائد ہے =	آنکھیں دکھلاتے ہیں وہ عشق کا قصہ سن کر	دکھانا وغیرہ جن میں (ل) زائد نہیں	زلف پر پیچ وہ دکھاتے ہیں

ممکن ہے کہ ان الفاظ کے علاوہ اور بھی دو چار الفاظ ہوں لیکن متروکات کے متعلق تو نوح صاحب نے قیامت ہی ڈھا دی ہے جتنے الفاظ انھوں نے ترک کئے اور کوئی نہیں کر سکتا اگر کرے تو اُس کی شاعری ہی غائب ہو جائے اِس کی بابت جب جناب احسن صاحب مارہروی حضرت سائل دہلوی جناب بہرگوالیاری وغیرہ سے گفتگو ہوئی تو ان حضرات نے یہ کہہ کر کہ زبان کی وسعت محدود ہو جائے گی اور اردو شاعری کے ذخیرے سے اِس قدر یا اِس قسم کے الفاظ نکل جانے پر نقصان عظیم ہوگا سخت مخالفت کی ۔ فی الحقیقت میرے خیال میں بھی اِن قیود کا عائد کرنا زبان کی وسعت کو تنگ کرنا ہے علاوہ اِس کے اِن پابندیوں کا نباہنا اور ان پابندیوں کے ساتھ اچھا شعر کہہ جانا ہر کسی کا کام بھی نہیں ہمیشہ اِن کا یہ خیال رہتا ہے کہ ایک معنی کے جب دو الفاظ سامنے ہوں تو وہ لفظ اختیار کرنا چاہیئے جس میں حروف کم ہوں اور جس میں حروف زائد ہوں اُنھیں ترک کر دینا چاہیئے یہ معیارِ فصاحت اپنی ذات خاص کے لئے اِنھوں نے قرار دیا ہے تمثیل کے لحاظ سے کچھ الفاظ درج ذیل ہیں اِن سے اور الفاظ کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے ۔

الفاظ متروک شدہ	تمثیل الفاظ متروک شدہ	الفاظ جو استعمال کئے جائیں	تمثیل الفاظ قائم شدہ
ہجراں	شامِ ہجراں صبحِ محشر ہو گئی	ہجر	قیامت شبِ ہجر آئے گی سر پر
زندگانی	اب یہ صورت ہے زندگانی کی	زندگی	زندگی عیش و مسرت سے بسر ہوتی ہے
افسانہ	مجھ سے نہ کبھی وہ مرا افسانہ سُنیں گے	فسانہ	فسانہ سُن رہے ہیں آرزو کا
آشیانہ	فصلِ گل میں غارت اپنا آشیانہ ہو گیا	آشیاں	آشیاں کی یاد آتی ہے مجھے
آستانہ	نہ چھوڑوں گا میں آستانہ تمھارا	آستاں	اُٹھنے کے اب نہیں ہیں کبھی آستاں سے ہم
اسکندر	حال اسکندر کا ہو جائے گا تم پر آئینہ	سکندر	سکندر نے بنا کر آئینہ خود میں بنایا ہے
افلاطوں	تم سے دانائی میں بڑھ کر آج افلاطوں نہیں	فلاطوں	فلاطوں کو نسبت نہیں آپ سے
وصال بمعنی ملاقات	شبِ وصال بگڑ کر وہ ہم سے کہتے ہیں	وصل	اب آئی شبِ وصل برسوں کے بعد
افسوں	افسوں تری آنکھوں میں نرالا نظر آیا	فسوں	سامنے تیری نگاہوں کے فسوں کچھ بھی نہیں

الفاظ متروک شدہ	تمثیل الفاظ متروک شدہ	الفاظ جو استعمال کئے جائیں	تمثیل الفاظ قائم شدہ
حالت	بدل جائے گی اب حالت ہماری	حال	حال میرا پوچھتے ہیں آپ کیا
پیغام	مرے نام اب کہاں نامہ کہاں پیغام آتا ہے	پیام	پیام بر سے عبث ہو گیا خفا کوئی
چاہت	خدا تیری چاہت سے محفوظ رکھے	چاہ	تری چاہ میں غم اٹھائے ہزاروں
میہماں	یہی آتا ہے جی میں اُن کو دل میں میہماں کروں	مہماں	میرے گھر میں کوئی مہماں نہیں
وگرنہ	وگرنہ آپ سے کرتا نہ میں گلہ کوئی	ورنہ	ورنہ مر جانا مجھے مشکل نہ تھا
داماں	کبھی دستِ جنوں اُلجھیں گے داماں و گریباں سے	دامن	اب کوئی تار سلامت مرے دامن میں نہیں
پہ	بے داد پہ بیداد وہ کرتے ہی رہیں گے	پر	آپ آزار پر آزار دئے جائیں مجھے
	وہ مری جان پہ سو ظلم و ستم ڈھائے گا		لاکھوں طرح کے ظلم مری جان پر ہوئے
کے مثلاً سنا کے سنبھال کے وغیرہ	سنا کے حالِ دلِ زار میں پشیماں ہوں	کر	حالِ دل اُن کو سنا کر ہم بھی دل میں خوش ہوئے
لیکن کر کے مستعمل مثلاً	خدا کا شکر کر کے خونِ دل میں روز پیتا ہوں		
پائے مال	خرام ناز سے دل کو پائے مال نہ کر	پامال	پامال کر گئے وہ دلِ بے قرار کو
رنگت	نہ پھولوں میں رنگت نہ پھولوں میں بو ہے	رنگ	ہمارے خون کا رنگ آپ کی حنا میں ہے
نصیبہ	اب نگاہیں لڑ گئیں پھر نصیبہ لڑ گیا	نصیب	آرام ہی فقط نہیں میرے نصیب میں
شیدائی	دیکھتا ہوں جسے وہ آپ کا شیدائی ہے	شیدا	کون کہتا ہے مجھے میں آپ کا شیدا نہیں
حلقوم	کوئی پھیرے کیوں چھری حلقوم پر	حلق	حلق پر تلوار ہم خود پھیر لیں
آشکارا	رازِ دل کا آشکارا ہو گیا	آشکار	آشکار الفت ہوئی تصویر سے
دختر	دخترِ رز نے ستم ڈھائے بہت	دخت	قہر کرتی ہے ادائے دختِ رز
دہاں	دہانِ یار میں گویا زباں نہیں ہوتی	دہن	سخن سخن میں نہیں وہ دہن دہن میں نہیں
پیراہن	پھوٹ نکلی ہے تری بو میرے پیراہن سے آج	پیرہن	وحشت میں بے نیاز ہوئے پیرہن سے ہم
شرار یا شرارہ	جو رخ پہ آہ کا شرارہ ہے	شرر	شرر نکلنے لگے بات بات میں منہ سے
	پھونک دے گا تری الفت کا شرارا ہم کو		
نیشتر	نیشتر ہوئے مژہ کے چبھ گئے	نشتر	ہر رگِ دل میں کئی نشتر ہیں
ولیکن	اُنھیں دل چاہئے لینا ولیکن دل نہیں لیتے	لیکن	ستم سہتا ہوں لیکن میں گلا ان کا نہیں کرتا

وغیرہ وغیرہ

لیکن یہاں، وہاں اور اگر ان تینوں الفاظ کے متعلق اوپر کا کلیہ قائم نہیں رکھتے کیوں کہ یاں واں اور گر کے مقابلے میں وہ تینوں الفاظ فصیح اور فصیح تر ہیں حالاں کہ اُن الفاظ میں حروف زاید موجود ہیں گر کے متعلق یہ خیال ہے کہ یہ لفظ بعض موقع پر اپنے پہلے لفظ سے مل کر ایک مستقل با معنی لفظ بن جاتا ہے مثلاً یہ مصرع (ستم گر نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا) اس کے دو معنی ہو گئے ایک تو یہ کہ گر ستم نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا دوسرے یہ کہ ستم بنانے والا نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا لہذا گر کی جگہ اگر ہی لکھنا اچھا ہے یہاں وہاں تو یاں واں

سے اچھے ہی ہیں یہ سب کچھ بجا سہی اور محل استعمال کی تو اور بات ہے مگر الفاظ متروک شدہ مندرجہ بالا جب قوافی کی صورت میں آجائیں گے تو شاعر ان قوافی کے مضامین سے محروم رہ جائے گا اور کوئی شعر ان قوافی میں پابندی کے خیال سے نہ کہہ سکے گا نوح صاحب تو نباہ کرتے ہیں اور کریں گے یعنی ان قوافی میں شعر نہ کہیں گے اور ان الفاظ کو قوافی کی صورت میں بھی نہ لائیں گے لیکن اور حضرات کیوں اپنی فکر کو محدود کرنے لگے وہ لکھیں گے اور یقیناً لکھیں گے بلکہ ان قیود کو وہ اپنے لئے ایک قسم کا ظلم تصور کریں گے اسی خیال سے یہ کسی اپنے شاگرد کو مجبور نہیں کرتے جس کا جی چاہے پابندی کرے جس کا جی چاہے نہ کرے۔

علاوہ ان متروکات کے اگرچہ طوفان نوح دیوان دوم کی خصوصیات میں ذیل کی باتیں درج ہو چکی ہیں تاہم ان کا مکرر لکھنا اس خیال سے ضروری ہے کہ ممکن ہے دوسرا دیوان کسی کے پاس نہ ہو اور وہ ان معلومات سے محروم رہے۔

(۱) دل، قاتل، محمل، بسمل، مشکل، ساحل وغیرہ کے قافیوں کے ساتھ سائل، مائل، حمائل، شمائل وغیرہ کا قافیہ یعنی جن الفاظ میں (لام) کے پہلے ہمزہ ہے لانا قابل ترک سمجھتے ہیں حالاں کہ تمام اساتذۂ سابق و حال نے برابر اپنے کلام میں لکھا ہے فی الحقیقت اس سے قوافی میں حسن نہیں رہ جاتا اگر محض سائل و حمائل ہی وغیرہ کے قوافی میں غزل کہی جائے تو کوئی برائی نہیں بلکہ حسن ہے کیوں کہ قوافی کی صورت ہی روی بدل جانے سے بدل جائے گی۔

(۲) تقابل ردیفین کا تو سب محتاط شعرا خیال رکھتے ہیں لیکن انھوں نے سفینۂ نوح دیوان اوّل و طوفان نوح دیوان دوم کے بعد سے اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ غزل کے کسی شعر میں بھی علاوہ بے ردیف مطلع کے پہلے مصرعہ کا آخری لفظ بھی ردیف کا ہم قافیہ نہ ہونا چاہیئے مثلاً کسی زمین کے یہ قوافی ہیں اور یہ ردیف ہے۔ تڑپاتے ہوا اچھا بہت اچھا۔ مرجاتے ہوا اچھا بہت اچھا۔ اس میں یہ شعر

میں حشر میں اللہ سے فریاد کروں گا   ہر دم مجھے تڑپاتے ہوا اچھا بہت اچھا

گا اور اچھا ہم قافیہ ہیں

(۳) اُردو، فارسی اور عربی کے ترکیبی قوافی میں حرف روی نکل جانے کے بعد جو شروع میں ٹکڑے بچیں وہ مطلع کے دونوں مصرعوں میں نہ بامعنی ہوں نہ ایک ترکیب کے ہوں مثلاً

گالیاں مجھ کو سناتے جایئے   اپنی محفل میں جلاتے جایئے

حرف روی کے پہلے ٹکڑے دونوں قافیوں میں سن اور جل بچے یہ دونوں امر ہیں اور بامعنی ہیں۔

وہ برتاؤ کرنے لگے مخلصانہ   بڑھایا بہت مجھ سے اب دوستانہ

پہلے مصرعہ میں مخلص اور دوسرے میں دوست رہا دونوں بامعنی الفاظ ہیں۔

(۴) حرف روی وغیرہ سے پہلے کا حرف مطلع کے دونوں قوافی میں ایک نہ ہونا چاہیئے مثلاً

ہمارے دل میں کیوں ارماں بہت ہیں   جگہ ہے گھر میں کم مہماں بہت ہیں

الف سے پہلے (میم) دونوں طرف موجود ہے آواز کے لحاظ سے اچھا نہیں معلوم ہوتا (۵) صرف غزل میں سب سے پہلے مطلع کے دونوں مصرعوں میں اگر اردو زبان کے قافیے ہیں تو غزل کے سب اشعار میں بھی اُردو ہی کے قوافی ہوں مثلاً

بگڑ کر دفعتاً کوئی ستم مجھ پر نہ ڈھا دینا   ذرا پہلے سے کہہ دینا بتا دینا جتا دینا

اس مطلع میں دونوں قافیے اردو کے ہیں اب اس کے بعد غزل میں جتنے شعر ہوں گے سب میں اردو ہی کے قوافی ہوں گے اور اگر سب سے پہلے مطلع کے دونوں مصرعوں میں فارسی یا عربی زبان کے قوافی ہیں تو غزل کے بقیہ اشعار میں فارسی یا عربی کے قافیوں کا ہونا لازمی ہے۔ مثلاً

آہ و زاری سے وہ کیا اے دلِ نالاں سمجھا　　　یہی سمجھا کہ مجھے بے سرو ساماں سمجھا

اس مطلع کے دونوں قافیوں میں سے ایک بھی اردو زبان کا قافیہ نہیں لہٰذا اب اس مطلع کے بعد کوئی شعر ایسا نہ ہونا چاہیئے جس میں اردو زبان کا قافیہ ہو اور اگر پہلے مطلع میں ایک مصرع کا قافیہ اردو اور دوسرا فارسی خواہ عربی ہے تو غزل کے بقیہ اشعار میں دونوں طرح کے قافیے لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً

عشق نے قدر نہ جانی میری　　　ہائے میں ہائے جوانی میری

اس مطلع کے دونوں قافیوں میں سے ایک قافیہ اردو اور دوسرا اردو نہیں لہٰذا اردو فارسی عربی ہر زبان کے قافیے آئیں گے۔

(۶) اسی طرح اگر پہلے مطلع کے دونوں مصرعوں میں الف کے قافیے صہبا، تماشا، افزا وغیرہ ہوں تو غزل کے باقی اشعار میں سب قافیے الف ہی کے ہوں مثلاً

کیا کہوں جلوہ گہِ ناز میں کیا کیا دیکھا　　　جو دکھایا مجھے اس نے وہ تماشا دیکھا

چوں کہ اس مطلع میں دونوں قافیے الف کے ہیں لہٰذا غزل کے سب اشعار میں وہی قوافی ہوں گے جن میں الف ہوگا اور اگر پہلے مطلع کے دونوں مصرعوں میں (ہ) ہائے ہوز کے قوافی ہوں جلوہ۔ نظارہ وغیرہ تو غزل کے باقی اشعار میں بھی سب قافیے وہی ہوں جن میں (ہ) ہائے ہوز ہو جیسے یہ مطلع

بیچ میں حائل ایک پردہ ہے　　　اس طرف میں اُدھر وہ جلوہ ہے

اس مطلع میں دونوں طرف (ہ) ہائے ہوز کے قافیے ہیں لہٰذا الف کا قافیہ نہ ہوگا اور اگر دونوں قوافی الف اور ہائے ہوز کے غزل میں آئیں گے تو پہلا مطلع ایسا ہونا چاہیئے جس میں ایک قافیہ الف کا اور دوسرا ہائے ہوز کا ہو مثلاً

دیکھ لیتا ہے تجھے دیکھنے والا تیرا　　　نہیں چھپتا نہیں چھپتا کبھی جلوا تیرا

اس مطلع میں دونوں قسم کے قافیے ہیں لہٰذا غزل میں دونوں طرح کے قوافی استعمال ہو سکتے ہیں لیکن فارسی ترکیب میں بصورت اضافت یا عطف ہائے ہوز الف سے مبدل نہ ہوگی اگر ہوگی تو قافیہ غلط ہو جائے گا جائز صرف بغیر ترکیب فارسی کی صورت میں ہے۔ مثلاً

پہلے جو تھا وہ پاس تمہارا نہیں رہا　　　یعنی نظر کو شوق نظارا نہیں رہا
کیا بتائیں جلوہ گاہِ ناز میں کیا ہو گیا　　　دل ہمارا بھی فدائے ناز و جلوا ہو گیا

(۷) پیمانہ، شانہ کی جمع پیمانوں، شانوں اور ارمان، ناداں کی جمع ارمانوں، نادانوں ہوئی اگر مطلع میں دونوں ایسے قافیے ہیں کہ جن کے واحد میں (ہ) مثلاً ستے خانہ، پیمانہ، دیوانہ وغیرہ ہو تو غزل میں سب ایسے قافیے ہوں اور اگر مطلع میں دونوں طرف ایسے قوافی ہیں کہ جن کے واحد میں (ن) مثلاً پریشاں۔ مہماں وغیرہ ہو تو غزل میں سب قوافی ایسے ہی ہوں اور اگر مطلع میں دونوں قسم کے قافیے ہوں

تو دونوں طرح کے قوافی استعمال کئے جائیں۔

(۸) اگر دو لفظ مل کر ایک بامعنی لفظ ہو جائے تو وہ بھی اچھی صورت نہیں جیسے یہ مصرع

جان اب باقی نہیں ہے جان میں

اس مصرع میں ہے اور جان مل کر لفظ 'ہیجان' بن جاتا ہے جو بامعنی لفظ ہے اسی طرح آواز پر بھی برخلاف کتابت کے خیال رکھنا چاہیے۔ مثلاً

آئے وہ مرے پاس تو اس حال سے آئے

اس مصرع میں اِس اور حال مل کر اسحال ہو گیا حالانکہ کتابت میں فرق ہے لیکن اسہال کا دھوکا سننے میں ہو جاتا ہے۔

(۹) ایک ہی آواز کے دو لفظ مل کر اگر ثقل پیدا کریں تو قطعی نہیں مگر جہاں تک ممکن ہو نہ استعمال کئے جائیں۔ مثلاً

ہمیں بھی دیکھنا یہ ہے کہ کتنے بے وفا تم ہو

یہاں کہ اور کتنے کے ملنے سے ثقل پیدا ہو جاتا ہے۔

اب کے کلام میں تو نہیں پہلے کے کلام میں تمام یہ باتیں موجود ہیں جس وقت جو بات خیال میں آئی اُسی وقت سے اُس پر عمل درآمد شروع ہوا۔ پچھلے اشعار مطبوعہ اور غیر مطبوعہ میں جو لفظ جس طرح تھے اُسی طرح رہ گئے اِس دیوان کی ہر غزل میں (ق) اور (ج) دو حرف لکھے ہوئے ہیں (ق) سے قدیم اور (ج) سے جدید مراد ہے جن غزلوں پر (ق) ہو اُن میں یہ قیود نہیں اور اکثر الفاظ متروک شدہ بھی اُن میں ملیں گے اور جن غزلوں پر (ج) ہے اُن میں یہ سب قیدیں ہیں اور الفاظ متروک شدہ قطعی نہ ہوں گے مئی ۱۹۲۱ء کے بعد سے جس قدر بھی اشعار آج تک کہے ہیں سب میں مندرجہ بالا کی پابندی کا خیال نہایت سختی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

حافظہ

یہ شاید کہیں لکھا جا چکا ہے کہ ابتدائے شاعری میں بالقصد انھوں نے اپنے استاد کے چاروں دیوان زبانی شروع سے آخر تک یاد کئے تھے اگرچہ اب بہت سے اشعار بھول گئے ہیں مگر پھر بھی کوئی ایسی غزل نہیں جس کے دو چار اشعار یاد نہ ہوں پہلے تو یہ قاعدہ تھا کہ رات کو جس قدر شعر کہتے تھے وہ ذہن میں محفوظ رہتے تھے صبح کو کتاب پر لکھتے تھے لیکن دو چار برس سے یہ معمول نہیں رہا جس وقت شعر کہیں گے اُسی وقت لکھ لیں گے مشاعروں میں جو شعر پسند آتا ہے دو چار روز یقینی یاد رہتا ہے پھر نہیں یاد رہتا تاہم ایک بڑا ذخیرہ اچھے اچھے شعروں کا ان کے خیال میں ہے بعض وقت خود پڑھتے ہیں اور خود ہی لطف اٹھاتے ہیں۔

مذہب کا احترام اور بیعت

مذہب کا احترام ہمیشہ رہا فقرا مشایخ اور بزرگان دین کے مزاروں سے خاص عقیدت ہے جہاں حاضری کا موقع پیش آتا ہے نہایت ادب اور عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں سات آٹھ سال ہوئے کہ حضرت سید شاہ مولانا وارث حسن صاحب رح کوڑہ جہان آبادی کے دست مبارک پر توبہ کر کے چشتیہ سلسلے میں بیعت بھی کر لی ہے۔

حاسدین

یہ سب جانتے ہیں کہ حاسد ہونا بُرا اور محسود ہونا اچھا ہے مگر پھر بھی اِس سے کوئی جگہ خالی نہیں دیکھی جاتی اِن کے برتاؤ اور ان کے حسنِ اخلاق کے سبب سے کوئی اِن کا حاسد نہیں کیوں کہ کبھی کوئی جھگڑا یا ہنگامہ نہیں ہوا۔ الغرض باہر کے لوگ حسد کرنے کی جگہ اِن کا احترام کرتے ہیں ہاں خاص نارسے میں اِن کی ذاتی وجاہت اور اعزاز ریاست کا حسد بہت سے لوگوں کے دلوں میں ہے اور شعرائے الہ آباد میں سے معدودے چند حضرات ایسے ہیں جنھیں حاسد جیسے ناپاک لفظوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اِس جماعت کو یہ اچھی طرح جانتے ہیں اور اُن کی بدبیں نگاہوں سے بچتے رہتے ہیں اُن لوگوں سے جب سامنا ہو جاتا ہے تو وہ منھ پر ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں کہ حسد کا پتہ بھی نہیں چلتا مگر دل میں چھُریاں بھری ہیں اِنھیں وجوہ سے الہ آباد کے مشاعروں سے یہ الگ ہو گئے ہیں لیکن جب کوئی معرکہ ہوتا ہے تو مخالف پارٹی کی بھی نگاہیں بیشتر اِنھیں کو ڈھونڈھتی ہیں اِس میں کوئی شک نہیں کہ حسد بہت بُرا عیب ہے اور اللہ تعالےٰ اِس سے سب کو محفوظ رکھے

احباب

دنیا میں ہر شخص کے تھوڑے بہت خاص خاص احباب ایسے ہوتے ہیں جن سے خصوصیت کے ساتھ برتاؤ رکھنے پر ہر انسان مجبور ہوتا ہے اِن کے دوستوں کی تعداد محدود نہیں جس سے ایک بار بھی ملاقات ہوئی وہ ہمیشہ کے لئے گرویدہ ہو گیا۔ کیا رعیت کیا حکام سب اِن سے خوش پائے گئے شعرا کے طبقے میں جتنے اِن کے معاصرین ہیں وہ سب اِن سے برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں آپس کی خط وکتابت دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اِن کے دل میں اُن کی محبت کتنی اور اُن کے دل میں کس قدر اِن کی محبت ہے۔ اِن خطوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔

شاگرد کرنے کا طریقہ

یہاں اور استادوں کی طرح کوئی خاص طریقہ شاگرد کرنے کا نہیں پہلے تو جہاں تک ممکن ہوتا ہے مہذب پیرایہ سے اور استادوں کا حوالہ دے کر ٹال دیا جاتا ہے اور اگر کسی نے زیادہ اصرار سے کام لیا تو اصلاح دینے میں عذر نہیں ہوتا لیکن اب کچھ دنوں سے نئے شاگرد قطعی نہیں کئے جاتے کیوں کہ اکثر اوقات قلت وقت کے سبب سے اُنھیں شاگردوں کی اصلاح نہیں ہوسکتی جن سے قدیمی تعلقات ہیں پھر نئے لوگوں کو کون سنبھالے یہ رات دن کا تجربہ ہے کہ اساتذہ قدیم وحال ہر نئے شاگرد سے کچھ نہ کچھ بطور شیرینی حقِ استادی طلب کرتے ہیں مگر اِن کی ذات اِن جھگڑوں سے بری ہے ہاں اپنی طرف سے بخوشی بغیر کسی تحریک کے اگر کوئی شخص بطور تحفہ کوئی چیز بھیج دے تو اُس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا یہ ضرور ہے کہ ہر نئے شاگرد کو اکثر یہ ہدایت کر دی جاتی ہے کہ اپنی حیثیت کے موافق وہ حضرت داغ اور جناب ذوق مرحوم کی نیاز اپنی طور سے اپنی جگہ دلا دے۔

اصلاح دینے کا طریقہ

جس کی غزل ہے اگر وہ اتفاقِ وقت سے خود موجود ہے تو اُس سے پڑھوا کر شعر سُنتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اُسی وقت اصلاح بھی دیتے جاتے ہیں یہ بولتے ہیں وہ لکھتا ہے اور اگر جس کی غزل ہے وہ موجود نہیں تو اُس کی غزل خود دیکھتے ہیں اور تغیر وتبدل الفاظ کا فرماتے ہیں بیشتر مشاعروں کے وقت یہ دیکھا گیا ہے کہ شعروں پر بے تامل اِس طرح اصلاح ہوتی ہے جس طرح کوئی نثر لکھتا ہو ایک بار الہ آباد میں یہ اسی طرح اصلاح دے رہے تھے کہ حکیم عبدالعزیز صاحب عرف حاجی جان صاحب بھی آگئے جب یہ اصلاح دے چکے تو انھوں نے کاغذ اٹھا لیا اور دیکھ کر حیران ہو گئے بے ساختہ اُن کی زبان سے

نکلا کہ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ کوئی ضروری خط لکھ رہے ہیں الغرض غور و فکر کی ذرا بھی انھیں ضرورت نہیں ہوتی شعر سنا اور فوراً اگر ضرورت ہوئی تو اصلاح دے دی ورنہ فرمادیا کہ آگے چلئیے یا پہلے شعر کے بعد دوسرے شعر کو دیکھنے لگے ایک غزل کی اصلاح کے لئے دس بارہ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے۔

شاگردوں کی تعداد

حضرت داغ دہلوی کے اُن شاگردوں کی تعداد جو مندرج رجسٹر تھے آخر وقت تک پندرہ سولہ سو کے لگ بھگ تھی یہاں اگرچہ کوئی رجسٹر باضابطہ نہ پہلے تھا نہ اب ہے مگر کوئی مردم خیز اور مشہور مقام ایسا نہ ہوگا جہاں کوئی نہ کوئی ان کا شاگرد موجود نہ ہو۔

نمونۂ اصلاح

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں بہت دنوں سے مسلسل حضرت نوح کی اصلاحوں کے نمونے جناب عابد مسیح صاحب عابد بی۔اے مرادآبادی ٹیچر اسکول سروہنہ ضلع میرٹھ ماہ وار لکھ رہے تھے اور انھیں معلومات بھی بڑی حد تک تھی اِس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اصلاحی اشعار کی تشریح و توضیح وہی لکھیں چنانچہ اس میری درخواست کو انھوں نے نہایت خوشی سے منظور فرماکر مجھے اپنا ممنون کرم فرمایا لہٰذا ذیل میں نمونۂ اصلاح کے متعلق جو کچھ آپ دیکھیں گے وہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔

"حضرت احسن مارہروی مدظلہٗ اپنی تالیف جلوہ داغ میں فرماتے ہیں کہ خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح چند قسم کی دی جاتی ہے منجملہ اُن کے ایک تو یہ ہے کہ قائل کے اصل کلام کو کاٹ کر اُس کی جگہ دوسرا شعر خواہ اُسی مضمون کا یا دوسرے مطلب کا اپنے الفاظ میں موزوں کردیا جائے اور ایک یہ کہ قائل کے تمام الفاظ و مطالب اپنی جگہ قائم رہیں اور صرف نقاط و حروف و الفاظ کے تغیر و تبدل یا کمی بیشی ہو جانے سے پست مضمون اعلیٰ اور مہمل شعر معنی دار ہو جائے ظاہر ہے کہ بہ نسبت پہلی ترکیب اصلاح کے یہ طریقہ اصلاح کسی قدر مشکل اور دشوار ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس کو یہ نہیں آتا وہ حقیقی اصلاح نہیں دے سکتا حضرتِ داغ اپنے تلامذہ کے کلام میں اکثر ایسی ہی حک و اصلاح فرماتے تھے جس میں صرف حروفی یا ایک آدھ لفظ کا تغیر و تبدل ہوتا تھا اور اگر کوئی مصرع بھی بنایا جاتا تھا تو انھیں الفاظ و مضمون میں جو اصل قائل کا ہوتا تھا لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی غلط محاورہ یا نامناسب لفظ ہو تو وہ بھی اپنی اصلی صورت پر چھوڑ دیا جاتا ہو" چوں کہ جناب نوح بھی ایک زمانے تک حضرتِ داغ کی خدمت میں رہ کر اچھی طرح ان کے اصلاح دینے کا طریقہ دیکھ چکے ہیں اِس لئے اصلاح دیتے وقت اپنے استاد کی طرح انھیں بھی صرف نقاط و حروف و الفاظ کے تغیر و تبدل مقدم موخر یا کمی بیشی کا خاص خیال رہتا ہے اِس موقع پر جی تو یہی چاہتا تھا کہ تمام شاگردوں سے اُن کا اصلاحی کلام منگواکر ایک مبسوط کتاب جداگانہ مرتب کروں لیکن اس کے لئے بڑے وقت اور کافی محنت کی ضرورت ہے کیوں کہ تمام اطراف ملک میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے ہیں اُن سے خط و کتابت کرکے اصلاحوں کا حاصل کرنا آسان کام نہیں اگر کبھی موقع ملا تو پھر دیکھا جائے گا فی الحال اصلاح کے چند نمونے جو بغیر کسی دقت کے فوراً ہاتھ آ گئے ہیں انھیں پر اکتفا کرتا ہوں اگرچہ یہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں مگر پھر بھی میرے بیان کی تصدیق اِن سے بخوبی ہو جائے گی۔

مرتضیٰ حسین صاحب دعا باشندہ ڈبائی ضلع بلند شہر

وہ مرا حال سن کے یہ بولے　　　کوئی قصہ ہے یا کہانی ہے

اصلاح　وہ مرا حال سن کے پوچھتے ہیں　　　واقعہ ہے کہ یہ کہانی ہے

اصل شعر کے مصرع ثانی میں (حال) کی طرف کوئی اشارہ نہ تھا (قصہ) اور (کہانی) دونوں ایک ہی اصلاح میں بجائے (قصہ) (واقعہ) رکھ دینا مفید بلاغت ہے اب مصرع ثانی میں شوخی پیدا ہو گئی اور مصرع اولے و مصرع ثانی دونوں میں محاکات کا لطف آ گیا۔

خوب تر کیوں نہ ہو وہ یوسف سے　　　یہ مصور کا نقش ثانی ہے

اصلاح　خوب تر کیوں نہ ہو وہ یوسف سے　　　کہ مصور کا نقش ثانی ہے

اصل شعر میں یہ خرابی تھی کہ ایک ہی ذات کے لئے (یہ) اور (وہ) دونوں لفظ متضاد معنی کے استعمال کئے گئے تھے (یہ) کو (کہ) بنا کر استدلال میں وضاحت پیدا کر دی گئی۔

کون سی ہے حرام اے واعظ　　　یہ نئی مے ہے یا پرانی ہے

اصلاح　کس کو سمجھوں حرام اے واعظ　　　یہ نئی مے ہے یہ پرانی ہے

(ہے حرام) تنافر کی حد تک نہیں پہنچا پھر بھی تلفظ میں برا معلوم ہوتا ہے اس شعر میں جو ضعف تالیف تھا وہ اصلاح میں لفظ (یہ) کی تکرار سے دور ہو گیا۔

قسمیں نہ آپ کھائیے مجھ کو یقین آ گیا　　　آپ کہاں عدو کہاں واقعی اتہام ہے

اصلاح　قسمیں نہ مجھ سے کھائیے مجھ کو یقین آ گیا　　　آپ کہاں عدو کہاں واقعی اتہام ہے

لفظ آپ کی تکرار دونوں مصرعوں میں تھی اگر ایک ہی مصرع میں ہوتی تو بری نہ تھی اصلاح میں لفظ (مجھ) کی تکرار ہے جو ایک ہی مصرع میں ہے واضح ہو کہ تکرار الفاظ کا معاملہ بہت نازک ہے کہیں تکرار مذکور سے شعر میں عیب اور کہیں حسن پیدا ہو جاتا ہے اصل شعر میں تکرار سے کوئی معنوی فائدہ نہ تھا اصلاح سے یہ امر واضح ہو گیا کہ عاشق کی ذات باعتبار مضمون شعر زیادہ اہم ہے کیوں کہ معشوق کے قسمیں کھانے کا مدعا یہی ہے کہ عاشق کو یقین آ جائے لہذا لفظ (مجھ) کی تکرار سے اصلی مرکز توجہ معلوم ہو جانے پر بلحاظ بلاغت شعر بلند ہو گیا۔

قاضی ریاض الدین احمد صاحب ریاض جیور ضلع بلند شہر

پاؤں جو مہرباں ترے تیر نظر کو میں　　　کر دوں نثار جان تصدق جگر کو میں

اصلاح　پاؤں جو مہرباں ترے تیر نظر کو میں　　　کر دوں نثار دل کو تصدق جگر کو میں

نثار ہونے کے لئے تو (جان) اور (جگر) دونوں برابر تھے لیکن یہ نازک فرق تھا کہ (جگر) میں نشانہ ہونے کی صلاحیت تھی (جان) میں یہ صلاحیت نہ تھی علاوہ اس کے ترکیب میں علامت مفعول یعنی (کو) کی تکرار سے مصرع ثانی اور چسپت ہو گیا۔

نہ کیا تم نے مرے قتل کا ارماں پورا　　　قول اگر دے تو کرے بھی اسے انساں پورا

اصلاح　کب ہوا تم سے مرے قتل کا ارماں پورا　　　قول اگر دے تو کرے بھی اسے انساں پورا

اصل مطلع بھی صحیح تھا لیکن افعال میں تنوع داخل کر کے حسن بڑھا دیا اصل مصرع اولے میں فعل معروف

تھا اصلاح میں فعل مجہول ہوگیا۔

سر بکف ہیں ہوں ادھر وہ ہیں ادھر تیغ بکف ۔۔۔ اب ہے موجود مرے قتل کا ساماں پورا

اصلاح ۔۔۔ سر بکف میں بھی ادھر تیغ بکف وہ بھی ادھر ۔۔۔ اب ہے موجود مرے قتل کا ساماں پورا

اگر مصرع اولیٰ یوں ہوتا (سر بکف میں ہوں ادھر تیغ بکف وہ ہیں اُدھر) تو اس صورت میں مصرع مذکور کے دونوں ٹکڑے حسن تقابل کے حامل ہو جاتے پھر بھی چستی کے اعتبار سے ترقی کی گنجائش باقی رہتی اس لئے (ہوں) اور (ہیں) کو کم کر دیا کیوں کہ مصرع ثانی میں (ہے) موجود تھا دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ لفظ (بھی) شامل ہونے سے تکرار کے ساتھ تقابل بھی قائم رہا اور مصرع ثانی کے لفظ (پورا) کی معنویت بھی واضح ہو گئی

وقت آخر کشمکش میں عاشق بیمار تھا ۔۔۔ موت تھی پیش نظر دل میں خیال یار تھا

اصلاح ۔۔۔ وقت آخر کشمکش میں عاشق بیمار تھا ۔۔۔ موت تھی پیش نظر دل کو خیال یار تھا

دونوں طرف لفظ (میں) آگیا تھا ایک طرف کم کر دیا گیا۔

برق چمکی کس گھڑی سرمہ ہوا کب کوہ طور ۔۔۔ اُس کو اس کی کیا خبر جو محو دید یار تھا

اصلاح ۔۔۔ برق چمکی کس گھڑی سرمہ ہوا کب جل کے طور ۔۔۔ اُس کو اس کی کیا خبر جو محو دید یار تھا

(کوہ) کی جگہ (جل کے) بنایا گیا (کوہ) کی چنداں ضرورت نہ تھی (جل کے) سے کس قدر شعر بلند ہو گیا اور معنی میں وسعت پیدا ہو گئی۔

لطف اُس نے کیا اُٹھایا دنیا میں زندگی کا ۔۔۔ جس نے مزا نہ چکھا کچھ عشق و عاشقی کا

اصلاح ۔۔۔ لطف اُس نے کیا اُٹھایا دنیا میں زندگی کا ۔۔۔ جس نے مزا نہ چکھا دل دے کے عاشقی کا

دل دے کے اس ٹکڑے کے بڑھ جانے سے معاملات عاشقی پر اشارہ ہو گیا اور زندگی عشاق کی کچھ تفصیل پیش نظر آ گئی۔

رہ گئے حیران کس کو دیکھ کر سب اہل حشر ۔۔۔ آگیا یہ کون محشر میں الٰہی بے نقاب

اصلاح ۔۔۔ رہ گئے حیران کس کو دیکھ کر سب داد خواہ ۔۔۔ آگیا یہ کون محشر میں الٰہی بے نقاب

دونوں مصرعوں میں (اہل حشر) اور (محشر) کے الفاظ اچھے نہ تھے (اہل حشر) کی جگہ (داد خواہ) رکھ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم روز حشر خدا سے فریاد کرنے کو تھے لیکن کسی کے آ جانے سے وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ حیران ہو کر رہ گئے۔

میرا دل چھانٹا ہے ظالم نے جفاؤں کے لئے ۔۔۔ واہ رے حسن نظر اللہ رے حسن انتخاب

اصلاح ۔۔۔ اُس نے چھانٹا دل مرا ظلم و ستم کے واسطے ۔۔۔ واہ رے حسن نظر اللہ رے حسن انتخاب

اصل شعر کے پہلے مصرع کی ترکیب الجھی ہوئی تھی جہاں تک ممکن ہو فعل سے پہلے فاعل آنا چاہیئے (ظالم) کی جگہ (اس) بنا دیا وہ عیب بھی نکل گیا اور جس نے ظلم و ستم کا ارادہ کیا وہ اپنے اس عمل سے خود بخود ظالم ثابت ہو گیا لہٰذا لفظ (ظالم) بے کار تھا۔

ڈھاتا ہے رات دن یہ ستم میری جان پر — یارب فلک ہی ٹوٹ پڑے آسمان پر

اصلاح — ڈھاتا ہے رات دن یہ ستم میری جان پر — ٹوٹا نہ آسمان کبھی آسمان پر

مصرع ثانی تھوڑی سی تبدیلی کے بعد وسعتِ مضمون کا باعث ہوگیا اور آسمان کی تکرار سے چار چاند لگ گئے

الفت اسے پھر سوجھی اک دشمنِ ایماں کی — یہ لیجئے پھر آئی شامت دلِ ناداں کی

اصلاح — الفت ہوئی پھر اس کو اک دشمنِ ایماں کی — پھر آئی نئے سر سے شامت دلِ ناداں کی

اصل شعر کا مطلب یہ تھا کہ دل نے پھر عشق بت کا ارادہ کیا اور پھر وہ آفت میں گرفتار ہوگیا اصلاح نے یہ بات سمجھادی کہ محض ارادے سے آفت میں پڑنا لازم نہیں آتا دل پہلے الفت کرکے تکلیف اٹھا چکا تھا لیکن دوبارہ مبتلائے عشق ہوگیا اس پہلو کو واضح کرنے کے لئے مصرع ثانی میں (پھر) پر (نئے سر سے) اضافہ فرمایا (یہ لیجئے) سے ایسا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

وکیل احمد صاحب حافظ غازی پوری

حجاباتِ نظر کو مشکلوں سے جب اٹھا پایا — فریبِ مدعا دیکھا فریبِ مدعا پایا

اصلاح — حجاباتِ نظر کو مشکلوں سے جب اٹھا پایا — فریبِ مدعا دیکھا قریبِ مدعا پایا

بہت نازک اور لطیف اصلاح ہے اصل شعر یہ تھا کہ اہلِ معرفت جب حجاباتِ نظر کو عبور کر گئے تو ان کو معلوم ہوا کہ ہر ایک حجاب یکے بعد دیگرے ہمارا مدعا بنا ہوا تھا اور جمال حقیقی کو ہم سے چھپائے ہوئے تھا منازل معرفت کے طے کرنے میں موجودات کو ہم نے غلطی سے جو اپنا مدعا سمجھ رکھا تھا وہ فریبِ نظر تھا یہ معنی تو درست ہیں لیکن یہ شعر ایک اور معنی کا بھی حامل ہے کہ حجاباتِ نظر دور ہوئے تو پتہ چل گیا کہ شروع سے آخر تک دھوکا ہی دھوکا تھا حقیقت کچھ بھی نہ تھی یہ معنی الحاد کی طرف لے جاتے ہیں اصلاح میں دوسرے (فریب) کو ایک نقطہ بڑھاکر (قریب) بنادینے سے وہ احتمال جاتا رہا عارف پہلے حجابات کو مدعا سمجھتا تھا جب وہ اٹھ گئے تو یہ مدعائے حقیقی کے قریب پہنچ گیا۔

ترے جلووں میں گم رہ کر یہی تیرا پتا پایا — کبھی دیکھا ہوا دیکھا کبھی دیکھا ہوا پایا

اصلاح — ترے جلووں میں گم رہ کر یہی تیرا پتا پایا — کبھی دیکھا ہوا دیکھا کبھی پایا ہوا پایا

ایک لفظ کے بدل دینے سے مصرع ثانی کے ٹکڑوں میں باہم خوب صورت تقابل پیدا ہوگیا۔

تسلیوں سے ہے ایسی نفرت کہ غفلتوں پر نظر نہیں ہے — جو بھر دے دردِ حیات دل میں نصیب وہ چارہ گر نہیں ہے

اصلاح — ہمیں ہے درکار بے قراری تسلیوں پر نظر نہیں ہے — جو بھر دے دردِ حیات دل میں نصیب وہ چارہ گر نہیں ہے

اصل کلام سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ مصرع اولے کا بیان کس کے متعلق ہے اصلاح میں یہ نقص رفع ہوگیا اور بے قراری اور تسلی کے الفاظ سے ایک خاص شان بھی پیدا ہوگئی۔

دعائیں خاموش ہوگئی ہیں لبوں پہ آہِ سحر نہیں ہے — انھیں خبر بھی مری ہوئی کب مجھے جب اپنی خبر نہیں ہے

اصلاح — دعائے شب پر نظر نہیں ہے لبوں پہ آہِ سحر نہیں ہے — انھیں خبر بھی مری ہوئی کب مجھے جب اپنی خبر نہیں ہے

انگریزی زبان میں جان داروں کے سے افعال کا بے جان اشیاء سے منسوب کیا جانا عام ہے لیکن اردو زبان کا محاورہ اس روش کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اصل مصرع اولے میں (دعائیں) بصورت جمع ہے اصلاح

نے لفظ مذکور کو واحد بنا دیا تاکہ (انھیں) کی ضمیر اس کی طرف نہ پھر سکے اب مصرع اولے کے دونوں ٹکڑے مرادف بھی ہوگئے اور شب اور سحر سے ضمنی طور پر حسن بھی پیدا ہوگیا۔

شباب کی نکہتوں نے کھینچا نسیم آئی حجاب ٹوٹا — گلوں میں آکر وہ بس گئے تھے کہ پردہ ہے پردہ در نہیں ہے

اصلاح — شباب کی نکہتوں نے کھینچا نسیم آئی حجاب ٹوٹا — گلوں میں وہ اس لئے چھپے تھے کہ پردہ ہے پردہ در نہیں ہے

اصلاح میں معنی کی تشریح بہت اچھی طرح ہوگئی اب مطلب بخوبی واضح ہوگیا۔

گداز عشق ہی سے زندگی بیدار ہوتی ہے — اسے وسعت جو مل جائے محیط حسن عالم ہو

گداز عشق ہی سے زندگی محدود رہتی ہے — اسے وسعت جو مل جائے محیط حسن عالم ہو

عام اس سے کہ زندگی پر بیدار ہونے اور سونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے یا نہیں غور کرنا چاہئے کہ (گداز) موجب انقباض یا باعث انبساط ہوتا ہے واضح ہو کہ (گداز) بطور مترادف (غم) استعمال کیا گیا ہے اور اسی معنی میں بالعموم استعمال بھی ہوتا ہے ظاہر ہے کہ انقباض سے وسعت نہیں پیدا ہوسکتی علاوہ اس کے وسعت کے لئے محدود ہونا لازم تھا۔

شعاع حسن خود ہی جذب کر لے گی تجھے بلبل — سبک روحی اگر تیری گلوں میں مثل شبنم ہو

اصلاح — شعاع حسن خود ہی جذب کر لے تجھ کو اے بلبل — سبک روحی اگر تیری گلوں میں مثل شبنم ہو

اصل مصرع اولے میں فعل خلاف قواعد زبان تھا اصلاح مذکور سے (بلبل) سے پہلے حرف ندا لانے کی بھی گنجائش نکل آئی اور فعل کی شکل بھی درست ہوگئی اور (بلبل) کو فاعل سمجھنے کا احتمال بھی جاتا رہا۔

منشی سکھ دیو پرشاد صاحب بسمل الہ آبادی

ہوا جینا بہت مشکل ہمارا — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ ہے دل ہمارا

اصلاح — ہوا جینا بہت مشکل ہمارا — نہ وہ ہم ہیں نہ اب وہ دل ہمارا

(اب) کے رکھ دینے سے دوسرا مصرع بہت چست ہوگیا اور تلفظ کی ثقالت بھی جاتی رہی۔

نہیں دل اب کسی قابل ہمارا — سہے کب تک مصیبت دل ہمارا

اصلاح — نہیں دل اب کسی قابل ہمارا — کبھی تھا سب کے قابل دل ہمارا

پیشتر دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہ تھا اصلاح میں مصرع ثانی تبدیل کر دیا گیا موجودہ صورت میں دل کے بعد (قابل) پھر (قابل) کے بعد (دل) آیا ہے اس الٹ پھیر سے جو لفظی حسن پیدا ہوا وہ ظاہر ہے۔

نہ سمجھو دل لگی کہتا ہوں دل سے — تمھارے ہاتھ میں ہے دل ہمارا

اصلاح — وفا و عشق سے کیا ہاتھ اُٹھائیں — تمھارے ہاتھ میں ہے دل ہمارا

اصل شعر میں سستہ گرم بھی تھا اور پہلا مصرع بھی پست تھا لیکن اصلاح میں مصرع بدل کر وہ نازکی پیدا کر دی کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے سبحان اللہ سبحان اللہ۔

بتائیں کیا بس اتنا جانتے ہیں — کسی نے لے لیا ہے دل ہمارا

اصلاح — بتائیں کیا بس اتنا جانتے ہیں — کسی نے ہم سے چھینا دل ہمارا

خرید کر یا مانگ کر بھی چیز حاصل کی جاسکتی ہے مصرع اوّل کے تیو ظاہر کر رہے ہیں کہ (لے لیا)

کے مقابلے میں (چھپنا) استعمال ہونا چاہئے اصلاح کے بعد شعر زیر بحث بلیغ ہوگیا۔

کوئی پوچھے حسینوں کی نظر سے ملا مٹی میں کیوں کر دل ہمارا

اصلاح کوئی پوچھے تری نیچی نظر سے ملا مٹی میں کیوں کر دل ہمارا

اصل شعر بھی درست تھا لیکن اصلاح میں (مٹی میں ملنے کا) ثبوت نیچی نظر سے بہم پہنچ گیا اور شعر میں لطافت آگئی۔

تمھیں معلوم ہے دل کی حقیقت جہاں تم ہو وہیں ہے دل ہمارا

اصلاح کہاں ہے دل یہ تم کیا پوچھتے ہو جہاں تم ہو وہیں ہے دل ہمارا

مصرع اولے اور مصرع ثانی میں کوئی خاص بات نہ تھی کیوں کہ دوسرے مصرع میں دل کی حقیقت یا ماہیت کا بیان نہیں کیا گیا بلکہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دل کہاں ہے اب مصرع ثانی اصلاح کے بعد لطف دے رہا ہے

دیکھ کر اُن کو ہو گئے بیہوش کیا کریں بات یہ بھی ہوش نہیں

اصلاح دیکھ کر اُن کو میں ہوا بیہوش کب گیا ہوش یہ بھی ہوش نہیں

اصل شعر کے الفاظ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ بے ہوش ہونے والا کون تھا دوسری بات یہ کہ واحد متکلم کافی ہے جمع کی ضرورت نہیں مصرع ثانی کی اصلاح سے یہ معنوی اضافہ ہوگیا کہ بے ہوش ہونے والا دفعتاً بے ہوش ہوا تھا کہ اُسے اتنا بھی نہ معلوم ہو سکا کہ میرا ہوش کب گیا یہ انتہائے بے ہوشی کی صورت خاص ہے۔

نغمۂ سرمدی سنائے کون کوئی اب ویسا سرفروش نہیں

اصلاح نغمۂ سرمدی سنائے کون کوئی سرمد سا سرفروش نہیں

سرمدی اور سرمد کے معنی جدا جدا ہو گئے اور اس تکرار میں اصلاح سے ایک حسن پیدا ہو گیا۔

زندگی کیا ہے اور کیا ہے موت رہ کے دنیا میں اس کا ہوش نہیں

اصلاح زندگی کیا ہے اور کیا ہے موت جاں نثاروں کو اس کا ہوش نہیں

پیشتر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس کی کیفیت بیان ہو رہی ہے علاوہ اس کے زندگی اور موت کے لئے (جاں نثاروں) کا لفظ قابل داد ہے۔

پردہ نہ اُٹھائیں گے ابد تک پردہ جو ازل سے کر رہے ہیں

اصلاح آئیں گے نہ سامنے ابد تک پردہ جو ازل سے کر رہے ہیں

لفظ (پردہ) کی تکرار بری معلوم ہوتی ہے اس لئے پہلے مصرع میں تبدیلی کر دی گئی۔

محمد عمر خاں صاحب عمر گورکھپوری

دل میں اُترا تو اتر کر نخلِ الفت بن گیا کیا سکھا کر آپ نے بھیجا تھا اپنے تیر کو

اصلاح دل میں اُترا اور شاخِ نخلِ الفت بن گیا کیا سکھا کر آپ نے بھیجا تھا اپنے تیر کو

شعر میں (تو اُتر کر) بے کار الفاظ تھے لہٰذا وہ نکال دئے گئے ان کی جگہ ایک ضروری لفظ (شاخ) رکھ دیا گیا کیوں کہ (تیر) کو (شاخ) سے نسبت ہے نہ کہ (نخل) سے

نواب میر یاور علی خاں صاحب بہادر یاور جاگیردار اسد پور ضلع امراؤتی ملک برار

ہر گھڑی ہے رنج وغم ہر وقت حیرانی مجھے   چین ہی لینے نہیں دیتی پریشانی مجھے

اصلاح   ہر گھڑی غم ہر گھڑی ایذائے روحانی مجھے   چین ہی لینے نہیں دیتی پریشانی مجھے

ایک وقت حیرانی اور پریشانی نہیں ہوسکتی اگر کوئی حیران ہوگا تو پریشان اور پریشان ہوگا تو حیران نہ ہوگا کیونکہ ایک دوسرے کی مخالف ہے اس لئے (حیرانی) کا لفظ نکال کر (ایذائے روحانی) رکھ دیا اب پریشانی کا ثبوت بخوبی ہوگیا۔

میری نظروں میں تو کوئی خوب رو جچتا نہیں   شکل انھیں کی بس نظر آتی ہے لاثانی مجھے

اصلاح   اور کوئی خوب رو آنکھوں میں اب جچتا نہیں   شکل انھیں کی بس نظر آتی ہے لاثانی مجھے

مصرع اولے کی تبدیلیوں کے اسباب یہ ہیں کہ مصرع ثانی میں بھی لفظ (نظر) موجود تھا علاوہ اس کے اگر (اور کوئی) نہ بڑھایا جاتا تو معشوق خود بھی (نہیں جچتا) کے عام حکم میں آجاتا۔

کیا خبر لوں اور کی اپنی نہیں مجھ کو خبر   ہے خیالِ یار میں اس درجہ حیرانی مجھے

اصلاح   کیا خبر لوں اور کی اپنی خبر مجھ کو نہیں   ہے خیالِ یار میں اس درجہ حیرانی مجھے

مصرع اولے کے دوسرے ٹکڑے میں ترتیب الفاظ الجھی ہوئی تھی اب موجودہ صورت میں روانی آگئی۔

محبت تری دل میں گھر کر گئی   اثر کرتے کرتے اثر کر گئی

اصلاح   محبت مرے دل میں گھر کر گئی   اثر کرتے کرتے اثر کر گئی

مصرع اولے میں لفظ (تری) بیچ میں آگیا تھا (محبت) کے ساتھ پڑھیئے تو (محبت تری) ہوتا ہے اور (دل) کے ساتھ پڑھئے تو (تری دل) پڑھا جاتا ہے اصلاح سے یہ عیب دور ہوگیا اور خوبی بھی پیدا ہوگئی۔

عبد الحفیظ صاحب عیش ساکن لودی پور ضلع داناپور پٹنہ

ہوتی ہے اور میری آہ بلند   چرخ جتنا مجھے دباتا ہے

اصلاح   اُتنی ہوتی ہے میری آہ بلند   چرخ جتنا مجھے دباتا ہے

مصرع ثانی کے لفظ (جتنا) کی رعایت سے مصرع اولے میں (اور) کا محل استعمال نہیں تھا جو لفظ اِس کی جگہ رکھ دیا ہے یعنی (اُتنی) یہی زبان کے اعتبار سے آنا چاہیئے تھا علاوہ اِس کے ہوتی کی (ی) بھی دبتی تھی اگرچہ یہ صورت جائز ہے لیکن اب اور صفائی آگئی۔

ہجر کے صدمے جھیلوں میں کب تک   جان ہی دے دوں دل میں آتا ہے

اصلاح   آکے پہلو سے جب وہ جاتا ہے   جی ہی دے دوں یہ جی میں آتا ہے

پہلا مصرع بہت کم زور تھا ترکیب الجھی ہوئی تھی دوسرے مصرع میں (دل) کی جگہ (جی) رکھنے سے حسن تکرار کا لطف آگیا ہجر کے معمولی صدمے جان دینے کے لئے اُتنے زبردست محرک نہیں ہوسکتے جتنا کسی معشوق کا پہلوے عاشق سے جدا ہونا اب اِس مصرع کے تبدیل کرنے سے شعر بلیغ ہوگیا اور شعر سے مطلع ہوجانے میں خوبی بھی پیدا ہوگئی۔

اولاد حسن صاحب توبہ ساکن سید سراواں ضلع الہ آباد

وہ اٹھ کر میرے پہلو سے کسی کا اپنے گھر جانا   وہ میرا ایک ٹھنڈی سانس لینا اور مر جانا

اصلاح وہ اُٹھ کر صبح دم اُن کا یہاں سے اپنے گھر جانا وہ میرا ایک ٹھنڈی سانس لینا اور مر جانا

پہلے مصرع میں (میرے) اور دوسرے مصرع میں (میرا) اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا صبح دم سے اضافۂ معنوی کے علاوہ رعایت لفظی کا بھی لطف پیدا ہو گیا کیوں کہ مصرع ثانی میں (ٹھنڈی سانس) کا لفظ موجود ہے۔

جو آئے ہو تو ٹھہرو کوئی لحظہ کچھ ہنسو بولو یہ کیا آنے میں آنا ہے اِدھر آنا اُدھر جانا

اصلاح جو آئے ہو تو ٹھہرو کوئی لحظہ کچھ ہنسو بولو یہ کیا آنا یہ کیا جانا اِدھر آنا اُدھر جانا

(آنا) اور (جانا) ان دونوں لفظوں کے اُلٹ پھیر سے مصرع ثانی کا حسن بڑھ گیا یعنی مصرع ثانی کے دوسرے ٹکڑے میں (اِدھر) اور (اُدھر) تھا پہلے ٹکڑے میں لفظ (یہ) کی تکرار سے اب ان ٹکڑوں میں ایک طرح کا خوب صورت تقابل پیدا ہو گیا۔

وہ ہوا دے رہے ہیں دامن سے کام آئی ہے میری بے ہوشی

اصلاح وہ ہوا دے رہے ہیں دامن سے میرے کام آئی میری بے ہوشی

یہ بتانا ضرور تھا کہ بے ہوشی سے کس کو فائدہ پہنچا علاوہ اس کے مصرع بھی چست ہو گیا۔

روز کے غم سے پائی ہیں نے نجات بخشش دی موت نے سُبک دوشی

اصلاح بارِ غم سے ملی نجات مجھے بخشش دی موت نے سُبک دوشی

دونوں طرف لفظ (نے) موجود تھا اس لئے مصرع اولے میں فعل کی شکل تبدیل کر دی گئی اور (سُبک دوشی) کی رعایت سے لفظ (بار) اضافہ کر دیا۔

ہو نہ ہو غم اُنھیں ہے دشمن کا نہیں بے وجہ یہ سیہ پوشی

اصلاح ہو نہ ہو سوگ انھیں ہے دشمن کا نہیں بے وجہ یہ سیہ پوشی

(غم) عام ہے (سوگ) خاص ہے (سیہ پوشی) کے ساتھ از روئے بلاغت (سوگ) ہی کی ضرورت تھی۔

فصلِ خزاں میں ہم کو رہا مے سے اجتناب لیکن بہار آتے ہی مے نوش ہو گئے

اصلاح عہدِ خزاں میں تھا ہمیں پینے سے اجتناب لیکن بہار آتے ہی مے نوش ہو گئے

(مے) کی تکرار سے بچانے کے لئے مصرع اولے میں تبدیلی فرمائی گئی۔

مولانا محمد متین صاحب شمسی سکندر پوری

ملتا نہیں ہے چین کبھی رات بھر مجھے رہتی ہے روزِ شام سے فکرِ سحر مجھے

اصلاح ہے بے قرار ہجر میں کیا رات بھر مجھے رہتی ہے روزِ شام سے فکرِ سحر مجھے

بے اصلاحی شعر میں (بے چینی) کا سبب نہیں ظاہر کیا گیا تھا (رات بھر) کے ساتھ (کبھی) رکھنا فضول تھا دونوں طرف لفظ (ہے) کی تکرار بری تھی انداز بیان بدل دینے سے یہ عیوب رفع ہو گئے اور مصرع اولے زیادہ چست بن گیا۔

گویا مری پسند کی دنیا بدل گئی ہر عیب عشق میں نظر آیا ہنر مجھے

اصلاح گویا مرے خیال کی دنیا بدل گئی ہر عیب عشق میں نظر آیا ہنر مجھے

(دنیائے خیال) کے ہوتے ہوئے (پسند کی دنیا) کہنا غیر ضروری ہے۔

مجھے جن دوستوں سے دل نوازی کی توقع تھی ۔ وہ سو دشمن ہیں میرے ایک میں سو جوڑنے والے

اصلاح ۔ مجھے جن دوستوں سے دل نوازی کی توقع تھی ۔ وہ سب غمّاز نکلے ایک میں سو جوڑنے والے

مصرع اولے میں فعل ماضی اور مصرع ثانی میں فعل حال تھا اصلاح سے یہ عیب دور ہوگیا (ایک میں سو جوڑنے) کی رعایت سے (غمّاز) (دشمن) کی جگہ مناسب ہے چوں کہ مصرع اولے میں (مجھے) موجود ہے اس لئے مصرع ثانی میں (میرے) بے کار تھا مصرع ثانی میں (ہیں) کی (ہے) دبتی تھی اب مصرع مذکور کافی چست ہوگیا ۔

لگایا ہو جس نے کبھی دل وہ جانے ۔ لٹے دل لگی میں ہزاروں گھرانے

اصلاح ۔ لگایا ہو جس نے کبھی دل وہ جانے ۔ مٹے دل لگی میں ہزاروں گھرانے

اگرچہ مطلع صحیح تھا لیکن اصلاح میں صرف ایک لفظ بدل دینے سے اور بلند ہوگیا لٹنے میں اور مٹنے میں جو خوبی ہے وہ ظاہر ہے ۔

بڑے اپنے مطلب کے نکلے سیانے ۔ لگے دل چُرا کر نگاہیں چُرانے

اصلاح ۔ بڑے اپنے مطلب کے نکلے سیانے ۔ لگے دل چُرا کر وہ آنکھیں چُرانے

مطلع میں پہلے دو فعل موجود تھے لیکن فاعل ایک جگہ بھی نہ تھا اصلاح سے معلوم ہوگیا کہ از روئے فصاحت ایسے موقع پر ایک جگہ فاعل مذکور اور ایک جگہ مقدر ہونا چاہئے ۔

وہ کرتے ہیں کریں میرے دلِ نخچیر کے ٹکڑے ۔ جدا ہونے نہ پائیں دل سے لیکن تیر کے ٹکڑے

اصلاح ۔ وہ کرتے ہیں کریں میرے دلِ نخچیر کے ٹکڑے ۔ مگر دل سے جدا ہونے نہ پائیں تیر کے ٹکڑے

دوسرے مصرع میں ذرا روانی نہ تھی اور لفظ (لیکن) درمیان میں تھا اب روانی پیدا ہوگئی اور (مگر) ابتدائے مصرع میں آنے سے وہ ثقالت جاتی رہی ۔

باغِ ہستی میں نرالا تھا فسانہ دل کا ۔ پتّہ پتّہ نظر آیا ہمہ تن گوش مجھے

اصلاح ۔ باغِ ہستی میں وہ دل کش تھا فسانہ دل کا ۔ پتّہ پتّہ نظر آیا ہمہ تن گوش مجھے

(نرالا) کی جگہ (دل کش) رکھنے سے مصرع ثانی مصرع اولے کے قریب آگیا پتوں کے ہمہ تن گوش ہونے کی توجیہ کے لئے لفظ (وہ) بہ معنی (ایسا) بڑھا دیا گیا ۔

اُن سے آنکھیں کیا ملیں مٹی میں دونوں مل گئے ۔ مجھ سے دل بھی اور دل سے میں بھی چھوٹا یا نہیں

عشق میں وہ رشتۂ اخلاص ٹوٹا یا نہیں ۔ مجھ سے دل بھی اور دل سے میں بھی چھوٹا یا نہیں

شاعر کی مراد (دونوں) سے (میں) اور (دل) ہے لیکن معنی دیگر کا بھی احتمال ہوتا ہے گو وہ معنی واضح نہیں ہیں لفظ (دونوں) عاشق و معشوق کی طرف اشارہ کرتا ہے دوسرا امر قابل غور یہ ہے کہ جدائی کے لئے بربادی لازم نہیں ممکن ہے کہ زید اور بکر زندہ رہیں لیکن ایک دوسرے سے نہ مل سکیں ان کل باتوں پر لحاظ کرکے مصرع اولے کو بدل دیا طبیعت کا اقتضا یہ تھا کہ شعر مطلع بنا دیا جائے کیوں کہ زمین زیر بحث نئی اور ایک حد تک مشکل ہے ۔

بیلی رام صاحب رآم کشمیری

عجب کیا ہیں جو تیرے پاس گستاخانہ آپہنچا | جہاں قائم ہوئی محفل وہیں پروانہ آپہنچا
اصلاح عجب کیا ہیں جو تیرے پاس گستاخانہ آپہنچا | جہاں تو شمع کی چمکی وہیں پروانہ آپہنچا

مطلع صحیح تھا لیکن محفل میں پروانے صرف اس سبب سے آتے ہیں کہ وہاں شمع ہوتی ہے اگر محفل نہ قائم ہو اور یوں ہی کسی جگہ شمع روشن کردی جائے تو بھی پروانے اُس پر ٹوٹ پڑیں گے اصلاح کے بعد مصرع اولے اور مصرع ثانی کے باہمی ربط کی نوعیت بدل گئی۔

نہ پوچھو کس لئے آیا ہے کیوں آیا ہے دیوانہ | کھلا دیکھا درِ زنداں کو آزادانہ آپہنچا
اصلاح حقیقت پوچھتے ہیں لوگ کیا میری اسیری کی | کھلا دیکھا درِ زنداں کو آزادانہ آپہنچا

شعر میں دو خرابیاں تھیں (۱) نہیں معلوم شاعر کس سے خطاب کر رہا تھا (۲) (آیا ہے آیا ہے آپہنچا) اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا اصلاح سے یہ سب نقائص دور ہو گئے۔

راحت اللہ خاں صاحب آزلؔ شاہ جہاں پوری

نہ ہوگی سہل تکمیل شہادت دستِ قاتل سے | بہ آسانی نظر آئے گی مجھ کو سخت مشکل سے
اصلاح نکل جائے تمنائے شہادت تیغِ قاتل سے | بہ آسانی نظر آئے گی مجھ کو سخت مشکل سے

(سہل) اور (آسان) ایک ہی مطلب کے لئے آئے تھے اصلاح میں ایک لفظ کم کر دیا گیا (تکمیل) کی جگہ (نکلنا) رکھ دینے سے عاشق کے جذبات واضح ہو گئے اِس تبدیلی کے بعد بجائے (دست) لفظ (تیغ) کا استعمال اس لئے انسب ہو گیا کہ شہادت کو تیغ سے خاص مناسبت ہے۔

مکمل ہو گئی یوں ہوتے ہوتے رسم قاتل سے | نگاہوں سے نگاہیں مل گئیں دل مل گیا دل سے
اصلاح اب اُٹھ کر جا نہیں سکتے کہیں ہم اُن کی محفل سے | نگاہوں سے نگاہیں مل گئیں دل مل گیا دل سے

مضمون یہ تھا کہ پہلے معشوق سے ہماری آنکھیں چار ہوئیں پھر دل سے دل ملا اِس طرح ہماری اُس کی دوستی ہو گئی بات درست تھی لیکن مصرع اوّل نامکمل تھا پڑھنے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس شخص کی رسم مکمل ہو گئی اصلاح میں رخ بدل گیا اب یہ ہے کہ نگاہوں سے نگاہیں ملتے ہی محبوب سے ہمارا دل مل گیا اِس کا اثر یہ ہوا کہ ہم محو ہو گئے اور محفل یار سے اُٹھنے کا امکان باقی نہ رہا پہلی صورت میں مصرع ثانی اِس بہتر معنی کا حامل تھا مگر اُس صورت میں مصرع اولے اِس کو ایک معمولی مطلب کی طرف لا رہا ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب برقؔ بہاپادری

مر کے پروانہ شمع کو کیا کیا | شام سے صبح تک جلاتا ہے
اصلاح جل کے پروانہ شمع محفل کو | شام سے صبح تک جلاتا ہے

مصرع اولے میں (کو کیا کیا) برا معلوم ہوتا تھا (شام سے صبح تک) معین تفصیل تھی اس کے ہوتے غیر معین تفصیل یعنی (کیا کیا) یوں بھی یہ الفاظ بے کار تھے (مر کے) کی جگہ (جل کے) رکھ دینے سے تجنیس پیدا ہو گئی (شمع) کے لئے محفل کی تخصیص اس لئے ضروری تھی کہ شاعر نے اُس کے شام سے صبح تک جلنے کا مضمون باندھا ہے۔

میرے اظہارِ شوق پر کوئی　　روز رستہ مجھے بتاتا ہے

اصلاح　رہ نما بھی رہِ محبت میں　　روز رستہ مجھے بتاتا ہے

جب کسی کو کوئی دھوکا دیتا ہے تو اُس کے فریب کے لئے (رستہ بتانے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے محض اظہارِ شوق پر رستہ بتانا اچھا نہ تھا بہ رعایت (رستہ) اور (رہ نمائے رہِ محبت) بہت معقول بنایا گیا۔

مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب رونق گیاوی

چمن کی کیا ہوئی وہ نکہت دلبر　　فدا گل کیوں ہیں زلفِ عنبریں پر

اصلاح　چمن والوں سے تم یہ راز پوچھو　　فدا گل کیوں ہیں زلفِ عنبریں پر

مصرع اولے میں (کیا ہوئی) جو کہا گیا تھا اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چمن سے خوشبو جاتی رہی یعنی فنا ہو گئی اِس صورت میں زلفِ محبوب کی تعریف نہ ہو گی بلکہ ہجو ملیح ہو گی کہ چمن سے جب خوشبو غائب ہو گئی تو پھول زلفِ عنبر پر فدا ہونے لگے ورنہ ایسا نہ ہوتا شاعر کا مدعا تو زلفِ محبوب کو پھولوں پر ترجیح دینے کا ہے جب گل ہائے چمن خود ہی اُس کی زلفِ معنبر پر نثار ہو رہے ہیں تو ترجیح ظاہر ہے لیکن مصرع اولے نے اِس تخیل میں خرابی پیدا کر دی تھی لہذا وہ بدل دیا گیا اصلاح میں جو محبوب سے خطاب کیا گیا وہ مفید بلاغت ہے کیوں کہ عاشق کا معشوق کے سامنے اِس کی تعریف کرنا مطلب سے خالی نہیں ہوتا۔

کہیں جادو پہ بھی جادو نہ چل جائے　　عجب عالم ہے چشمِ سرمگیں پر

اصلاح　جسے دیکھو اُسی کو دیکھتا ہے　　عجب عالم ہے چشمِ سرمگیں پر

شعر میں (چشمِ سرمگیں) کا (جادو) محض ادعائی تھا علاوہ اِس کے اس زیرِ بحث جادو پر کوئی جادو چل جانے کا قرینہ موجود نہ تھا اصلاح سے واضح ہو گیا کہ (چشمِ سرمگیں) سحر کار ہو یا نہ ہو لیکن اُس کی دل کشی بہر صورت مسلم ہے۔

مولوی شاہد حسن صاحب تسوز ناروی

اب یاد بھی دلانے سے آتا نہیں خیال　　دو دن میں آپ نے مجھے ایسا بھلا دیا

اصلاح　اب یاد بھی دلانے سے آتا نہیں ہوں یاد　　دو دن میں آپ نے مجھے ایسا بھلا دیا

لفظ (خیال) کے سُننے پر سامع خیال کی نوعیت کو نہ سمجھ سکے گا اور وہ فطرۃً دریافت کرے گا کہ کس چیز کا یا کس بات کا خیال اِس صورت میں صاف مطلب ادا نہیں ہوتا اصلاح سے مطلب واضح ہو گیا۔

تمھیں ہم عاشقو تسخیر کا نسخہ بتاتے ہیں　　نگاہِ یاس و حسرت سے برابر دیکھتے جاؤ

اصلاح　اثر اے دردمندانِ محبت بالیقیں ہوگا　　نگاہِ یاس سے اُن کو برابر دیکھتے جاؤ

مصرع اولے میں (نسخہ تسخیر) بے کار تھا دوسرے یہ کہ عاشق کے لئے ہر وقت مایوس رہنا ضرور نہیں لفظ (دردمندانِ محبت) سے (یاس) کا قرینہ پیدا ہو گیا مصرع ثانی سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ صلاح دینے والا کس کی طرف دیکھنے کی صلاح دے رہا ہے اصلاح نے (یاس) کا مترادف (حسرت) کم کر کے ضروری لفظ (اُن کو) رکھ دیا اِس لفظ کی بہت ضرورت تھی بغیر اِس خاص اشارے کے کوئی لطف نہ تھا اب ضعفِ تالیف کی خرابی جاتی رہی۔

اودھ کشور پرشاد صاحب کشتہ گیاوی

کبھی حسرت کبھی ارماں ہیں دل میں　　کبھی مہماں سے خالی گھر نہیں ہے

اصلاح　کبھی پیکاں کبھی ارماں ہیں دل میں　　غرض مہماں سے خالی گھر نہیں ہے

حسرت اور ارمان مترادف الفاظ ہیں اس لئے دونوں کے استعمال سے معنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا کبھی کی تکرار پہلے مصرع میں تو اچھی مگر دوسرے میں بُری تھی اس سبب سے (کبھی) کی جگہ (غرض) کا لفظ اصلاح میں رکھ دیا گیا اب واضح ہوگیا کہ مصرع ثانی بطور نتیجہ بیان ہے۔

مریضِ ناتواں کو زور اتنا بھی بہت کچھ ہے　　خیالِ یار کا دامن نہ چھوٹے زندگانی میں

اصلاح　مریضِ ناتواں کو یہ سہارا بھی بہت کچھ ہے　　خیالِ یار کا دامن نہ چھوٹے زندگانی میں

مضمون کے اعتبار سے (زور) کی جگہ (سہارا) بہت خوب بنایا گیا اگرچہ (زندگی) کے ہوتے ہوئے نوح صاحب نے (زندگانی) کو ترک فرمایا ہے لیکن جیسا کہیں اوپر لکھ چکا ہوں کہ اپنے شاگردوں کو ان خصوصیات کی متابعت کے لئے مجبور نہیں کرتے۔

کرشمہ دیکھئے یہ ضبطِ غم کا　　ستم گر اب ستم پرور نہیں ہے

اصلاح　دکھایا یہ اثر میری وفا نے　　ستم پرور ستم پرور نہیں ہے

مصرع اولے میں (یہ) کہنے کے بعد مصرع ثانی میں (اب) بے کار تھا کیوں کہ اشارے کے لئے ان دو میں سے ایک کافی تھا علاوہ اس کے مصرع اولے میں (دیکھئے) اور (یہ) متصل رکھنے سے تنافر پیدا ہوگیا تھا (ضبطِ غم) تو ممکن ہے کچھ کرشمہ نہ دکھا سکے لیکن (وفا) کا اثر یقیناً (ضبط) سے زیادہ ہوتا ہے معشوق کی جفا کے مقابلے میں عاشق کی وفا کا غالب ہونا بہتر مضمون ہے دوسرے مصرع میں بھی اصلاح نے ایک خاص روانی پیدا کر دی۔

ہوئے جاں باز جب مرنے پہ راضی　　تو اُن کے ہاتھ میں خنجر نہیں ہے

اصلاح　ہمیں شوقِ شہادت کھینچ لایا　　تمھارے ہاتھ میں خنجر نہیں ہے

اصلاح نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا عشاق کو شایانِ شہادت ہونا چاہئے نہ کہ مرنے پر محض راضی تخاطب سے مضمون موکد ہوگیا۔

عبدالحفیظ صاحب حفیظ الہ آبادی

نہیں مونس کوئی غربت میں میرا　　دلِ درد آشنا ہے اور میں ہوں

اصلاح　کوئی مونس نہیں غربت میں میرا　　دلِ درد آشنا ہے اور میں ہوں

مصرع اولے میں ترتیب الفاظ اچھی نہ تھی اس لئے بدلی گئی۔

گھٹا ہے شیشہ ہے ساغر ہے مے ہے　　کوئی نازک ادا ہے اور میں ہوں

اصلاح　گھٹا بھی باغ بھی ساغر بھی مے بھی　　کوئی نازک ادا ہے اور میں ہوں

مصرع ثانی میں لفظ (ہے) تھا اور پہلے مصرع میں بھی کئی جگہ تھا لہٰذا (گھٹا) کے لطف دوبالا کر دینے کے لئے (باغ) کا اضافہ فرما دیا اور (ہے) کی تکرار بھی مٹا دی۔

حسینوں کی محبت میں شب غم　　حفیظ آہِ رسا ہے اور میں ہوں

اصلاح　فرشتے آسماں کی خیر مانگیں　　حفیظ آہِ رسا ہے اور میں ہوں

محبت اور شبِ غم کی قیدوں کے دور ہو جانے سے مضمون جامع ہو گیا نئے مصرع کا اندازِ بیان تعریف سے مستغنی ہے اب آہِ رسا کی تاثیر ظاہر ہو گئی اور شعر میں غضب کا بانکپن پیدا ہو گیا۔

مرزا عثمان غنی صاحب غنیؔ الہ آبادی

وہی روداد رنج و غم وہی طرزِ فغاں میری　　سُنی ہے کس کے منھ سے آپ نے یہ داستاں میری

اصلاح　وہی روداد رنج و غم وہی طرزِ فغاں میری　　سُنی ہے میرے منھ سے تم نے اکثر داستاں میری

مطلع پہلی صورت میں خاندانی رنگ سے ہٹا ہوا تھا صاف ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ مصرع اولے اور مصرع ثانی میں کیا تعلق ہے اصلاح سے وہ ربط پیدا ہو گیا جو خاندانِ حضرت داغ کے کلام کا ایک خاص جوہر ہے۔

پریشاں کیوں ابھی سے ہو گئے سُن کر فغاں میری　　ذرا سنئے ادھوری رہ نہ جائے داستاں میری

اصلاح　پریشاں وہ ابھی سے ہو گئے سُن کر فغاں میری　　مجھے ڈر ہے ادھوری رہ نہ جائے داستاں میری

کسی کی داستان سن کر کسی کا پریشان ہو جانا اختیاری فعل نہیں بلکہ اضطراری فعل ہوتا ہے اس لئے مصرع اولے میں لفظ (کیوں) بلاغت کے خلاف تھا (مجھے ڈر ہے) اس ٹکڑے سے قلبی کیفیت بھی ظاہر ہو گئی اور ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ داستان کا اثر اِس حد تک ہوا کہ اب سننے والے سے کہنے والا کچھ دیر تک خطاب نہیں کر سکتا کیوں کہ اب سُننے کی تاب سُننے والے میں باقی نہیں۔

رقیب روسیہ بھیجا گیا میرے بلانے کو　　جو بیٹھے بیٹھے اُن کو یاد آئی ناگہاں میری

اصلاح　اُسی کے ساتھ ہی قصدِ ستم بھی کر لیا دل میں　　جو بیٹھے بیٹھے اُن کو یاد آئی ناگہاں میری

رقیب وغیرہ کے مضامین اب مبتذل سمجھے جاتے ہیں علاوہ اِس کے یہ پتہ نہیں چلتا کہ بلانے کے لئے بالخصوص (رقیب) ہی کیوں بھیجا گیا پھر دونوں جانب (کو) برا معلوم ہوتا ہے اصلاح سے یہ عیوب بھی نکل گئے اور معشوق کا سنگ دل ہونا واضح ہو گیا۔

تمنا تھی مجھے اظہار دردِ غم کی مدت سے　　مگر اب کیوں نہیں کھُلتی نہیں کھُلتی زباں میری

اصلاح　تمنا تھی مجھے اظہار دردِ غم کی مدت سے　　مگر اب کیوں نہیں کھُلتی ترے آگے زباں میری

نہیں کھُلتی نہیں کھُلتی ایک (نہیں کھُلتی) بے کار تھی اس کی جگہ (ترے آگے) رکھ دینے سے اندازِ بیان میں انداز پیدا ہو گیا یعنی زبان کے نہ کھُلنے کی ایک وجہ ظاہر ہو گئی۔

عبد الجلیل صاحب مائلؔ بنگلوری

ظالم ستم شعار دغا باز بے وفا　　جتنا سمجھ رہا ہوں میں اُس سے سوا ہیں آپ

اصلاح　ظالم ستم شعار دغا باز بے وفا　　جتنا سمجھ رہے ہیں ہم اُس سے سوا ہیں آپ

مصرع ثانی میں لفظ (میں) کی (ی) دبتی تھی اصلاح سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوا کہ مظلومیت کے حکم میں زیادہ لوگوں کے آجانے سے (ظالم) کی ستم شعاری اظہر ہو گئی۔

حافظ امداد حسن خاں صاحب حسنؔ الہ آبادی

تیرے سودائی کی صورت قابلِ تصویر ہے — طوق گردن میں پڑا ہے پانوٗں میں زنجیر ہے

اصلاح — دید کے قابل اسیرِ عشق کی تصویر ہے — طوق گردن میں پڑا ہے پانوٗں میں زنجیر ہے

قابلِ تصویر کے معنی تصویر اتار لینے کے قابل نہیں ہو سکتے اس لئے ترمیم کی گئی۔

بولتی ہوتی تو کیا جانے ستم ڈھاتی یہ کیا — اس کی خاموشی قیامت ہے غضب تصویر ہے

اصلاح — بولتی ہوتی تو کیا جانے ستم ڈھاتی یہ کیا — اس خموشی میں قیامت آپ کی تصویر ہے

پہلی صورت میں دوسرا مصرع اُلجھا ہوا تھا اب صاف ہوگیا اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ وہ تصویر آپ کی ہے۔

وشو شنکر صاحب وشنو لکھنوی

آرزوؤں کا اثر ہر عاشقِ کامل میں ہے — عشق میں کامل وہی ہے جذب جس کے دل میں ہے

اصلاح — یوں تو خوبی کچھ نہ کچھ ہر عاشقِ کامل میں ہے — عشق میں کامل وہی ہے جذب جس کے دل میں ہے

مصرع اولے معنی کے اعتبار سے نامکمل تھا مصرع ثانی میں لفظ (لیکن یا مگر) مقدر ہے اس لئے پہلے مصرع میں ایسے لفظ کی ضرورت ہے جو معنی کی طرف ہدایت کر سکے اصلاح سے یہ خرابیاں دور ہوگئیں (یوں تو) سے مصرع ثانی کے مضمون کی طرف اشارہ ہوگیا۔

مصطفےٰ خاں صاحب ناظرؔ

زوال سے یہ کمال کے ہوگیا ظاہر — رہے ہمیشہ کسی کا شباب مشکل ہے

اصلاح — زوال سے یہ کمال کے ہوگیا روشن — رہے ہمیشہ کسی کا شباب مشکل ہے

شعر پہلے بھی صحیح تھا لیکن (ظاہر) کی جگہ (روشن) رکھ دینے سے خاص بات پیدا ہوگئی۔

کیا بتائیں دل لگا کر آپ سے کیا کیا کیا — آہ کی نالہ کیا شیون کیا فریاد کی

اصلاح — کیا بتائیں دل لگانے پھر رہا کیا مشغلہ — آہ کی نالہ کیا شیون کیا فریاد کی

مصرع اولے میں ژولیدگی ہے (آپ سے) درمیان رہ کر معنی کو بگاڑ رہا ہے ایک تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ (آپ سے دل لگانے) سے مختلف نتائج پیدا ہوئے دوسرے یہ معنی بھی لئے جا سکتے ہیں کہ (دل لگانے کے بعد ہم نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ناقابلِ بیان ہے موخر الذکر معنی رکیک یعنی ذم کا پہلو لئے ہوئے ہیں علاوہ اس کے مصرع اولے کا لفظ (کیا) مصرع ثانی کے الفاظ (کی کیا کیا کی) سے پہلے بُرا معلوم ہوتا ہے اصلاح سے یہ سب عیوب رفع ہوگئے اور اندازِ بیان میں یہ خوبی پیدا ہوگئی کہ مصرع اولے میں فعل لازم اور مصرع ثانی میں فعل متعدی آگیا۔

سید سرور علی صاحب سرورؔ الہ آبادی

ازل سے یاد مے خانے کی تھی مے خانہ یاد آیا — نکلتے وقت میری روح کو پیمانہ یاد آیا

اصلاح — ازل سے یاد مے خانے کی تھی مے خانہ یاد آیا — دمِ آخر بھی میری روح کو پیمانہ یاد آیا

(نکلتے وقت) کی جگہ (دمِ آخر) کہنے سے معنی میں وضاحت آگئی لفظ (بھی) کے اضافے سے معنی مؤکد ہوگئے۔

فضائے لالہ و گل میں اگر مے خانہ یاد آیا — ہوئی توبہ کو گردش دور میں پیمانہ یاد آیا

اصلاح — فضائے لالہ و گل میں مجھے مے خانہ یاد آیا — ہوئی توبہ کو گردش خود بخود پیمانہ یاد آیا

اصل مطلع میں کئی خرابیاں تھیں (۱) دونوں جانب لفظ (میں) تھا (۲) یاد اُسے کرتے ہیں جو سامنے موجود نہ ہو لیکن کہا گیا تھا (کہ دور میں پیمانہ یاد آیا) جب شراب کا دور جاری تھا تو پیمانہ بھی موجود تھا پھر اُس کا یاد آنا کیوں کر کہا جا سکتا تھا (۳) جب فعل ماضی کے ساتھ حرف شرط (اگر) آتا ہے تو فعل مذکور در اصل فعل ماضی نہیں ہوتا بلکہ فعل مضارع کے معنی دیتا ہے ماضی سے مراد ماضی مطلق ہے ایک لفظ (خود بخود) نے سارے عیوب کو مٹا دیا۔

راہِ الفت میں ہماری عمر گو آخر ہوئی ۔۔۔ دور ہیں لیکن ابھی تک منزلوں منزل سے ہم

اصلاح ۔۔۔ وادیِ الفت میں اپنی عمر آخر ہو گئی ۔۔۔ دور ہیں لیکن ابھی تک منزلوں منزل سے ہم

(راہِ الفت) کی جگہ (وادیِ الفت) اور مصرع ثانی میں لفظ (ہم) کے ہوتے مصرع اولے میں (ہماری) کی جگہ (اپنی) بہتر ہے از روئے محاورہ (ہو گئی) کہنا چاہئے تھا۔

جان محمد صاحب انور گوالیاری

اُن کو وفا کی دنیا میں یاد بہت ہم آئیں گے ۔۔۔ اب تو ستاتے ہیں ہم کو بعد کو پھر پچھتائیں گے

اصلاح ۔۔۔ عشق و وفا کی دنیا میں یاد بہت کچھ آئیں گے ۔۔۔ ہم کو ستاتے ہیں وہ ابھی بعد کو پھر پچھتائیں گے

مطلع میں لفظ (ہم) اور (کو) دوبارہ سہ بارہ آئے ہیں اور یہ تکرار لفظی مفید معنی نہیں اصلاح کے بعد جو الفاظ کی ترتیب ہو گئی ہے اس سے بہتر ممکن نہیں مصرع اولے میں (آئیں گے) فعل کا فاعل مقدر ہے لیکن اس میں عیب نہیں کیوں کہ اس کے بعد فوراً یعنی مصرع ثانی کے بالکل شروع میں اُس ذات کا ذکر ہو گیا ہے جو فعل (آئیں گے) کا فاعل ہے اسی طرح مصرع ثانی میں لفظ (وہ) (ستاتے ہیں) اور (پچھتائیں گے) کے درمیان میں آ کر دونوں طرف کام دے رہا ہے۔

طفیل احمد صاحب آرمان شاہجہان پوری

الاماں مانگوں نہ کیوں اُس شوخ کی تحریر سے ۔۔۔ خط بھی لکھتا ہے جو وہ مجھ کو تو نوکِ تیر سے

اصلاح ۔۔۔ الاماں مانگوں نہ کیوں بے درد کی تحریر سے ۔۔۔ خط بھی لکھتا ہے جو وہ مجھ کو تو نوکِ تیر سے

مصرع ثانی میں لفظ (وہ) کے ہوتے ہوئے مصرع اولے میں (اُس) کی ضرورت نہ تھی از روئے بلاغت نوکِ تیر سے خط لکھنے والے کو شوخ نہیں بلکہ بے درد کہنا چاہئے تھا۔

کیمیا میرے لئے خاکِ درِ محبوب ہے ۔۔۔ اور کیا اکسیر ہو گی بڑھ کے اِس اکسیر سے

اصلاح ۔۔۔ کیمیا میرے لئے خاکِ درِ محبوب ہے ۔۔۔ خاک اب اکسیر ہو گی بڑھ کے اِس اکسیر سے

شعر پہلے بھی صحیح تھا اصلاح کے بعد معنی میں زور آ گیا اور لفظ (خاک) کے استعمال کے بعد خاک کے محاورے نے اکسیر کے لئے ایک بات پیدا کر دی۔

وفا صاحب جیوری

نکلنے کو نہیں کہتی جو حسرت ہے مرے دل میں ۔۔۔ محبت کر کے یا رب پڑ گیا ہوں سخت مشکل میں

اصلاح ۔۔۔ نکلنے کو نہیں کہتی جو حسرت ہے مرے دل میں ۔۔۔ محبت کر کے یا رب پھنس گیا میں سخت مشکل میں

اصلاح سے معنی میں ترقی ہو گئی کیوں کہ مشکل میں پڑ جانے سے آدمی اتنا پریشان نہیں ہوتا جتنا پھنس جانے سے ہوتا ہے پھنس جانے کا مفہوم یہ ہے کہ اب رہائی دشوار ہے مصرع ثانی سے لفظ (ہوں) کم

کر دیا گیا اور (میں) رکھ دیا گیا اس کی وجہ سے ترکیب چست ہوگئی۔

ہے دل کا مدعا دل میں ہے دل کی آرزو دل میں — نہ کوئی آرزو نکلی نہ کوئی مدعا نکلا

اصلاح — کہ دل کا مدعا دل میں ہے دل کی آرزو دل میں — نہ کوئی آرزو نکلی نہ کوئی مدعا نکلا

مصرع ثانی میں (ہے) کی تکرار بے کار تھی اور جس شانِ تلفظ کے ساتھ مذکور نظم ہوا ہے وہ ابتدا میں بُری معلوم ہوتی تھی کیوں کہ (ہے) دب جاتی تھی اس ترمیم سے یہ عیب رفع ہو گیا۔

دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا — ایسے کا اعتبار کون کرے

اصلاح — دل ہمارا رہا رہا نہ رہا — ایسے کا اعتبار کون کرے

(کا کیا) پڑھنے میں (ککیا) ہو جاتا تھا اب ترمیم سے صاف ہو گیا۔

دشمنوں سے دوستی ہے دوستوں سے اجتناب — اپنی عادت اپنا ڈھنگ اپنا قرینہ دیکھئے

اصلاح — دشمنوں سے دوستی ہے دوستوں سے دشمنی — اپنی عادت اپنا ڈھنگ اپنا قرینہ دیکھئے

(اجتناب) کی جگہ (دشمنی) رکھ دینے سے مصرع اولےٰ میں خوب صورت تقابل پیدا ہو گیا۔

الٰہ یار خاں صاحب بریاں الٰہ آبادی

مژدۂ جاں فزا یہ بادِ صبا لائی ہے — باغِ عالم میں نئے سر سے بہار آئی ہے

اصلاح — مژدۂ روح فزا بادِ صبا لائی ہے — باغِ عالم میں نئے سر سے بہار آئی ہے

مصرع اولےٰ میں (فزا) کا الف دبتا تھا (جاں) کی جگہ (روح) بنانے اور لفظ (یہ) کم کر دینے سے عیب رفع ہو گیا (یہ) کی ضرورت بھی نہ تھی۔

کون کہتا ہے کہ میں قبر میں تنہا آیا — میری حسرت بھی مرے ساتھ ہی ساتھ آئی ہے

اصلاح — یہ تو کہتا نہیں مرقد میں اکیلا ہوں میں — میری حسرت بھی مرے ساتھ ہی ساتھ آئی ہے

استفہام انکاری کا استعمال جہاں تک ممکن ہو نہ کرنا چاہئے کیوں کہ اس طرز ادا سے اکثر اوقات وضاحت میں کمی آجاتی ہے پہلے مصرع میں یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ کوئی نہیں کہتا کہ میں قبر میں تنہا آیا یہ ایک عام بات ہو گئی اپنی ذات کی خصوصیت باقی نہ رہ گئی علاوہ اس کے (تنہا آیا) سے ایک وقت مخصوص کی کیفیت ظاہر ہوتی تھی (اکیلا ہوں) کہنے سے وقت کی وہ قید نہ رہی اس لئے کہ مرقد میں آدمی قیامت تک رہے گا مصرع ثانی میں جو تاکید پائی جاتی ہے اُس کی رعایت سے مصرع اولےٰ میں لفظ (تو) بہت خوب بڑھایا گیا ہے۔

ضبط سے کام لے تو نالہ نہ کر اے بریاں — اس میں تیری بھی ہے اور اُس کی بھی رسوائی ہے

اصلاح — ضبط سے کام لے فریاد نہ کر اے بریاں — اس میں تیری بھی ہے اور اُس کی بھی رسوائی ہے

(نالہ نہ کر) اس میں ضمیر مستتر تھی اس لئے تو رکھنے کی ضرورت نہ تھی اور یہ وجہ بھی تھی کہ مصرع ثانی میں لفظ (تیری) موجود ہے۔

انوار الحسن صاحب نورؔ آردی

ساقی پلا دے جام مے خوشگوار کا — آتا ہوا زمانہ ہے فصلِ بہار کا

اصلاح — ساقی پلا دے جام مے خوشگوار کا — آیا ہے سال بھر میں زمانہ بہار کا

فصل کی ضرورت نہ تھی (سال بھر میں) بڑھا دینے سے درخواست کی مقبولیت ظاہر ہوگئی اور مے طلب کرنے کا سبب معلوم ہوگیا

پوچھو نہ حال اُس کے دلِ بے قرار کا ۔۔۔ مارا ہوا جو ہو نگہ شرم سار کا

اصلاح ۔۔۔ کیا کہئے حال اُس کے دلِ بے قرار کا ۔۔۔ مارا ہوا جو ہو نگہ شرم سار کا

یہ نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ (نہ پوچھو) کس سے بطور خطاب کہا گیا یہ طرز پسندیدہ نہیں اس لئے اس کی جگہ (کیا کہئے) رکھا گیا علاوہ نقص رفع ہونے کے دلِ بے قرار کی اہمیت بڑھ گئی۔

حبیب احمد صاحب عیشؔ باشندۂ کوکھا ضلع الہ آباد

لٹ گیا دل ہمارا محفل میں ۔۔۔ اُن کے حسن و جمال نے مارا

اصلاح ۔۔۔ زندہ رہنا مجھے ہوا مشکل ۔۔۔ اُن کے حسن و جمال نے مارا

(حسن و جمال نے مارا) اس کا تعلق لٹ جانے سے کچھ نہ تھا محفل کی بھی ضرورت نہ تھی انھیں وجوہ سے ترمیم کی گئی یعنی مصرع اولے بدل دیا گیا۔

چھایا سیاہ ابر کہ پیدا ہوئی اُمنگ ۔۔۔ بوندیں پڑیں کہ کُھل گئی بوتل شراب کی

اصلاح ۔۔۔ بدلی اُٹھی فلک پہ کہ پیدا ہوئی اُمنگ ۔۔۔ بوندیں پڑیں کہ کُھل گئی بوتل شراب کی

پہلے مصرع میں کسی قدر کمزوری تھی ترمیم سے وہ دور ہوگئی اب دونوں مصرعے برابر کے ہوگئے۔

عزیز خاں صاحب یوسف زئی عزیزؔ مرزا پوری

آگ سینے میں لگی دل بھی مرا خاک ہوا ۔۔۔ بجلیاں ایسی گرائیں تری انگڑائی نے

اصلاح ۔۔۔ آگ سینے میں لگی خاک ہوا دل جل کر ۔۔۔ بجلیاں ایسی گرائیں تری انگڑائی نے

(بھی) کہنا اُس وقت درست ہوتا جب دوسرا واقعہ بطور اضافہ بیان کیا جاتا دل سینے میں ہوتا ہے اس لئے جب سینے میں آگ لگے گی تو دل ضرور جل جائے گا یعنی پہلا واقعہ سبب ہے اور دوسرا مسبب لفظ (بھی) کے استعمال کا یہ موقع نہیں ہے۔

یہ کیا کہا اب ترے پہلو سے جائیں گے ۔۔۔ اک تیر اور دل پہ مرے تم لگا چلے

اصلاح ۔۔۔ یہ کیا کہا کہ جائیں گے اب دشمنوں کے گھر ۔۔۔ اک تیر اور تم مرے دل پر لگا چلے

(اور) سے پہلی صورت میں کوئی معنوی فائدہ نہ تھا اصلاح سے ظاہر ہوگیا کہ عاشق کے دل پر دو صدمے تھے اول معشوق کی جدائی دوم اُس کا رقیب کے گھر جانا مصرع ثانی میں ترتیب الفاظ کے بدل جانے سے (پہ) کی جگہ پورا لفظ (پر) لانے کی گنجائش ہوگئی۔

اب رکھ دیا ہے در پہ تو اُٹھنا محال ہے ۔۔۔ میری جبیں نہیں کہ ترا آستاں نہیں

اصلاح ۔۔۔ جُھک کر سرِ نیاز کا اٹھنا محال ہے ۔۔۔ میری جبیں نہیں کہ ترا آستاں نہیں

مصرع اولے میں تانیث (جبیں) کی رعایت نہیں رکھی تھی اس باعث سے مصرع مذکور میں اعتراض کا پہلو تھا اصلاح میں سرِ نیاز کا لفظ خاص ہے اور قابلِ غور ہے مصرع کی شان اس ترمیم سے دوبالا ہوگئی۔

لازم یہ ہے مرے جگر و دل فغاں کریں ۔۔۔ وہ پوچھتے ہیں درد کہاں ہے کہاں نہیں

اصلاح اس کے جواب میں جگر و دل فغاں کریں وہ پوچھتے ہیں درد کہاں ہے کہاں نہیں

(لازم یہ ہے) یہ ٹکڑا بے کار تھا الفاظ (اس کے جواب میں) رکھ دینے سے شعر بالکل نیا ہوگیا کیا خوب اصلاح ہے۔

اعمال الدین صاحب اعمالؔ ساکن اجھوہ

عار کیوں آئے نہ مجنوں کو دمِ جوشِ جنوں پردہ پوشی ہے مرے جامے کی عریانی میں

اصلاح راز الفت کا دمِ جوشِ جنوں بھی نہ کھلا پردہ پوشی تھی مرے جامے کی عریانی میں

لفظ عار) خدا جانے کس مصلحت سے تھا جس کے سبب سے پورا مصرع مضمون کے لحاظ سے اُلجھ کر رہ گیا اصلاح سے باوجود (عریانی) پردہ پوشی کا ثبوت کس ۔۔۔ ا و خوبی سے بہم پہنچ گیا۔

کوئی گُل روپئے گل گشتِ چمن آئے گا باغ باں آج ہے پھولوں کی نگہ بانی میں

اصلاح بالیقیں وہ پئے گل گشت چمن آئیں گے باغ باں آج ہے پھولوں کی نگہ بانی میں

اصل شعر کے لفظ (کوئی) سے معلوم ہوتا ہے کہ قائل ایک غیر متعلق شخص ہے اصلاح سے ظاہر ہوگیا کہ عاشق نے اپنے تعلق خاطر کی وجہ سے ایک عام واقعہ کو اہمیت دے دی ہے اب مضمون میں لطافت پیدا ہوگئی۔

ہوا ہوش کب ہم کو بے ہوش ہو کر جدھر دیکھتے تھے اُدھر دیکھتے ہیں

اصلاح رہا اس قدر ہوش بے ہوش ہو کر جدھر دیکھتے تھے اُدھر دیکھتے ہیں

شعر میں معمولی مضمون تھا یعنی سکتے کے عالم میں جس طرف نظر اٹھ گئی اُسی طرف رہی اصلاح سے حسن پیدا ہوگیا اب معنی یہ ہوئے کہ ہمارے سکتے کو معمولی سکتہ نہ سمجھنا ہم عقل سے کام لے کر ایک ہی جانب دیکھ رہے ہیں یعنی دیدارِ محبوب کا لطف ہم کو آ رہا ہے۔

یہی دل وہ ہے جس کی تم تاک میں ہو اِسی پر تمھاری نظر دیکھتے ہیں

اصلاح ہمارا بھی دل ایک ہے سیکڑوں میں اِسی پر تمھاری نظر دیکھتے ہیں

اب مصرع اولے میں متانت آگئی (ایک ہے سیکڑوں میں) کہنے سے (دل) کی تعریف بھی زوردار ہوگئی اور نظر پڑنے کا سبب بھی ظاہر ہوگیا۔

مرے دل کی الٰہی خیر ہو مجھ کو یہی ڈر ہے وفورِ غم سے گھل کر بہہ نہ جائے چشمِ گریاں سے

اصلاح مرے دل کی الٰہی خیر ہو مجھ کو یہی ڈر ہے وفورِ غم میں گھل کر بہہ نہ جائے چشمِ گریاں سے

مصرع ثانی میں دو (سے) آگئے تھے پہلا کم کر کے (سے) کی جگہ (میں) بنا دیا گیا اب سماعت پر گراں نہیں۔

ہمیں ہے اب یہیں رہنا یہیں جینا یہیں مرنا نکلنے کو تو ہم سو بار نکلے بزمِ جاناں سے

اصلاح ہمیں پھر بھی یہیں رہنا یہیں جینا یہیں مرنا نکلنے کو تو لاکھوں بار نکلے بزمِ جاناں سے

مصرع اولے میں (ہمیں) موجود تھا اس لئے مصرع ثانی میں ہم کہنے کی ضرورت نہ تھی لفظ مذکور کو خارج کرنے سے (سو) کی جگہ (لاکھوں) رکھنے کی گنجائش ضمناً نکل آئی اور اس سے معنی میں اضافہ ہوگیا مصرع اولے سے لفظ (ہے) کم کر دینے پر عبارت میں زور پیدا ہوگیا یعنی مصرع ثانی کے لفظ (تو) کی رعایت سے مصرع اولے

میں (ہے اب) کی جگہ (پھر بھی) بہت خوب بنایا گیا۔

نظر رکھتے ہیں کیوں ہم وادیٔ غربت میں پہلو پر — نکل کر دل رفو چکّر نہ ہو چاکِ گریباں سے

اصلاح: نظر رکھتے ہیں کیوں ہم وادیٔ وحشت میں پہلو پر — نکل کر دل کہیں چلتا نہ ہو چاکِ گریباں سے

متانت زبان کے خیال سے (رفو چکّر) کم کر دیا گیا لفظ (کہیں) کے اضافے سے معنی میں وضاحت بڑھ گئی۔

خلیل الرحمٰن صاحب شعلہ دہلوی

جب پریشاں یار کی زلفِ دوتا ہو جائے گی — جان لیوا عشق میں کالی بلا ہو جائے گی

اصلاح: جب پریشاں رخ پہ وہ زلفِ دوتا ہو جائے گی — جان لیوا عشق میں کالی بلا ہو جائے گی

لفظ (یار) بغیر ترکیب فارسی کے اچھا نہیں معلوم ہوتا علاوہ اس کے زلفِ دوتا کے پریشان ہونے کے لئے رخ کی بھی ضرورت تھی۔

دل لگی دل کے لئے پیکِ قضا ہو جائے گی — جان کی خواہاں حسینوں کی ادا ہو جائے گی

اصلاح: دل لگی دل کے لئے وجہِ قضا ہو جائے گی — جان کی گاہک حسینوں کی ادا ہو جائے گی

پیکِ قضا ایک عام ترکیب تھی خواہاں اور گاہک میں جو لطیف فرق ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

نگاہِ ناز میں وہ ہلکی ہلکی جنبشِ شوخی — ہے گویا معنیٔ بے لفظ و شرحِ مختصر دیکھو

اصلاح: نگاہِ ناز میں ہیں ہلکی ہلکی گردشیں کیا کیا — ذرا تم معنیٔ بے لفظ و شرحِ مختصر دیکھو

(جنبشِ شوخی) کا ٹکڑا بے جوڑ تھا علاوہ اس کے دوسرے مصرع میں (ہے گویا) کی (ی) دبتی تھی (ہے) پہلے خواہ دوسرے مصرع کے شروع میں آ جائے تو (ی) کا اعلان بخوبی ہونا چاہئے اصلاح سے یہ دونوں عیوب مٹ گئے اور چستی پیدا ہو گئی۔

حکیم سید حسین عرف محمد اطہر صاحب زیبا ناروی

حسیں دوسرا کوئی ایسا نہیں ہے کسی اور پر کیا اٹھیں اب نگاہیں
زمانے میں جب ایک تم منتخب ہو تمھیں ہم نہ چاہیں تو پھر کس کو چاہیں

اصلاح: حسیں دوسرا کوئی ایسا نہیں ہے کسی اور پر کیا اٹھیں اب نگاہیں
زمانے میں بس ایک تم منتخب ہو تمھیں ہم نہ چاہیں تو پھر کس کو چاہیں

صرف ایک لفظ کی اصلاح ہے یعنی (جب) کی جگہ (بس) بنا دیا گیا لیکن کس قدر روانی آ گئی۔

وہ شئے کہ پڑا جس پہ ترے حسن کا سایہ — دنیائے محبت میں خدا میرے لئے ہے

اصلاح: وہ دل کہ پڑا جس پہ ترے حسن کا سایہ — دنیائے محبت میں خدا میرے لئے ہے

(شئے) کی جگہ لفظ (دل) رکھ دینے سے کیا بلاغت پیدا ہو گئی دل کا تعلق جو محبت اور حسن سے ہے وہ فطری ہے۔

یہ بدلی ہوئی رُت یہ ہوائیں یہ گھٹائیں — پینے کا زمانہ ہے کہ توبہ کا زمانہ

اصلاح: یہ نکھری ہوئی رُت یہ طرب خیز گھٹائیں — پینے کا زمانہ ہے کہ توبہ کا زمانہ

(بدلی ہوئی رُت) میں وہ بات نہ تھی جو (نکھری ہوئی رُت) میں پیدا ہو گئی (یہ ہوائیں یہ گھٹائیں) یہ ٹکڑا بہ نسبت پہلے ٹکڑے کے بہت کم زور تھا رُت میں بھی صفت مقدم تھی اور اب گھٹائیں کے لئے بھی

صفت مقدم (طرب خیز) کا لفظ آگیا۔

بند بابِ مے کدہ ہرگز نہ ہوگا حشر تک محتسب یہ بھی کوئی توبہ کا دروازہ ہوا

اصلاح بند بابِ مے کدہ ساقی کرے کیوں حشر تک محتسب یہ بھی کوئی توبہ کا دروازہ ہوا

ہوگا اور ہوا یہ دونوں لفظ قریب قریب ایک سے تھے لفظ ساقی کے رکھ دینے سے ترکیب اور معنی میں زور پیدا ہو گیا

وہ حسیں کتنے ہیں کب یہ رائے قائم ہو سکی حسنِ روز افزوں کا اب تک کس کو اندازہ ہوا

اصلاح وہ حسیں کتنے ہیں میں یہ رائے قائم کیا کروں حسنِ روز افزوں کا اب تک کس کو اندازہ ہوا

پہلے مصرع میں (کب) اور دوسرے مصرع میں (اب تک) اچھا نہ معلوم ہوتا تھا اصلاح نے ایک خاص بانکپن پیدا کر دیا

حافظ ریاض احمد صاحب ریاضؔ ناروی

فخرِ رسالت فخرِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کل نبیوں سے افضل اعظم صلے اللہ علیہ وسلم

اصلاح فخرِ رسالت فخرِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم بہتر برتر افضل اعظم صلے اللہ علیہ وسلم

پہلی صورت میں ذرا اور نبیوں کی توہین کا پہلو نکلتا تھا اب برابر کے الفاظ رکھنے سے وہ بات بھی جاتی رہی اور تناسب بھی آگیا۔

جب ہوئے پیدا شاہِ دو عالم آنے لگی آواز پیہم صلے اللہ علیہ وسلم صلے اللہ علیہ وسلم

اصلاح سارا عالم ہو گیا شیدا ہو گئے جب عالم میں پیدا صلے اللہ علیہ وسلم صلے اللہ علیہ وسلم

اصلی صورت میں مطلع ہونے کا بھی دھوکا ہوتا تھا کیوں کہ بے ردیف کی اکثر زمینوں میں بھی شعر کہے جاتے ہیں تقابل ردیف تو اسے نہیں کہہ سکتے مگر یہ شکل کچھ اچھی نہیں علاوہ اس کے (آنے لگی آواز پیہم) اس کا نتیجہ کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا اب مطلب صاف ہو گیا اور وہ خرابی بھی رفع ہو گئی۔

اسی طرح کچھ اصلاحیں حافظ صاحب کے اور شعروں پر بھی ہیں جن کی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں مبصر نگاہیں آسانی سے اندازہ کر لیں گی صرف شعر اور اصلاح لکھے دیتا ہوں۔

حبیبؐ و محبوب کبریا ہو درود تم پر سلام تم پر شرف میں ہر ایک سے سوا ہو درود تم پر سلام تم پر

اصلاح حبیبؐ و محبوب کبریا ہو درود تم پر سلام تم پر شرف میں سب سے تمھیں سوا ہو درود تم پر سلام تم پر

تمھارے رتبے ہیں سب سے اعلیٰ تمھارے درجے ہیں سب سے اعلیٰ خدا کے نزدیک جانے کیا ہو درود تم پر سلام تم پر

اصلاح تمھارے رتبے ہیں سب سے اعلیٰ تمھارے درجے ہیں سب سے بالا خدا نہیں جلوۂ خدا ہو درود تم پر سلام تم پر

وہ کہتے ہیں سناؤ داستانیں پھر مصیبت کی کہانی غم کی قصہ درد کا روداد الفت کی

اصلاح وہ کہتے ہیں سناؤ سرگذشت اپنی مصیبت کی فسانے غم کے قصہ درد کا روداد الفت کی

وہ آئے تھے پہلو میں کیا جان کر ذرا میں سنے چھیڑ اخفا ہو گئے

اصلاح ہمیشہ یہ عادت تمھاری رہی ذرا میں سنے چھیڑ اخفا ہو گئے

یہ عالم رہا مدتوں عشق میں حسیں جس کو دیکھا فدا ہو گئے

اصلاح یہ عالم ہیں عالم ہمارا رہا حسیں جس کو دیکھا فدا ہو گئے

دو روزہ زیست کا ہم فلسفہ نہ سمجھے تھے جو مر گئے تو ہمیں مر کے یہ ہوا معلوم

اصلاح مآل عمرِ دو روزہ کا اپنی کچھ بھی نہ تھا ۔ جو مر گئے تو ہمیں مر کے یہ ہوا معلوم

اُسی کا عشق ہے دنیائے اہلِ الفت میں ۔ جسے خدائی بھی ہونے لگے خدا معلوم

اصلاح اُسی کا عشق ہے قدر و لحاظ کے قابل ۔ جسے خدائی بھی ہونے لگے خدا معلوم

یہی تو رازِ حقیقت کا ایک پردہ ہے ۔ خودی جو مٹ گئی ہونے لگا خدا معلوم

اصلاح یہی تو رازِ حقیقت کا ایک پردہ تھی ۔ خودی جو مٹ گئی ہونے لگا خدا معلوم

فدائے یار ہوئے جو فدائے یار رہے ۔ وہی تو عشق کی دنیا میں باوقار رہے

اصلاح فدائے یار ہوئے جو فدائے یار رہے ۔ وہی وفائے محبت میں ذی وقار رہے

کس لئے آپ علاجِ دلِ شیدا نہ کریں ۔ پہلے بیمار کیا ہے تو اب اچھا نہ کریں

اصلاح کس لئے آپ علاجِ دلِ شیدا نہ کریں ۔ پہلے بیمار کیا اب اسے اچھا نہ کریں

آئی تو یاد کب مری اُس گل عذار کو ۔ دیکھا جو رہ گذر میں کسی کے مزار کو

اصلاح آئی ہماری یاد تغافل شعار کو ۔ دیکھا جو رہ گذر میں کسی کے مزار کو

کہنے لگی کہ آج یہ اکسیر ہو گیا ۔ جب وہ اُڑا چکے مرے مشتِ غبار کو

اصلاح کہنے لگے یہ خاک سے اکسیر ہو گیا ۔ جب وہ اُڑا چکے مرے مشتِ غبار کو

ہم کھڑے ہیں کب سے کوہِ طور پر ۔ اُن کا جلوہ کیوں نظر آتا نہیں

اصلاح ہم کھڑے ہیں کب سے کوہِ طور پر ۔ اُس کا جلوہ اب نظر آتا نہیں

جی بجا ہے جفا نہیں کرتے ۔ شکوۂ غم پہ کیا نہیں کرتے

اصلاح جی بجا ہے جفا نہیں کرتے ۔ وہ مرے دل پہ کیا نہیں کرتے

عشق تیرا ذکر تیرا صرف میرے دل میں ہے ۔ اور کیا ہے الفتِ اغیار تیرے دل میں ہے

اصلاح صرف تیرا درد تیری یاد میرے دل میں ہے ۔ اور جو اس کے علاوہ ہے وہ تیرے دل میں ہے

یہ اپنی عمر میں ہم نے عجیب کام کیا ۔ کہ جان و دل کو ترے عشق میں تمام کیا

اصلاح یہ ہم نے جوششِ محبت میں خوب کام کیا ۔ تمام خود بھی ہوئے دل کو بھی تمام کیا

نئی صورت نیا نقشہ نیا انداز ہوتا ہے ۔ شروعِ عشق سے اس کا ستم آغاز ہوتا ہے

اصلاح نیا عالم نیا نقشہ نیا انداز ہوتا ہے ۔ کہ انجامِ وفا سے ظلم کا آغاز ہوتا ہے

جناب ڈاکٹر موتی لال صاحب ککڑ الہ آبادی

مرے غم کو کوئی پوچھے مرے ٹوٹے ہوئے دل سے ۔ کہ ان آنکھوں میں دو آنسو بھی اب آتے ہیں مشکل سے

اصلاح مرے غم کو کوئی پوچھے مرے ٹوٹے ہوئے دل سے ۔ کہ دو آنکھوں میں دو آنسو بھی اب آتے ہیں مشکل سے

حیات و موت کا اب فلسفہ سمجھا کرے دنیا ۔ جسے بڑھنا تھا آگے بڑھ گیا دنیا کی منزل سے

اصلاح حیات و موت کا اب فلسفہ سمجھا کرے کوئی ۔ جسے بڑھنا تھا آگے بڑھ گیا دنیا کی منزل سے

آج رہنے دیجئے یوں ہی نظامِ کائنات ۔ کل جو ممکن ہو بدلئے گا خدا ہونے کے بعد

اصلاح آج رہنے دیجئے یوں ہی نظامِ کائنات ۔ کل خدائی کو بدلئے گا خدا ہونے کے بعد

فرطِ وحشت میں کسی کا کوئی پرساں نہ ملا
ہاتھ کو ہاتھ گریباں کو گریباں نہ ملا

اصلاح
جوشِ وحشت میں کسی کا کوئی پرساں نہ ملا
ہاتھ کو ہاتھ گریباں کو گریباں نہ ملا

طوافِ خانۂ صیاد کو آنے لگے تنکے
نشیمن آگ دے دینے کے قابل ہوتا جاتا ہے

اصلاح
طوافِ خانۂ صیاد کو بڑھنے لگے تنکے
نشیمن آگ دے دینے کے قابل ہوتا جاتا ہے

اُدھر وہ شان جلووں کی فراوانی نہیں جاتی
اِدھر یہ حال کوئی شکل پہچانی نہیں جاتی

اصلاح
اُدھر وہ شان جلووں کی فراوانی نہیں جاتی
اِدھر یہ شکل کوئی شکل پہچانی نہیں جاتی

راز ہو جائے نہ افشا کہیں مے خانے کا
دل دھڑکتا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

اصلاح
راز ہو جائے نہ ظاہر کہیں مے خانے کا
دل دھڑکتا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

جہاں سب رونے والے ہوں وہاں رونے کا کیا حاصل
ذرا ہنستے ہوئے گورِ غریباں سے گذر جانا

جہاں سو رونے والے ہوں وہاں رونے سے کیا حاصل
ذرا ہنستے ہوئے گورِ غریباں سے گذر جانا

آئی ہوئی بہار چلی بھی گئی مگر
دامن کو تار تار کئے جا رہا ہوں میں

اصلاح
آئی بہار اور چلی بھی گئی مگر
دامن کو تار تار کئے جا رہا ہوں میں

دیکھا بھی تم کو دل بھی دیا آرزو بھی کی
اپنی خطا شمار کئے جا رہا ہوں میں

اصلاح
دیکھا بھی تم کو دل بھی دیا آرزو بھی کی
اِک اِک خطا شمار کئے جا رہا ہوں میں

وہ کیا کیا مسکراتے ہیں مری عرضِ تمنا پر
مگر جو بات ہونی چاہتی تھی وہ نہیں ہوتی

اصلاح
وہ کیا کیا مسکراتے ہیں مری عرضِ تمنا پر
مگر جو بات ہونی چاہئے پھر بھی نہیں ہوتی

آشیاں کی سے لیے قفس میں چھیڑ کر کیا شاد ہوں
سب کہیں گے میں حدودِ قید سے آزاد ہوں

اصلاح
آشیاں کی لے قفس میں چھیڑ کر کیا شاد ہوں
سب یہ سمجھیں گے حدودِ قید سے آزاد ہوں

لہو کا ایک قطرہ ہی سہی پھر بھی مرا دل ہے
جو بہ نکلے تو دریا ہے ٹھہر جائے تو ساحل ہے

اصلاح
لہو کا ایک قطرہ ہی سہی پھر بھی مرا دل ہے
جو بہ نکلے تو دریا ہے جو رُک جائے تو ساحل ہے

برابر کی چوٹوں کا سہنا تھا مشکل
مگر عشق میں آئینہ ہو گئے ہم

اصلاح
نگاہوں کی چوٹوں کا سہنا تھا مشکل
مگر عشق میں آئینہ ہو گئے ہم

وہ سُن کے مسکرائے مجھے لطف آ گیا
جیسے یہی کمی تو مری داستاں میں تھی

اصلاح
وہ سن کے مسکرائے مجھے لطف آ گیا
جیسے کمی اسی کی مری داستاں میں تھی

یہ دعا کرتے ہیں سب جی سے گذرنے والے
وہ سلامت رہیں مرتے رہیں مرنے والے

اصلاح
یہ دعا مانگتے ہیں جی سے گذرنے والے
تم سلامت رہو مرتے رہیں مرتے والے

عابد مسیح صاحب کا لکھا ہوا دلچسپ اور مفید مضمون ختم ہوگیا اس میں کوئی شک نہیں کہ اصلاحی خوبیاں اُنھوں نے بہت اچھی طرح دکھائیں ہر اصلاح کی وجہ اصلی اور اشعار کے عیوب نہایت شرح و بست کے ساتھ لکھ دئے اب اس پر نہ کسی مزید شرح کی ضرورت نہ کسی تفصیل کی حاجت ہے۔

اصلاح کے متعلق سب سے پہلے ایک کتاب (مشاطۂ سخن) صفدر صاحب مرزاپوری نے لکھنؤ سے شایع کی جس میں بہت سے قدیم اساتذہ کی اصلاحوں کے نمونے مع اصلاح اور وجوہ اصلاح موجود ہیں اِس میں کوئی کلام نہیں کہ صفدؔر صاحب نے ایک بڑا کام انجام دے کر ادبی خدمات میں نمایاں اور ضروری اضافہ فرمایا۔ پھر اِس صورت میں کہ اصلاحوں کو ایک مدت ہوگئی تھی نہ وہ استاد زندہ تھے نہ وہ شاگرد موجود تھے اِس جاں کاہی اور تلاش کی جس قدر بھی اُنھیں داد دی جائے وہ کم ہے۔ اُنھیں کی دیکھا دیکھی عبدالعلی صاحب شوؔق سندیلوی نے بھی ایک نئی بات سوچی وہ اِس صورت میں کہ سولہ غزلوں پر اُنھوں نے بیالیس[۴۲] اساتذہ اور مشاہیر ہند یعنی سید علی احسن صاحب احسؔن مارہروی۔ سید انور حسین صاحب آرزؔو لکھنوی۔ سید فضل حق صاحب آزاؔد عظیم آبادی۔ سید مشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی۔ سید افضل علی خاں عرف چھوٹے بھیا صاحب افضؔل لکھنوی۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب اقبؔال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لاہوری لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی۔ مولوی فضل الرحمٰن صاحب باقؔی غازی پوری۔ مرزا عاشق حسین صاحب بزؔم۔ اکبر الہ آبادی۔ سید حسین احمد میاں صاحب بیتؔاب شاہ جہاں پوری۔ سید وحید الدین احمد صاحب بیخوؔد دہلوی۔ سید محمد احمد صاحب بیتؔاب خود موہانی۔ مرزا ذاکر حسین صاقبؔ لکھنوی۔ حکیم افتخار حسین صاحب جگرؔ بسوانی جلیل القدر فصاحت جنگ حافظ جلیل حسن صاحب جلیؔل مانک پوری۔ منشی محمد ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہ جہاں پوری۔ سید امیر حسن صاحب دلگیر مارہروی۔ شمس العلما سید محمد یوسف صاحب رنجوؔر عظیم آبادی سید ریاض احمد صاحب ریاؔض خیر آبادی۔ حافظ محمد جعفر زہریؔ خیر آبادی ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائؔل دہلوی۔ خان بہادر میر محمد صاحب شاؔد عظیم آبادی۔ حافظ اعجاز علی صاحب شہرؔت امیٹھوی۔ حکیم سید حسین مرتضےٰ صاحب شفؔق عماد پوری۔ منشی احمد علی صاحب شوؔق قدوائی۔ مولانا سید احمد حسن صاحب شوکتؔ میرٹھی۔ مولانا سید علی نقی صاحب صفؔی لکھنوی۔ حکیم سید نور الدین صاحب عتیقؔ حیدر آبادی۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیؔز لکھنوی۔ مولانا شوکت علی خاں صاحب فاؔنی بدایونی۔ سید عابد علی صاحب کوثؔر خیر آبادی۔ مرزا محمد تقی بیگ صاحب مائؔل دہلوی۔ مرزا کاظم حسین صاحب محشؔر لکھنوی۔ اعتبار الملک سید افتخار حسین صاحب مضطؔر خیر آبادی۔ مولوی سید محمد شرف الدین صاحب مومؔن ٹونکی۔ ابوالعلا حکیم سید سعید احمد صاحب ناطقؔ کان پوری نواب حیدر یار جنگ مولانا سید علی حیدر صاحب طبا طبائی نظمؔ لکھنوی۔ سید نواب علی صاحب نواؔب بڑودوی۔ محمد نوح صاحب نوحؔ ناروی۔ مولانا نیاز محمد خاں صاحب نیاؔز فتح پوری۔ مولانا سید رضا علی صاحب وحشتؔ کلکتوی۔ مولانا عبد اللطیف صاحب یکتؔا جاوروی سے اصلاحیں لیں اور یہ کسی پر بھی ظاہر نہ ہونے پایا کہ اِن غزلوں کی اصلاحیں کسی وقت میں خاص صورت سے کتابی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کی جائیں گی ہر استاد نے یہی سمجھا کہ شوؔق صاحب میرے ہی شاگرد ہیں اور مجھی سے اصلاح لیتے ہیں اگر یہ راز لوگوں پر کھل جاتا تو سب اساتذہ نہایت غور و فکر سے اصلاح دیتے اور اِس صورت میں اصلی شانِ اصلاح چھپ جاتی اِس کتاب کا نام اصلاح سخن لکھائی چھپائی کے لحاظ سے بھی بُری نہیں طالبانِ فن کو استفادہ کے لئے اِس کو دیکھنا چاہئے جہاں اور بہت سے حضرات کی اصلاحیں ہیں وہاں نوحؔ صاحب کی بھی اصلاحیں اِس موقع پر کچھ اشعار کی اصلاحوں کا لکھ دینا میرے خیال میں نامناسب نہ ہوگا۔

اصلی شعر ٹکڑے دل کرتا ہوا جھونکا نسیمِ صبح کا بلبلِ نالاں کے حق میں تیز خنجر ہو گیا

آرزو جس نے گل بکھرا دیئے موجہ وہ بادِ تند کا بلبلِ شیدا کے حق میں تیز خنجر ہو گیا

اطہر قید میں صیاد کی جھونکا نسیم صبح کا بلبلِ نالاں کے حق میں تیز خنجر ہو گیا

باقی دل کو ٹکڑے کر گیا جھونکا نسیم صبح کا یعنی وہ میرے قفس میں آ کے خنجر ہو گیا

بزم کیا دیا چیں بر جبیں ہونے نے وقتِ ذبح کام اُن کو غصے میں جو دیکھا تیز خنجر ہو گیا

بے باک جو گرا پتہ وہ تاثیرِ خزاں سے باغ میں

بے خود موہانی یہ بھی قسمت جاں فزا جھونکا نسیمِ صبح کا بلبلِ حسرت زدہ کے حق میں خنجر ہو گیا

جلیس دل کو ٹکڑے کر گیا جھونکا نسیمِ صبح کا

دل گردشِ قسمت سے ہر جھونکا نسیمِ صبح کا

ریاض باڑھ دے سکتا نہیں خنجر کو کوئی اس طرح جب نگہ قاتل نے کی تیز اور خنجر ہو گیا

شاد اے خزاں جھونکا کہاں تیرا کہاں بلبل کا دل اُس زبوں قسمت کے حق میں تیز خنجر ہو گیا

شفق چل گیا صرصر کا اک جھونکا چمن میں جس گھڑی ذبح بلبل کے لئے اک تیز خنجر ہو گیا

شوق قلم زد

عزیز قلم زد

مصفر جب چلا گلزار میں جھونکا نسیمِ صبح کا

نوح جو گرا پتہ خزاں میں شاخِ گل سے ٹوٹ کر

سائلؔ، جگرؔ، بے خودؔ دہلوی، صفیؔ، فانیؔ، وحشتؔ نے کوئی تصرف نہیں کیا شعر کو بدستور رہنے دیا۔

اصلی شعر ساتھ پروانے کے جل جل کے دلِ شمع نصیب داخلِ ملتِ اربابِ وفا ہو جانا

آرزو جل کے پروانوں کے ساتھ اے دلِ ہم قسمتِ شمع

اطہر مثلِ پروانہ کسی بزم میں جل کر اے دل تو بھی اب شاملِ اربابِ وفا ہو جانا

افضل ساتھ پروانوں کے جل جل کے دلِ شمع صفت

باقی ساتھ پروانوں کے جل جل کے دلِ سوز نصیب

جگر شمع پروانوں سے کہتی ہے کہ جل کر دم صبح

دل شاملِ صحبتِ اربابِ وفا ہو جانا

سائل بوالہوس کو کسی تعلیم سے ہوگا نہ نصیب

شاد ساتھ پروانوں کے جل جل کے سرِ بزم اے دل

شہرت وہ مٹا کر مجھے کہتے ہیں مبارک یہ شرف

شوق جل کے پروانوں نے چاہا ترے عاشق کی طرح

مائل منھ سے کہنا تو ہے آسان بہت مشکل ہے

محشر ساتھ پروانوں کے جل جل کے سحر تک اے شمع

مظفر — شمع پروانے کے ارمان میں تو بھی جل کر
مومن — قلم زد
ناطق — مثل پروانوں کے جل جل کے دلِ شمع نصیب
نوح — ساتھ پروانوں کے جل بجھ کے ترا شمع سحر
نیاز — مثل پروانوں کے جلتا ہی نہیں اے دلِ زار
وحشت — ساتھ پروانوں کے جل جل کے دلِ شمع صفت

بے باک، عزیز، احسن، آرزو، بزم، بے خود دہلوی، جلیل، ریاض، صفی، یکتا نے بدستور رہنے دیا۔

اصل شعر — دل سے ہوتی ہے تو خالی کبھی کہیں جاتی ہے — تم یہ چاہو کہ مرے قلب پہ تاثیر نہ ہو
احسن — دل سے ہوتی ہے تو جاتی نہیں خالی فریاد — غیر ممکن ہے کہ تم پر کوئی تاثیر نہ ہو
آرزو — قلم زد
اطہر — دل سے ہوتی ہے تو خالی نہیں جاتی ہرگز — غیر ممکن ہے دعا میں مرے تاثیر نہ ہو
بزم — لاکھ چاہو کہ مرے قلب پہ تاثیر نہ ہو
بے خود دہلوی — یہ تو ہونی ہی نہیں آہ میں تاثیر نہ ہو
بے خود موہانی — آہ نکلی جو مرے دل سے تو پھر خیر نہیں — تم یہ چاہا کرو دل پر مرے تاثیر نہ ہو
جلیل — دل سے ہو آہ تو خالی بھی کہیں جاتی ہے
دل — دل سے ہو آہ تو خالی بھی کہیں جاتی ہے
ریاض — آپ پر اور مری آہ کی تاثیر نہ ہو
سائل — نالۂ دل تو بری دل پہ بنا دیتا ہے — لاکھ تم چاہو کہ دل پر مرے تاثیر نہ ہو
شاد — دل سے نکلا ہے اثر چاہے گا نالہ دل پر — تم کو یہ ضد کہ مرے قلب پہ تاثیر نہ ہو
شہرت — نہیں ممکن کہ ترے قلب پہ تاثیر نہ ہو
شفق — قلم زد
شوق — اُس پہ امید اثر آہ کی نادانی ہے — جس کے گھر زہر بھی کھاؤں میں تو تاثیر نہ ہو
صفی — دل سے نکلی ہے مری آہ یہ ناممکن ہے — تم جو چاہو کہ مرے قلب پہ تاثیر نہ ہو
عزیز — غیر ممکن ہے ترے قلب پہ تاثیر نہ ہو
ناطق — قلم زد
نوح — میں یہ چاہوں کہ فغاں نکلے تو دل ہی میں رہے
وحشت — قلم زد

اصل شعر — بالآخر بے زبانی پر دہانِ زخم بسمل کی — زبانِ تیر قاتل سے صدائے آفریں نکلی
اطہر — دہانِ زخم سے بسمل نے دی جب داد قاتل کو — زبانِ تیغ قاتل سے صدائے آفریں نکلی
بے باک — زبانِ تیغ قاتل سے صدائے آفریں نکلی

بےخود موہانی	خموشی پر دہانِ زخم کی پیار آگیا آخر	
دل	دلِ درد آشنا کو وقفِ ایذا پا کے مقتل میں	
ریاض	لیا کام اس طرح قاتل نے اپنے دستِ نازک سے	دہانِ زخم بسمل سے صدائے آفریں نکلی
سائل	سکوت و بے زبانی پر دہانِ زخم بسمل کی	
شفق	دہانِ زخم بسمل بے زباں تھا واہ کیا کہنا	زبانِ تیغ قاتل سے صدائے آفریں نکلی
شوق	ترے عاشق نے تیرا تیر کھا کر آہ کی نا حق	نہ کیوں کم بخت کے منھ سے صدائے آفریں نکلی
فانی	ادا سے بے زبانی پر دہانِ زخم بسمل کی	
نوح	صلہ میں نے یہ پایا قتل گہ میں جان دینے کا	زبانِ تیغ قاتل سے صدائے آفریں نکلی
نیاز	قلم زد	
وحشت		زبانِ تیغ قاتل سے صدائے آفریں نکلی

عزیز۔ بزم۔ بےخود دہلوی۔ جلیل۔ صفی نے بدستور قائم رکھا۔

اصلی شعر	دل میرا مجھی کو پھیرتا جا	ظالم ترے کام کا نہیں ہے
آرزو		جب یہ ترے کام کا نہیں ہے
اطہر	دل پھیر کے میرا مجھ کو بولے	یہ تو مرے کام کا نہیں ہے
باقی	یہ دل تو ہے داغ دارِ الفت	
جگر	مظلوم یہ دل ہے پھیر دے تو	
دلگیر	آشفتہ ہے بے قرار ہے دل	
ریاض	مجھ کو تو پھیر دے مرا دل	
شوق	دل مانگ رہے ہیں یوں وہ مجھ سے	گویا مرے کام کا نہیں ہے
فانی	قلم زد	
نوح	ناکام ازل ہے دل ہمارا	
یکتا	دل میرا مجھی کو پھیر دیجیے	

احسن۔ آزاد۔ بزم۔ بیباک۔ بےخود دہلوی۔ ثاقب۔ جلیل۔ دل۔ سائل۔ شاد۔ شفق۔ صفی۔ عزیز۔ مضطر۔ نواب۔ وحشت نے بدستور قائم رکھا

اصلی شعر	ایسی کیا خوش خبری لائے ہوا کے جھونکے	دل مسرت سے اچھلنے لگے دیوانوں کے
آرزو		دل جو غنچوں کی طرح کھل گئے دیوانوں کے
اطہر	مژدۂ موسمِ گل لائی نسیمِ سحری	
افضل	لاکھ صحرا میں جنوں کو ہو ترقی حاصل	حوصلے پست نہ ہوں گے ترے دیوانوں کے
بیباک	کون سی خوش خبری لائے ہوا کے جھونکے	دل خوشی سے جو اچھلنے لگے دیوانوں کے
بےخود موہانی	کچھ نہ کچھ خوش خبری لائے ہوا کے جھونکے	دل مسرت سے اچھلتے ہیں جو دیوانوں کے

جگر		دل مسرت سے پھڑکنے لگے دیوانوں کے
دل	دفعتاً ولولہ انگیز ہوا پھر سنکی	
ریاض	آج کیا ایسی خبر لائے ہوا کے جھونکے	
سائل	ایسی کیا خوشش خبری لائی نسیم سحری	
شاد	کیا خبر دی کسی جھونکے نے کہ صحرا کی طرف	خود بخود پاؤں کھنچے جاتے ہیں دیوانوں کے
شوکت	فصلِ گل آتے ہی وحشت کی ہوا پر ہیں سوار	
شوق		دل شگفتہ جو ہوئے جاتے ہیں دیوانوں کے
مائل	میں وہ دیوانہ ہوں مجنوں بھی مجھے کہتا ہے	قبلہ و کعبہ مگر آپ ہیں دیوانوں کے
محشر		اور کچھ ہو گئے تیور ترے دیوانوں کے
نوح	ایسی کیا خوشش خبری لائی بیاباں کی ہوا	

بزم۔ مضطر۔ وحشت۔ احسن۔ شفق۔ صفی۔ فانی۔ ناطق نے اسی طرح رہنے دیا۔ خود اپنے اشعار پر اصلاح۔

پہلے تھا

یہ بھی اچھا ہے کہ وہ دل کو مرے چور کریں　　ایک آئینے سے بن جائیں کئی آئینے

ترمیم

یہ بھی اچھا ہے کہ وہ دل کو مرے چور کریں　　ایک آئینے سے بن جائیں ہزار آئینے

پہلے تھا

شمع کے سر پہ بھی آفت آئی پروانے کے ساتھ　　کر دیا دونوں کو اُس نے اپنی محفل سے الگ

ترمیم

شمع کے سر پہ بھی آفت آئی پروانے کے ساتھ　　کر دیا دونوں کو جل کر اُس نے محفل سے الگ

اصلاح کے متعلق بہت کچھ طوالت ہوگئی لیکن یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے استاد کی معلومات وسیع النظری قوتِ مشق، فکرِ سخن کا اندازہ ہوتا ہے میرے خیال میں اپنی غزل کہہ لینی تو آسان ہے لیکن اصلاح دینی آسان نہیں اپنی غزل میں تو اپنے خیالات ہوتے ہیں جس طرح چاہئے نظم کر دیجیئے۔ مضمون کے لئے مناسب الفاظ فوراً ہی ذہن میں آجاتے ہیں مگر دوسرے شخص کے خیالوں کا سمیٹنا اپنی طرف سے لفظوں کا انتخاب کرنا بڑی دشوار بات ہے اصلاح کے لئے ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ مضمون وہی ہو لیکن لفظوں کی اُلٹ پھیر تغیر و تبدل سے نقائص رفع ہو جائیں اور شعر میں ایک خاص خوبی پیدا ہو جائے مندرجہ بالا اصلاحوں کے دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نوح صاحب کو اصلاح دینے میں بھی کہاں تک قدرت ہے پہلے انھیں کے شاگردوں پر انھیں کی اصلاحوں کے نمونے ہیں مگر آخر میں، جو اصلاح سخن مولفہ عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی سے کچھ اشعار مع اصلاح کے پیش کئے گئے اُن کے دیکھنے سے کچھ تو مختلف استادوں کی اصلاح کا اندازہ ہوتا ہے کہ کن صاحب کا خیال اصلاح دیتے وقت کہاں تک پہنچا یعنی کن صاحب نے شعر میں کیا تصرف فرمایا اور اسی کے ساتھ کچھ ہستی ایسی بھی آتی ہے کہ ایک جگہ وہی شعر قابل اصلاح نہیں سمجھا جاتا اور دوسری جگہ

اُسی پر اصلاح ہوتی ہے پھر تیسری جگہ وہ قلم زد کیا جاتا ہے اِس موقع پر جی تو یہی چاہتا تھا کہ ہر اصلاح کے متعلق کچھ اپنی ناقص رائے ظاہر کروں لیکن ادب مانع ہے کیوں کہ اصلاح دینے والوں کی فہرست میں جتنے اسمائے گرامی ہیں میں اُنھیں اپنا قابلِ احترام بزرگ جانتا ہوں اور لائقِ احترام سمجھتا ہوں لہذا اِس صورت میں بڑی گستاخی ہوگی اگر میں اپنے خیالات کا اظہار کسی کے موافق کسی کے خلاف کروں گا اِس میں کوئی شک نہیں ہر اصلاح اپنی جگہ خوب ہے تاہم کسی میں بڑی حد تک لطف ہے اور کسی میں اُس حد تک نہیں میں اِس معاملے کو ناظرین کے مذاق پر چھوڑتا ہوں اور اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتا۔

نوح کی مجموعی زندگی اور عام کلام کی کیفیت پر اجمالی نظر

شاعر کے ہر سوانح نگار کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ واقعاتِ حیات لکھنے کے بعد سب سے آخر میں شاعر کی مجموعی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے کثیر التعداد اشعار میں سے مختلف مذاق کے کچھ اشعار انتخاب کر کے پیش کرتا ہے اِس صورت میں اُسے ہر شعر کی خوبیاں شرح و بسط کے ساتھ ظاہر کرنی پڑتی ہیں چوں کہ بسیطِ عالم میں طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اِس لحاظ سے ہر مذاق کا خیال رکھنا اور سب کے مذاق کے موافق شعروں کا انتخاب کرنا پھر اُن پر تنقیدی نگاہ ڈالنی کوئی آسان کام نہیں بعض موقع پر دیکھا گیا ہے کہ وہی ایک شعر کہیں وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور وہی شعر کہیں کچھ بھی اثر نہیں پیدا کرتا یہ شعر کی خطا نہیں بلکہ اِس کو سامعین کے مذاق کی مخالفت اور مطابقت کا اثر سمجھنا چاہیئے اتفاقِ وقت ہے اگر کوئی شعر کسی کے حسبِ حال ہوتا ہے تو بہ نسبت اُس شخص کے جس پر کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا یہ زیادہ متاثر ہوتا ہے یہ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ مشاعروں میں اچھے اچھے اشعار پر بعض وقت داد نہیں ملتی اور بعض وقت کمزور سے کمزور بڑی حد تک داد پا جاتے ہیں کچھ تو شاعر کا ذاتی وقار کچھ پڑھنے کا طریقہ یہ دونوں قوتیں مل کر اپنا کام کر جاتی ہیں لیکن کاغذ پر پہنچ کر وہی شعر نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رکھتا کاغذ پر نہ مصنف کی حضوری ہوتی ہے نہ نغمہ سرائی کا اثر ہوتا ہے صرف شعر کی اصلی تصویر نگاہوں میں رہتی ہے اِس صورت میں بھی اگر شعر اچھا ثابت ہو تو میرے خیال میں وہ کامیاب کہا جا سکتا ہے کچھ دنوں سے مشاعروں میں شعرا ترنم یا نغمہ سرائی کی لے میں اپنی غزلیں پڑھتے ہیں سامعین کی ذہنیت خوش گلوی اور نغمہ سرائی پر فوراً منتقل ہو جاتی ہے اِس سبب سے بیش تر بُرائیاں اور اکثر خوبیاں بھی نگاہوں سے پوشیدہ رہ جاتی ہیں جب سننے والے کا خیال شعر سمجھنے کے لئے حاضر نہیں تو اُس وقت کی داد بھی حقیقتاً داد کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی یہ تعریف شعر کی نہیں ہوتی بلکہ خوش آوازی کی معجز نمائی ہے اور نال سم آواز کا اُتار چڑھاؤ دل کشی وغیرہ کا ایک خاص کرشمہ ہے۔

نوح صاحب ایک بہت معمولی گاؤں بھوانی پور ضلع رائے بریلی اپنے ننہال میں پیدا ہوئے کم سنی ہی میں باپ کا سایہ ہمیشہ کے لئے سر سے اُٹھ گیا جملہ پرورش و پرداخت نانا کے ذمے تھی وہاں کسی زمانے میں ہر طرف علم و فضل و کمال و فن کی ضیا باری ہو رہی تھی بلکہ زمانے کے انقلاب نے اب اِس کو کسی قابل نہ رکھا تھا نہ وہ لوگ باقی تھے نہ علم و فن کی گرم بازاری تھی چند چراغ جھلملا رہے تھے جن کا عدم وجود دونوں برابر تھا باپ کے انتقال کرتے ہی جائداد کے متعلق طرح طرح کے دعوے ہوئے خانگی جھگڑوں میں گھر کا سرمایہ برباد ہوتا رہا گھر ہی پر والدہ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی نہ کوئی نگراں نہ کوئی تاکید کرنے والا جو کچھ پڑھا لکھا محض اپنے ذاتی شوق سے پڑھا لکھا عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو مہاجنوں کے تقاضے تھے اپنے

حسنِ انتظام سے بغیر کسی گانو کے الگ کئے ہوئے نہایت جواں مردی اور مستقل مزاجی سے قرض کے بار کو اپنے سر سے اُتارا اور بینک میں بھی بہت کچھ جمع کیا اور جو وقتی اور ناگہانی زحمتیں پیش آتی رہیں اُن کے رفع کرنے کی بھی تدابیر فرماتے رہے جن میں فضلِ خداوندی کا بھی زبردست ہاتھ شامل رہتا تھا جو شخص اتنے مصائب اور ہزاروں قسم کے افکار میں مبتلا ہو وہ شاعری کے لئے کسی طرح موزوں نہیں لیکن اللہ کی دین تھی کہ گھر بیٹھے یہ دولتِ بے زوال انھیں ملی یہ دنیا بھر کے کام بھی کرتے تھے اور فرصت کے وقت شعر بھی کہتے تھے جس نے اِن کا ابتدائی حال دیکھا ہے اُس کو یہ کبھی یقین نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی وقت میں یہ ایک ایسے مکمل شاعر ہوں گے جن کو دنیا مانے گی اور جن کا شاعرانہ اعزاز تمام ہندوستان میں ایسا بڑھے گا کہ بڑے بڑے نامی گرامی مشاعروں میں صدارت کی کرسیاں خالی کی جائیں گی۔

پہلے پہلے شاعری میں اِنھوں نے میر نجف علی صاحب نجفؔ سے اصلاح لی پھر اُنھیں کے حکم پر متعدد اساتذہ سے خط و کتابت کی آخر میں دبیر الدولہ ناظم یار جنگ فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے اور ایسے شاگرد ہوئے کہ اپنے استاد کے نام کو بھی اپنے نام کے ساتھ روشن کر دیا آج وہ زندہ ہوتے تو ان کا کمال دیکھ کر اظہارِ مسرت فرماتے اور فرطِ مسرت سے اپنے جامے میں پھولے نہ سماتے تاہم اُن کی روح فخر کرتی ہوگی بغیر کہے سُنے گھر سے چل کر پہلی بار اُن کی خدمت میں حیدرآباد پہنچے پھر گھر کا انتظام کر کے اطمینان سے دوبارہ بھی حاضر ہوئے حضرت داغؔ کی شفقت بزرگانہ جیسی کچھ اُن پر رہی اُس کو دیکھنے والوں نے دیکھا ہے اور اُس سند سے بھی پتہ چلتا ہے جو خوش ہو کر اور اچھی طرح جانچ پرکھ کر اِن کو انھوں نے مرحمت فرمائی انھیں عنایاتِ بزرگانہ کو اِس قدر زمانہ گذر جانے پر جب یہ یاد کرتے ہیں تو رو دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج استاد زندہ ہوتے تو زیادہ فیض حاصل کرنے کا موقع ملتا اِس زمانے میں جو کچھ وہ اصلاح دیتے وہ کچھ اور ہی اصلاح ہوتی۔

انھوں نے مختلف مقامات کے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی اپنے اشعار سے سامعین کو بے خود کیا صدارت کو زینت دی جہاں گئے وہاں سے کامیاب پھرے اِس وقت کسی اور کے شاگردوں کی تعداد اِتنی نہ ہوگی جس قدر اِن کے شاگردوں کی ہے کوئی شہر ہندوستان میں ایسا نہ ہوگا جہاں کوئی نہ کوئی اِن کا نام لیوا موجود نہ ہو لوگ صعوبتِ سفر اُٹھا اُٹھا کر اِن سے ملنے کے لئے اِن کے دولت خانے پر آتے ہیں اِن کا فیض کسی خاص جماعت پر منحصر نہیں ہندو، مسلمان، عیسائی ہر مذہب و ملت کا آدمی شاگردوں کی فہرست میں نظر آتا ہے۔

لوگوں کا یہ خیال خدا جانے کہاں تک درست ہو کہ شاعری بغیر صحبتِ شعرا کے نہیں آتی اِس کے لئے ایسی محفل کی ضرورت ہے جہاں دو چار شاعر ہر وقت نغمہ سنجی کرتے ہوئے پائے جائیں مگر اِن کو اپنے وطن میں ایسا موقع کہاں پیش آیا اِنھوں نے ایسے وقت میں آنکھیں کھولیں جب زمانے کی دستبرد نے اُن ہستیوں کو مٹا دیا تھا جو باعثِ فخر و مباہات تھیں دن رات رعایا سے اُنھیں کے لب و لہجہ میں ہم کلام ہونا اور پھر ایسے اشعار کہنے جو اہلِ زبان کی کسوٹی پر زبان کے لحاظ سے پورے پورے اُتریں اِنھیں کا کام ہے۔

ایک ایک بار حضرت سائلؔ دہلوی تارہے تشریف لائے اور کئی روز تک ٹھہرے ان کو اپنے اسامیوں سے گفتگو سن کر فرمانے لگے کہ بھائی نوحؔ تم کمال کرتے ہو کہ مقامی گفتگو ایسی اور شاعری کی زبان ایسی سخت تعجب ہے کہ جب تم باہر قدم رکھتے ہو تو یہاں کے الفاظ یہیں چھوڑ جاتے ہو کیا مجال ہم لوگوں میں یہاں کا کوئی لفظ تمھاری زبان سے نکل جائے سخن گوئی کا مدّاح تو میں پہلے ہی سے تھا لیکن اب اس کی مدح سرائی بھی کروں گا چنانچہ دہلی پہنچ کر اس کا ذکر انھوں نے خاص خاص لوگوں کے علاوہ اپنے گھر میں بھی کیا حضرت داغؔ کی صاحب زادی مسکرا کر خاموش ہوگئیں کچھ دنوں کے بعد جب دہلی جاکر یہ اُن کے مہمان ہوئے تو ایک دن انھوں نے اِن سے دریافت کیا اور نفر سچا کچھ ایسے فقرے جو رعایا سے یہاں بولتے تھے اِن کی زبان سے سنے اور بہت دیر تک ہنستی رہیں اُس دن سے کئی روز تک یہ مشغلہ رہا کہ ان سے یہاں کے الفاظ سنتیں اور اپنی جگہ محو حیرت ہو جاتیں الغرض اِن سب خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اخباری تحریک پر حضرت سائلؔ نے اِنھیں حضرت داغؔ کا صحیح جانشین مان کر اپنی مہری دستخطی سند جانشینی مرحمت فرمادی ابتدا میں تو اس کی بابت بہت کچھ مخالفت اور مطابقت کا اظہار ہوا بہت سے اطراف ہند سے مضامین اخبارات اور رسالوں میں مہینوں تک نکلتے رہے لیکن آخر آخر جتنے مخالف تھے اُن سب کو اس تحریر کے آگے سر جھکا دینا پڑا کیوں کہ یہ تحریر معمولی تھی نہ لکھنے والا معمولی شخصیت کا آدمی تھا سائلؔ صاحب یا خود جانشین بنتے یا اور کسی کو بناتے چنانچہ حق بحق دار رسید کے خیال سے خوش ہو کر یہ سہرا اپنے دست مبارک سے انھوں نے ان کے سر باندھا میرے خیال میں اس کے لیئے دہلوی یا لکھنوی ہونا ضروری نہیں کمال ایک ایسی چیز ہے جس میں مقامی قیود کی ضرورت نہیں ہے دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ مختلف مقامات پر ایسی ہستیاں اس وقت بھی موجود ہیں جو مقامی خصوصیت والوں سے کسی طرح کم نہیں پھر کیا وجہ تھی کہ یہ شرف دہلی ہی تک محدود ہوتا اور نارہ محروم رہ جاتا جو کچھ بھی جناب سائلؔ نے جانشینی کا فیصلہ کیا وہ نہایت انصاف سے کیا اب اس اٹل فیصلے پر کسی وقت تجویز ثانی کی ضرورت ہی باقی نہ رہ گئی۔

پہلے بھی رسالے نکلتے تھے اور اب بھی نکلتے ہیں قدیم زمانے میں اِن کا کلام قریب قریب ہر زمانے اور ہر رسالے میں چھپتا رہا لیکن زمانہ حال میں خاص خاص رسالے اور بالخصوص سالنامون میں نظر آتا ہے مدیر رسالہ کی تحریک پر یہ اپنا کچھ نہ کچھ کلام بھیج دیتے ہیں مشاعروں میں ہر مہتمم مشاعرہ اِن کے بلانے کی کوشش کرتا ہے یہ شرکت کا وعدہ کریں یا نہ کریں اعزاز مشاعرہ بڑھانے کے خیال سے پوسٹر اور اشتہار میں نام ضرور درج ہو جاتے گا علاوہ اِس کے وہ اِن کے معاصرین کے خطوط بھی جو اِن کے نام وقتاً فوقتاً آتے ہیں ظاہر کر رہے ہیں کہ جملہ حضرات کے دل میں ایک حد تک وقار ہے متعدد کتابوں میں اِن کا ذکر خاص طور سے کیا گیا اور زمانے نے اِن کے متعلق اچھی رائے قائم کی اِس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود حضرت داغؔ نے ناخدائے سخن، انجمن مین پوری نے تاج الشعرا اور لسان العصر حضرت اکبرؔ الٰہ آبادی نے فصیح العصر کا خطاب عطا کیا۔

اصلاح زبان کی دُھن اِن کو ہمیشہ رہی اس باعث سے اپنی ذات خاص کے لیئے اِنھوں نے بہت سی قیدیں عاید کر لیں بہت سے الفاظ وقتاً فوقتاً ترک کر دیئے لیکن اِس کے ساتھ ہی شاگردوں

کو اختیار بھی دے دیا کہ وہ ترک کریں یا نہ کریں پھر بھی اکثر تلامذہ متروکات کا خیال رکھتے ہیں اور بہت سے پابند نہیں اِس میں کوئی شک نہیں کہ متروکات سے اظہارِ خیال کے لئے لفظوں کی کمی ہو جاتی ہے تاہم کلام میں خاص خوبیاں پیدا ہوتی ہیں پھر یہ کسی کو مجبور بھی نہیں کرتے اپنی ذات خاص کے لئے انھیں ہر طرح کا اختیار ہے علاوہ اِس کے اِن متروکات کا نباہنا ہر کسی کا کام نہیں اس کے لئے بڑی مشاقی کی ضرورت ہے۔

حضرت داغ کی صحبت میں جہاں اور بہت سی باتیں انھیں معلوم ہوئیں وہاں اصلاح دینے کا ملکہ بھی حاصل ہوا، چونکہ اصلاح لکھنے کی خدمت اِن کے سپرد تھی اِس سبب سے بہت سی غزلوں کی اصلاحیں یہ وہاں دیکھتے رہے اور انھیں باتوں سے اب کام لیتے ہیں اِن کی اصلاح میں یہ خاص خوبی ہے کہ مضمون وہی رہتا ہے لیکن دو ایک الفاظ کے الٹ پھیر اور مقدم موخر کے تغیر و تبدل سے شعر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے بعض لوگوں کو میں دیکھتا ہوں کہ شاگرد کے شعر کا مضمون کچھ ہے اور اصلاح کچھ دیتے ہیں مضمون کی نوعیت ہی قائم نہیں رہتی یعنی استاد کا شعر ہو جاتا ہے اور شاگرد سے کوئی تعلق باقی نہیں رکھتا پچھلے صفحوں میں بہت سے اصلاح کے نمونے درج ہو چکے ہیں اس کے متعلق زیادہ لکھنے کی اب ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

سفینۂ نوح دیوان اوّل ہے ۲۲۵ صفحے ۲۶۴ غزلیں اور ۲۱۷۶ اشعار ہیں اگرچہ ابتدائے زمانہ کا یہ کلام ہے مگر اِس سے اُس وقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے دنوں میں بھی انھوں نے کیسے اچھے اچھے شعر کہے ہیں دیوان کے آخر میں بڑے بڑے لوگوں کی تقریظیں اور تاریخیں ہیں اِن میں بہت سے حضرات ایسے ہیں کہ بغیر ذاتی معلومات اور بغیر سوچے سمجھے ہوئے کسی کے لغو اثر سے متاثر ہو کر فضول اِن کی تعریف لکھنے والے نہ تھے دیوان اوّل کے بعد دوسرا دیوان طوفان نوح بہت دنوں کے بعد شایع ہوا اُس وقت اِن کی مشق مکمل ہو چکی تھی اور یہ ہر طرح شاعر کہے جانے کے مستحق تھے پہلے دیوان میں استاد کا تصرف تھا دوسرے میں خاص انھیں کے قوتِ کمال کی جلوہ ریزی تھی ذہانت اور مشاقی کے لئے اِتنا موقع بہت تھا جو اِن کو سفینہ اور طوفان کی اشاعت کے درمیان میں ملا۔

دوسرے دیوان میں برخلاف پہلے دیوان کے حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدے، مرثیے، غزلیں قومی اخلاقی، ملکی تاریخیں، ظرافت وغیرہ الغرض ہر طرح کا سامان موجود ہے اِس کی قدر بہت زیادہ ہوئی لوگوں کی زبانوں پر اِس کے اشعار ہیں کثیر التعداد غزلیں گراموفون کے ریکارڈوں میں بھری گئیں ارباب نشاط نے محفلوں میں گا کر قدر دانوں سے خراجِ تحسین لیا بہت سے حضرات نے علاوہ قطعات، تاریخ ویقار نظم کے تبصرہ لکھا بیشتر رسالوں اور اخباروں میں تقریظیں چھپیں جناب جوشؔ ملسیانی نے اپنی گراں قدر رائے کا رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور کے جوبلی نمبر میں ۳۰ صفحوں پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ اظہار فرمایا یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جیسے جیسے شاعر کی مشق بڑھتی ہے ویسے ویسے اُس کے کلام میں طرح طرح کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں اس موقع پر جو بات زبان سے نکلتی ہے وہ پتھر کی لکیر ہوتی ہے سیدھی ترکیب پر بھی سامعین کلیجا تھام لیتے ہیں سادگی سے بناوٹ شرما جاتی ہے کیوں کہ مشاق شاعر جو کچھ کہے گا اُس کہنے کا انداز ہی جدا ہوگا شان ہی نرالی ہوگی بات وہی ہے جسے سب کہتے ہیں لیکن کہنے کا طریقہ بھی کوئی چیز ہے لوگ اِس طریقے کے لئے کوشش کرتے ہیں سر پھوڑتے ہیں مگر نہیں آتا

وہبی اور کسبی شاعری میں بڑا فرق ہے بے ساختہ منھ سے جو شعر نکل جائے گا وہ شعر ہوگا جس میں قوتِ فکر صرف کی جائے گی اس میں وہ بات قیامت تک پیدا نہیں ہو سکتی۔

تیسرے دیوان میں شاعری کے جملہ محاسن موجود ہیں اگر ایک جگہ میرؔ کی سادگی تو دوسری جگہ مرزا کی بلند پروازی ہے محاسنِ شعری میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف سہل ممتنع ہے اس کی نظیر یں کثرت سے دیکھنے والوں کو ملیں گی فی الحقیقت شعر کی بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کی نثر نہ ہو سکے بیشتر تو ان کے قلم سے ایسے شعر نکلتے ہیں جن کے لئے دوسرے الفاظ نہیں مل سکتے اگر کوئی نثر نظم کرنا چاہے تو وہی الفاظ سامنے آئیں گے جو استعمال ہو چکے ہیں طوفان نوحؑ کی طرح اس دیوان میں بھی حمد، نعت منقبت سلام۔ غزلیں۔ سہرے مختلف موقعوں کے قطعات رباعیاں۔ مخمس۔ مسدس۔ تاریخیں۔ سرکاری اخلاقی اصلاحی۔ وقتی۔ ملکی۔ قومی۔ اعزازی ظرافت وغیرہ وغیرہ سب کچھ ہے ان سرخیوں کو دیکھ کر ہر شخص بخوبی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا کچھ نہ ہوگا لیکن فی الحال غزلیں ہی شایع کی جاتی ہیں بقیہ چیزیں پھر شایع ہوں گی جس صنف پر قلم اٹھایا ہے بغیر گل کاری کئے ہوئے نہیں رہا بعض دیوانوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر غزل میں دو چار ہی شعر حقیقتاً شعر کہے جانے کے قابل ہوتے ہیں بقیہ معمولی اشعار کہہ کر غزل پوری کر لی جاتی ہے مگر اس دیوان میں یہ بات ہر گز نہیں۔ خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے کہ جس شعر میں کوئی لطف نہ ہو وہ رکھا ہی نہ جائے یہی وجہ ہے کہ ہر شعر میں ایک حسن نظر آتا ہے کوئی مصرع کوئی لفظ ایسا نہیں جس میں دل آویزی اور شاعرانہ خوبی موجود نہ ہو بہت سی غزلیں اس میں ایسی ملیں گی جن کی زمینیں بالکل نئی اور طبع زاد ہیں اب تک اُن طرحوں پر کسی نے اشعار نہیں کہے کل جدیدٌ لذیذٌ کا مسئلہ ہر وقت پیش نظر رکھا گیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ پامال زمینوں میں مزا نہیں اول تو اساتذہ اور کہنے والوں نے مضامین اوسع کوئی پہلو نہیں چھوڑا پھر انھیں زمینوں میں بار بار اشعار سُن سُن کر دلچسپی باقی نہیں رہتی مشاعروں سے تو مجبور ہو جانا پڑتا ہے ورنہ اپنی جگہ کہنے کے لئے نئے قوافی نئی ردیفوں پر طبیعت کی جولانیاں دکھائی گئی ہیں لوگوں کا عام طور سے یہ خیال ہے کہ غزل میں زور پیدا کرنے کے لئے صرف قافیے سے کام نہیں چلتا ردیف کا ہونا بھی ضروری ہے مگر اس خیال کی تردید میں بہت سی اور بالخصوص بڑی بحروں میں ایسی غزلیں لکھی گئیں ہیں جن کی نظیر ملنی آسان نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے کے لئے کسی خصوصیت کی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی اگر قوتِ فکر بخوبی ہے تو ہر رنگ ہر صنف میں وہ اپنا جوہر دکھا ہی جائے گی ان بے شمار اور بہترین اشعار میں سے کچھ اشعار انتخاب کر کے اُن پر تبصرہ لکھنا نہایت دشوار ہے دس پانچ یا سو پچاس شعر ہوتے تو یہ بھی ممکن تھا لیکن جب از ابتدا تا انتہا یہ دیوان تمام و کمال محاسن شعری سے مالا مال ہے تو کوئی کہاں تک اس مجموعے سے شعر انتخاب کرے اور اُن پر تنقیدی نگاہیں ڈالے انشاء اللہ تعالیٰ شایع ہونے پر اس کے متعلق بہت اچھے اچھے مضامین نکلیں گے اور دنیائے شاعری میں اس سرے سے اس سرے تک یہ ایک عظیم تہلکہ ڈال دے گا یہ دیکھا گیا ہے کہ زمانے میں مذاق اور مذاق کے ساتھ ساتھ طبیعتیں مختلف واقع ہوئی ہیں لہٰذا صاحبِ ذوق اپنی اپنی طبیعت کے موافق اس سے لطف اٹھائیں گے

اور خوش ہو ہو کر سچے دل سے داد دینے پر مجبور ہوں گے فقط

مجید احمد مجیدؔ و سہیل احمد سہیلؔ
ناروی

عطیہ عالی جناب نواب ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب طوطی ہند سائل دہلوی
داماد و استادی نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی

نوح استاد کو پیارا تھا مجھے پیارا ہے — بولتا دلی کی بولی ہے وطن نارا ہے
میں سمجھتا ہوں اُسے قوتِ بازو سائل — جانشیں داغ کا آنکھوں کا مری تارا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جن غزلوں پر (ق) یعنی قدیم ہے اُن میں الفاظ متروک شدہ ملیں گے جن پر (ج) یعنی جدید ہے اُن میں نہ ملیں گے

حمد

اس زمین میں کسی اور کی بھی غزل دیکھی ہے

۳۰ اپریل ۱۹۲۴ء

(ج)

ہیں نمازوں کو سمجھ کر انتظام اللہ کا
ذہن میں رکھتا ہوں پانچوں وقت نام اللہ کا

شانِ قہاری سے بڑھ کر لطفِ عام اللہ کا
بخشش دینا اپنے بندوں کو ہے کام اللہ کا

غیر ممکن ہے کُھلے ممکن نہیں پورا نہ ہو
مصلحت اللہ کی یا انتظام اللہ کا

ہم کو غم ہو یا خوشی ہر حال میں ہم خوش رہیں
یہ بھی کام اللہ کا ہے وہ بھی کام اللہ کا

سالکانِ جادۂ وحدت کو بڑھنا چاہیے
پوچھ کر اللہ والوں سے مقام اللہ کا

ہم نہ سمجھیں تو نہ سمجھیں خیر یہ ہے اور بات
مصلحت کے ساتھ ہے ایک ایک کام اللہ کا

باریابی منحصر ہے خوبیٔ تقدیر پر
پاس جتنا دور بھی اتنا مقام اللہ کا

شام کو مہتاب نکلے ہر سحر کو آفتاب
اللہ اللہ ہے یہ حسنِ انتظام اللہ کا

بات ہے اللہ کی اللہ ہی کے واسطے
ہو نہیں سکتا کوئی قائم مقام اللہ کا

کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ کوئی کچھ کوئی کچھ
سو طرح سننے میں آیا ایک نام اللہ کا

دیدہ و دل میں مرے فرقِ مراتب کچھ نہیں
اس جگہ بھی اس جگہ بھی ہے قیام اللہ کا

ہے عجب تفسیر رازِ پاک کی قرآن پاک
کاشفِ سرِّ حقیقت ہے کلام اللہ کا

عقل ہو معذور جس سے قدرت اس کا نام ہے
جو سمجھ ہی میں نہ آئے وہ ہے کام اللہ کا

نوح اپنے دل کو دیکھو ہے یہی دیر و حرم
ڈھونڈتے پھرتے ہو کیوں ہر سو مقام اللہ کا

طبع زاد ۶؍ جون ۱۹۲۵ء

ج

کیا خدا ہر جگہ نہیں ملتا
ہم جہاں ڈھونڈھتے وہیں ملتا

وہ ہمیں کس لئے نہیں ملتا
ہر کہیں تھا تو ہر کہیں ملتا

سب سے ملتا ہے سب کو ملتا ہے
کون کہتا ہے وہ نہیں ملتا

دل ہی میں اُس کی جستجو ہوتی
لطف جب تھا ہمیں یہیں ملتا

تھی غرض ہم کو اُس کے ملنے کی
اِس سے کیا بحث وہ کہیں ملتا

کس قدر دیر آشنا وہ ہے
بے ملائے کبھی نہیں ملتا

کیا ہمیں سعی کی ضرورت تھی
وہ اگر چاہتا یونہیں ملتا

ہے قیام اُس کا خانۂ دل میں
مگر اِس پر بھی وہ نہیں ملتا

ڈھونڈھتے ہم جہاں جہاں اُس کو
لطف ہوتا وہیں وہیں ملتا

ہم بھی کچھ دردِ دل سنا دیتے
کاش موقع سے وہ کہیں ملتا

وہ بھی ملتا ہے میں جو ملتا ہوں
نہیں ملتا ہوں تو نہیں ملتا

دیر و مسجد میں ڈھونڈھتا تھا ہمیں
وہ یہیں یا وہیں کہیں ملتا

حضرتِ نوحؔ آپ تو ملئے
دیکھئے پھر وہ کیوں نہیں ملتا

طبع زاد ۱۰؍ جون ۱۹۲۷ء

ج

دیر و حرم میں آتے جاتے جلوہ دیکھا اکثر تیرا
اِس کی اُس کی تجھ سے رونق یہ گھر تیرا وہ گھر تیرا

تو آقا ہے تو مولا ہے تو مالک ہے تو خالق ہے
دیکھا بھالا جانچا پرکھا کس نے پایا ہمسر تیرا

وہم ہزاروں راہیں لاکھوں عقل بھی ناقص فہم بھی عاجز
ڈھونڈھیں گے ہم تجھ کو کیوں کر کھوج ملے گا کیوں کر تیرا

دل کو سنبھالے دل کو اُچھالے دل کو سنوارے دل کو نکھارے
طفل و جواں پیر کے حق میں ذکر ہے سب سے بہتر تیرا

اعلےٰ ادنےٰ افضل اسفل جن و انساں حور و ملائک
فضل و کرم احسان و ترحم اِس پر اُس پر سب پر تیرا

مجھ کو تجھ سے خاص تعلق تجھ کو مجھ سے خاص تعلق
جلوہ تیرا جلوہ میرا منظر میرا منظر تیرا

لطف اُٹھایا آنکھوں نے بھی جلوہ دیکھا نظر دل نے بھی
چھُپ کر کھُل کر لڑ کر مل کر جم کر چل کر پھر کر تیرا

سجدوں پر ہو خاص توجہ اِس کی پروا ہی نہیں تجھ کو
میرے لئے کیا کم یہ شرف ہے سر میرا سنگِ در تیرا

دیدہ و دل کا رتبہ اِتنا دیر و حرم کی عظمت ایسی
گھر کے مالک یہ تو بتا دے سمجھوں کس گھر کو گھر تیرا

دونی لذت پاتا ہوں میں دُہرا لطف اُٹھاتا ہوں میں
قندِ مکرر سے بڑھ کر ہے مجھ کو ذکرِ مکرر تیرا

بحرِ مصیبت میں تھی ہمیشہ نوحؔ توجہ فضلِ خدا پر
بیڑا طوفانی موجوں سے پار نہ ہوتا کیوں کر تیرا

طبع زاد ۱۲ اگست ۱۹۲۸ء

ج

ہم سمجھے ہیں اِس کو راز ترا — بے حقیقت نہیں مجاز ترا
لاکھ پردے ہیں لاکھ جلوے ہیں — کر سکے کون امتیاز ترا
جلوۂ حسن ہو کہ پرتوِ عشق — بٹ گیا اِن میں سوز و ساز ترا
سر بزانو کسی خیال میں ہوں — یہ بھی ہے سجدۂ نماز ترا
ہم نہ اِن کا ادب کریں کیوں کر — کعبہ و دیر میں ہے راز ترا
عقل میری پہنچ نہیں سکتی — لے اُڑا مجھ کو امتیاز ترا
کارِ عالم سے بیشتر مجھ کو — دھیان آتا ہے کارساز ترا
کچھ ہے اغماض کچھ توجہ بھی — مجھ سے یہ ناز ہے نیاز ترا
کیوں نہ وجد آئے سارے عالم کو — نَے بشر کی ہے اور ساز ترا
ناز والے کبھی دکھا مجھ کو — میں نے دیکھا نہیں نیاز ترا
ہر کہیں تو ہے پھر کہیں بھی نہیں — کھُلتے کھُلتے کھُلا یہ راز ترا
جس نے محمود پر خدائی کی — ایک بندہ تھا وہ ایاز ترا
دیکھ سکتا نہیں کوئی تجھ کو — اِس سبب سے ہے احتراز ترا
ہر جگہ اہلِ ذوق پاتے ہیں — کچھ نہ کچھ لطفِ امتیاز ترا
بن گیا کوہِ طور پر بجلی — جلوۂ حسنِ دل نواز ترا
جرمِ عصیاں سے کر مجھے بھی پاک — نام ہے پاک بے نیاز ترا
تابعِ حکم ہر دو عالم ہیں — سلسلہ ہے بہت دراز ترا
تو ہی معبود اور تو ہی عبد — سخت مشکل ہے امتیاز ترا

نوحؔ طوفان اگر اُٹھاتے ہیں
تو ہے اِس میں بھی کوئی راز ترا

نعت

طبع زاد ۲۸ اپریل ۱۹۲۳ء

اِسے سودا اُسے سودا محمدؐ کا محمدؐ کا — خدا بھی شیفتہ کس کا محمدؐ کا محمدؐ کا

وہ محبوبِ الٰہی ہیں وہ مطلوبِ الٰہی ہیں — کہاں ہم سر کہاں ہمتا محمدؐ کا محمدؐ کا
زمانہ مجھ کو چاہے گا خدائی مجھ کو چاہے گی — کہ میں ہوں چاہنے والا محمدؐ کا محمدؐ کا
ہمارے دل میں ہے الفت محمدؐ کی محمدؐ کی — ہمارے سر کو ہے سودا محمدؐ کا محمدؐ کا
شبِ معراج بلوایا فلک پر اپنے پاس اُن کو — خدا کو پاس تھا ایسا محمدؐ کا محمدؐ کا
مزا جب ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے ہر دم سُنے جاوں — کئے جائے کوئی چرچا محمدؐ کا محمدؐ کا
بُرے ہم ہیں مگر قسمت ہماری سب سے اچھی ہے — وسیلہ مل گیا اچھا محمدؐ کا محمدؐ کا
مری دیوانگی پر عقل والے وجد کرتے ہیں — ہوا کس کا مجھے سودا محمدؐ کا محمدؐ کا
ملک پوچھیں گے تو کہہ دوں گا ادنا ایک خادم ہوں — محمدؐ کا محمد کا محمدؐ کا محمدؐ کا
یہ وجہِ سر بلندی ہے یہ وجہ سر فرازی ہے — اگر سر ہو تو ہو سودا محمدؐ کا محمدؐ کا
زمیں پر بھی فلک پر بھی ادب ملحوظ رکھتے ہیں — بشر کیا کیا ملک کیا کیا محمدؐ کا محمدؐ کا
اِسی باعث سے آنکھوں میں نظر کو دی جگہ ہم نے — نظر میں ہے رُخِ زیبا محمدؐ کا محمدؐ کا
کوئی غافل ہو لیکن ہم کبھی غافل نہیں ہوتے — تصور ہے تصور تھا محمدؐ کا محمدؐ کا
اگر سمجھو تو اِس سے بھی خبر وحدت کی ملتی ہے — خدا کو عشق تھا تنہا محمدؐ کا محمدؐ کا
محمدؐ تو محمدؐ ہیں خدا رکھے خدا رکھے — مریضِ عشق بھی اچھا محمدؐ کا محمدؐ کا

عنایت اور کچھ ہو یا نہ ہو یا رب عنایت ہو
محمد نوح کو سودا محمدؐ کا محمدؐ کا

منقبت

حمد، نعت، منقبت اور سلام وغیرہ چاہے وہ جس ردیف و قوافی میں ہوں ہمیشہ ادب کے خیال سے میں غزلوں کے پہلے درج کرتا ہوں۔

طبع زاد ۱۲ ستمبر ۱۹۳۴ء

ج

محمدؐ کے علاوہ سب سے بہتر — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
مددگار و معین ہم درد و یاور — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
فضیلت میں مراتب میں برابر — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
بنے محبوبِ محبوبِ خدا کے — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
حدیثوں کے رہے حافظ محافظ — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
مصیبت میں مدد فرمانے والے — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر

نظر آئے نظر جس سمت اُٹھی — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
عناصر جسمِ پاکِ مصطفٰےؐ کے — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
ہوئے چاروں طرف مقبول چاروں — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر
کہے جاؤں سنے جاؤں ہمیشہ — ابوبکر و عمر عثمان و حیدر

مری کشتی کریں گے پار اے نوحؔ
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

قصیدہ بطور مخمس ولادت حضرت امام حسین علیہ السلام ۲۶ نومبر سنہ ۱۹۳۳ء

تیسری شعبان کو آیا تیسرا سلطان دیں

جناب گدا حسین صاحب تپشؔ دریاآبادی نے الٰہ آباد میں اپنی عقیدت سے یہ طرح دے کر مشاعرہ کیا وہ حضرت علیؑ کو پہلا اور امام حسن کو دوسرا اور امام حسین کو تیسرا سلطان دیں مانتے ہیں لیکن میں اپنی عقیدت میں حضور صلعم کو پہلا چار یار کو دوسرا تیسرا چوتھا پانچواں امام حسن کو چھٹا اور امام حسین کو سلطان دیں ساتواں سمجھتا ہوں اس لحاظ سے تیسرے سلطان دیں کی جگہ ساتواں سلطان دیں لکھ دیا ہے

مرحبا صد مرحبا عزّ و وقارِ شانِ دیں
اور بھی گذرے گذرنے کے لئے شاہانِ دیں
تاجدارِ دیں سے خالی کب رہا ایوانِ دیں
لے کر اپنے ساتھ احکامِ خدا فرمانِ دیں
تیسری شعبان کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

آج ہے مغرور اپنی کامیابی پر زمیں
آج ہے ایک ایک ذرّہ روکشِ مہرِ مبیں
آج ہے اوجِ زمیں سے شرمگیں عرشِ بریں
آج ہے انوار گستر مالکِ تخت و نگیں
تیسری شعبان کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

مائلِ جشنِ ولادت امتِ خیر الانام
دم بدم تازہ بتازہ نو بنو دلکش نظام
ہر طرف مصروفِ اظہارِ مسرت خاص و عام
ہے اسی باعث سے یہ تاریخ واجبِ احترام
تیسری شعبان کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

کھل گئے گل ہائے مقصد ہنس پڑی دل کی کلی
ہوگئی رخصت خزاں جاتی رہی سب کھلبلی
یوں نسیمِ جاں فزا آہستہ آہستہ چلی
روضۂ رضواں بنی ملکِ عرب کی ہر گلی
تیسری شعبان کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

باغِ عالم میں نزولِ رحمتِ پروردگار
حسنِ گل حسنِ چمن حسنِ فضا حسنِ بہار
ڈالی ڈالی رنگ افشاں پتی پتی عطر بار
کیوں ہوا ایسا سریر آرا ہوا اک تاجدار

تیسری شعباں کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

ایک ہیں معراج اک ہیں صوم کا ہے اہتمام — پیشتر اس سے رجب ہے بعد اس کے ہے صیام
یہ مبارک وہ مقدس دونوں ہی فرخندہ فام — بیچ میں شعبان جس پر صد درود و صد سلام

تیسری شعباں کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

اللہ اللہ عالمِ حسنِ فروزانِ حسین — شش جہت میں کر دیا جلووں نے اعلانِ حسین
اس سرے سے اس سرے تک سب ثنا خوانِ حسین — کہہ رہے ہیں شاد ہو ہو کر محبانِ حسین

تیسری شعباں کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

غیرتِ خورشید صبحِ اولیں روئے حسین — نکہتِ گلزارِ جنت بوئے گیسوئے حسین
صنعتِ صناعِ قدرت قدِّ دلجوئے حسین — قوتِ بازوئے حیدر زورِ بازوئے حسین

تیسری شعباں کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

وسعتِ عالم میں کیا کیا کام قدرت نے سر کئے — کر سکے تشریح کوئی کس طرح لب ہیں سئے
سیکڑوں اعزاز بے مانگے ہوئے بھی دے دیئے — یہ شرف مخصوص تھا بس اس مہینے کے لئے

تیسری شعباں کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

اس لئے اُس نے میں نے تو نے سب نے اپنی عید کی — عید آنے بھی نہ پائی اور سوجھی عید کی
حبذا صلِ علےٰ کیا بات ایسی عید کی — تیسری شعبان کی گویا ہے پہلی عید کی

تیسری شعباں کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

اِن کو کہئے فاطمہ کا لاڈلا پیارا پسر — اِن کو کہئے مرتضےٰ کا لختِ دل لختِ جگر
اِن کو کہئے احمدِ بے میم کا نورِ نظر — اِن کو کہئے اکبر و سجاد و اصغر کا پدر

تیسری شعباں کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

ولولوں کا جوش اُٹھا خاطرِ ناشاد میں — خوش نہیں دیکھا تھا اتنا اب تک اپنی یاد میں
ہے اثر کیا جانے کیا اہلِ سخن کی داد میں — نوح پہنچے بزمِ یارانِ الٰہ آباد میں

تیسری شعباں کو آیا ساتواں سلطانِ دیں

سلام

سلام وغیرہ کسی ردیف و قافیہ میں ہوں لیکن غزلوں سے پہلے اِن کا لکھنا مناسب ہے

طبع زاد ۲ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

اے اہلِ غم یہ قول تھا اکثر حسین کا — ق — اُجڑے گا کربلا میں بھرا گھر حسین کا

کرتا مقابلہ کوئی کیوں کر حسین کا
اللہ کا عتاب تھا خنجر حسین کا

یہ زہر سے ہوئے وہ ہوئے تیغ سے شہید
قسمت حسن کی اور مقدر حسین کا

بھر دے دیا تو خاص تھی اِس میں یہ مصلحت
یعنی نہ ہو سکے کوئی ہم سر حسین کا

عباس رزم گہ میں یہ کہتے ہوئے بڑھے
میں ہوں پسر علی کا برادر حسین کا

قاسم اِسی خیال سے پہلے ہوئے شہید
وہ حالِ زار دیکھتے کیوں کر حسین کا

ہمت جو تھی کسی کی تو ہمت حسین کی
خنجر جو تھا کسی کا تو خنجر حسین کا

وہ تشنگی تھی کر نہیں سکتے تھے گفتگو
منہ دیکھتے تھے اکبر و اصغر حسین کا

نیزے پہ کیا چڑھا کہ چڑھا آسمان پر
یوں بھی بہت بلند رہا سر حسین کا

راہِ خدا میں گھر جو اُٹھایا تو اور بھی
دل میں خدائی بھر کے ہوا گھر حسین کا

جا کر وہی بنا ہے شفق آسمان پر
جتنا گرا تھا خون زمیں پر حسین کا

پانی سے خشک لب نہ ہوئے پھر بھی آشنا
سارا بدن لہو میں ہوا تر حسین کا

وہ پھر رہی تھیں دھوپ میں بے تاب بی بیاں
سایہ کبھی تھا جن کے سروں پر حسین کا

قہرِ خدا سے کیا نہ خبر ظالموں کو تھی
بہتے پھریں گے خون بہا کر حسین کا

اُف یہ غضب یہ قہر یہ آزار یہ ستم
بے جسم سر تھا جسم تھا بے سر حسین کا

کس کو سنائے نوح کوئی قدر داں نہیں
وہ رو رہا ہے مرثیہ کہہ کر حسین کا

طبع زاد ۱۸ ستمبر ۱۹۲۰ء

مطلب تھا صرف اِسی سے حسن کو حسین کو
خالق کی بندگی سے حسن کو حسین کو

معلوم ہو گیا تھا کہ ہوں گے شہید ہم
بچپن میں پہلے ہی سے حسن کو حسین کو

یہ لختِ دل وہ لختِ جگر مصطفٰے کے ہیں
پوچھو ہمارے جی سے حسن کو حسین کو

پایا رسولِ پاک سے جو کچھ علی نے فیض
وہ مل گیا علی سے حسن کو حسین کو

دل میں بھری ہوئی تھی شہادت کی آرزو
نفرت تھی زندگی سے حسن کو حسین کو

راہِ خدا میں فاطمہ زہرا نے دے دیا
کس شوق کس خوشی سے حسن کو حسین کو

کینہ تھا ظالموں کو حسن سے حسین سے
کاوش نہ تھی کسی سے حسن کو حسین کو

اپنی خوشی سے کام نہ تھا کام تھا فقط
اللہ کی خوشی سے حسن کو حسین کو

حکمِ خدا جو تھا تو پہنچتا نہ کیوں گزند
دشمن کی دشمنی سے حسن کو حسین کو

اے نوح ساری عمر اِسی میں گذر گئی

روتا ہوں کیا ابھی سے حسن کو حسین کو

طبع زاد یکم ستمبر ۱۹۲۰ء

ق

اے سلامی رن میں آتے ہیں حسین — ہاشمی جوہر دکھاتے ہیں حسین
خاک میں ملتا ہے وہ مثلِ سرشک — جس کو آنکھوں سے گراتے ہیں حسین
ایک دل پر ایک جانِ زار پر — رنج و غم لاکھوں اُٹھاتے ہیں حسین
کل فدا کرتے تھے گھر کا مال و زر — آج اپنا گھر لٹاتے ہیں حسین
اُس طرف موجود ہے فوجِ یزید — جس طرف نظریں اُٹھاتے ہیں حسین
اقربا کی لاش اُٹھائے اور کون — چلتے پھرتے آتے جاتے ہیں حسین
جو شقی اُٹھتا ہے مثلِ گردِ باد — خاک میں اُس کو دباتے ہیں حسین
غم اُٹھاتے ہیں مگر کچھ غم نہیں — پانو اپنے کب اُٹھاتے ہیں حسین
ہائے پانی کے لئے اصغر کی ضد — روٹھتے ہیں وہ مناتے ہیں حسین
اشکِ خوں آلودہ برساتے نہیں — رنگ یوں اپنا جماتے ہیں حسین
کوفیوں کو شمر نے دی بڑھ کر صدا — اب کہاں جاتے ہو آتے ہیں حسین
لوگ پانی سے نہاتے ہیں مگر — خون سے اپنے نہاتے ہیں حسین
کیوں نہ ہو بے رونقی عشرے کے بعد — دس دنوں تک رہ کے جاتے ہیں حسین
تعزیہ میں تعزیہ کے بھیس میں — ہر برس جلوہ دکھاتے ہیں حسین

ہر طرف اُٹھتا ہے طوفانِ سرشک
نوحؔ کو اتنا رُلاتے ہیں حسین

طبع زاد ۲۳ اگست ۱۹۲۳ء

رج

اے اہلِ عزا یہ رنج و الم کیا کم ہیں خدائی بھر کے لئے — خنجر تھا علی اکبر کے لئے ناوک تھا علی اصغر کے لئے
سرور کے لئے تڑپا ہی کرے بجلی کو ملا یہ حکم خدا — بادل کو بھی یہ ارشاد ہوا رونا ہی رہے سرور کے لئے
ہر وقت ستم ہر آن ستم ہر لحظہ ستم ہر لمحہ ستم — صورت ہی کوئی باقی نہ رہی تسکینِ دلِ مضطر کے لئے
چاہیں تو اُٹھا دیں سب کے قدم چاہیں تو فنا کر دیں سب کو — کہنے کو بہتر ہیں لیکن کافی ہیں یہ لشکر بھر کے لئے
شکوں کا نکلنا بند ہوا مظلوم کہاں تک اب روئیں — دو چار لہو کی بوندیں بھی باقی نہیں چشمِ تر کے لئے
شبیر یہ سچ فرماتے تھے اُن کا یہ بجا فرمانا تھا — کیا خانہ خرابی خلق ہوئی دنیا میں مرے ہی گھر کے لئے
آزار و ستم کچھ اُٹھ نہ رہا بیداد و جفا کچھ اُٹھ نہ رہی — ایک ایک سر بے تن کے لئے ایک ایک تنِ بے سر کے لئے

اے نوحؔ یہ پہنچا زخم نیا یہ داغ انھیں ایک اور ملا

روتے تھے ابھی یثرب والے احمد کے لئے حیدر کے لئے

ہر سمت ہے جہاں میں دہائی حسین کی

ذیل کے سلام کو مع خمسہ کے میں نے بھوساول کے مسالمہ میں ۳ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پڑھا تھا شعرا میں سے حضرات آغاز۔ اختر۔ تحمل۔ جوہر۔ حافظ۔ خیالی۔ راغب۔ شاد۔ شوق۔ صابر۔ عاشق۔ ماہر۔ مضطر۔ ایمان۔ امجد ریاضی۔ ناطق۔ قمر۔ قادر۔ مسلم وغیرہ وغیرہ موجود تھے دیوان میں جہاں یہ خمسہ لکھا ہوا ہے وہاں مفصل حالات درج ہیں۔

	ج
اہلِ عزا کو یاد پھر آئی حسین کی	فریاد ہے حسن کی دہائی حسین کی
یہ بات ہے درست بنا گھر بگڑ گیا	لیکن خدا نے بات بنائی حسین کی
اہلِ ستم جلیں گے جہنم میں بالیقیں	کیوں کر نہ بجھے گی آگ لگائی حسین کی
ہونے کے واسطے تو ہوئے سیکڑوں امام	صبر و رضا نے قدر بڑھائی حسین کی
عباس نے دعا یہی مانگی دمِ اخیر	اللہ خیر ہو مرے بھائی حسین کی
وہ دوپہر وہ دھوپ وہ جلتی ہوئی زمیں	وہ تشنگی وہ رن وہ لڑائی حسین کی
اعدا کو بھوک تھی کہ یہ ہوں پیاسے ہی شہید	ہر شخص چاہتا تھا برائی حسین کی
اس پر بھی خوب کام لیا ذوالفقار سے	نازک تھی شاخِ گل سے کلائی حسین کی
دیکھا نہ اُن کو تو یہ نظر کا قصور تھا	بڑھ کر علی نے لاش اٹھائی حسین کی
خیمے کے گرد پھیلے ہوئے تھے سب اہلِ شام	لٹتی تھی دن دہاڑے کمائی حسین کی
آنسو پیئے تو نام شہیدوں کا لے لیا	کھائی اگر قسم بھی تو کھائی حسین کی
پھر کر وطن جو آئے محبوں کے روبرو	عابد نے سرگذشت سنائی حسین کی
کرتا ہوں تعزیوں پہ ادا رسمِ تعزیت	دیتی ہے مجھ کو شکل دکھائی حسین کی
اس غم سے خاک اڑاتا ہے ساحل فرات کا	بڑھ کر نہ میں نے پیاس بجھائی حسین کی

اے نوح کیوں اٹھاتے ہو طوفان تو قدم
دیکھو سواری آئی وہ آئی حسین کی

خاک خوں میں جب سرِ شبیر غلطاں ہو گیا
کر دیا خاموش مجھ کو آپ کی تصویر نے

یہ دونوں طرحیں بھوساول کے مسالمہ و مشاعرہ کے لئے مقرر کی گئی تھیں چنانچہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو مسالمے میں سلام پڑھے گئے اس تاریخ کے واقعات جو "البرہان" برہان پور کے ایڈیٹر نے لکھے ہیں انھیں یہاں درج کرتا ہوں اور ۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کے حالات (ببے) کی ردیف میں غزل عاشقانہ کے ساتھ ناظرین کو ملیں گے۔ مطبوعہ البرہان ۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۶ء

اراکین انجمن اور صاحبان بھوساول نے جس گرم جوشی حسن انتظام اور اخلاص سے مشاعرے کو کامیاب بنانے کی فکر تھی بفضلہ تعالیٰ اُن کی سعی کارآمد و شاندار ثابت ہوئی بالخصوص مشاعرے کے دوران میں مدرسۂ فلاح دارین کی کارروائی نے مشاعرہ اور قومی ضروریات میں چار چاند لگا دئے تھے اس بنیاد پر یہ توقعات کسی طرح بیجا نہیں کہ خدا نے چاہا تو انجمن مجلس حسینی اور مدرسۂ فلاح دارین کا مستقبل اور بھی شاندار ہوگا ساتھ ہی یہ ایک بڑی فروگذاشت ہوگی اگر معزز صدر مشاعرہ کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے لائق صدر نے جس قابلیت سے صدارت کے فرائض کو ادا کیا ہے اور حاضرین و سامعین و شعرا کے ساتھ جس حسن اخلاق کا برتاؤ برتا وہ ادبی دنیا کی ایک بے مثال نظیر تھی جس نے قلوب کو مسخر کر لیا ہے اس کے بعد اراکین انجمن و حضرات بھوساول کی مہمان نوازی بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اپنے جلسے کے معزز صدر کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا اور بعد اختتام جلسہ شاندار طریقے پر الوداع کیا ہے جس سے یقیناً اُن کے معزز مہمان کا دل و دماغ بہترین خیالات لیے کر رخصت ہوا ہے

مشاعرہ

۱۵ را کتوبر ۱۹۲۶ء کو تاج الشعرا فصیح العصر ناخدائے سخن حضرت مولانا محمد نوح صاحب نوحؔ ناروی مدظلہ انجمن مجلس حسینی بھوساول کی دعوت پر دس بجے دن کی ٹرین سے بھوساول تشریف لائے کارپردازان انجمن اور رؤسائے شہر نے اسٹیشن پر آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور قیام گاہ پر یعنی انجمن فلاح دارین کی خاص عالی شان بلڈنگ میں جو مسلمانان بھوساول کی بیداری اور مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے بعد طعام آرام فرمایا شب کو قریب سات بجے چہلم شریف کے سلسلے میں ٹٹی کا جلوس نکالا گیا جو چہلم حضرت امامؑ کے مراسم میں یہاں ایک رواج چلا آرہا ہے جلوس نہایت شاندار تھا بعد فاتحہ خوانی قریب دس بجے شب سے طرحی سلام پر ایک وسیع منڈوے میں جو کاغذی گل بوٹوں سے آراستہ کیا گیا تھا مشاعرہ شروع ہوا قابل صدر نے صدارت کو رونق بخشی اور شعرائے بھوساول، بیاول، دھولیہ، مالی گانو، مئو، ملکہ پور، کھام گانو، برہان پور، کھنڈوہ وغیرہ نے حسب اجازت اپنے اپنے پاکیزہ کلام سنانے شروع کئے ایک سے ایک بہتر کلام سنے گئے سب سے آخر میں معزز صدر نے اپنا کلام فصاحت نظام سنایا معنی کے اس قدر دریا بہائے کہ سننے والوں کو طوفان کا گمان ہوتا تھا موج ہائے مضامین نے وہ تلاطم برپا کیا کہ سارا پنڈال صدائے مرحبا و آفریں سے گونج اٹھا آخرکار قریب چار بجے صبح کو یہ متبرک جلسہ اپنے نکات و جذبات شاعری کو لئے ہوئے پوری کامیابی کے ساتھ ختم ہوا

اے سلامی اور سے کیا اور ساماں ہوگیا
جس کو بخشا تھا شرف خونِ سرِ شبیر نے
اپنے مہمانوں پر اعدا نے کیا پانی بھی بند
کر دیا بادِ حوادث نے الگ اک اک ورق
شاہ کہتے تھے دکھا کر اکبر و اصغر کی لاش

کائناتِ غم کا ہر ذرہ پریشاں ہوگیا
کربلا کا اُس قدر ٹکڑا گلستاں ہوگیا
تین دن پہلے ہی مر جانے کا ساماں ہوگیا
یوں کتابِ دیں کا مجموعہ پریشاں ہوگیا
نذرِ خنجر وہ ہوا یہ نذرِ پیکاں ہوگیا

بے گناہوں کا لہو اتنا کیا گردوں نے جذب
تھا جو تارا قطرۂ خونِ شہیداں ہوگیا

رہ گئے قاسم وہیں اپنا کلیجا تھام کر
پار جب اس پار سے اُس پار پیکاں ہوگیا

شاہ نے یوں جسم پر پہنا شہادت کا لباس
گرد دامن بن گئی خنجر گریباں ہوگیا

مشتعل تھے زائروں کے دل میں لاکھوں داغِ غم
قبرِ اطہر پر جو یہ پہنچے چراغاں ہوگیا

جانتے ہیں ماتمِ شہ کو ہم اپنا فرضِ خاص
کی ترقی اس قدر غم نے کہ ایماں ہوگیا

بن گیا کون و مکاں میں رنگِ گل رنگِ شفق
خونِ ناحق یوں شہیدوں کا نمایاں ہوگیا

جان دینے پر تُلے تھے عابدِ بیمار بھی
یہ کہو اللہ ہی اُن کا نگہباں ہوگیا

تیغ جو اُٹھی وہ پلٹی کام کر چکنے کے بعد
تیر جو آیا وہ پیوستِ رگِ جاں ہوگیا

ابر و شبنم پر نہیں موقوف کچھ غم کا اثر
روضۂ اقدس سے جو گذرا وہ گریاں ہوگیا

قطرۂ خوں سے تو اضحؔ تیر کی ہوتی رہی
دل میں آیا دل میں بیٹھا دل میں مہماں ہوگیا

شاہ کہتے تھے ہمیں مرنے کا اپنے غم نہیں
غم تو اس کا ہے کہ مجموعہ پریشاں ہوگیا

جس کو زانوئے محمد ہر جگہ ملتی رہی
خاک و خوں میں وہ سرِ شبیر غلطاں ہوگیا

فتحؔ اپنے بس میں کچھ ایسا تھا جوشِ اشکِ غم
ہم جہاں روئے وہیں موجود طوفاں ہوگیا

۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء

ج

نہری جنگ میں تھا بند فقط کیا پانی
تین دن تک نہ ملا شاہ کو دانا پانی

وقتِ آخر بھی ہوا تھا نہ مہیا پانی
اب ہے پانی کا اسی غم سے کلیجا پانی

پیاس بجھوا نہ سکے شہ کی جو پانی دے کر
حشر کے روز بھریں گے وہی اعدا پانی

صبر سے کام لیا حکم اگر دے دیتے
نہ گرجتا کبھی بادل نہ برستا پانی

تشنگی بڑھ گئی اتنی ہوئے یوں مضطر
نام پانی کا سنا منہ میں بھر آیا پانی

ہائے وہ دشتِ بلا گرم ہوا قہر و جفا
اور پانی کے نہ پانے کی وہ ایذا پانی

آنسوؤں میں نظر آتے تھے لہو کے قطرے
غم سے دل خون ہوا اور کلیجا پانی

بی بیاں تشنہ لبی سے جو دعائیں کرتیں
پردۂ خیمۂ اطہر سے نکلتا پانی

امتحاں گاہِ شہادت کا عجب رنگ رہا
خون برسا جو نہ برسا تو نہ برسا پانی

تشنہ کاموں کے گلے اُس سے بھی تر ہو نہ سکے
خنجر و تیغ و سناں میں تھا ذرا سا پانی

محوِ نظارۂ سفاکی و بیداد رہیں
شمر کم بخت کی آنکھوں میں نہ اترا پانی

پانی پانی وہ پکارا کئے پانی نہ ملا
آج تک ہے عرقِ شرم سے دریا پانی

یہ بھی تھی شرطِ شہادت کہ رہے دور فرات
ورنہ شبیر سے کرتا نہ کنارا پانی

صورتِ شمع جو ہم روئے تو حاصل کیا ہے
یوں بہیں اشک کہ ہو سر سے بھی اونچا پانی

مشک بھر کر یہی کہتے ہوئے عباس چلے
سب پئیں تو پئیں ہم کیا پئیں تنہا پانی

لکھ گیا تھا یہی تقدیر میں کیا روزِ ازل
ٹھنڈے ہو جائیں مگر پائیں نہ ٹھنڈا پانی

ہم نے مانا کہ انھیں پیاس بھی ہے بھوک بھی ہے
کیا مگر کھائیں پئیں اُٹھ گیا دانا پانی

کثرتِ ظلم و ستم سے ہوئے عابد نہ ملول
وہ سمجھتے تھے اُتر جائے گا چڑھتا پانی

رزم گہ میں تو نہ بھولے سے بھی سیراب کیا
اب شہیدوں کو دکھایا کرے جلوا پانی

حضرتِ نوح نے اچھا یہ اُٹھایا طوفاں
بحر ہے ایک مگر بیس طرح کا پانی

حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ

حسب فرمائش جناب عبد الغفار صاحب رئیس رنگون ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۸ء

ہمیں بھی کوئی پیمانہ جنابِ غوث الاعظم کا
رہے آباد مے خانہ جنابِ غوث الاعظم کا

کبھی چھوڑا نہ کاشانہ جنابِ غوث الاعظم کا
بڑا عاقل ہے دیوانہ جنابِ غوث الاعظم کا

شرابِ معرفت بدمست کر دے سارے عالم کو
چھلکتا جائے پیمانہ جنابِ غوث الاعظم کا

حسابِ حشر سے پہلے وہ داخل ہوگا جنت میں
ملے گا جس کو پروانہ جنابِ غوث الاعظم کا

وہ پائے احمدِ بے میم کی توقیر فرمائی
شبِ معراج وہ شانہ جنابِ غوث الاعظم کا

جگر کو اپنے سمجھاؤں کہ اپنے دل کو بہلاؤں
یہ دیوانہ وہ دیوانہ جنابِ غوث الاعظم کا

تمنا ہے کہ میں بغداد پہنچوں اُن کے روضے پر
مرے آگے ہو کاشانہ جنابِ غوث الاعظم کا

ضیائے شمعِ عرفاں نے جہاں کو گھیر رکھا ہے
جسے دیکھو وہ پروانہ جنابِ غوث الاعظم کا

یہ سُنتا ہوں سوا ہے دل کا رتبہ عرشِ اعظم سے
دلِ اعظم ہے کاشانہ جنابِ غوث الاعظم کا

اُنھیں عالم سے نسبت اہلِ عالم کس طرح دیتے
کہ عالم تھا جداگانہ جنابِ غوث الاعظم کا

ہمارے خانۂ دل میں خیالِ غیر کیا آئے
یہ کاشانہ ہے کاشانہ جنابِ غوث الاعظم کا

چراغِ طورِ سینا سے نہیں کچھ واسطہ اس کو
ہمارا دل ہے پروانہ جنابِ غوث الاعظم کا

جلو اے پینے والو گیارہویں تاریخ آپہنچی
کھلا پُرکیف مے خانہ جنابِ غوث الاعظم کا

تمھیں اے نوح دیوانے ہو کیا سارے زمانے میں
زمانہ بھی ہے دیوانہ جنابِ غوث الاعظم کا

غزلیں

۱

اب جنوں مالک ہوا ہے خانۂ زنجیر کا

اس طرح پر ۲۰ اپریل ۱۹۱۸ء کو مین پوری میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا مقامی شعرا میں سے جناب اصغر صادق۔ مائل۔ فدا صاحبان مختلف مقاموں سے حضرات مومن ٹونکی۔ بے دم اٹاوی۔ عطا۔ ہمزہ۔ خلیل۔ زلالی۔ شرر۔ وامق فانی۔ جمالی بدایونی۔ ادیب فتح پوری وغیرہ شریک تھے بعد ختم مشاعرہ انجمن معیار الشعرا کی طرف سے اکثر حضرات کو خطاب دیے گئے چنانچہ مجھے بھی تاج الشعرا کا خطاب ملا غزل پر جو کچھ داد دی گئی وہ اُن صاحبوں سے پوشیدہ نہیں جو مشاعرے میں رونق افروز تھے

نقشِ الفت میں جو ہوتا رنگ کچھ تاثیر کا
دیکھتے منہ ہم کسی منہ بولتی تصویر کا

ہو خیال اُن کو تو کیوں ہو آہِ بے تاثیر کا
کیا بھروسہ کیا ٹھکانہ اِس ہوائی تیر کا

چال ہی تو ہے کہ تم سے چاہ لیے پر چل گئی
پڑ گیا تقدیر سے پانسہ مری تدبیر کا

کس لیے کرتے ہو شکوہ کس لیے کرتے ہو آہ (ق)
مجھ سے یہ کہتا ہے چپ رہنا تری تصویر کا

اُس نظر نے اِس نظر سے دل کے دو ٹکڑے کیے
ایک حصّہ تیغ کا تھا ایک حصّہ تیر کا

اپنی اپنی سعی میں جن کو ہوئیں ناکامیاں
سیکھ لیں تدبیر سے وہ فلسفہ تقدیر کا

جس کو دنیا کی دو رنگی میں ہو کچھ بھی احتمال
دوسرا رخ دیکھ لے وہ اپنی ہی تصویر کا

نامہ بر کہنا زبانی دے کے میرا خط انھیں
مرثیہ ہے یہ تمھارے عاشقِ دلگیر کا

یہ ہے سچّا عشق سچّا جذب سچّا اتحاد
دل میں آیا تو نہ نکلا دل سے پیکاں تیر کا

خوب رویانِ جہاں بھی مطمئن رہتے نہیں
گل کو ہے گل چیں کا کھٹکا شمع کو گل گیر کا

تاب لائے گا کوئی کیا جلوۂ دیدار کی
آئینہ بھی ہو گیا اندھا تری تصویر کا

جوڑ دے گا رشتۂ جوشِ جنوں کو اور بھی
ایک اک حلقہ مری ٹوٹی ہوئی زنجیر کا

دل کے مٹ جانے کی صورت یوں مصوّر کھینچ دے
کچھ دبا پہلو رہے بایاں مری تصویر کا

کچھ تو گذرے ہیں مرے دل پر بھی ایسے واقعات
منحرف تدبیر سے ہوں معترف تقدیر کا

اِس نظر سے دیکھ ہر ذرّے کو اے ذوقِ نظر
گو نہیں اکسیر لیکن جزو ہے اکسیر کا

پیچھے پیچھے جا رہے ہیں اقربا روتے ہوئے — آگے آگے ہے جنازہ عاشقِ دل گیر کا
اُن کو حیرت مجھ کو سکتہ وہ بھی حیپ میں بھی خموش — ہو رہا ہے سامنا تصویر سے تصویر کا

وہ نہ پہلو میں رہے تو کیوں یہ قبضے میں رہے
لے کے دل ٹھیکہ بھی لے لو نوحؔ کی جاگیر کا

نہ کہنا غیر اس محفل میں شامل ہو نہیں سکتا

اس طرح پر ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو میرٹھ میں جنرل مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بڑے بڑے شعرا مدعو کئے گئے صوفی صاحب۔ آثر صاحب۔ شمس صاحب میرے بلانے کو نارسے آئے لیکن میں عزیزی ریاض احمد صاحب سلمۂ کی علالت سے نہ جا سکا غزلیں بھیج دی تھیں بعد کو معلوم ہوا کہ انفلوئنزا پھیل جانے سے مشاعرہ نہیں ہوا ملتوی ہو گیا۔

مزہ الفت میں کیا دونوں کو حاصل ہو نہیں سکتا — ق — مگر مشکل ہے ایک اُن کا مرا دل ہو نہیں سکتا
جفا و رشک و غم سہنے کے قابل ہو نہیں سکتا — مرا دل ہو بھی، ہو سکتا ہے ترا دل ہو نہیں سکتا
کسی کے رنج و غم میں کوئی شامل ہو نہیں سکتا — مرا ساتھی مرا حامی مرا دل ہو نہیں سکتا
عزیزِ خلق بننے کو وفا کی بھی ضرورت ہے — فقط پہلو میں ہونے سے کوئی دل ہو نہیں سکتا
الٰہی اُٹھ گئی دنیا سے کیا تاثیر الفت کی — وہ کہتے ہیں ہمارا دل ترا دل ہو نہیں سکتا
وہ فرماتے ہیں لاؤ مجھ کو دے دو کس طرح دے دوں — مرے پہلو میں پیدا دوسرا دل ہو نہیں سکتا
وفا سے آدمی تسخیر کر لیتا ہے عالم کو — وہ دل میں رہتے رہتے کیا مرا دل ہو نہیں سکتا
ہم آہیں کیا کریں انجام آہوں کا سمجھتے ہیں — ہوا میں بھی شگفتہ غنچۂ دل ہو نہیں سکتا
وہ موسےٰ ہی تھے غش کھا کر گرے جو طور سینا پر — ہمیں جلوے سے سکتہ بھی توانے دل ہو نہیں سکتا
جگہ دوں کیا سمجھ کر میں ترے پیکاں کو پہلو میں — مرا دل بن نہیں سکتا مرا دل ہو نہیں سکتا
پرائی چیز مل جائے تو پھر بھی وہ پرائی ہے — کوئی لے کر مرا دل مالکِ دل ہو نہیں سکتا
نگاہوں سے نگاہیں لڑ کر اکثر چھپ بھی سکتی ہیں — مگر مل کر کبھی دل سے جدا دل ہو نہیں سکتا
وفا و عشق میں بھی کوئی شے ذاتی فضیلت ہے — تڑپنے کو جگر تڑپے مگر دل ہو نہیں سکتا
لگاوٹ اور پھر اُس پر لگاوٹ خوب رویوں کی — انھیں تو دل بھی دے کر کوئی بے دل ہو نہیں سکتا
ہوائے گل اُڑا لے جائے لیکن کیا تماشا ہے — عنادل کے تلفظ سے جدا دل ہو نہیں سکتا

وفا سے اُس کو مطلب ہے جفا سے واسطہ اس کو
جنابِ نوحؔ کا دل آپ کا دل ہو نہیں سکتا

مختلف قوافی

یہ بسمل ہو نہیں سکتا وہ بسمل ہو نہیں سکتا — ق — کوئی قاتل بنے بننے سے قاتل ہو نہیں سکتا

جو پہنچیں گے تو ہم پہنچیں گے مر کر اُس کے کوچے تک
کہ جیتے جی کوئی جنت میں داخل ہو نہیں سکتا

کبھی ذرے سے اُبھر کر مہر تاباں بن نہیں سکتے
کوئی تارا چمک کر ماہِ کامل ہو نہیں سکتا

یہ کہہ کر کیا مجبور اُسے آنکھیں لڑانے پر
نظر ہو جس کی شرمیلی وہ قاتل ہو نہیں سکتا

کبھی دنیا کے جھگڑے ہیں کبھی عقبےٰ کے قصے ہیں
ہمارے دل کو اطمینان حاصل ہو نہیں سکتا

عجب کیا ہے یہ کہہ کر آئینہ رکھ دیں وہ ہاتھوں سے
کہ آپ اپنے سے میں ہرگز مقابل ہو نہیں سکتا

کبھی چلتی ہوائیں روکنے سے رُک نہیں سکتیں
کوئی آزاد پابندِ سلاسل ہو نہیں سکتا

بگولوں کی طرف کیوں دوڑتا پھرتا ہے اے مجنوں
کہ ہر محمل تری لیلےٰ کا محمل ہو نہیں سکتا

جو پہلو میں دلِ دقت پسند اپنا سلامت ہے
تو ہر مشکل سے مشکل کام مشکل ہو نہیں سکتا

رہے گا در حلقۂ بحرِ محبت ہی میں ہر پھیر کر
سفینہ نوحؔ کا ممنونِ ساحل ہو نہیں سکتا

محبت کا اثر ہر ایک کے دل پر نہیں ہوتا

محبی سید تصدق حسین صاحب قرار مرحوم شاہ جہاں پوری نے لکھنؤ سے اس طرح پر مجھ سے پانچ شعروں کی تھی میں نے اسی وقت ذیل کے اشعار ۳۰ جون ۱۹۱۹ء کو لکھ کر اُن کے پاس بھیج دئے ممکن ہے کوئی مشاعرہ اس طرح پر لکھنؤ میں ہوا ہو

جو سر گرمِ فغاں ہیں جوشِ الفت میں کہیں ہوتا
فلک بھی خاک ہو کر داخلِ جزوِ زمیں ہوتا

ق

مرا دل غرقِ دریائے محبت کیوں نہیں ہوتا
دُرِ مقصود اسے ملتے اگر یہ تہ نشیں ہوتا

یہ لالچ بھی نہیں اب کیا مرے ارمان نکلیں گے
جو دل پہلو میں ہوتا تو کوئی پہلو نشیں ہوتا

تری محفل میں دیکھی بے رخی ہم نے قیامت کی
تعجب ہے یہاں کوئی کسی کا کیوں نہیں ہوتا

یہ آنا ہی مرا دنیا میں تھا تمہید جانے کی
نہ میں زیرِ فلک ہوتا نہ میں زیرِ زمیں ہوتا

مٹی جاتی ہے ساری خلق اُن کی خوش خرامی پر
مگر میں ہوں کہ اب بھی حشر کا قائل نہیں ہوتا

جو وہ دل کر کبھی ملنے کا پھر اقرار کر لیتے
یقیں ہوتا نہ کیوں کر مجھ کو ہوتا بایقیں ہوتا

رہا ترکش میں تیر اتیر تو کیا فائدہ اس سے
یہ میرے دل میں ہوتا یا مرے دل کے قریں ہوتا

وہی تو ہے وہی اے نوحؔ تیری گریہ وزاری
مگر دنیا میں اب طوفاں بپا کیوں نہیں ہوتا

اُن کے ہاتھوں میں گلِ بازی تھا میرا دل نہ تھا

اس طرح پر الہ آباد میں ۸ ستمبر ۱۹۱۹ء کو محبی سید محمد حسین صاحب جوہر و مکرمی سید ماجد علی صاحب ماجد و کبیل کے اہتمام سے ایک مشاعرہ ہوا تھا مجھ سے بھی شرکت کے لئے زور دیا گیا لیکن میں بہ وجہ بارش نہ جا سکا یہ غزل صرف ایک قافیے میں ہے اور تمام غزل میں اضافت اور واو عطف نہیں ہے

ق

کیا چھلاوا تھا ترا جلوہ وہ اسے قاتل نہ تھا
میں نے دیکھا مڑ کے تو پہلو میں میرا دل نہ تھا

کیا کہا یہ کام اُس کے واسطے مشکل نہ تھا
دل تمھیں دیتا مرے دشمن کا اِتنا دل نہ تھا

لے گئی اُن کی نگاہِ ناز ہم سے چھین کر
جس کو اپنا دل سمجھتے تھے وہ اپنا دل نہ تھا

دل کسی کو دے کے دل والے تڑپتے ہی رہے
تھا وہی آرام سے پہلو میں جس کے دل نہ تھا

کس طرح کہہ دوں اُسے تم لے کے چلتے ہو گئے
پہلے یہ تو جانچ لوں پہلو میں تھا یا دل نہ تھا

وہ مٹا تو ساتھ اُس کے ایک دنیا مٹ گئی
دل میں تھے ارمان بھی لاکھوں اکیلا دل نہ تھا

پھیر لیں کیا سوچ کر اپنی نگاہیں آپ نے
دل کے قابل وہ نہ تھیں یا اُن کے قابل دل نہ تھا

مل گئی مجھ کو بھی ہمت وہ بھی سستے چھٹ گئے
کہہ دیا دل لے کے میرا تھا تمھارا دل نہ تھا

چاہتے ہیں کب سے ہم یہ کچھ خبر ہے آپ کو
جان بھی دل میں نہ تھی پہلو میں بھی جب دل نہ تھا

ہاتھ رکھ دینے سے اُن کے اور زحمت بڑھ گئی
تھا اگر اے نوحؔ یوں پہلے تو اب اپنا دل نہ تھا

عمر بھر غم کو خوشی درد کو درماں سمجھا

۱۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو پٹنہ عظیم آباد میں جناب سید شاہ حامد حسین صاحب حامدؔ سجادہ نشین درگاہ حضرت ارزاں صاحب رح کے اہتمام سے اس طرح پر عظیم الشان مشاعرہ ہوا مقامی شعرا کے علاوہ جناب بدر صاحب آروی اور جناب فصاحت صاحب لکھنوی عشرت صاحب سندیلوی، توبہ صاحب سید سراوانی، صفدر صاحب مرزاپوری، اور جناب یاس صاحب وغیرہ موجود تھے مجھے ذیل کی غزل پر بہت داد ملی مشاعرہ دس بجے رات کو شروع ہو کر بارہ بجے دن کو ختم ہوا

ق

آہ و زاری سے وہ کیا اے دلِ نالاں سمجھا
بس یہ سمجھا کہ تجھے بے سر و ساماں سمجھا

دل میں کیا کیا نگہِ ناز نے شکلیں بدلیں
کوئی نشتر اِسے سمجھا کوئی پیکاں سمجھا

کوچۂ یار کا رتبہ کوئی ہم سے پوچھے
کچھ نہ سمجھا جو اسے روضۂ رضواں سمجھا

چارہ گر کہتا ہے مٹ جائے گی تکلیف تری
کیا مرے درد کو یہ قابلِ درماں سمجھا

عشق کی لاگ نصیحت سے سوا ہوتی ہے
مجھ کو سمجھا کے یہ اب ناصحِ ناداں سمجھا

اور جو کچھ ہو حقیقت وہ فرشتے جانیں
گلشنِ خلد کو میں کوچۂ جاناں سمجھا

شام ہوتی ہے سحر ہوتی ہے پھر ہوتی ہے شام
اُس کی قدرت کو نہ سمجھے گا نہ انساں سمجھا

مشکلیں عشق و محبت کی ہنسی کھیل نہیں
قابلِ داد وہ ہے جو اِنھیں آساں سمجھا

زخمِ الفت کہیں دنیا میں سئے جاتے ہیں
چاک دل کو بھی وہ کیا چاکِ گریباں سمجھا

دل میں ارمان بھی ہے شوق بھی ہے ذوق بھی ہے
اس بھرے گھر کو وہ کیا خانۂ ویراں سمجھا

خوف سے دوسرے دیوان کی غزلیں نہ پڑھیں

نوحؔ طوفان کو وہ نوحؔ کا طوفاں سمجھا

طبع زاد ۲۱ اگست ۱۹۲۰ء

یہ خلاصہ ہے مرے حالات کا
پڑ گیا رونا مجھے دن رات کا

جانتا ہو جو محل ہر بات کا
کیا ٹھکانہ اُس کی معلومات کا

چھپ کے جانا اُن کے گھر مشکل نہیں
منتظر ہوں میں اندھیری رات کا

کس طرح تھامے اثر کو دوڑ کر
نالہ ہے بے پانو کا بے ہات کا

بات بھی میری جو تم سنتے نہیں
خوف ہے آخر تمھیں کس بات کا

اچھی سوجھی یہ قیامت میں تمھیں
دن کو اب کر لیتے ہو وعدہ رات کا

دل جو دیتا ہوں تو کہتا ہے وہ شوخ
تم سے میں طالب نہیں سوغات کا

کیا ستم تو نے کیا اے ضبطِ اشک
ہائے وہ عالم بھری برسات کا

لوگ کر لیتے ہیں کیوں کر اعتبار
میری تیری اِس کی اُس کی بات کا

دیکھئے جس وقت کوئے یار میں
حشر ہے دو چار کا چھ سات کا

انتہائے عشق میں پیش آ گئی
ابتدا میں خوف تھا جس بات کا

ق

چل دئے اُٹھ اُٹھ کے میرے چارہ ساز
ہے بھروسہ اب خدا کی ذات کا

دل اُڑا لینا کوئی مشکل نہیں
ہے یہ کرتب اُن کے بائیں ہات کا

ہر گھڑی یادِ خدا سے کام ہے
پوچھنا کیا نوحؔ کی اوقات کا

طبع زاد ۳۰ اگست ۱۹۲۰ء

شکووں پہ ستم آہوں پہ جفا سو بار ہوئی سو بار ہوا
ہر بات مجھے ہر کام مجھے دشوار ہوئی دشوار ہوا

ساقی کی نشیلی آنکھوں سے ساری دنیا سارا عالم
بدمست ہوئی بدمست ہوا سرشار ہوئی سرشار ہوا

ہے نام دلِ مضطر جس کا کہتے ہیں جسے سب جانِ حزیں
مرنے کے لئے مٹنے کے لئے تیار ہوئی تیار ہوا

اظہارِ محبت بھی ہے غضب اظہارِ محبت کون کرے
حجت اُن سے جھگڑا مجھ سے ہر بار ہوئی ہر بار ہوا

دنیا میں بہار اب آپہنچی مے خانے کا در بھی کھل جائے
ایک ایک گلی ایک ایک مکاں گلزار ہوئی گلزار ہوا

کیوں رحم وہ ظالم کرنے لگا کیوں موت یہاں تک آنے لگی
الفت سے مری صورت سے مری بیزار ہوئی بیزار ہوا

حسرت اپنی ارماں اپنا آزار اپنا تکلیف اپنی
ہم درد بنی ہم درد بنا غم خوار ہوئی غم خوار ہوا

ملنے سے متنفر تھا جس کو آغوش میں اب وہ سوتا ہے
تقدیر مری اقبال مرا بیدار ہوئی بیدار ہوا

ق

مقتل میں جفائیں ڈھانے پر مقتل میں جفائیں سہنے پر
قاتل کی نظر بسمل کا جگر تیار ہوئی تیار ہوا

اے نوحؑ یہ کیا سوجھی تم کو طوفان اٹھایا کیوں تم نے
ساری دنیا سارا عالم بیزار ہوئی بیزار ہوا

طبع زاد ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۳۱ء

ناکامِ نشاطِ عیش و خوشی ہر وقت کے رنج و غم نے کیا
جو تم نے کہا وہ دل نے کیا جو دل نے کہا وہ ہم نے کیا

یہ حال ہے میرے مرقد کا عالم ہے یہ میرے مدفن پر
صرصر نے کسی دن جھاڑو دی چھڑکاؤ کبھی شبنم نے کیا

فرقت میں ہزاروں ظلم سہے الفت میں ہزاروں رنج دیئے
کیا ہم نے کیا کیا تم نے کیا یہ تم نے کیا وہ ہم نے کیا

آنکھوں سے بہے مٹی میں ملے احباب کو پروا کچھ نہ ہوئی
ماتم مرے ایک ایک آنسو کا مژگاں کی صفِ ماتم نے کیا

اب کوئی اسے فریاد کہے یا کوئی اسے شکوہ سمجھے
ہم کو جو ستایا بندوں نے تو شکر خدا کا ہم نے کیا

یوں آپ بگڑنے کو بگڑیں لیکن یہ ذرا سوچیں سمجھیں
کیا صرف ہمیں نے عشق کیا دنیا نے کیا عالم نے کیا

یہ تم نے کیا یہ تم نے سنا یہ تم نے کہا یہ کون کہے
وہ پوچھتے ہیں کیا ہم نے کہا کیا ہم نے سنا کیا ہم نے کیا

حسرت کو بھی حسرت آتی ہے عبرت کو بھی عبرت آتی ہے
وہ شکل ہماری غم میں ہوئی یہ حال ہمارا غم نے کیا

دنیا کو ڈبویا اشکوں سے طوفان اٹھایا رو رو کر
دریائے غمِ الفت میں بپا اے نوحؑ تلاطم ہم نے کیا

۱ اس زمین میں اکثر احباب کی غزلیں سن کر ۳؍ نومبر ۱۹۲۱ء کو یہ غزل کہی

ج

کیوں کر ہو مرا دل نہ پریشانِ تمنا
یہ جوشِ غمِ عشق یہ ہیجانِ تمنا

لکھتا ہوں انھیں خط میں دل و جانِ تمنا
ہوتا ہے نئی شکل سے اعلانِ تمنا

اب رنج و غم و یاس ہیں مہمانِ تمنا
کس آفت و زحمت میں پھنسی جانِ تمنا

چلتے ہیں ہوائے ستم و جور کے جھونکے
اڑ جائیں نہ اوراقِ پریشانِ تمنا

دیکھو تم انھیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھو
آنسو بھی ہیں منجملۂ سامانِ تمنا

دیباچۂ الفت میں رگِ دل کے لہو سے
سرخی کوئی لکھوں پئے عنوانِ تمنا

دل تندر کرو ظلم سہو ناز اٹھاؤ
اے اہلِ تمنا یہ ہیں ارکانِ تمنا

ہر زخمِ جگر ایک گلِ باغِ وفا ہے
ہر داغِ دل اک شمعِ شبستانِ تمنا

مجھ سے کوئی پوچھے مرے دل سے کوئی پوچھے
تم آن ہو تم شان ہو تم جانِ تمنا

مر جاتے ہیں گھٹ گھٹ کے اسیرانِ محبت
کھلتا نہیں پھر بھی درِ زندانِ تمنا

کرتا ہوں خیالاتِ دلِ زار کی دعوت
بچھتا ہے شب و روز یہاں خوانِ تمنا

محرومیِ تقدیر کا شاکی جو رہا ہو
وہ کون ہے وہ ہیں بے سر و سامانِ تمنا

جو طالبِ الفت ہو وہ مضبوط کرے دل
اٹھے گا اسی نیو پہ ایوانِ تمنا

آنکھیں ہوں کہ نظریں ہوں کلیجا ہو کہ دل ہو
الفت میں ہیں سب تابعِ فرمانِ تمنا

سو داغ مرے دل میں ہیں سو زخم جگر میں
اللہ ری بہارِ چمنستانِ تمنا

دیکھیں جو اسے آپ تو حسرت کی نظر سے
ہے نوح کا دیوان بھی طوفانِ تمنا

طبع زاد ۳۱ر جنوری ۱۹۲۲ء

گیا جو وقت تو پھر کر کے غور کیا ہوگا
نہ ہوگا کچھ بھی یہی ہوگا اور کیا ہوگا

نہ اور ہوں گے نہ ہم ہوں گے اور کیا ہوگا
وہ پوچھتا ہے کہ انجام جور کیا ہوگا

فنا کے بعد زمانے میں اور کیا ہوگا
نہ ہوگا دور کوئی وہ بھی دور کیا ہوگا

نہ پاس آئیں نہ بیٹھیں نہ وہ کلام کریں
حجاب اس سے زیادہ اب اور کیا ہوگا

فلک کے ظلم تو ہم کو مٹائے دیتے ہیں
جو آپ جور کریں گے وہ جور کیا ہوگا

یہ چھیڑ کیاں بھی عبث ہیں یہ دھمکیاں بھی فضول
جفائیں ہوں گی ستم ہوں گے اور کیا ہوگا

کرم کے بعد تو مجھ پر وہ جور ڈھائیں گے
مگر خبر نہیں پھر بعد جور کیا ہوگا

زمیں بھی درپئے ایذا فلک بھی دشمنِ عیش
یہ سوچتا ہوں کہ جینے کا طور کیا ہوگا

بشر کو خلد میں راحت ملے ملے نہ ملے
نئے مقام نئے گھر کا طور کیا ہوگا

نگاہِ لطف سے مجھ کو وہ قتل کرتے ہیں
کرم کا حال جو یہ ہے تو جور کیا ہوگا

کہا جب اُن سے جفاؤں پر آپ غور کریں
تو کر کے غور کہا کر کے غور کیا ہوگا

کبھی وہ کہتے ہیں دل اور چاہیئے ہم کو
کبھی وہ کہتے ہیں رہنے دو اور کیا ہوگا

بڑوں کی ذات سے چھوٹوں کی ہے جہاں میں نمود
سبو نہ ہوگا تو ساغر کا دور کیا ہوگا

اُٹھائیں خلق میں طوفان سب کو غرق کریں
جنابِ نوح کے اشکوں سے اور کیا ہوگا

جو کچھ ہوا وہ عشق کی امداد سے ہوا

اس طرح یہ ۲۱ر جولائی ۱۹۲۲ء کو جناب آغا علی خاں صاحب رئیس الہ آباد کی شادی میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا چونکہ بات کان پڑ گئی تھی مقامی شعرا میں سے جناب ناطق داکبر دعروج وغیرہ کانپوری اور مشاہیر شعرا میں سے جناب ثاقب۔ عزیز۔ محشر۔ بہار۔ مقبول۔ شفیق لکھنوی اور جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر ڈپٹی کلکٹر اور جناب قمر۔ اعجاز۔ تحمل۔ ضامن۔ بسمل۔ غنی۔ اعظم۔ شیدا۔ واجد۔ یوسف۔ گدا۔ محسن۔ محمود الہ آبادی موجود تھے۔ بارش کے سبب سے مجمع زیادہ نہ تھا میں نے اپنی غزل پڑھی امید سے زیادہ داد ملی حاضرینِ مشاعرہ نہایت خوش ہوئے اب تک اگر کوئی صاحب حاضرین میں سے مل جاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی شعر پڑھتے ہیں۔

ج

آگاہ وہ مرے دلِ ناشاد سے ہوا
اتنا تو کام نالہ و فریاد سے ہوا

یہ جھوٹ ہے کہ نالہ و فریاد سے ہوا
وہ روشناسِ غم مری روداد سے ہوا

تیور بدل گئے تری چتون بدل گئی
آخر قصور کیا دلِ ناشاد سے ہوا

وہ حشر میں جو آئے تو خورشیدِ حشر بھی
شرمندہ اُن کے حسنِ خداداد سے ہوا

اُتریں نئی نئی جو زمانے میں آفتیں
پہلا مقابلہ دلِ ناشاد سے ہوا

آتی رہی تسلّیِ خاطر کو بار بار
تجھ سے نہ وہ ہوا جو تری یاد سے ہوا

مارا اُنھیں کو تھی جنھیں مرنے کی آرزو
یہ کارِ خیر اُس ستم ایجاد سے ہوا

جس کی نظر میں ہیچ تھے دنیا کے انقلاب
پامال وہ بھی عشق کی افتاد سے ہوا

آنے لگا ستم میں بھی ہم کو کرم کا لطف
ظاہر ترا کمال اِس ایجاد سے ہوا

وہ بات کیا جو اور کی تحریک سے ہوئی
وہ کام کیا جو غیر کی امداد سے ہوا

سب کہہ رہے ہیں نوحؔ کی اس میں خطا نہیں
طوفانِ غم بپا تری بیداد سے ہوا

طبع زاد ۱۸ر جولائی سنہ ۱۹۲۳ء

ج

عیش کے بدلے ہمیشہ غم ہمیں سہنا پڑا
جس طرح قسمت نے رکھا اُس طرح رہنا پڑا

سنئے سنئے ماجرائے شوق سنئے شوق سے
آپ نے چھیڑا تو مجبوراً مجھے کہنا پڑا

چند قطرے خون کے جن پر تھی دل کی زندگی
آنسوؤں کے ساتھ آنکھوں سے اُنھیں بہنا پڑا

چار دن کی زندگی میں یہ نہ پوچھ اے ہمنشیں
کیا مجھے کرنا پڑا سننا پڑا کہنا پڑا

کیا ستم کیا رشک کیا آزار کیا غم کیا ملال
عشق میں سب کچھ دلِ بے تاب کو سہنا پڑا

دیکھ کر محشر میں اُن کو مٹ گئے سارے گلے
چپ نہ رہنے کی جگہ بھی چپ ہمیں رہنا پڑا

بحرِ الفت میں کیا موجوں نے عالم کو تباہ
جس طرف دریا کا رُخ تھا اُس طرف بہنا پڑا

شکر ہے تیری بدولت اے دلِ راحت پسند
ہم کو دنیا کے بکھیڑوں سے الگ رہنا پڑا

اس سے بڑھ اور اب کیا ہو گی رسوائی مری
رازِ دل محشر میں سب کے سامنے کہنا پڑا

اب طریقِ عشق میں ہے ناتوانی سے یہ حال
جس جگہ میں گر پڑا مجھ کو پڑا رہنا پڑا

چاہتے ہیں مجھ سے وہ اپنی خوش اطواری کی داد
خیر اب ذکر آ گیا اِس کا تو کچھ کہنا پڑا

کشتیِ امید ساحل پر اٹک کر رہ گئی
نوحؔ کو طوفانِ بحرِ یاس میں بہنا پڑا

طبع زاد ۳۱ر جولائی سنہ ۱۹۲۳ء

ج

رہ نوردِ عشق سب کو چھوڑ کر آگے بڑھا
جان کا کھٹکا تھا بڑھنے میں مگر آگے بڑھا

ڈھونڈھنے والے نے اِس صورت سے طے کی راہِ شوق
پہلے پوچھا پھر کسی کو پوچھ کر آگے بڑھا

ہے ابھی تو دل ہی میں سوزِ محبت کا اثر
پھونک دے گا تجھ کو یہ شعلہ اگر آگے بڑھا

سیرگاہِ خلق میں سب کچھ تو ہے کیا کچھ نہیں
دیدۂ پُر شوق کھول اپنی نظر آگے بڑھا

ہم نے یہ مانا کہ تھی راہِ محبت خوف ناک
ہر مسافر کچھ سمجھ کر جلد تر آگے بڑھا

اپنی جانب آپ کے ناوک کو آتے دیکھ کر
پیشوائی کے لئے میرا جگر آگے بڑھا

اور تو سب کوچۂ قاتل میں ڈر کر رہ گئے
وہ فقط میں تھا جو بے خوف و خطر آگے بڑھا

نوحؔ جوشِ چشم دریا بار کو قابو میں رکھ
پھر کہاں کی خیر یہ طوفان اگر آگے بڑھا

خندہ زن گل ہو کے غنچہ مسکرا کر رہ گیا

اس زمین پر بہت دنوں پہلے ایک مشاعرہ سندیلہ ضلع ہردوئی میں ہو چکا تھا وہاں جو غزل میں نے جا کر پڑھی تھی وہ طوفان نوح میں درج ہو چکی ہے پھر دوسرا مشاعرہ اس طرح پر ۱۵ ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو کرسچین کالج الہ آباد میں منعقد ہوا مقامی شعرا میں سے جناب ماجد۔ ضامن۔ بسمل۔ قمر۔ بے خود۔ سجاد۔ شوقی۔ بیرونی شعرا میں سے جناب ثاقب۔ شفیق لکھنوی۔ بے خود موہانی موجود تھے مشاعرہ ۸ بجے رات سے شروع ہو کر ۳ بجے رات کو ختم ہوا سامعین کی تعداد قریب ۸ سو کے تھی مجھے اس غزل پر بہت کچھ داد ملی

ج

آرزو مندِ شہادت آہ بھر کر رہ گیا
روح کھنچ کر رہ گئی کھنچ کر جو خنجر رہ گیا

کیا بتاؤں کس طرح دل میں وہ خنجر رہ گیا
آرزو ہو کر سمایا درد بن کر رہ گیا

ماجرائے قتل کہنے کو زباں پر رہ گیا
کس کی گردن رہ گئی اب کس کا خنجر رہ گیا

دل فدا کرنے کو آمادہ تھے لاکھوں اہلِ عشق
سر فدا کرنے کا سہرا میرے ہی سر رہ گیا

اضطراب و ضعف کے حملے تھے کیسے یاد ہیں
میں اُٹھا اُٹھ کر چلا کچھ دور چل کر رہ گیا

کشتگانِ عشق تو ملکِ عدم کو چل بسے
اب تمہیں تم رہ گئے خنجر ہی خنجر رہ گیا

چار حرفِ آرزو کی شرح میں طول اِس قدر
ایک دفتر لکھ گیا اور ایک دفتر رہ گیا

دل تہ و بالا ہوا لیکن نہ نکلا خارِ غم
اِس طرف سے اُس طرف کروٹ بدل کر رہ گیا

گو وہی دل ہے مگر وہ جوشِ خونِ دل نہیں
اڑ گئی ساغر سے مے ساغر ہی ساغر رہ گیا

زخمِ دل جتنے ہوئے تھے خشک پھر رِسنے لگے
تم نے لیں انگڑائیاں میں آہ بھر کر رہ گیا

آپ آئے آپ بیٹھے آپ نے پوچھا مزاج
پھر بھی مضطر دل مرا مضطر کا مضطر رہ گیا

موت پھر وہ موت اُن کے ناتواں بیمار کی
ایک ہچکی آ گئی چپکے سے مر کر رہ گیا

کھینچ کر لانا تھا تیر ناز کو اے جذبِ شوق
دل کے اندر رہنے والا دل کے باہر رہ گیا

غیر ممکن تھا مریضانِ محبت کا علاج
جس نے دیکھی نبض وہ خاموش ہو کر رہ گیا

مٹ گیا دل ہی تو شکرِ دل نوازی کیا کروں
سر گیا تو پھر کہاں احسان سر پر رہ گیا

ہے پشیمانی ستم اہلِ ستم کے واسطے
جب نہ گردن کٹ سکی کر وہ خنجر رہ گیا

کیوں نہ بہتے اشک بڑھ جاتا اگر ہیجانِ غم
خیر گذری نوحؔ یہ طوفان دب کر رہ گیا

ج

دنیائے محبت میں یوں فرض ہوا رہنا
راضی برضا رہنا شاکر بقضا رہنا

اُن کا وہ خفا آنا اُن کا وہ خفا رہنا
آنے میں یہ کیا آنا رہنے میں یہ کیا رہنا

یہ ناز ترا کیا ہے اغماض ترا کیا ہے
کیا مجھ کو جدا رکھنا کیوں مجھ سے جدا رہنا

ظالم ترے کوچے میں قاتل تری محفل میں
رہنے کو ہم آئے تھے دشوار ہوا رہنا

کیا شیوۂ الفت ہے یہ شیوۂ الفت ہے
پامالِ جفا رہ کر مصروفِ وفا رہنا

دل اپنا کہیں ٹھہرے تو ہم بھی کہیں ٹھہریں
اس کوچے میں آ رہنا اُس کوچے میں جا رہنا

یہ بات اگر دیکھی تو آپ ہی میں دیکھی
اظہارِ وفا کرنا مشغولِ جفا رہنا

کہتے تھے رہیں گے ہم پہلو میں ترے آ کر
وہ آ گئے پہلو میں اب صرف رہا رہنا

عالم میں الم دیکھے دنیا میں ستم دیکھے
رہنے کی یہ صورت تھی تو ہم کو نہ تھا رہنا

اے نوحؔ وہ کہتے ہیں تم کھیل سمجھتے تھے
بے تابِ لقا ہونا مشتاقِ لقا رہنا

آنسو جو نہ تھم جاتے کیا جانئے کیا ہوتا

اسی طرح یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو راجہ پور الہ آباد میں جناب میر سجاد علی صاحب وکیل کے اہتمام سے ایک اچھا خاصا مشاعرہ ہوا مقامی شعراء میں سے قریب قریب سب موجود تھے لکھنؤ سے حضرات عزیز، ثروت، ثاقب نے شرکت کی یہ جلسہ گیارہ بجے دن سے شروع ہو کر نو بجے رات کو ختم ہوا میں نے بھی یہ غزل پڑھی تھی

ج

وہ بت ہی رہا لیکن بت سے جو خدا ہوتا
کیا جانئے کیا کرتا کیا جانئے کیا ہوتا

بیداد کے شکوؤں پر یہ ظلم نیا ہوتا
وہ دل سے خفا ہوتے دم مجھ سے خفا ہوتا

اظہارِ محبت پر مجھ سے وہ خفا ہوتا
تقدیر مخالف تھی تدبیر سے کیا ہوتا

وہ دیکھتا آئینہ تو لطف نیا ہوتا
یا مجھ ادا کرتا یا مجھ ادا ہوتا

پھر تیری اداؤں پر دل اپنا فدا ہوتا
پہلو میں وہ ہوتا بھی تو ہونے سے کیا ہوتا

یہ سوچ سمجھ کر ہم چپ رہ گئے الفت میں
قسمت جو رسا ہوتی نالہ بھی رسا ہوتا

حالِ غمِ الفت پہ رُکنا ہی نہ تھا مجھ کو
سُنتے کہ نہ وہ سُنتے میں نے تو کہا ہوتا

ہیں ہاتھ اُٹھانے سے ہاتھوں کو نہ کیوں کھینچوں
امیدِ اثر ہوتی مصروفِ دعا ہوتا

کیا وجہ بگڑنے کی لڑنے کی جھگڑنے کی
کچھ میں نے کہا ہوتا کچھ تم نے سنا ہوتا

آکر وہ مرے گھر تک گھر سے نہ پلٹ جاتے
میں نے جو دعا کی تھی نالہ بھی کیا ہوتا

یہ راز تھا پوشیدہ الفت نہ بڑھانے میں
دل مجھ سے ملا کر وہ کس دل سے جدا ہوتا

ہے شکر کہ دل ہی میں نالے رہے گھٹ گھٹ کر
لب تک جو یہ آجاتے کیا جانئے کیا ہوتا

بے فکر ہمیں رکھا آزارِ محبت نے
جتنی ہی دوا کرتے اُتنا ہی سوا ہوتا

یہ اُس بتِ کافر کی تعریف مکمل ہے
اور اِس سے اگر بڑھ کر ہوتا تو خدا ہوتا

چار اشک بہا کر ہم مجبورِ وفا ٹھہرے
طاقت تھی نہ رونے کی تو ضبط کیا ہوتا

بیداد کی آندھی میں آزار کے جھونکوں میں
نالہ بھی جو ہم کرتے تو وہ بھی ہوا ہوتا

ناکامِ ازل ہم تھے مایوسِ ابد ہم ہیں
جینے ہی سے کیا ہوگا مرنے ہی سے کیا ہوتا

دریائے محبت سے لبریز تھا ہر آنسو
اے نوحؔ جو ہم روتے طوفان بپا ہوتا

کہ نالہ منھ سے نکلا زمزمہ ہو کر عنادل کا

از اخبار البرہان برہان پور

بتقریب چہلم شہدائے کربلا علیہم السلام والصلوٰۃ

ایک شاندار سالانہ مجلس حضرت نوحؔ کی صدارت میں

جناب نوحؔ کا نام نامی اور اسم گرامی کسی خاص تعارف کا محتاج نہیں دنیائے شاعری اور تعلیم یافتہ طبقے میں شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب شخص ہوگا جو اس ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر اور جانشین حضرتِ داغ مرحوم کی جدتِ طبع فکر رسا زبان دانی اور طوفان خیز شاعری سے واقف نہ ہو فی الحقیقت اردو علم ادب آپ کے بار احسان سے کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتا سفینۂ نوح اُس طوفانی زمانے میں جب کہ غریب اردو ناقدری کے بحر زخار میں غرق ہونے والی تھی بچانے والا بیڑا ثابت ہوا جو آپ ہی کی جدت طرازی محاورہ بندی کا نتیجہ ہے اور جس کی سارے ہندوستان میں دھوم ہے زبان میں لوچ سلاست حسن بیان اور شاعری کے تمام نکات آپ کے ذاتی جوہر ہیں یہ ساری خوبیاں آپ امسال انجمن مجلس حسینی کی صدارت قبول فرما کر بھوساول میں ۳؍ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو دکھا گئے اور خراج تحسین سے جھولیاں بھر لے گئے دکن کے موجودہ شعرا اور بالخصوص اہل خاندیس کو اراکین مجلس مذکور کا تہ دل سے شکر گذار ہونا چاہئے جنھوں نے اپنی مساعی جمیلہ اور حسنِ خدمات سے ہزاروں روپیہ فراہم کر کے ایسے مستند اور کامل فن سے انھیں نیاز حاصل کرنے اور اُن کے بے نظیر کلام سننے کا موقع دیا یہ معرکۃ الآرا دو غزلیں جو ایک ہی قافیہ (دل) میں لکھی گئی ہیں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے سر ورق درج اخبار کی جاتی ہیں کہ وہ بھی لطف سخن اٹھائیں اور دیکھیں کہ ایک قافیے کو اتنے شعروں میں کس خوبی سے باندھا ہے ہر شعر بجائے خود حضرتِ دل کی جداگانہ داستان ہے دل کے حروف کی طرح ہر شعر کا مضمون جدا ہے اور پھر لطف یہ کہ شاعری کے نکات اور خوبی زبان سے کوئی شعر خالی نہیں مجلس میں صدائے

تحسین و آفرین کا وہ طوفان اٹھا کہ جناب نوح کو سنبھالنا مشکل ہو گیا لیکن جناب نوح آخر نوح ہی ٹھہرے صدارت کے سفینے کو ساحلِ کامیابی تک بحسن و خوبی لے گئے۔ دیگر شعرا نے بھی خوب خوب غزلیں پڑھیں اور خوب خوب اپنے کمال کے جوہر دکھاتے اور حاضرینِ بزم سے دادِ سخن حاصل کی۔

کھلے کیا محفلِ عالم میں اہلِ محفل کا
چھپا ایک ایک کے دل سے راز ایک ایک کے دل کا

کوئی سمجھے تو کیا سمجھے یہ نکتہ ذوقِ کامل کا
جو الفت میں تمھاری لام ہے وہ لام ہے دل کا

ہوئی توسیع اہلِ ذوق میں شمشیرِ قاتل سے
بجائے خود ہے دل وہ بھی جو ٹکڑا ہے مرے دل کا

پریشانی میں جتنے اشک تھے وہ ہو گئے باہر
اٹھایا درد نے اٹھ کر جنازہ حسرتِ دل کا

قیامت آگئی الفاظِ الفت آگئے لب پر
لفافہ گفتگو ہی گفتگو میں کھل گیا دل کا

یہ مانا خلق میں ہیں سیکڑوں آئینہ گر لیکن
کوئی ٹکڑے سے ٹکڑا جوڑ دے ٹوٹے ہوئے دل کا

چلا ہے ناوکِ صیاد گھر اپنا بنانے کو
بنا دے اسے ہوائے شوق اسے رستہ مرے دل کا

ہجومِ یاس میں جب سر جھکا کر غور کرتا ہوں
دکھا دیتا ہے اس کی شکل مجھ کو آئینہ دل کا

دمِ جوشِ جنوں عقدہ کھلا یہ دم نکلنے پر
ملا تھا سلسلہ تارِ گریباں سے رگِ دل کا

کھلیں راہیں جنوں کی اور بھی برباد ہونے پر
بیاباں بن گیا وسعت میں ہر ذرہ مرے دل کا

ہوئی مسمار ہم یوں چار دیواری عناصر کی
کھنڈر بھی اب نظر آتا نہیں کاشانۂ دل کا

خیالِ کعبہ و بت خانہ ہم کرتے تو کیا کرتے
عبادت کے لئے کافی تھا گوشہ اپنے ہی دل کا

خوشا تقدیر اس کی جس کو ذوقِ سوزِ الفت ہو
مجھے پیارا ہے دل سے بھی زیادہ آبلہ دل کا

کوئی ڈھونڈے بھی تو اجزا فراہم ہو نہیں سکتے
بکھیرا یوں ہوائے غم نے شیرازہ مرے دل کا

دکھایا شعبدہ کیا خوب یہ ان کی محبت نے
جو پیکاں تھا مرے دل میں وہ ارماں بن گیا دل کا

سناؤ اب غزل اسے نوح اپنے رنگ کی سب کو
مگر یہ شرط ہے چھٹنے نہ پائے قافیہ دل کا

جو کہتے تھے نہ اٹھے گا کسی سے ناز قاتل کا
وہ میرے دل کو دیکھیں کیا کلیجا ہے مرے دل کا

اسے خواہش اسے حسرت اسے ارماں ہے قاتل کا
خدا حافظ خدا ناصر خدا مالک مرے دل کا

بلا کر بھی وہ رہ کہتے ہیں تو میں پہچان لیتا ہوں
یہ ٹکڑا ہے جگر کا اور یہ ٹکڑا مرے دل کا

فضیلت کعبہ و بت خانہ پر ہے عرشِ اعظم کو
مگر ہے عرشِ اعظم سے زیادہ مرتبہ دل کا

وہ پیمانِ وفا توڑیں مگر یہ سوچ لیں پہلے
مآلِ کار کیا ہوگا کسی ٹوٹے ہوئے دل کا

تمنائیں تو جب ہوتیں کہ تم کچھ مہرباں ہوتے
تمھاری بے دلی نے خاتمہ ہی کر دیا دل کا

اٹھیں تھیں غرق کرنے کے لئے لہریں محبت کی
نہیں معلوم ڈوبا یا بچا بیڑا مرے دل کا

دمِ آخر بھی کیا صورت کسی کی ہم نہ دیکھیں گے
رگیں کھنچنے لگیں اب ٹوٹتا ہے آسرا دل کا

شبِ غم اشکِ خوں آلودہ آنکھوں سے نکلتے ہیں — لہو پانی کیا ایک آرزو و یاس نے دل کا

بیانِ غم کی اب ہے کیا ضرورت دردمندوں کو — جو نالہ منہ سے نکلا وہ بھی تھا اک مرثیہ دل کا

وہ لکھ لکھ کر زمیں پر پاؤں سے اپنے مٹاتے ہیں — یہ مطلب ہے نہ رہ جائے جہاں میں نام بھی دل کا

فقط دو حرف تھے اور ایک لفظِ مختصر لیکن — بہت کچھ ہم نے سر مارا نہ عقدہ حل ہوا دل کا

تمہارے تیر سے نسبت نظر کو دے کوئی کیوں کر — یہ دشمن روح کی ہے اور وہ بدخواہ ہے دل کا

تمہارے سامنے شکوے تمہارے ہو نہیں سکتے — کہاں اتنی جسارت مجھ میں دل اتنا کہاں دل کا

شبِ فرقت نہیں اِس کے علاوہ مشغلہ کوئی — مرا ماتم کرے دل اور میں ماتم کروں دل کا

بندھا یہ قافیہ کن خوبیوں سے اتنی مشکلوں میں
جنابِ نوحؔ نے پہلو نہ چھوڑا ایک بھی دل کا

مشاعرۂ جھانسی منعقدہ ۱۷ اپریل ۱۹۲۶ء کے لئے یہ غزل کہی تھی لیکن علالت سے نہ جا سکا

ہجر کی تاریک راتوں میں یہ ساماں ہو گیا — داغ ہائے دل چمک اُٹھے چراغاں ہو گیا

دل نے چاہا تھا رہے پوشیدہ اُن کا رازِ عشق — رنگ بن کر میرے چہرے سے نمایاں ہو گیا

فصلِ گل آتی نہ آتی کیا تھا اُس کا اعتبار — پہلے ہی سے تار تار اپنا گریباں ہو گیا

برق نے گر کر بنایا مجھ کو ممنونِ کرم — جل اُٹھے تنکے نشیمن میں چراغاں ہو گیا

مل گئی یوں مجھ کو اُس کافر کی الفت سے نجات — کچھ نہ بن آئی تو مجبوراً مسلماں ہو گیا

اشکِ پر خوں کا ٹپکنا تھا کہ آ پہنچی بہار — رو دیئے جس گھر میں ہم وہ گھر گلستاں ہو گیا

جب یہ ٹھہرا حال تو جمعیتِ خاطر کہاں — تم نے کوئی بات کہہ دی میں پریشاں ہو گیا

اہلِ غم تاریکیِ غم کی شکایت کیا کریں — دل سے آہِ پر شرر نکلی چراغاں ہو گیا

قدردانی بر طرف لطف و کرم بالائے طاق — میں نے جس کو دل دیا وہ دشمنِ جاں ہو گیا

مٹ گئیں سب حسرتیں جاتے رہے سب ولولے — خانۂ دل اِس قدر اُجڑا کہ ویراں ہو گیا

کیا بتائیں نوحؔ اپنے واقعاتِ بحرِ غم
ناز جس پر تھا وہ بیڑا غرقِ طوفاں ہو گیا

ذیل کے قافیہ ردیف پر لکھنؤ میں مشاعرہ ہوا میں ماگھ میلہ الہ آباد کے سبب سے نہیں شریک ہو سکا مطلع کے لئے کام کا قافیہ اور مقطع کے لئے نام کا قافیہ مشروط تھا درمیانی اشعار کے لئے صرف آرام، انجام، پیغام قوافی تھے حالاں کہ پیام کے ہوتے ہوئے میں پیغام سے احتراز کرتا ہوں لیکن اصول و ضوابطِ مشاعرہ سے مجبوری رہی جو لوگ شریکِ مشاعرہ ہوئے اُن کا بیان تھا کہ مشاعرہ بہت اچھا ہوا

سلام

عذر یہ چلتا ہوا اُن کا دمِ الزام تھا — میں نے پوچھا کیوں نہ آئے کہہ دیا کچھ کام تھا

بعد مر جانے کے اطمینان تھا آرام تھا — عمر بھر انسان کو یہ فکر تھی وہ کام تھا

جو سلامت رہ گیا وہ موردِ الزام تھا — کوچۂ قاتل میں مرجانا ہی پہلا کام تھا

عمر آخر ہو گئی اب وقتِ آخر کیا کہیں — کس قدر تکلیف تھی کتنا ہمیں آرام تھا (آرام)

مہربانی کی نگاہیں حشر برپا کر گئیں — خوگر آزار کو آزار ہی آرام تھا

لطفِ خوابِ مرگ کی تشریح اور اب کیا کریں — حشر تک چونکے نہ ہم اتنا ہمیں آرام تھا

سانس اُکھڑی موت آئی جینے والے مر گئے — چار دن کی زندگی کا اس قدر انجام تھا (انجام)

اب ہوا یہ تجربہ ہم کو بڑی مدت کے بعد — عشق کا آغاز اچھا تھا بُرا انجام تھا

وہ جو پہلو سے اُٹھے تو اُٹھ گئے دنیا سے ہم — ہجر کا پیغام گویا موت کا پیغام تھا (پیغام)

اُن کے آگے میری تقریر اک معمہ بن گئی — گفتگو کی گفتگو پیغام کا پیغام تھا

کھُل گیا مجھ پر ترے برتاؤ سے تیرا فریب — کچھ نہ تھا پیغام میں پیغام ہی پیغام تھا

کیوں نہ بسم اللہ پڑھ کر اس کو پڑھتے اہلِ درد — عشق کے دفتر میں سرنامے پہ اپنا نام تھا (نام)

کھُل گیا دنیا پر اے قاصد تجھی سے رازِ دوست — دے دیا کس کو مرا خط اور کس کے نام تھا

اشک باری کی بدولت ہو گیا مشہورِ خلق
کیوں نہ میں طوفان اٹھاتا نوح میرا نام تھا

طرح زاد ۱۸ر جولائی ۱۹۲۶ء

چین ہو یا بے چینی ہو پہلے دل گھبرائے گا — جاتے جاتے جائے گی آتے آتے آئے گا (ج)

قاصد آنے جانے میں تھک تھک کر گھبرائے گا — جائے گا پھر آئے گا آئے گا پھر جائے گا

ڈھونڈنے والی نظروں سے دیکھیں گے پہلو کی طرف — اُن کی اِس دل جوئی پر میرا دل اِترائے گا

دل میں امیدیں لاکھوں تھیں کچھ نکلیں کچھ باقی ہیں — خیر کبھی پھر آؤ گے پھر کبھی دیکھا جائے گا

دیر و حرم کے مالک سے ہم کچھ مانگیں کبھی تو سہی — ہے وہ بڑا دینے والا دے گا یا دلوائے گا

دل کے خود آزار و الم دل کی قدر بڑھائیں گے — ہوگا یہ اکسیر مگر خاک میں جب مل جائے گا

ناصح آنے والا ہے دو ہی باتیں ہونی ہیں — یا اُسے ہم سمجھائیں گے یا وہ ہمیں سمجھائے گا

شکوۂ غم کی محشر میں ہم کو تو امید نہیں — سامنے وہ آ جائیں گے ہوش کسے رہ جائے گا

دل دینے والا غم سے چھُوٹ جائے گا دل دے کر — دل لینے والا دل میں دل لے کر پچھتائے گا

نوح کے رونے پر ہنسنا یہ دردِ دل کا خوب نہیں
بحرِ محبت میں اِس سے اور کبھی طوفان آئے گا

حسب فرمائش جناب بھائی احسن صاحب مارہروی
۱۳ر ستمبر ۱۹۲۶ء

ہے یہ مطلب کہ رہے مورِدِ احساں میرا
درد دے کر مجھے کرتے ہیں وہ درماں میرا

آپ کا دل جو پریشاں نظر آتا ہے مجھے
اس نے دیکھا تو نہیں حالِ پریشاں میرا

امتحاں گاہِ محبت میں نہ ٹھہرا کوئی
ہے ازل ہی سے یہ جیتا ہوا میداں میرا

تھا تمھارا یہ رہا پاس تمھارے جب تک
آ گیا اب مرے دل میں تو ہے پیکاں میرا

اس سے بڑھ جاتی ہے کچھ اور پریشاں حالی
آپ پوچھا نہ کریں حالِ پریشاں میرا

اب سوا جوشِ جنوں ہو تو اڑاؤں کس کو
خاک بھی جس میں نہیں وہ ہے بیاباں میرا

ہو رہائی تو رہائی کو گوارا نہ کروں
جانتا ہوں کہ مرے دم سے ہے زنداں میرا

آ گیا پنجۂ وحشت میں خدا خیر کرے
اب گریباں نہیں میرا یہ گریباں میرا

اب نہ وہ دل نہ جگر اب نہ وہ راحت نہ خوشی
آپ نے لوٹ لیا لٹ گیا ساماں میرا

کیوں نہ ہیں دل سے غمِ عشق کی توقیر کروں
ہے یہ اک خاص بلایا ہوا مہماں میرا

پھول کھلتے ہیں تو ہوتا ہے مجھے اور جنوں
صبح ہوتی ہے تو ہنستا ہے گریباں میرا

تم ابھی نوح کے رونے سے خبردار نہیں
جو زمانے کو ڈبو دے وہ ہے طوفاں میرا

حشر میں فریاد کرتا کون کس کو ہوش تھا

اس طرح بر ۱۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے ایک خاص مشاعرہ میور کالج میں ہوا مقامی شعرا کے علاوہ حضرت سائل دہلوی جعفی صاحب۔ بہار صاحب۔ منے آغا صاحب۔ ظریف صاحب لکھنوی جناب شہیر صاحب مچھلی شہری وغیرہ موجود تھے چوں کہ مجمع بہت تھا اس باعث سے بہت سی غزلیں اچھی طرح سننے میں نہ آئیں یہ مشاعرہ دس بجے شب کو شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا

بے خودی میں کب مجھے اظہارِ غم کا ہوش تھا
حالِ دل وہ پوچھتے تھے اور میں خاموش تھا

موت آ جاتی جو ایسے میں تو لطفِ جوش تھا
تم بھی تھے خنجر بکف میں بھی کفن بر دوش تھا

دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہوئے بے ہوش تھا
مل گئی جس سے نظر ساقی کی وہ مے نوش تھا

کیا کہوں اس کشمکش میں کیا مصیبت آ گئی
ابتدا تھی عشق کی اور انتہا کا جوش تھا

آفتابِ حسن کے جلووں نے ہلچل ڈال دی
ذرہ ذرہ کائناتِ عشق کا خاموش تھا

کب رہی گلزار تک محدود تاثیرِ بہار
مے کدے میں بھی بقدرِ ظرف سب کو جوش تھا

طورِ سینا بھی جلا موسیٰ بھی غش کھا کر گرے
اب ہوا معلوم اس باعث سے وہ روپوش تھا

دل کو بھڑکا کر ستم ڈھایا ہوائے شوق نے
ایک شعلہ تھا مگر اپنی جگہ خاموش تھا

کیا خبر نظروں نے کیا دیکھا کسی کو دیکھ کر
ہے مجھے بس ہوش اتنا ہی کہ میں بے ہوش تھا

ہر رگِ دل سو جگہ سے خود بخود رستی رہی
فصلِ گل جب تک تھی یہ اپنے لہو کا جوش تھا

جلوۂ صد رنگ نے دھوکے میں رکھا عمر بھر
تو ہمارے رو برو تھا اور پھر روپوش تھا

کیوں نہ کرتا حسن از خود رفتگی کا احترام
اصطلاحِ عشق میں بے ہوش ہی باہوش تھا

اللہ اللہ طے ہوئی کس لطف سے الفت کی راہ
پیچھے پیچھے دل تھا اپنا آگے آگے جوش تھا

دل نہیں پہلو میں تو اب خونِ دل کیوں کر پیوں
ساقیِ محفل کے دم سے لطفِ نوشا نوش تھا

واقعاتِ عشق پر کیا غور کرتے اہلِ عشق
عقل ہی حیران تھی خود ہوش ہی بے ہوش تھا

قبر میں میت مری اِس شان سے رکھی گئی
ذرہ ذرہ خاک کا کھولے ہوئے آغوش تھا

کیا خبر کب کوچۂ قاتل میں آ جاتی اجل
یہ سمجھ کر جو وہاں تھا وہ کفن بر دوش تھا

ہم چمن سے کب چھٹے جس وقت اے اہلِ چمن
شاخِ گل کا ذکر کیا ہر خار بھی گل پوش تھا

اب وہ جوشش اپنا کہاں اگلی جوانی اب کہاں
چار دن کی تھی جوانی چار دن کا جوش تھا

عمر تو گذری مگر کس طور سے اِس طور سے
بندہ عصیاں کوش تھا اللہ عصیاں پوش تھا

آپ کیا آئے قیامت میں قیامت آ گئی
ورنہ شورِ حشر بھی اِس وقت تک خاموش تھا

ہو گئی غرقاب دنیا آ گیا طوفانِ اشک
نوح تیرے دیدۂ پرنم میں کتنا جوش تھا

موسمِ گل میں قفس میرا نشیمن ہو گیا

اِس طرح پر ۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء کو کرسچین کالج الہ آباد میں ایک مشاعرہ بڑے پیمانے پر ہوا مقامی شعرا کے علاوہ حضرات محشر، بہار، سراج، منظر لکھنوی۔ عالی جناب سائل دہلوی وغیرہ شریک تھے اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں یہ مشاعرہ آٹھ بجے شب کو شروع ہو کر تین بجے رات کو بحسن و خوبی ختم ہوا

ج

سوزِ غم جوشِ جنوں سے پہلے روشن ہو گیا
چاک دامن ہوتے ہوتے خاکِ دامن ہو گیا

غم نہیں جل کر جو خاک اپنا نشیمن ہو گیا
برق گرنے سے اندھیرا گھر تو روشن ہو گیا

کیا کہوں اوروں کو دل بھی مجھ سے بدظن ہو گیا
لیجئے پہلو میں پیدا ایک دشمن ہو گیا

نالہ و فریاد سے وسعت کہاں تک بڑھ گئی
اِس قدر پھیلا قفس اپنا کہ گلشن ہو گیا

دے دیا قدرت نے رُت پھرتے ہی اذنِ گشتی
گل ہوئے ساغر بکف میں گل بدامن ہو گیا

اللہ اللہ شمع لا کر قبر پر وہ رکھ گئے
میں تو یہ سمجھا چراغِ عمر روشن ہو گیا

دل کے دو حصے جو کر ڈالے تھے حسن و عشق نے
ایک صحرا بن گیا اور ایک گلشن ہو گیا

بھرتے بھرتے حسرتیں دل میں ہزاروں بھر گئیں
دانہ دانہ جمع ہو جانے سے خرمن ہو گیا

وہ تجلی داغہائے دل کو غم نے بخش دی
اِن چراغوں سے ہمارا نام روشن ہو گیا

تھی نگاہِ حسن میں کتنی مرے دل کی بساط
ایک آنسو تھا جو گر کر جذبِ دامن ہوگیا

کم سے کم اتنا اثر تو ہم نے دیکھا دیر میں
جو یہاں دو چار دن بیٹھا برہمن ہوگیا

چاہئے تھی شمع اس تاریک گھر کے واسطے
خانۂ دل میں چراغِ عشق روشن ہوگیا

ورطۂ دریائے غم سے کوئی بچ سکتا نہیں
نوحؔ کا طوفان دنیا بھر کا دشمن ہوگیا

میری قسمت نے دکھایا گھر مجھے صیاد کا

اس طرح پر ماڈرن اسکول الہ آباد میں ۹ر نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک اچھا خاصہ مشاعرہ ہوا مقامی شعرا کے علاوہ ناطری صاحب لکھنوی بھی موجود تھے آٹھ بجے رات سے ڈھائی بجے صبح تک نشست رہی

ج

پھر قفس میں قدرداں کوئی نہ تھا بیداد کا
ہم اِدھر چھوٹے اُدھر ہی چھٹ گیا صیاد کا

سانحہ آزار و غم کا واقعہ بیداد کا
کھل گیا اُترا ہوا منھ عاشقِ ناشاد کا

وقت ہوگا صرف اِنھیں میں بلبلِ ناشاد کا
ایک گھر ہے باغباں کا ایک گھر صیاد کا

ہر قدم پر حشر ڈھایا شوخیِ رفتار نے
میں ہوں قائل اِس تری چلتی ہوئی بیداد کا

کیا دکھائے گی نہ دونوں میں کوئی اپنا اثر
آہ پہلے کر چکا اب قصد ہے فریاد کا

خاک میں مل کر مجھے معراجِ الفت مل گئی
ذرّے ذرّے نے مچایا غل مبارکباد کا

ہم نے رکھے تھے جو تنکے آشیاں کے واسطے
ہوگیا تیار اُنھیں سے جھونپڑا صیاد کا

وہ قدم رکھ دیں زمیں پر مجھ لکیریں کھینچ کر
ہے یہی خاکہ مری بگڑی ہوئی روداد کا

دام سے چھٹ کر ہوا میں دامِ الفت میں اسیر
ہاتھ آجائے تو لوں بایاں قدم صیاد کا

حسن کی تعریف کرنی بھی قیامت ہوگئی
داد دینے پر اُنھیں موقع ملا بیداد کا

جا رہے ہیں دردمندانِ محبت حشر میں
دیکھئے کیا ہو نتیجہ آخری فریاد کا

اک صدائے دل خراش آتی ہے آدھی رات کو
کوہ پر ہوتا ہے ماتم آج تک فرہاد کا

اور اسیرانِ قفس پر تازہ آفت آگئی
کیا مجھے حاصل ہوا گھر پھونک کر صیاد کا

فاتحہ گورِ غریباں پر ذرا پڑھ دیجئے
اک طریقہ ہے یہی بھولے ہوؤں کی یاد کا

فصلِ گل میں بڑھ گیا ذوقِ اسیری اس قدر
باغباں سے پوچھتا ہوں میں پتہ صیاد کا

زندگی جب تک رہے گی روز آفت آئے گی
ختم ہم ہوں گے تو ہوگا خاتمہ بیداد کا

آشیاں میں ہم نے دیکھے رات بھر گلشن کے خواب
صبح دم چونکے تو گھر تھا سامنے صیاد کا

جو موافق تھے کبھی وہ اب مخالف ہوگئے
نوحؔ دیکھا حالِ یارانِ الہ آباد کا

طبع زاد ۲۷ جولائی ۱۹۲۷ء

گلشن میں کبھی ہم سنتے تھے وہ کیا تھا زمانہ پھولوں کا ۔۔۔ کلیوں سے کہانی کلیوں کی پھولوں سے فسانہ پھولوں کا
کیا موسم گل پر اترا کر ہم گائیں ترانہ پھولوں کا ۔۔۔ دو روز میں آنے والا ہے اک روز زمانہ پھولوں کا
ایام خزاں میں اہل چمن صرصر کو ستم سے کیا روکیں ۔۔۔ بیگانہ ہوا جب سبزہ بھی تو کون یگانہ پھولوں کا
پھر باد صبا وہ آ پہنچی پھر رنگ کھلا نکہت پھیلی ۔۔۔ اسے لوٹنے والو اب لوٹو معمور خزانہ پھولوں کا
نازاں ہے جو اپنی قسمت پر گل چیں کو یہ کیا معلوم نہیں ۔۔۔ جائے گی بہار آئے گی خزاں بدلے گا زمانہ پھولوں کا
گل چیں سے کبھی میں سنتا ہوں بلبل سے کبھی میں کہتا ہوں ۔۔۔ اس دردسری کا باعث ہے دلچسپ فسانہ پھولوں کا
شاخیں بھی بلائیں لیتی ہیں پتے بھی نچھاور ہوتے ہیں ۔۔۔ اللہ رے جوانی گلشن کی اُف اُف رے زمانہ پھولوں کا
ایام خزاں میں اے بلبل تکلیف بہت بڑھ جائے گی ۔۔۔ پھولوں کی قسم دیتا ہوں تجھے چھیڑ اب نہ ترانہ پھولوں کا
جب اہل چمن سو جاتے ہیں تو حسن کے ڈاکو آتے ہیں ۔۔۔ کچھ رات گئے کچھ رات رہے لٹتا ہے خزانہ پھولوں کا
مرغان قفس کو نیند کہاں نیند آئے بھی امید کہاں ۔۔۔ گل چیں سے انھیں سنواتا ہے صیاد فسانہ پھولوں کا
کیا ذکر چمن کیا فکر چمن کیا ذوق چمن کیا شوق چمن ۔۔۔ داغوں سے ہمارا خانۂ دل ہے دولت خانہ پھولوں کا
کیا خوب ملی گل کھانے کی یہ داد ہمیں مرجانے پر ۔۔۔ پھولوں میں ہمارے چھیڑ دیا بلبل نے ترانہ پھولوں کا
فطرت کے مسافر کو بس میں رکھ سکتے نہیں اشجار چمن ۔۔۔ آتا ہے زمانہ پھولوں کا جاتا ہے زمانہ پھولوں کا

اے نوحؔ اثر اتنا تو کیا تم پر بھی چمن کے منظر نے
طوفان اٹھانا بھول گئے لے بیٹھے فسانہ پھولوں کا

۲۶ اکتوبر ۱۹۲۸ء

زمانے کو قضا نے مار ڈالا ۔۔۔ ہمیں تیری ادا نے مار ڈالا
دعائیں بھی مری بے کار ٹھہریں ۔۔۔ تمھاری بد دعا نے مار ڈالا
تمھیں حسن و ادا و ناز دے کر ۔۔۔ خدائی کو خدا نے مار ڈالا
کدھر سے سانس دل میں آئے جائے ۔۔۔ ہجوم مدعا نے مار ڈالا
کہیں گے حشر میں قاتل کے منہ پر ۔۔۔ ہمیں اس کی ادا نے مار ڈالا
قسم کھاتا ہوں میں تیری جفا کی ۔۔۔ مجھے تیری جفا نے مار ڈالا
اڑا لائی ہمیں قاتل کے گھر تک ۔۔۔ محبت کی ہوا نے مار ڈالا
سب اُن کی انجمن میں جی رہے ہیں ۔۔۔ قضا کو کیا ادا نے مار ڈالا
جفائیں عمر بھر الفت میں جھیلیں ۔۔۔ ہمیں پاس وفا نے مار ڈالا
تری سیدھی نظر سے بچ گیا میں ۔۔۔ مگر بانکی ادا نے مار ڈالا

کیا تھا مجھ کو پیدا جس خدا نے
اُسی میرے خدا نے مار ڈالا

مرض تھا کچھ مجھے درماں ہوا کچھ
طبیبوں کی دوا نے مار ڈالا

یہ کیسا ظلم ہے تیری گلی میں
جسے پایا ادا نے مار ڈالا

کھڑے ہیں وہ جھکی جاتی ہیں آنکھیں
اسی طرزِ حیا نے مار ڈالا

سمجھ لو دل میں تم مجھ سے نہ پوچھو
کسے کس کی ادا نے مار ڈالا

نگاہِ شوخ سے میری طرف دیکھ
حیا والے حیا نے مار ڈالا

جنابِ نوح سے شکوہ ہے مجھ کو
کہ طوفانِ بلا نے مار ڈالا

طبع زاد ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۸ء

ج

کوئی نہیں پہچانے والا
مر جائے مرجانے والا

محفل میں آئے گا کیوں کر
خلوت میں شرمانے والا

میں روکوں لیکن کیا روکوں
جائے گا گھر جانے والا

شکر خدا کا ہم کرتے ہیں
کام آیا کام آنے والا

صبر مرا بیکار نہ جائے
تڑپے وہ تڑپانے والا

اپنا دل بہلاؤں کس سے
ہے کون آنے جانے والا

وہ نہ ملیں مجھ کو مل جائے
کوئی جی بہلانے والا

دل وہ شے ہے جس کا شاکی
کھونے والا پانے والا

لطف و کرم فرماتا جائے
لطف و کرم فرمانے والا

سب سے مشکل بات یہی ہے
زندہ ہو مرجانے والا

کیا سمجھے اسرارِ محبت
دل دے کر پچھتانے والا

پھولوں کا مرجھانا دیکھے
کلیوں پر اترانے والا

جان مری ہے جانے والی
دل ہے اُن پر آنے والا

یا میں ہوں یا میرا دل ہے
روز نیا غم پانے والا

نوح محبت کی دنیا میں
ہے طوفان اُٹھانے والا

دیکھنا دیکھنا مقتل میں وہ قاتل آیا

اس طرح پر ایک بڑا مشاعرہ مسلم کلب کان پور میری صدارت میں جناب اختر صاحب نے کیا ۹ر فروری ۱۹۲۹ء کی ۸ بجے

رات کو شروع ہو کر قریب ۶ بجے صبح تک یہ نشست قائم رہی اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں جناب آسان۔ عروج۔ گوہر صاحبان کان پوری موجود تھے اور آگرہ سے جناب مظہر مرحوم مع اپنے دو شاگردوں کے اور لکھنؤ سے قدیر صاحب سراج صاحب مہدی صاحب و شوق صاحب بھی آئے تھے

ج

بن سنور کر مرے آگے جو وہ قاتل آیا
درد اٹھا شوق بڑھا ہوش گیا دل آیا

حسن اس خاص ادا سے سرِ محفل آیا
ایک کی جان گئی دوسرے کا دل آیا

اور چیزیں تو زمانے کی زمانے کو ملیں
میرے حصے میں فقط درد بھرا دل آیا

عشق کا راز سمجھنا کوئی آسان نہیں
کیا خبر مجھ کو گیا دل کہ مرا دل آیا

اور انھیں لاگ بڑھی لاگ کی اور آگ بڑھی
محفلِ ناز میں کیوں تذکرۂ دل آیا

آپ کیا پوچھتے ہیں عشق و وفا کی تفصیل
مختصر یہ ہے مری جان گئی دل آیا

ہم سمجھتے تھے دل آئے گا تو ٹٹ جائیں گے
اب یہ ہٹ جانے سے معلوم ہوا دل آیا

وہ ابھی رسمِ محبت سے خبردار نہیں
دل کے جانے کو یہ سمجھیں تو کہیں دل آیا

اب سمجھ ہو گی تو وہ آپ سمجھ جائیں گے
ہم سنا کر انھیں کہتے ہیں کہیں دل آیا

وہ سنیں یا نہ سنیں غور کریں یا نہ کریں
عشق کہتا ہے کہے جاؤ کہیں دل آیا

ہم تو ایک ایک جگہ عشق میں بدنام ہوئے
تم بتاؤ کہ تمھارا بھی کہیں دل آیا

نوح کیا اور قوافی نہ ملے تھے تجھ کو
تیرے ہر شعر کے آخر میں وہی دل آیا

مختلف قوافی

ج

بزمِ دل کش میں مرا آئینۂ دل آیا
سامنے آیئے اب تو مقابل آیا

دردمندانِ محبت کا سنبھلنا معلوم
جب مسیحا کو بلایا کوئی قاتل آیا

دل سے امید بہت کچھ تھی مگر کیا کہیے
کام یہ بھی مری مشکل میں مشکل آیا

سخت جاں اور نہ تھا محفلِ عالم میں کوئی
آئینہ ہی ترے چہرے کے مقابل آیا

کھل گیا اس سے کہ اب دن ہے قیامت کا قریب
مے پرستوں کو خیالِ حق و باطل آیا

دم جو ٹھہرے دمِ آخر تو یہ معلوم کروں
جان لینے کو قضا آئی کہ قاتل آیا

گردشِ بخت نے دی رائے پلٹ جانے کی
پھیر کھا کر جو مسافر سرِ منزل آیا

راحت و عیش کے ملنے کی توقع کس کو
صبر بھی عشق میں آیا تو بمشکل آیا

رات دن حسن پرستی میں بسر کی ہم نے
مہرِ تاباں جو گیا تو مہِ کامل آیا

خود بخود مر گئے حاضر تھے جو مرنے والے
آج مقتل میں اس انداز سے قاتل آیا

جوشش دریائے محبت نے ڈبو دی کشتی
نوح سمجھے تھے کہ اب سامنے ساحل آیا

طبع زاد ۲ر مئی ۱۹۲۹ء

وہ کہتے ہیں آؤ مری انجمن میں مگر ہیں وہاں اب نہیں جانے والا
نشاط و الم کے سفید و سیہ نے ہماری نگاہوں کو حیرت میں ڈالا
مرا درد پوچھا مرا حال دیکھا مرے دل کا ارمان تم نے نکالا
بڑی نیو آنسیں ہیں گو دوستی کی مگر دوستی کس طرح نبھ سکے گی
شوالے کی جانب قدم کیوں بڑھاؤں نظر کس لیے سوئے مسجد اٹھاؤں
فدا کر دیا میں نے دل اس حسیں پر جو بے درد بھی ہے دل آزار بھی ہے
جفا کا فسانہ تغافل کا قصہ مصیبت کی روداد غم کی کہانی
ہائیں یہ ہوئیں کیا ہزاروں جفائیں ہزاروں برائیں ہزاروں بلائیں
وہ آئے تھے پہلو میں بے ہوش تھا میں کوئی ہو گی دل پر بہت کچھ نوازش
ہزاروں بلانوش اِدھر بھی اُدھر بھی ملی اتنی فرصت کہاں کہتے ہیں
محبت کے جوگی ستم کے بروگی وفا کے بھکاری جفا کے پجاری
چرا لے گیا کوئی دل بھی جگر بھی اڑا لے گیا کوئی صبر و سکوں بھی
وطن سے نکل کر اکیلے چلے تھے مگر جوشش یقینی کے قرباں جائیں
فغاں کی بھی ایذا دہانی کروں میں محبت کو بھی کچھ توجہ دلاؤں
غضب ڈھا گئیں سیدھی سادی ادائیں ستم کر گئیں ترچھی بانکی نگاہیں
ادھر طور پر غش میں موسیٰ پڑے ہیں ادھر ہاتف غیب کہہ رہا ہے
یہ مطلب تمھارا ہاں اس کے نہ نکلیں جو تم میں نہ کچھ اور پیچیدگی ہے

ج

کہ اکثر بلایا بلا کر بٹھایا بٹھا کر اٹھایا اٹھا کر نکالا
اِدھر روشنی ہے اُدھر تیرگی ہے کہیں ہے اندھیرا کہیں ہے اجالا
خدا اور بھی دے زیادہ مراتب سوا اور اس کے کبھی ہو بول بالا
اسے ہے نزاکت مجھے ہے نقاہت نہ وہ آنے والا نہ میں جانے والا
مرے دل کو اللہ آباد رکھے مرا دل ہی مسجد ہے دل ہی شوالا
محبت کی دھن میں نہ سوچا نہ سمجھا نہ جانچا نہ پرکھا نہ دیکھا نہ بھالا
اِدھر کہہ رہا ہے اُدھر سن رہا ہے کوئی کہنے والا کوئی سننے والا
زمانے میں کوئی سنبھلنے نہ پایا کسی شوخ نے ہوش جب سے سنبھالا
مگر کیا خبر مجھ کو اللہ جانے تمنا نکالی کہ کانٹا نکالا
رہا کام پینے پلانے سے سب کو نہ ڈھونڈی صراحی نہ ساغر کھنگالا
جہاں دیکھ پاتے ہیں جلوہ بتوں کا بچھاتے ہیں اپنا وہیں مرگ چھالا
یقیں ہے تمنا نکلتے نکلتے نکل جائے گا عاشقوں کا دوالا
ملا وحشت غربت میں اک اک قدم پر ہمیں اک نہ اک جان جانے والا
پھر ہم جذب دل کا نکلنے نہ پائے نکل آئے پردے سے وہ پردے والا
یہی شور اٹھا جدھر سے وہ گذرے مجھے مار ڈالا مجھے مار ڈالا
ذرا کھولیے آپ آنکھیں تو اپنی قریب آ گیا دیکھیے دور والا
مرے خانۂ دل میں رنج و الم نے تنا ہر طرف خوب مکڑی کا جالا

تمھارا ثنا خواں تمھارا دعا گو تمھارا فدائی تمھارا سلامی
یہ کیا کہہ دیا اس نے واقف نہیں ہم وہی ہاں وہی نوح طوفان والا

رسوا کر دیا، مہیا کر دیا اس ردیف و قافیہ پر ۱۲ر نومبر ۲۹ء کو الہ آباد میں مشاعرہ ہوا چوں کہ قوافی میں بہت وسعت تھی اس لیے میں نے قوافی محدود کر کے یہ اشعار کہے تھے

شیوۂ لطف و کرم پر مجھ کو شیدا کر دیا
اب علاج درد دل کا مجھ کو شیدا کر دیا
پردۂ اسرار میں چھپتا کہاں تک حسن دوست

ج

آپ کی ہمدردیوں نے درد پیدا کر دیا
چارہ گر نے یہ نیا روگ اور پیدا کر دیا
کچھ نہ بن آئی تو اپنے کو ہویدا کر دیا

فصلِ گُل آتے ہی تو نے اے ہوائے فصلِ گُل
خون میں ہیجان دل میں خون پیدا کر دیا

وہ ستم گر دل وفا پرور محبت سنجھ چکی
خوبیٔ قسمت نے کس پر کس کو شیدا کر دیا

ساقیِ محفل وہ کیسی چیز تھی جس چیز نے
اِس سرے سے اُس سرے تک جوش پیدا کر دیا

اب مرے دل کو کسی پہلو قرار آتا نہیں
غم نے بجلی کا اثر رگ رگ میں پیدا کر دیا

واہ کیا کہنا ترا اے مظہرِ انوارِ حق
خود مری ہی شکل پر مجھ کو ہی شیدا کر دیا

سازِ دل سے رازِ دل کی خوبیاں جاتی رہیں
میں نے تم پر تم نے دنیا پر ہویدا کر دیا

کیوں اُٹھاتی قدرتِ حق ایسی زحمت بار بار
عشق کو بھی حسن ہی کے ساتھ پیدا کر دیا

نام شاید اور کچھ ہو لوگ اُسے کہتے تھے دل
جس نے مجھ پر تم کو تم پر مجھ کو شیدا کر دیا

نوحؔ کیا سوجھی یہ کیا دل میں تمھارے آ گئی
پھر وہی طوفان اشکوں کا ہویدا کر دیا

میں بت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا

اس طرح پر جناب سید شاہ حامد حسین صاحب حامدؔ سجادہ نشین درگاہ حضرت ارزاں صاحبؒ نے پٹنہ میں ۹ر دسمبر ۲۹ء کو ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا مقامی شعرا اور قرب و جوار کے اچھے کہنے والے موجود تھے لیکن بدر صاحب آروی اپنی علالت سے شریک نہ ہو سکے تقریباً دو ہزار آدمیوں کا مجمع تھا مشاعرہ دس بجے رات سے شروع ہو کر بخیر و خوبی آٹھ بجے صبح کو ختم ہوا

میں کثرتِ جمال سے حیران ہو گیا
اے حسن آفریں ترے قربان ہو گیا

غیروں کے واسطے جو پریشان ہو گیا
انسان بھی نہ تھا تو وہ انسان ہو گیا

میں دل کے ہتکھنڈوں سے پریشان ہو گیا
قربان کر گیا مجھے قربان ہو گیا

ممکن نہیں وہ تیر کو چٹکی سے کھینچ لیں
اتنا رہا یہ دل میں کہ ارمان ہو گیا

دستِ جنوں مرے ابھی حد سے بڑھے نہ تھے
خود ہی گلے سے دور گریبان ہو گیا

وہ کہہ گئے کہ آپ کا جینا فضول ہے
مرنا اب اور بھی ہمیں آسان ہو گیا

اے خضر مجھ کو خواہشِ عمرِ ابد نہیں
دو دن کی زندگی سے پریشان ہو گیا

توبہ کی گفتگو تھی کہ پھر بدلیاں اُٹھیں
یوں مے کشی کا غیب سے سامان ہو گیا

اچھی کہی کہ سر سے نہ اُترے گا بارِ عشق
کیا یہ بھی کوئی آپ کا احسان ہو گیا

دیکھا کچھ اس طرح ترے چہرے کو بار بار
محفوظ میرے دل میں یہ قرآن ہو گیا

وہ دل کہ جس نے پائے تھے اوصافِ باطنی
ظاہر پرستیوں سے پریشان ہو گیا

دل میں بتوں کی یاد خموشی کے ساتھ ہے
سب مجھ کو جانتے ہیں مسلمان ہو گیا

اوّل تو خلق اور کرم بھی پھر اُس کے ساتھ
باتیں یہ جس کو آ گئیں انسان ہو گیا

میں اُن سے کہہ رہا ہوں کہ اب رحم کیجئے
وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ نادان ہوگیا

ظلم و ستم سے ہاتھ کب اُس نے اٹھائیے
کہہ کر یہ بات میں ہی پشیمان ہوگیا

جس نے بچا لیا وہ رہا بے نیازِ غم
دل جس نے دے دیا وہ پریشان ہوگیا

پائی تھی ایک جان ترے جاں نثار نے
لیکن ہزار جان سے قربان ہوگیا

ترکیب فارسی سے رہے دور قافیے
اے نوح فرض لون کا اعلان ہوگیا

محتاج آفتاب نہیں ماہ تاب کا

اس طرح پر دوسرا مشاعرہ پھر وہیں ۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو ہوا پہلے دن کی میری کامیابی دیکھ کر کچھ لوگوں نے خفیہ یہ سازش کی کہ میری غزل پر سب خاموش رہیں کوئی داد نہ دے لیکن پہلے ہی مطلع پر لوگ بے اختیار ہو کر داد دینے لگے یہاں تک کہ جو مخالف تھے اُن کی بھی توبہ ٹوٹ گئی یہ مشاعرہ پہلے دن کے دیکھتے ہوئے بہت اچھا ہوا شعرا سب وہی تھے آخر میں لوگوں نے بے حد اصرار کے ساتھ مجھ سے غیر طرح چار غزلیں پڑھوائیں

ج

جس پر لکھا تھا حال مرے اضطراب کا
ٹھہرا کتاب میں نہ ورق وہ کتاب کا

چھوٹا کب اُن کے ہاتھ سے ساغر شراب کا
رندوں نے رس نچوڑ لیا آفتاب کا

اللہ رے جوشش مستیِ عہدِ شباب کا
لہرا رہا ہے سامنے دریا شراب کا

کیسا جواب اُن کے رخِ لاجواب کا
منھ پھر گیا اِدھر سے اُدھر آفتاب کا

کیا حالِ دل کہوں دلِ ناکامیاب کا
میت ہے آرزو کی جنازہ شباب کا

خورشیدِ روزِ حشر سے مے خوار ڈر چکے
یہ اُس کو جانتے ہیں پیالہ شراب کا

اِتنے گناہ میں نے کئے اِس خیال سے
لینا تھا جائزہ کرمِ بے حساب کا

تردید کر رہا ہے یہ برقِ نگاہ کی
ہوگا مآل کیا دلِ پُر اضطراب کا

پھر گل کھلے پھر ابر اُٹھا پھر ہوا چلی
اے بارشِ کرم کوئی چھینٹا شراب کا

بہتر یہ ہے کسی کو ازل ہی میں چھانٹ لوں
موقع ملے ملے نہ ملے انتخاب کا

دنیا سے بے ثباتیِ دنیا کو پوچھئے
سُنئے زبانِ موج سے قصہ حباب کا

کہنا تھا بار بار پیو بھی پلاؤ بھی
ساغر سے خود بخود وہ چھلکنا شراب کا

اے دستِ شوق دامنِ محبوب تھام لے
ٹوٹے گا سلسلہ نہ سوال و جواب کا

دو چار سال عمر کے اچھے بسر ہوئے
اب ہم ہیں اور غم گئے گذرے شباب کا

روتے ہیں بار بار مرے ذوق و شوق بھی
مُنھ دیکھ دیکھ کر دلِ ناکامیاب کا

دل کے بہت سے زخم جگر کے بہت سے داغ
اِن میں حساب ہے ستمِ بے حساب کا

جو کھو رہے تھے آہ میں تیری دھواں نہیں
دھندلا سا رنگ ہوگیا اُن کی نقاب کا

سب کچھ تو جانتا ہوں مگر میں خموش ہوں
عالم ہے رازِ عشق میں گونگے کے خواب کا

یارب اگر ملے تو دل ایسا مجھے ملے
خوگر ہو ظلم کا متحمل عتاب کا

رہتا ہے کوئے یار میں حاضر تمام دن
کیوں عرش پر دماغ نہ ہو آفتاب کا

طوفانِ بحرِ شوق میں دنیا فنا ہوئی
اے نوح معجزہ تھا یہ چشمِ پرآب کا

طبع زاد ۱۰ر فروری سنہ ۳۰ء

ج

منھ کسی کے رشتۂ الفت سے کب موڑا گیا
اِس طرف توڑا گیا اور اُس طرف جوڑا گیا

پھر کسی ظالم سے رشتہ عشق کا جوڑا گیا
کچھ ہمارا عہد ٹوٹا اور کچھ توڑا گیا

فی الحقیقت کوچہ گردی وجہِ ننگِ عشق تھی
آستانِ یار مجھ سے کس طرح چھوڑا گیا

مژدۂ وحشت جو پھر دینے لگی بادِ بہار
دامنِ گل میں گریباں کیا مرا جوڑا گیا

لوگ پڑھتے تھے تو تاریخ آج اہلِ عشق کی
جس میں میرا حالِ غم تھا وہ ورق موڑا گیا

دل کی رنگینی مرے دل پر قیامت ڈھا گئی
منتخب جو پھول تھا پہلے وہی توڑا گیا

حشر میں انصاف ہوگا یہ توقع اب نہیں
فیصلہ میرا انھیں کی رائے پر چھوڑا گیا

کیوں نہ بڑھ کر داستاں بنتی مری رودادِ عشق
ایک ٹکڑا ہر جگہ اِس میں نیا جوڑا گیا

گر پڑے بجلی کہیں اُن پر نہ اُن کے حسن کی
آئینے کے رخ سے منھ اس واسطے موڑا گیا

لکھ سکے پھر بھی نہ ہم پورا بیانِ زندگی
ہر ورق کے خاتمے پر اک ورق جوڑا گیا

اے ادائے حسن شاید تھا یہی دربانِ عشق
خارِ غم سے دل کا اک اک آبلہ پھوڑا گیا

لکھ رہے ہیں وہ کہ تم نے بالیقیں فریاد کی
قطعِ الفت کے لئے بہتان یہ جوڑا گیا

ہر گھڑی طوفانِ چشمِ تر سے یہ ڈرتے رہے
نوح یہ اچھا شگوفہ عشق میں چھوڑا گیا

ازل سے جو ابد تک کام آیا وہ مرا دل تھا

اس طرح پر ۲۲ر مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کو معین الادب لکھنؤ کا سالانہ مشاعرہ ہوا لیکن مجھے اپنی علالت سے شرکت سے معذوری رہی دل کا قافیہ مطلع کے لئے مخصوص تھا اور بقیہ قوافی بسمل، حاصل، قاتل، محفل، مشکل، منزل قرار پائے تھے انھیں قوافی کی قید تھی

ج
دل

سمجھنا کوچۂ قاتل کے آزاروں کا مشکل تھا
بس اتنا یاد ہے مجھ کو کہیں سر تھا کہیں دل تھا

تری الفت سے پہلے سو طرح کا لطف حاصل تھا
کبھی میں بھی تھا دل والا مرے پہلو میں بھی دل تھا

یہ عالم راہِ ذوق و شوق میں منزل بمنزل تھا
کہ آگے آگے غم تھے پیچھے پیچھے غم زدہ دل تھا

وہ تم پر مٹ چکا پہلے ہی اب کیا اس سے حاصل تھا
ٹٹولا تو مرے پہلو میں ہر جانب کہیں دل تھا

بسمل

پتہ میرا نہ پوچھ اس پر ذرا کر غور اے قاتل
تری تیغِ ادا کا سب سے پہلے کون بسمل تھا

نگاہِ آخری چلنے میں خنجر سے سوا نکلی
پلٹ کر میں نے جب دیکھا تو قاتل آپ بسمل تھا

حاصل

وہ آئے قبر تک کچھ دیر بیٹھے چل دیے اٹھ کر
فقط اتنا کسی بے کس کے مرجانے کا حاصل تھا

وہ شوق آغازِ الفت میں یہ غم انجامِ الفت میں
غرض ہم کو سکونِ دل نہ حاصل ہے نہ حاصل تھا

فنا کے بعد اب واقف ہوا ہوں رازِ ہستی سے
جسے کہتے ہیں مرنا وہ مرے جینے کا حاصل تھا

قاتل

تماشا حشر کا وہ بھی مری آنکھوں نے دیکھا ہے
سب اپنی اپنی کہتے تھے مگر خاموش قاتل تھا

خدا کے سامنے یہ عذر بھی کیا لطف دیتا ہے
وہ کہتے ہیں مرے پردے میں کوئی اور قاتل تھا

محفل

بہائے کون آنسو اب مآلِ شمعِ سوزاں پر
وہ مجمع اٹھ گیا جو قدر دانِ لطفِ محفل تھا

چراغِ حسنِ عالم تاب پر اے دل تصدق ہو
جو پروانہ سلامت رہ گیا وہ ننگِ محفل تھا

مشکل

لگا کر دل جو زندہ رہ گئے صد مرحبا ان کو
ہماری رائے میں سب سے سوا یہ کام مشکل تھا

گئے گذرے زمانے میں کچھ ایسے دن بھی گذرے ہیں
تمھیں ہر بات آساں تھی ہمیں ہر کام مشکل تھا

منزل

طریقِ عشق میں گذرے بہت رہ رو نگاہوں سے
وہ اتنا جلد پہنچا جس کو جتنا شوقِ منزل تھا

کہاں کے خضر کیسے ہم سفر کیا دشت پیمائی
جو منزل تک مجھے پہنچا گیا وہ شوقِ منزل تھا

جناب نوح بھی موجود اگر ہوتے تو کیا کرتے
کہ بحرِ عشق میں بیڑا مرا سیلابِ منزل تھا

بات کرنی چاہتے ہیں آپ دیوانے سے کیا

اس طرح پر ۲۲ مارچ ۱۹۳۱ء کو انجمن معین الادب لکھنؤ کا سالانہ مشاعرہ تین بجے دن سے شروع ہو کر بارہ بجے رات کو ختم ہوا مقامی شعرا قریب قریب سب موجود تھے نواب مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی نے بھی شرکت فرمائی تھی مطلع کے لئے دیوانے کا قافیہ بقیہ اشعار کے لئے بیگانے، پروانے، پیمانے، خانے، ویرانے کے قافیے مخصوص تھے

ج
دیوانے

حسنِ غارت گر کو مطلب میرے بار آنے سے کیا
شوق ہے دیوانگی سے ذوق دیوانے سے کیا

اڑ چلا آوارہ وحشت بھی مثلِ رنگ و بو
کہہ دیا پھولوں نے کھل کر تیرے دیوانے سے کیا

بیگانے

ہم ترے اغماض پر دل کو مخاطب کیا کریں
ایک بیگانے کا شکوہ ایک بیگانے سے کیا

دل کے ہوتے میں بتاؤں اور کس کو راز دار
کام جب نکلے یگانے سے تو بیگانے سے کیا

پیمانے

بے طرح نکھرا نظر آنے لگا رنگِ چمن
مے چھلک کر گر پڑی کچھ میرے پیمانے سے کیا

کیف ہوتا ہے مجھے خالی بھی اکثر دیکھ کر
اڑ گئی ساقی کی چشمِ مست پیمانے سے کیا

بے جلائے بزمِ سوز و ساز میں خود جل بجھی / لاگ تھی شمعِ سحر کو ایسی پروانے سے کیا

بے کہے میں جان دے دوں گا کسی دن خود بخود / عشق میں تحریک جل مرنے کی پروانے سے کیا

اللہ اللہ یہ شرابِ تند کا جوش و خروش / توڑ کر خم کو نکل جائے گی مے خانے سے کیا

وضع داری بھی ہے کوئی چیز اے پیرِ مغاں / آ گئے تو آ گئے اب جائیں مے خانے سے کیا

جام و ساغر خوب چھلکے دورِ پیہم چل چکے / چاہتے ہیں بادہ کش بہہ جائے مے خانے سے کیا

شیشہ و خم مہر بر لب جام و ساغر اہلِ ظرف / راز مے خانے سے باہر جائیں مے خانے سے کیا

جوشِ وحشت میں بھی ہم آوارہ پھر سکتے نہیں / ایک ویرانے سے کام ایک ایک ویرانے سے کیا

کوہ و صحرا کی طرف بھی لے چل اے جوشِ جنوں / کام نکلے گا ہمارا صرف ویرانے سے کیا

کر دیا اس قافیے نے شاملِ اہلِ جنوں / ورنہ تھا اے نوح مطلب ہم کو ویرانے سے کیا

طبع زاد ۸ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء

یہ کیا رخنہ سازی یہ کیا پیش بندی یہ کیسا کنایہ یہ کیسا اشارا

قرائن سے معلوم ہوتا ہے ہم کو کسی روز لٹ جائے گا دل ہمارا

مشیت نے دنیا کی نظروں کے آگے ہمیشہ کیا پیش طرفہ نظارا

حقیقت میں ہستی نہیں کچھ ہماری تصرف کرے سے نہیں کچھ ہمارا

کچھ امید پیدا ہوئی بے کسی میں مگر کیا خبر راز امید کیا ہے

جو سودائی ہوں گے وہ سودا کریں گے جنھیں عقل ہوگی نہ ایسا کریں گے

مجاز و حقیقت کی باریکیوں پر وہ ڈالے نگاہیں جو باریک بیں ہو

اثر حسن کا جلد ہوتا ہے دل پر طبیعت ادھا دھند آتی ہے اکثر

تلاطم بپا ہو کہ طوفان اٹھے بلا آئے سر پر کہ ٹوٹے قیامت

جسے حسنِ تفریح کی آرزو ہو وہ کیوں کر اٹھے حسن کی انجمن سے

کبھی عشق میں انقلاب ایسا آئے محبت کبھی یہ تغیر دکھائے

دعا کے لیے ہاتھ میں کیوں اٹھاؤں فغاں کا بھرم کیا سمجھ کر گنواؤں

سحر ہو گئی شب امید میں گزری یہ کہتے ہوئے لگ اٹھے انجمن سے

نشاط و مسرت کی صورت نہ دیکھی مرے دل نے آزار و غم میں بسر کی

نہ کوئی عداوت نہ کوئی خصومت نہ رنجش کسی سے مرا سب سے یکجہتی

وفا میں دل اپنا تصدق کروں میں محبت میں جان اپنی کر دوں نچھاور

ابھی ناوک آیا نہیں میرے دل تک صدا ناوک انداز نے دی وہ مارا

نگاہیں بھی اس عشوہ گر کی نگاہیں اشارہ بھی اس فتنہ گر کا اشارہ

کسی کو بگاڑا کسی کو بنایا کسی کو دبایا کسی کو ابھارا

وہی آپ شیدا وہی آپ شاہد اسی کی نظر اور اسی کا نظارا

شبِ ہجر آواز آئی کہاں سے صدا غم نے دی یا اجل نے پکارا

محبت کے بازار میں ہم نے دیکھا ذرا سا منافع بہت سا خسارا

ہمارے لیے دین و دنیا یہی ہے خدا کا بھروسہ بتوں کا سہارا

قیود و شرائط سے کیا اس کو مطلب محبت میں کیا فال کیا استخارا

وہ دریائے الفت میں دل بستگی ہے کریں گے نہ پھر اک اس کے کنارا

کہیں بھی ہے جو ہے تو یہیں ہے نرالا تماشا انوکھا نظارا

بدل جائے دل اور دل ہو بدل کر ہمارا تمھارا تمھارا ہمارا

لگا تار آنکھیں دکھاتا ہے مجھ کو شبِ غم فلک پر سے ایک ایک تارا

جواب آپ نے کچھ نہیں کی تو اب کیا کرے گا وہ خاطر تو تیغِ عنایت مدارا

وہ سچ کہہ رہے ہیں اگر کہہ رہے ہیں محبت کے بارے کو آفت کا مارا

ہزاروں ستم ڈھائے مجھ پر فلک نے ضرور اس میں تھا کچھ تمھارا اشارا

تری پیاری پیاری اداؤں کے آگے نہ یہ مجھ کو پیاری نہ وہ مجھ کو پیارا

طریق طلب طرفہ تر جوش دارد بایں جوش ایں طرفہ تر ہوش دارد
کبھی کوئی صدمہ کبھی کوئی ایذا کبھی یہ مصیبت کبھی وہ مصیبت
ہزاروں کھلے راز سربستہ لیکن یہی بات اب تک سمجھ میں نہ آئی

خدائی نمی خواہم اندر خدائی کہ می خواہم اندر خدائی خدارا
ہم اس کے علاوہ سبب کیا بتائیں نوازش ہے دل کی کرم ہے تمہارا
نگاہوں کے آگے تو ہے بزم عالم نہاں ہے نگاہوں سے وہ بزم آرا

جو آتا ہے اسے نوح ان کو نوا کہیں وہ رستہ طرف فاصلہ کچھ نہ پوچھیں
چلیں بل پہ اور کھینچیں سر اٹھو سر اٹھو سے لو بسمل دکھن ہے نارا

جو نہ کرنا چاہئے وہ کام قاتل نے کیا

۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء کو اس طرح پر ایک عظیم الشان مشاعرہ ریلوے تھیٹر الہ آباد میں ملازمان ریلوے بالخصوص زبیری صاحب مرزا احمد جان صاحب کے اہتمام سے ۸ بجے شب کو شروع ہو کر ۱۰ بجے دن کو ختم ہوا مقامی شعرا کے علاوہ عزیز سلونی، ریاض جیوری دعا ڈبائیوی انعام حمایت ولی زاہد گوالیاری انور پرتاب گڑھی فضل کمال اقبال حضرت متین مچھلی شہری وغیرہ شریک تھے افسوس ہے کہ تو یہ اور بسمل صاحب اس میں اپنی اپنی وقتی ضرورتوں سے شریک نہ ہو سکے

ج

کیوں کہوں مجروح مجھ کو حسنِ قاتل نے کیا
واقعہ تو یہ ہے جو کچھ بھی کیا دل نے کیا

قصدِ فریاد و فغاں بھولے سے جس دل نے کیا
اور بھی ستھراؤ اس کا تیغ قاتل نے کیا

آرزوئے قتل کا چرچا جو بسمل نے کیا
تیغ قاتل کو اشارہ چشم قاتل نے کیا

اب مجھے انکارِ عشق اُن سے ہو کس بنیاد پر
رنج و غم نے دی گواہی فیصلہ دل نے کیا

جیسے فوراً ہی ڈبو دے گا مجھے دریائے عشق
اس طرح رخصت سبک سارانِ ساحل نے کیا

دم نکلنے کا نہیں غم بلکہ اس کی ہے خوشی
سب سے پہلے صاف مجھ پر ہاتھ قاتل نے کیا

ناوکِ بے داد پر بھی کھل گئے اسرارِ عشق
کیوں سلام شوق جھک کر حسرتِ دل نے کیا

مرحلہ تھا اپنی مرگ و زیست کا کتنا اہم
حل اسے آسانیوں کے ساتھ مشکل نے کیا

جب کوئی آیا تو ہم تعظیم دینے کو اٹھے
کس قدر رسوا ترے آدابِ محفل نے کیا

حسن پر اس کے سوا کیا عشق کا ہوتا اثر
میرے دل نے آہ کی شکوہ ترے دل نے کیا

کوئے جاناں کی کشش سب کو اڑا کر لے گئی
رہ روؤں کا خیر مقدم آپ منزل نے کیا

رہتی دنیا تک رہے گا یادگارِ حسن و عشق
کام وہ میں نے کیا تم نے کیا دل نے کیا

جانتا تھا آشنائے بحرِ الفت کا مآل
کچھ سمجھ کر ہی کنارا مجھ سے ساحل نے کیا

اب زباں تک بے حجابی شکایت آئے گی
صبر جتنا ہو سکا اتنا مرے دل نے کیا

صبح دم اٹھ کر اسی کے ساتھ وہ بھی چل دئے
شمعِ کشتہ غم اتنا اہلِ محفل نے کیا

عشق میں ہے قابلِ تقلید یہ حسنِ ادب
رنج و غم سہہ کر کبھی شکر رنج و غم دل نے کیا

قیس کو محروم رکھا جلوۂ دیدار سے
جو نہ لیلیٰ نے کیا وہ ظلم محمل نے کیا

اللہ اللہ دیکھتے ہی مر مٹا اُس شوخ پر
کام اور اتنا بڑا پہلے پہل دل نے کیا

غم بھی ہوتا ہے تو اب احساسِ غم ہوتا نہیں
حل مری مشکل کو آڑے دن کی مشکل نے کیا

جب نہ آنا تھا تو یہ کیوں کہہ دیا تھا آئیں گے
ہم کو مضطر اور اُن کے عہدِ باطل نے کیا

سر زمینِ کوئے محبوب اور اُس پر پائے شوق
مجھ کو منزل سے الگ توقیرِ منزل نے کیا

نوحؔ تجھ سے بحرِ عالم میں نہ تھا واقف کوئی
تیرا شہرہ کشتی و طوفان و ساحل نے کیا

طبع زاد ۱۵ر نومبر ۱۹۳۲ء

ج

ہجر کی شب خاتمہ بالخیر میرا ہو گیا
صبح ہونے سے بہت پہلے سویرا ہو گیا

کیا ضرورت قتل کی یوں ہی سویرا ہو گیا
تم نے آنکھیں پھیر لیں سُتھراؤ میرا ہو گیا

اِس طرح عشق و وفا میں ختم کر دی زندگی
تو نہ جب میرا ہوا تو میں ہی تیرا ہو گیا

ہم سے چھٹتا کوچۂ محبوب مشکل تھی یہ بات
جب ملی فرصت تو جھٹ پٹ ایک پھیرا ہو گیا

کیا دکھاتے اور اثر اس سے زیادہ حسن و عشق
میں بھی اُس کا ہو گیا اب وہ بھی میرا ہو گیا

چار باتوں میں نہیں معلوم کتنا تھا اثر
تو نے اپنا کر لیا جس کو وہ تیرا ہو گیا

کثرتِ آزار و غم کا اور کچھ مطلب نہیں
اے دلِ ناشاد پورا وقت تیرا ہو گیا

گلشنِ عالم میں کس کو مل سکا لطفِ شباب
چار دن کے واسطے سب کا بسیرا ہو گیا

ڈھونڈتے تھے وہ بہانہ ظلم ڈھانے کے لئے
کام اوروں نے بگاڑا نام میرا ہو گیا

ہم یہ کہتے ہیں کہ ٹھہرو رات ابھی گذری نہیں
وہ یہ کہتے ہیں کہ جانے دو سویرا ہو گیا

دل کو لے کر میری دل جوئی اگر کچھ کی گئی
کون سا اس میں بڑا نقصان تیرا ہو گیا

ہیں ابھی نکلا نہ تھا صحرا نوردی کے لئے
خانہ ویرانی کا میرے گھر میں ڈیرا ہو گیا

لو شبِ غم آ گئی پھر دن گذر جانے کے بعد
تھا اُجالا جس قدر اتنا اندھیرا ہو گیا

مضطر طوفان و کشتی خواب میں دیکھا کئے
نوحؔ چپوں کو رات گذری اب سویرا ہو گیا

نزدیک سے جو دیکھا نہ گیا کیا دور سے دیکھا جائے گا

اس طرح بر تنظیم ادب الٰہ آباد میں مشاعرہ قرار پایا تھا لیکن چند وجوہ سے نہ ہو سکا چند شعراء میں نا اتفاقی ہو گئی تھی
بقیہ مطلع و بغیر عطف و اضافت

ج

بے داد کا شکوہ حشر کے دن اک حشر نیا ڈھائے گا
یعنی جو سنیں گے وہ اس کو تو اور انھیں غصہ آئے گا

کہنے کو یہی سب کہتے ہیں آج آئے گا وہ کل آئے گا
لیکن نہیں آتا مجھ کو یقیں آئے گا تو دیکھا جائے گا

شامل نہیں حسب کے دل کی طلب وہ کر کے دعا پچھتائے گا
دنیا کی مقامی دولت پر انسان بہت پچھتائے گا
اٹھے گا جو دل تو اشکوں کا بہنا بھی فزا دے جائے گا
آغاز خراب انجام برا عشق ایک اک غم ڈھائے گا
کعبہ ہو کہ بت خانہ ہو مگر دل دونوں جگہ گھبرائے گا
کب تک مرے مرنے کا صدمہ یاروں کو مرے تڑپائے گا
یہ سوچ سمجھ کر پہلو سے دل کو مرے وہ لے جائے گا
نظروں میں نہ آئے گا لیکن راز اس کا سمجھ میں آئے گا
آزار اٹھانے کی طاقت ہر شخص کہاں سے لائے گا
ہم جانتے ہیں ہم مانتے ہیں دل پردہ قیامت ڈھائے گا

کیا ہاتھ بڑھانے سے حاصل مشکل سے اثر ہاتھ آئے گا
یہ چیز یہیں رہ جائے گی تنہا وہ یہاں سے آئے گا
یہ ابر وہ ہے پانی کی جگہ دامن میں گہر برسائے گا
دونوں کا خلاصہ اتنا ہے دل آئے گا دم جائے گا
قدرت کا تماشا دیکھ سکے قدرت یہ کہاں سے لائے گا
دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے جو آئے گا وہ جائے گا
بے کام سہی ناکام سہی خود کام یہی کام آئے گا
دیکھے گا جو منظر میرا دل آنکھوں سے نہ دیکھا جائے گا
جب ہم نہ زمانے میں ہوں گے تو دل میں کوئی پچھتائے گا
اور اس کے علاوہ کیا ہوگا لٹ جائے گا مٹ جائے گا

اے نوح سفینہ ہر پھر کر ساحل سے کبھی مل جائے گا
کیا اس کو محبت کا دریا طوفان میں غم پہنچائے گا

نظر پیدا کر اے دل پھر تماشا دیکھ قدرت کا

اس طرح پر کرسچین کالج الہ آباد میں ۲۷ نومبر سنہ ۱۹۳۳ء کو فرید جعفری صاحب کے اہتمام سے مشاعرہ ہوا صفی صاحب آرزو صاحب ظریف صاحب لکھنوی شہر میں تھے لیکن شریک ہوئے حفیظ صاحب جالندھری نے غیر طرح نظمیں پڑھیں متین صاحب مچھلی شہری اور مقامی شعرا نے طرح میں اپنا اپنا کلام سنایا یہ مشاعرہ ۱۰ بجے شب سے شروع ہو کر ۳ بجے رات کو ختم ہوا۔

یہ باعث تھا ہماری گو مگو تقریر حسرت کا
وہ فرماتے ہیں یہ بھی اک طریقہ ہے شکایت کا
انھیں اغماض حسرت سے مجھے ارمان حسرت کا
وہ دیکھیں مہرباں ہو کر تماشا میری وحشت کا
تعجب کیا جو تم پہنچے ہمارے خانۂ دل تک
خدا جانے خدا کے سامنے کیا بحث چھڑ جائے
کریں گے احترام شوق میر احسن والے بھی
تمھارے حسن کی شہرت ہوئی سارے زمانے میں
مری کم مائگی پر معترض کیوں آپ ہوتے ہیں
ازل ہی سے مری تقدیر میں تھا داغ ناکامی
کہانی غم کی تم سنتے ہو سب تم کو سناتے ہیں

ج

وہ معنی پوچھ کر مطلب کبھی کچھ پوچھیں محبت کا
محبت سے نہیں سنتے کبھی قصہ محبت کا
یہ صورت ہے یہ عالم ہے محبت کی محبت کا
یہ ہے بازی گری قسمت کی کرتب ہے محبت کا
کہ آنکھوں میں سما کر مل گیا رستہ محبت کا
شہادت رنج و غم کی اور دعوے بھی محبت کا
بھکاری ہوں تمنا کا پجاری ہوں محبت کا
مرے دل کو سمجھ لو اشتہار اپنی محبت کا
جو داغ دل ہے وہ بھی ایک سکہ ہے محبت کا
سر لوح جبیں لکھا گیا طغرا محبت کا
ہمیں بھی یاد ہے اک واقعہ اپنی محبت کا

بالآخر کثرتِ مشکل نے مشکل میری آساں کی
جہاں سے اُٹھ گیا صدمہ اٹھا کر میں محبت کا

سرِ دربار شاید وہ مرا بھی مدعا سن لیں
کوئی کہہ دے کہ حاضر ہے نمایندہ محبت کا

جنابِ نوح بھی طوفانِ غم میں دل ڈبو بیٹھے
خدا ہے ناخدا اب کشتیِ بحرِ محبت کا

کچھ پتہ راہ کا نہ منزل کا

اس طرح پر ۲ دسمبر ۱۹۳۳ء کو جی بی بی کالج مظفرپور میں اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرہ ہوا حضرت سائل دہلوی ڈاکٹر مبارک و سیف صاحبان عظیم آبادی وکشتہ صاحب گیاوی مجید احمد سلمہٗ ناروی مقامی شعرا میں سے قاری مصطفیٰ صاحب و اختر صاحب نے خوب خوب غزلیں پڑھیں مجید احمد کو دو تمغے ملے عالی جناب خواجہ محمد نور صاحب جسٹس ہائی کورٹ پٹنہ صدر مشاعرہ تھے مشاعرہ نو بجے شب سے شروع ہو کر تین بجے رات کو ختم ہوا بعد مشاعرہ تین روز تک مختلف وقتوں میں جناب مجتبےٰ صاحب وکیل کے دولت خانے پر شعر خوانی ہوتی رہی ایک روز بچو بابو نے بھی دعوت کی

ج

حوصلہ دیکھ لے مرے دل کا
تیغ قاتل کی ہاتھ قاتل کا

اُن کے نقشِ قدم کو دیکھیں گے
ہوگا خاکہ مٹے ہوئے دل کا

ہے بھی دریائے عشق میں کہ نہیں
نام ہی سن رہا ہوں ساحل کا

اس طرف بھی کوئی خدنگ نگاہ
تم کو دیتا ہوں واسطہ دل کا

کھل گیا حال دشت وحشت میں
پچھلی منزل سے اگلی منزل کا

ہم سمجھتے ہیں آپ کیا سمجھیں
مرتبہ اور مرتبہ دل کا

صبح ہوتے ہی اُٹھ گئے احباب
لُٹ گیا وہ سہاگ محفل کا

اک طرف کعبہ اک طرف ہے دیر
دیکھئے رخ کدھر پھرے دل کا

چھیڑتا ہے کسی کو محشر میں
حشر کیا ہوگا من چلے دل کا

اُس جگہ اب ہے تیر پہلو میں
تھا ٹھکانہ جہاں کبھی دل کا

غرق دریائے غم ہوا خود بھی
خاک اُڑا کر غبار ساحل کا

فہم و ادراک سے ہے بالاتر
کوئی کیا سمجھے فلسفہ دل کا

اُن کی نظروں میں ایک ہیں دونوں
داغ دل کا چراغ محفل کا

شمع سوزاں اس انجمن میں نہیں
جل رہا ہے کنول مرے دل کا

خود بخود جھک گئی مری گردن
فرض تھا احترام قاتل کا

عشق میں یہ خبر نہ تھی مجھ کو
مدعا ہوگا مدعی دل کا

نوح طوفانِ بحرِ الفت میں
کیا پتہ پوچھتے ہو قاتل کا

جہانِ حسن کا ہر ذرّہ آفتاب ہوا

۱۱؍ فروری ۱۹۴۳ء کو وردھا میں اس طرح پر مشاعرہ تھا لیکن زلزلہ آجانے سے ملتوی ہوگیا

ج

کچھ اور حسن تمہارا دمِ شباب ہوا
جو دو پہر ہوئی تو گرمِ آفتاب ہوا

خیالِ عشق و وفا میں وہ کامیاب ہوا
جو وقفِ دردِ رہا نذرِ اضطراب ہوا

سب اہلِ حشر یونہیں رہ گئے سرِ محشر
تمام دن میں ہمارا فقط حساب ہوا

اگر یہ سچ ہے تو پھر فصلِ گل نہیں آئی
شراب خوار کوئی تارکِ شراب ہوا

جہانِ حسن میں انوارِ حسن کا یہ سماں
چمک اٹھا کوئی ذرّہ تو آفتاب ہوا

ہزار شکر کہ جانِ حزیں مری نکلی
یہیں سے اُن کی جفاؤں کا سدِّباب ہوا

خیالِ بادہ و ساقی سے کیا مجھے مطلب
شراب اتنی لنڈھائی کہ خود شراب ہوا

تلاشِ منزلِ مقصد کی سرگذشت نہ پوچھ
بہت خراب پھرا میں بہت خراب ہوا

تمام عمر فرشتے اِسے لکھا ہی کئے
فنا کے بعد مکمّل مرا حساب ہوا

خلافِ عقل مراتب کی آرزو ہے فضول
اگر بڑھا کوئی نقطہ تو کیا کتاب ہوا

یہ اور بات ہے ناوک نے بے رُخی برتی
مگر دل اپنے ارادے میں کامیاب ہوا

چراغِ بزم کی توقیر اہلِ بزم کریں
کہ اپنے دل کو جلا کر یہ باریاب ہوا

جنابِ نوحؔ کے رونے کا معجزہ دیکھو
وفورِ شرم سے طوفان آب آب ہوا

بزمِ ادب گوالیار کے لئے یہ غزل کہی تھی لیکن میں اپنی علالت کے سبب سے شریک نہ ہو سکا

ج

جو ہم نے کام کیا وہ خراب ہو نہ سکا
مگر فضا کے لئے سدِّباب ہو نہ سکا

اگر وہ ہم سبر جامِ شراب ہو نہ سکا
تو بالیقیں کوئی چیز آفتاب ہو نہ سکا

کوئی شرر بھی حریفِ و جواب ہو نہ سکا
ہوا مگر دلِ پر اضطراب ہو نہ سکا

تری نگاہ کی گردش بھی دیکھ لی ہم نے
جہانِ غم میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا

سوالِ شوق و تمنّا کا ماحصل معلوم
کہ لاجواب وہ حاضر جواب ہو نہ سکا

نگاہِ قہر نے ایسی نگاہ بانی کی
حریمِ ناز میں دل باریاب ہو نہ سکا

نگاہِ مست سے کہہ دو کہ بے خبر سب کی
خراب ہم ہوئے عالم خراب ہو نہ سکا

جہاں کی خاک اڑائی سکونِ دل کے لئے
مگر کہیں وہ ہمیں دستیاب ہو نہ سکا

طلوعِ سوزِ محبت نے کیا ترقی کی
جگر کا داغ اگر آفتاب ہو نہ سکا

پیامبر کی رسائی تو سخت مشکل تھی
مرا خیال وہاں باریاب ہو نہ سکا

یہ واقعہ ہے کہ طوفان اُٹھانے والوں میں
جناب نوحؔ تمھارا جواب ہو نہ سکا

حسب فرمائش گراموفون کمپنی کلکتہ ۲۷ر جون ۱۹۳۴ء

کیا رسمِ محبت کا بڑھانا نہیں اچھا
اچھی کہی آنا کہیں جانا نہیں اچھا

اندازِ ستم یاد دلانا نہیں اچھا
شکووں سے مرا باز نہ آنا نہیں اچھا

اے شمع پتنگوں کی طرف خاص کرم ہو
جلتے ہیں یہ خود اِن کا جلانا نہیں اچھا

احساسِ ستم اور ستم ڈھائے گا مجھ پر
بے ہوش رہوں ہوش میں آنا نہیں اچھا

دم توڑ رہا ہوں کوئی دم اور بھی ٹھہرو
ایسے میں مرے پاس سے جانا نہیں اچھا

آجائے اگر خود ہی تو آجائے کسی پر
بالقصد مگر دل کا لگانا نہیں اچھا

پھیر یں گے رُخ اپنا وہ مرے دل کی طرف سے
آئینے کو آئینہ دکھانا نہیں اچھا

یہ دل میں سما جاتے ہیں آنکھوں میں سما کر
اچھوں سے نگاہوں کا ملانا نہیں اچھا

تردیدِ تغافل تو وہ کیا مجھ سے کریں گے
اچھا یہی کہ دیں کہ ستانا نہیں اچھا

ممکن ہے کہ آتی ہو دوا اِس کی کسی کو
آزارِ محبت کا چھپانا نہیں اچھا

دیکھو جسے وہ اُن کی طرف دیکھ رہا ہے
اتنا بھی نگاہوں میں سمانا نہیں اچھا

بے درد کو ہمدرد بنانا تو ہے بہتر
ہمدرد کو بے درد بنانا نہیں اچھا

آغوش میں رہ کر بھی نظر اُن کی ہے دل پر
نزدیک سے یہ تیر چلانا نہیں اچھا

طوفان محبت میں اُٹھاتے ہو اُٹھاؤ
اے نوحؔ مگر حشر اُٹھانا نہیں اچھا

طبع زاد ۱۰ر جولائی ۱۹۳۴ء

بطورِ یادگارِ زہد مے خانے میں رکھ دینا
مری ٹوٹی ہوئی توبہ کو پیمانے میں رکھ دینا

کہا تھا اے دلِ نافہم و ناداں تجھ سے یہ کس نے
خدا خانے کی حرمت کو صنم خانے میں رکھ دینا

پسند آئے نہ آئے منحصر ہے یہ طبیعت پر
کسی کے سامنے دل ہم کو نذرانے میں رکھ دینا

دوبارہ پھر کسی دن میرے کام آئے گی اے ساقی
جو مے پینے سے بچ جائے وہ پیمانے میں رکھ دینا

کہیں آئیں کہیں جائیں کہیں اُٹھیں کہیں بیٹھیں
قدم ہر پھر کر اپنا ہم کو بُت خانے میں رکھ دینا

چراغِ انجمن اپنی ضیا پھیلانے والا ہے
اٹھا کر شعلۂ الفت کو پروانے میں رکھ دینا

کہاں ہم ڈھونڈتے تجھ کو پھریں گے اُس گھڑی ساقی
صبوحی کے لئے تھوڑی سی پیمانے میں رکھ دینا

نظر آتے ہیں کچھ انگور مجھ کو اے مرے ساقی
لہو توبہ کا اِن کے ایک اِک دانے میں رکھ دینا

خطائے عشق پر کیوں نوحؔ اپنی جان کھو بیٹھے
زخم اتنی بڑی اور اس کو جرمانے میں رکھ دینا

طبع زاد ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۲ء

ج

عشق میں مجھ کو بگڑ کر اب سنورنا آگیا
ہوگیا ناکام لیکن کام کرنا آگیا

یہ اگر سچ ہے کہ مجھ کو عشق کرنا آگیا
تو سمجھ لو روز جینا روز مرنا آگیا

دعوئے عشق و وفا پر مجھ کو مرنا آگیا
کہہ گذرنے کی جگہ اب کر گزرنا آگیا

درطۂ دریائے غم نے ایسے غوطے دے دیئے
ڈوبنا پھر ڈوب کر مجھ کو ابھرنا آگیا

زندگی سے اور تو کچھ فائدہ پہنچا نہیں
بس یہی جینے کا حاصل تھا کہ مرنا آگیا

چند خون آلودہ آنسو جذبِ دامن ہوگئے
پیکرِ سادہ میں غم کو رنگ بھرنا آگیا

شیوۂ عشق و وفا میں ہم کو ناکامی سہی
کم سے کم یہ تو ہوا بے موت مرنا آگیا

شوق سے ظلم و ستم اب روز ڈھاتے جایئے
اہلِ غم کو غم اٹھا کر غم نہ کرنا آگیا

کچھ توہم کچھ توقع کچھ الم کچھ انبساط
عشق کرکے مجھ کو جینا اور مرنا آگیا

کثرتِ آزار نے تعلیم دے دی ضبط کی
جبر کے باعث سے دل کو صبر کرنا آگیا

اشک آنکھوں میں پہنچ کر دل میں پھر واپس گئے
یوں سمجھ میں چڑھتے دریا کا اترنا آگیا

کم سے کم تھا اک طرح کا آسرا اقرار تک
لیکن اُن کو صاف اب انکار کرنا آگیا

رہ گذر سے عشق کی ہیں آج تک گذرا نہیں
کس طرح کہہ دوں مجھے جی سے گذرنا آگیا

حسن کی نخوت نے پہنچایا اُڑا کر عرش تک
اب تو پریوں کا بھی تم کو پر کترنا آگیا

بحرِ ذوق و شوق میں یہ بھی غنیمت جانیے
نوحؔ کو طوفان اٹھا کر غرق کرنا آگیا

۶ر نومبر ۱۹۳۲ء

ج

عشق میں غم کے سوا کیا مجھ کو حاصل ہوگیا
دل اِدھر آیا اُدھر آیا گیا دل ہوگیا

روزِ اوّل ہی ظہورِ عشق کامل ہوگیا
خون کے دو چار قطرے جم گئے دل ہوگیا

ہجر کی شب کا گذرنا سخت مشکل ہوگیا
ایک اک تارا مرا ڈوبا ہوا دل ہوگیا

عشق اُن سے کرکے غم سہنے کے قابل ہوگیا
پہلے دل ہی دل تھا اب دل بن گیا دل ہوگیا

پھول بنتے بھی نہ پایا تھا کہ آگئی پژمردگی
تم نے جس غنچے کو دیکھا وہ مرا دل ہوگیا

ہم نے کیا دیکھا یہ دیکھا اُن کا جلوہ دیکھ کر
مبتلائے درد و غم اچھا بھلا دل ہوگیا

میں کہوں میرا ہے تو اس کو نہ مانے گا کوئی
آپ کی مٹھی میں جا کر آپ کا دل ہوگیا

وہ نگاہِ ناز سے دیکھیں نہ دیکھیں غم نہیں
تیر اتنے آ گئے ترکش مرا دل ہو گیا

چار راتیں چار دن اور اس قدر تبدیلیاں
دوسرے تم ہو گئے اب دوسرا دل ہو گیا

اور کیا اُن کو دکھاتی چشمِ تر اعجازِ عشق
جو گرا آنسو وہی اپنی جگہ دل ہو گیا

تیرے کوچے سے اُڑے تھے چند ذرّے خاک کے
بن گیا کوئی جگر اُن میں کوئی دل ہو گیا

اللہ اللہ اُس کماں کش کا یہ اندازِ کمال
تیر ابھی آیا نہیں زخمی مرا دل ہو گیا

حسن کا جلوہ دکھاتا اور کیا اپنا اثر
ابر میں بجلی بنا آغوش میں دل ہو گیا

کثرتِ غم نے ہوا باندھی یہ کوئے یار میں
منتشر ایک ایک میرا ذرّہ دل ہو گیا

میں اسے جادو سمجھ لوں یا کرامت آپ کی
کہہ دیا جس گل کو دل ہو جائے وہ دل ہو گیا

رکھ دیا بہرِ تسلّی آپ نے دل پر جو ہاتھ
میں یہی سمجھا کہ پیدا دوسرا دل ہو گیا

سیکڑوں طوفاں اُٹھیں گے عشق میں تو ڈر نہیں
نوح کا دل بھی جنابِ نوح کا دل ہو گیا

۱۷ر نومبر سنہ ۱۹۳۴ء

ج

کیوں کہا آزارِ شوق جان وہی دل پر اُٹھا
سامنے آ امتحاں لے رُخ بدل خنجر اُٹھا

چھوڑ کر طرزِ تغافل تیغ لے خنجر اُٹھا
تو نہ مجھ سے ہاتھ اُٹھا تو ہاتھ اب مجھ پر اُٹھا

ظلم کا شکوہ بھی کرنا عشق میں ہے ننگِ عشق
اُٹھ سکے تجھ سے جہاں تک اے دلِ مضطر اُٹھا

ہم جو پہنچے مے کدے میں تو ہوا یہ احترام
بندگی کو خُم جھکا تعظیم کو ساغر اُٹھا

عذر کرتا تھا فلک انکار کرتی تھیں زمیں
مجھ کو حیرت ہے کہ دل سے بارِ غم کیوں کر اُٹھا

چار حرفِ آرزو پر چار حکم اُس نے دیئے
دور ہو گھر سے نکل اب جلد اُٹھ بستر اُٹھا

کیوں نہ ہو گا پار بیڑا دل میں ہمت چاہیے
ناخدا لے کر خدا کا نام تو لنگر اُٹھا

قتل گہ میں حسرتیں دونوں کی نکلیں ایک ساتھ
میں اِدھر گردن جھکاؤں تو اُدھر خنجر اُٹھا

عشق جیسی چیز کی توقیر کرائے بوالہوس
اس کا صدمہ جان پر دل پر کلیجے پر اُٹھا

آسماں ٹکرائے یا وسعت زمیں کی تنگ ہو
تو نہ اِتنا پاؤں پھیلا تو نہ اتنا سر اُٹھا

ہم نے دیکھا یہ ہزاروں بار بزمِ یار میں
آرزو لے کر جو بیٹھا داغِ دل لے کر اُٹھا

دیکھ ساقی عقل کھلے کھنچتے ہی رُت پھر گئی
جلد اب ساغر اُٹھا ساغر اُٹھا ساغر اُٹھا

آستانِ یار سے چھٹنے کا صدمہ کیا کہوں
میں اُٹھا اُٹھنے کو اُس در سے مگر مر کر اُٹھا

قتل اِس حیرت نے قبل از قتل کر ڈالا ہمیں
دستِ نازک سے تمہارے کس طرح خنجر اُٹھا

اضطرابِ شوق سے راہِ طلب میں تھا یہ حال
بارہا اُٹھ کر گرا میں بارہا گر کر اُٹھا

دشمنِ رفعت ہے گردش اُس کی اے رفعت پسند
آسماں کو پہلے سر پر دیکھ لے پھر سر اُٹھا

مے کدے میں بادہ کش بیٹھے تھے جیسے منتظر
اُس طرف بدلی اُٹھی اور اس طرف ساغر اُٹھا

اللہ اللہ کیا محبت کی کشش سجدے میں تھی
سر اُٹھا تو میرے سر کے ساتھ سنگِ در اُٹھا

دیکھیے اب کیا دکھائے جوشِ بحرِ آرزو
خیر ہو پھر نوح کا طوفانِ چشمِ تر اُٹھا

مبارک شاخِ غم کو نخلِ کوہِ طور ہو جانا

اس طرح پر ۸ فروری ۳۵ء کو مشاعرہ ہونے والا تھا لیکن ملتوی ہو گیا پھر کسی تاریخ میں ہوا لیکن میں شریک ہو سکا

ج

وفا و مہر کے بعد آپ کا مغرور ہو جانا
یہ ایسا ہے کہ جیسے پاس ہو کر دور ہو جانا

مناسب ہے انھیں عشق و وفا سے دور ہو جانا
نہ ہو قسمت میں جن کی سرمد و منصور ہو جانا

نہ بھولا ہے نہ بھولے گا مجھے مسرور ہو جانا
کسی کا پاس آنا اور غم کا دور ہو جانا

ترا مجبور کر دینا مرا مجبور ہو جانا
پھر اس کا رفتہ رفتہ مستقل دستور ہو جانا

اثر اُلٹا دکھایا چارۂ آزارِ الفت نے
مرے زخمِ جگر کا زخم سے ناسور ہو جانا

دکھائے پانچ عالم اِک پیامِ شوق نے مجھ کو
اُلجھنا روٹھنا لڑنا بگڑنا دور ہو جانا

دیا یہ حکم اُن کو حسن دے کر دینے والے نے
چمکنا اس قدر رشکِ چراغِ طور ہو جانا

نہیں یہ گردشِ قسمت مسافر کی تو پھر کیا ہے
بھٹک کر منزلِ مقصد سے کوسوں دور ہو جانا

تغافل سے تو یہ طرزِ ستم پھر بھی غنیمت ہے
مجھے مغموم کر کے آپ کا مسرور ہو جانا

نشاط و عیش و عشرت نے نہ دیکھا پھر مجھے مڑ کر
کسی کا دور ہو جانا تھا سب کا دور ہو جانا

دوبالا کر گیا آزار کو غم کو مصیبت کو
مری عرضِ مکرر کا بھی نامنظور ہو جانا

خراشِ ناخنِ غم پر یہ تاکیدِ محبت ہے
کہ پہلے زخم بننا بعد کو ناسور ہو جانا

زمانے کی دو رنگی میں نشاط و رنج شامل ہیں
مری تاریک شب کا صبح دم کافور ہو جانا

جہاں بدلی اُٹھی رندوں کو سوجھی بزم آرائی
بہم مل جل کر اِن کا خوشۂ انگور ہو جانا

یہ دُہری دُہری مجھ پر آپ کیوں بیداد کرتے ہیں
نظر سے دور رکھنا خود بھی دل سے دور ہو جانا

جہانِ حسن میں شہرت تمھاری ہے اُڑی تم کو
پری تو بن گئے اب رہ گیا بس حور ہو جانا

جناب نوح بحرِ غم میں طوفانی علامت ہے
یہ ساحل سے مرے بیڑے کا بہہ کر دور ہو جانا

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اس طرح پر ۱۶ فروری ۱۹۳۵ء کو شاہ جہاں پور میں مشاعرہ ہوا لیکن میں علالت کے سبب سے شریک نہ ہو سکا

ج

غم اس قدر ملے کسی قابل نہیں رہا ۔۔۔ دل تو رہا مگر وہ مرا دل نہیں رہا
کیا مبتلائے عشق مرا دل نہیں رہا ۔۔۔ ہاں ہاں رہا مگر متحمل نہیں رہا
ہر دم کی آہ آہ سے زحمت میں جان تھی ۔۔۔ اچھا ہوا کہ درد بھرا دل نہیں رہا
انکارِ قتل اُس نے کیا اس ادا کے ساتھ ۔۔۔ قاتل مری نگاہ میں قاتل نہیں رہا
اللہ ری کشش کسی برقِ نگاہ کی ۔۔۔ جب سامنا ہوا تو مرا دل نہیں رہا
اسرارِ عشق آ گئے دل سے زبان پر ۔۔۔ میں اُس کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا
عہدِ وفا زباں سے ہزار آپ کیجئے ۔۔۔ دل کی تو بات یہ ہے کہ وہ دل نہیں رہا
تیغِ نگاہِ ناز سے سب ہو گئے ہلاک ۔۔۔ اب مطمئن رہو کوئی بسمل نہیں رہا
دستِ جنوں کو قیس کے بڑھنے تو دیجئے ۔۔۔ سُن لیجئے گا پردہ محمل نہیں رہا
دریائے ذوق و شوق میں ایسا تھا مد و جزر ۔۔۔ اپنے مقام پر کبھی ساحل نہیں رہا
دنیا میں ہر مکین کو ضرورت مکاں کی ہے ۔۔۔ حسرت رہے تو کیا رہے جب دل نہیں رہا
کوسوں وفورِ شوق میں آگے نکل گئے ۔۔۔ ہم کو خیالِ جادہ و منزل نہیں رہا
امواجِ بحرِ غم کے مناظر تھے سامنے ۔۔۔ میری نگاہ میں کبھی ساحل نہیں رہا
یہ جھوٹ ہے وہ مجھ کو فراموش کر گئے ۔۔۔ یہ سچ ہے میں ہی قابلِ محفل نہیں رہا

اے نوح کیا غضب تھا وہ طوفانِ بحرِ شوق
مڑ کر جو کی نگاہ تو ساحل نہیں رہا

طبع زاد ۲۰ / اکتوبر ۱۹۳۵ء

میرے گھر کو دُلھن بنائے جا ۔۔۔ ساتویں آٹھویں دن آئے جا
کام کے وقت کام آئے جا ۔۔۔ میری بگڑی ہوئی بنائے جا
مجھ کو دل یہ صلاح دیتا ہے ۔۔۔ وہ نہ آئیں مگر بلائے جا
کچھ توجہ ہو کچھ تغافل ہو ۔۔۔ کچھ ہنسائے جا کچھ رلائے جا
کون کیسا ہے کون کتنا ہے ۔۔۔ اہلِ الفت کو آزمائے جا
لطف پینے کا یہ ہے اے ساقی ۔۔۔ میں پئے جاؤں تو پلائے جا
اپنا جلوہ نہ تو دکھا مجھ کو ۔۔۔ اپنی آواز ہی سنائے جا
تجھ کو ہے اپنے ظلم ہی کی قسم ۔۔۔ ظلم ڈھایا تو ظلم ڈھائے جا
کون کہتا ہے اے دلِ خوددار ۔۔۔ اُن کی محفل میں بے بلائے جا
غنچۂ آرزو ہے کھلنے پر ۔۔۔ مسکرائے جا مسکرائے جا

انقلابِ خیال زندہ باد — اِک نہ اِک رنگ روز لائے جا

عشق میں لطف کیا بغیر اِس کے
نوحؔ طوفانِ اشک اٹھائے جا

حسبِ فرمائش جناب مائل صاحب انبالوی ۲۷ اپریل ۱۹۳۶ء

باقی نہ رہ گیا اثرِ جوشِ نقشِ پا[۱] — راہِ طلب میں ایسے اُڑے ہوشِ نقشِ پا
آئے جو ہاتھ ساغرِ سر جوشِ نقشِ پا — کیوں اُس گلی میں ہم نہ ہوں مدہوشِ نقشِ پا
چلتا ہوں مثلِ بادِ سحر کوئے یار میں — ہوں فرطِ لاغری سے سبک دوشِ نقشِ پا
باہر قدم پڑے نہ حدودِ نیاز سے — اے سالکانِ عشق رہے ہوشِ نقشِ پا
مشقِ خرام خاک میں سب کو ملائے گی — دیتے ہیں یہ خبر لبِ خاموشِ نقشِ پا
اُفتادگانِ غم کو تکلف نہیں پسند — ہے صرف خاک زینتِ آغوشِ نقشِ پا
کیا رہ روانِ عشق کہیں رازِ رہ روی — خاموش کر گئے لبِ خاموشِ نقشِ پا
ہم خاک اگر ہوں تو ہمیں حاصل ہو یہ شرف — ہاتھ آئے کوئے یار میں آغوشِ نقشِ پا
اپنی جگہ سے کوئی اُٹھے بھی تو کیا اُٹھے — پامالِ غم ہے محفلِ خاموشِ نقشِ پا

راہِ وفا میں نوحؔ جو طوفاں اُٹھائیں ہم
قائم نہ رہ سکے اثرِ جوشِ نقشِ پا

طبع زاد ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

محبت میں ہو کر شریکِ تمنا خبر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا — نشاں میرے دل کا اثر میرے غم کا خبر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
یکایک طبیعت میں آئی کچھ ایسی کہ تیروں کو دل میں کہ کہ جگہ دی — سلامت رہو اے خبر لینے والے خبر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
دئے چھوٹے اکثر ہزاروں ولاسے اُڑایا مرے دل کو ناز و ادا سے — جگر ہی جگر رہ گیا صرف باقی جگر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
ہوا مشکلوں سے یہ موقع میسر اِدھر آؤ بیٹھو سنو جی لگا کر — وفا و محبت میں آزار و غم کا اثر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
مریضِ محبت کے دم پر بنی ہے حیات اجل میں لڑائی ٹھنی ہے — یہ مانا کہ صحت کا ذمہ نہ لو گے مگر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
ستایا بہت کچھ دبایا بہت کچھ محبت میں مجھ کو مٹایا بہت کچھ — فلک سے فلک کی جفاؤں کا بدلہ اگر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
خوشی ہو مسرت ہو راحت ہو مجھ کو الم ہو قلق ہو مصیبت ہو کچھ ہو — تمہیں میرے مونس تمہیں میرے حامی اثر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
جو ہم عرض کرتے خطا تھی ہماری کہ تھی اِک طرح کی بڑی ذمہ داری — جگر خود یہ کہتا ہے میں ہوں تمہارا جگر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
وفا و محبت سے اغماض بالکل کہاں تک ستم ڈھانے والا تغافل — خبردار ہو کر ہماری خبر لو خبر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا
محبت کے آداب دیکھے نرالے ہوئے کام سب وقت پر ہونے والے — کہا میں نے کب تم مری جان لے لو مگر تم نہ لو گے تو پھر کون لے گا

[۱] اس زمین میں تو ان اضافت سے حضرت داغ رح بھی بہت نہ بچ سکے

تمنا کا رہا مرے دل میں گھٹ کر فغاں کا پہنچا سرِ بزم لُٹ کر
یہ کیا کہہ رہے ہو اثر ہم نہ لیں گے اثر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا

مرے دل کی جانب نگاہیں اُٹھاؤ توجہ کرو اور غیرت بڑھاؤ
نہ گاہک نہ اس کا طلب گار کوئی اگر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا

تمھاری ہی محفل میں چھپلی تھی رحمت تمھاری ہی محفل میں آئے گی آفت
اثر تم نہ لیتے تو پھر کون لیتا اثر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا

نگاہِ طلب کیوں رہے صرف دل تک یہ کیسا توہم ہے کس واسطے شک
ہمارا جگر بھی تمھارا جگر ہے جگر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا

کبھی داستانِ محبت سنوگے کبھی شکوۂ ظلم پر سر دُھنو گے
مری ایک اک زود اثر گفتگو کا اثر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا

کوئی واقفِ رسم و راہِ وفا بھی کوئی غافلِ سہر بیم و رجا بھی
اِدھر باخبر کی اُدھر بےخبر کی خبر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا

محبت میں طوفان ایسے اُٹھائے کہ دنیائے حسرت نے بھی غوطے کھائے
کبھی امتحاں نوح کے جوشِ غم کا اگر تم نہ لوگے تو پھر کون لے گا

کچھ نہ ہوگا فقط اک نام خدا کا ہوگا

اس طرح پر درگاہ حضرت سید شاہ ارزاں صاحب رح پٹنہ میں ۱۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو زیر انتظام جناب سید شاہ حامد حسین صاحب حامد سجادہ نشین مشاعرہ ہوا مقامی شعرا میں سے علاوہ ڈاکٹر مبارک صاحب سب لوگ رہے نشست ۹ بجے رات سے شروع ہوکر ۵ بجے صبح ختم ہوئی

ج

آپ کہتے ہیں قیامت میں تماشا ہوگا
وقت وہ ہوگا کوئی بھی نہ کسی کا ہوگا

فطرتاً تو دلِ خود دار نہ ایسا ہوگا
تم تماشا جو بناؤ گے تماشا ہوگا

عیشِ امروز میں شامل غمِ فردا ہوگا
کیا خبر تھی اِدھر ایسا اُدھر ایسا ہوگا

حسن پر ظلم کے شکووں کا اثر کیا ہوگا
بلکہ ہوگا یہی خود عشق ہی رسوا ہوگا

پاس بیٹھا ہے مگر مجھ کو پریشانی ہے
وہ جدا ہوگا تو معلوم نہیں کیا ہوگا

آپ تو اپنی جفاؤں سے نہ رکھیں محروم
خیر جو کچھ مری تقدیر میں ہوگا ہوگا

دردمندانِ محبت نے یہ رکھی ہے شناخت
جس سے ہوگی ہمیں صحت وہ مسیحا ہوگا

مختصر روزِ جزا قصۂ غم نا محدود
وہ ہے معلوم ہمیں حشر جو دل کا ہوگا

جب انھیں قدر نہیں ذوق نہیں عشق نہیں
لے تو وہ لیں دلِ مضطر کو مگر کیا ہوگا

ہم دکھا دیں گے تمھیں عشق و وفا کی تاثیر
حسنِ مختار بھی مجبورِ تمنا ہوگا

تابِ نظارۂ محبوب ہنسی کھیل نہ تھی
ہم اُسے دیکھیں گے جس نے اُسے دیکھا ہوگا

حشر کا نام سنا جس کی زباں سے تم نے
کیوں نہ پوچھا یہ اُسی سے کہ وہاں کیا ہوگا

سیکڑوں ظالم و مظلوم نظر آئیں گے
حشر کا حشر تماشا کا تماشا ہوگا

سوچتا ہوں میں نہ دیکھے گی نظر دیکھے گی
تم یہ کیا کہتے ہو ایسا تو نہ ہوگا ہوگا

لے چلا مجھ کو حقیقت کی طرف عشقِ مجاز
اُس کے بندے ہیں جب ایسے تو وہ کیسا ہوگا

عشق کا راز چھپانے سے چھپے کیا ممکن
اس کے معنی یہ ہوئے حسن بھی رسوا ہوگا

دل کو تم شوق سے لے جاؤ مگر یاد رہے
یہ نہ میرا نہ تمہارا نہ کسی کا ہوگا

ہم نہ کچھ منہ سے کہیں گے وہ سمجھ جائیں گے
اس طرح نزع میں اظہارِ تمنا ہوگا

دے دے مے خانے کا مے خانہ بلانوشوں کو
گھونٹ دو گھونٹ سے اے پیرِ مغاں کیا ہوگا

سیکڑوں ڈوب گئے بہہ بھی گئے مر بھی گئے
آپ نے نوح کا طوفان تو دیکھا ہوگا

جو گرا آنکھوں سے آنسو حسن کا دریا ہوا

اس طرح پر ایک مشاعرہ پہلے بھی جناب آغا علی خاں صاحب الہ آباد میں کر چکے تھے پھر دوسرا مشاعرہ اسی زمین پر ۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو سکندرآباد ضلع بلندشہر میں ہوا مقامی شعرا کے علاوہ حضرت ساحر زار دہلوی منور لکھنوی قمر بدایونی آزاد انصاری دعا ڈبائیوی صوفی میرٹھی زیبا ناروی فدا گلاوٹھوی حسب اصرار مفتون و کوثر صاحبان شریک مشاعرہ ہوئے اور قبل آغاز مشاعرہ تصویر کھینچی گئی جو سب کو دی گئی

ج

یہ نیا اغماض اور انداز میں پیدا ہوا
حشر بھی اٹھا مگر تم نے نہ پوچھا کیا ہوا

پھر رہا ہوں در بدر میں ٹھوکریں کھاتا ہوا
وہ بھی کیا ساعت تھی سر جب مائلِ سودا ہوا

ہیں نشاط و عیش پا کر غم سے بے پروا ہوا
کام قدرت نے بنایا نام قسمت کا ہوا

اور کیا ہوتا اگر بڑھتا ہمارا جوشِ اشک
اے خیالِ ضبطِ غم گھٹ کر تو یہ دریا ہوا

جان دے دی سر پٹک کر آستانِ یار پر
اس طرح پورا مری تقدیر کا لکھا ہوا

روح آئی میرے تن میں لے کر اپنے ساتھ عشق
اس طرف پیدا ہوا میں اس طرف شیدا ہوا

دیکھنا دریائے غم میں وہ مرا دل تو نہیں
اک سفینہ پھر رہا ہے ہر طرف بہتا ہوا

جو گرے دامن پہ اشکِ سرخ وہ گلشن بنے
جو اڑا ذرہ مرے قدموں سے وہ صحرا ہوا

تم یہی کہہ دو ہمارے شکوۂ بیداد پر
صبر کر جو کچھ تری قسمت میں ہونا تھا ہوا

درد و غم نے دی بشارت یاس و حرماں نے نوید
اللہ اللہ عشق بھی کس حسن سے پیدا ہوا

تعزیت کو بھی نہ وہ آئے مرے مرنے کے بعد
جان دے دی جان دینے کا حاصل کیا ہوا

کیا اثر رکھتی تھی حسن و عشق کی پہلی کرن
وہ بنے برقِ تجلی دل مرا موسیٰ ہوا

رہ روِ عشق و وفا کا روکنے والا تھا کون
بڑھ گیا آگے حدودِ غم کو ٹھکراتا ہوا

جس قدر تھی کشمکش مجھ کو مٹی وہ بعدِ قتل
ناخنِ شمشیر سے ہستی کا عقدہ وا ہوا

چار دن کی زندگی میں کچھ دنوں کی عمر میں
کیا بتاؤں کیا کہوں کیا کیا کیا کیا کیا ہوا

ہم نے ان کو دیکھ کر محشر میں کیوں فریاد کی
عشق تو بدنام تھا ہی حسن بھی رسوا ہوا

بالیقیں نالہ نکل کر دل سے پہنچا عرش تک
دیکھتا ہوں اک پھریرا آج لہراتا ہوا

اِس طرح جیسے اُنھیں اے نوحؔ آگاہی نہیں
پوچھتے ہیں حشر کیا طوفان و کشتی کا ہوا

ولہٗ

حشر مدت سے اسی حسرت میں تھا کھویا ہوا
دو قدم چلنے نہ پائے تم کہ وہ برپا ہوا

ہر بشر ناپید ہونے کے لئے پیدا ہوا
زندگی سب کو ملی لیکن نتیجہ کیا ہوا

چشم بدبیں دیکھ سکتی کس طرح میرا عروج
میں بُرا دنیا سے ٹھہرا یہ بہت اچھا ہوا

گر پڑے تھے جو مری آنکھوں سے ذکرِ حسن پر
نام اُنھیں چند آنسوؤں کا عشق میں دریا ہوا

کیا کروں میں دل سے آہیں دل میں اتنا دم نہیں
وہ صدا دے کس طرح جو ساز ہو ٹوٹا ہوا

راہِ الفت ہم نے کن دشواریوں سے ختم کی
ایک اِک ذرّہ یہاں اپنی جگہ صحرا ہوا

آخر آخر مٹ گئے سب ولولے سب حوصلے
اوّل اوّل عشق میں ایسا ہوا ویسا ہوا

میں ہوا بیمار تم نے جب کہا بیمار ہو
اور جب تم نے کہا اچھا ہو میں اچھا ہوا

خاک اُڑا کر قیس نے جب دل سے کوئی آہ کی
نجد کا اِک اِک بگولہ محملِ لیلیٰ ہوا

یہ بھی تجھ سے پوچھنا ہے داخلِ ترکِ ادب
کیوں ہوا ایسا نہ یارب اور کیوں ایسا ہوا

اس طرح وہ پوچھتے ہیں مجھ سے میرا حالِ دل
پھر بتاؤ پھر کہو ہاں کیا کہا ہاں کیا ہوا

حسرت اُن پر جن کو فکرِ شانِ خودداری ہوئی
آفریں اُس کو جو کوئے عشق میں رسوا ہوا

دردِ دل پر منحصر تھی آرزو کی زندگی
ہم نہ اچھے ہو سکے یہ بھی بہت اچھا ہوا

خاک اُڑانے کی حقیقت اے جنوں مجھ سے نہ پوچھ
میں نے جس ذرّے کو وسعت دی وہی صحرا ہوا

نوحؔ طوفانِ حوادث نے کیا یہ دل کا حال
پیشتر صحرا ہوا صحرا سے پھر دریا ہوا

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب تھا

۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو اس طرح پر مچھلی شہر ضلع جون پور میں مشاعرہ ہوا لیکن مجھے شرکت سے معذوری ہوئی

یہ کیا تھا داغِ محبت جو کامیاب نہ تھا
جہاں میں دھوپ تھی گردوں پر آفتاب نہ تھا

کھلی جو آنکھ تو اگلا سا اضطراب نہ تھا
وہ ایک خواب تھا گویا مرا شباب نہ تھا

کسی کے حسنِ جہاں سوز کا جواب نہ تھا
ہوئی یہ خیر جو نزدیک آفتاب نہ تھا

تمھارے حسن کے نزدیک کامیاب نہ تھا
مری نگاہ میں ذرّہ تھا آفتاب نہ تھا

تلاش کرتے رہے دل کو بزمِ یار میں ہم
وہاں سب اور تھے یہ خانماں خراب نہ تھا

وہ چار دن کو جو آئے تو پھر چلے بھی گئے
یہ اک طرح کا تغیر تھا انقلاب نہ تھا

وفورِ شوق میں ہم عرضِ حال کیا کرتے
وہاں کسی کی کسی بات کا جواب نہ تھا

دلِ حزیں کو نظر سے گرا دیا تم نے
خراب تھا مگر اتنا بھی اب خراب نہ تھا

کمالِ عشق و وفا لے گیا وہاں مجھ کو
جہاں کسی کا تصور بھی باریاب نہ تھا

وہ چل دیے تو بڑھی اور بے قراریٔ شوق
وہ آ گئے تو مرے دل کو اضطراب نہ تھا

کبھی چھپے کبھی نظروں کے سامنے آئے
ابھی حجاب تھا اُن کو ابھی حجاب نہ تھا

یہ دیکھتا ہوں وہ آئے ہیں اور بیٹھے ہیں
مرے خیال میں بھی اِس طرح کا خواب نہ تھا

مرے کمال کو مے خوار جانچتے تو کبھی
کہ مست تھا مگر آلودۂ شراب نہ تھا

فرشتے رہ گئے محشر میں دیکھ کر مجھ کو
ہوئی جو جانچ تو باقاعدہ حساب نہ تھا

ملے جو رنج و الم مجھ کو یہ نصیب کی بات
کسی کا عشق تو فی نفسہٖ خراب نہ تھا

وقارِ بادۂ کوثر کو جانتا کیوں کر
ہزار شکر کہ میں تارکِ شراب نہ تھا

خدا سے حشر میں ہم کیا شکایتیں کرتے
وہ تربیت غمِ الفت کی تھی عتاب نہ تھا

کوئی سبب تو بتاؤ یہ کیا کہا تم نے
جنابِ نوح کا طوفان کامیاب نہ تھا

ذیل کی ردیف و قوافی میں رائے بریلی کا سالانہ مشاعرہ ہوا لیکن مجھے شرکت سے معذوری رہی

دونوں گھروں کا لطف جداگانہ مل گیا
کعبے سے ہم چلے تھے کہ بت خانہ مل گیا

ساقی سے یوں ثبوت کریمانہ مل گیا
پیمانہ میں نے مانگا تھا مے خانہ مل گیا

دل کیوں نہ ہم فروخت کریں اس یقین پر
قیمت بھی اب ملے گی جو بیعانہ مل گیا

ساقی کی چشمِ مست اِدھر آج اُٹھ گئی
ہم کو ہمارے ظرف کا پیمانہ مل گیا

کرنی پڑی نہ اور کہیں جستجو مجھے
کعبے ہی کے حدود میں بت خانہ مل گیا

محشر میں دیکھ کر اُنھیں یوں شاد ہو گئے
گویا ہمیں نجات کا پروانہ مل گیا

مل کر بھی جل گیا کہ بچا یہ نہ پوچھئے
اِتنا ہوا کہ شمع سے پروانہ مل گیا

اب در بدر کی ٹھوکریں کھانے سے کیا غرض
مجھ کو خدائے کعبہ و بت خانہ مل گیا

اللہ رے چشمِ ساقیٔ محفل کا لطفِ خاص
سب یوں ہی رہ گئے مجھے پیمانہ مل گیا

وہ خط میں لکھ رہے ہیں تری عافیت نہیں
مجھ کو عدم کی راہ کا پروانہ مل گیا

اے سالکانِ جادۂ عرفاں بڑھے چلو
بت خانہ مل گیا تو خدا خانہ مل گیا

توقیرِ عشق خاک اُڑانے سے بڑھ گئی
یہ ہے غلط کہ خاک میں دیوانہ مل گیا

پائے عروج کیوں نہ ہماری فروتنی
پھولا پھلا وہ خاک میں جو دانہ مل گیا

جوشِ جنوں کے واسطے اب کچھ نہ چاہیے
ویرانے کی تلاش تھی ویرانہ مل گیا

پیمانہ و سبو کی ضرورت نہیں رہی
مجھ کو مزاجِ ساقیِ میخانہ مل گیا

مرقد سے کشتگانِ محبت نکل چکے
اب حشر تک کے واسطے کاشانہ مل گیا

معلوم ہم نے کر لئے اسرارِ حسن و عشق
تقدیر سے اگر کوئی دیوانہ مل گیا

رکھ لی خدائے عشق نے جوشِ جنوں کی شرم
گھر سے نکلتے ہی مجھے ویرانہ مل گیا

وہ کہہ گئے کہ پھر کوئی طوفان اٹھائیے
اے نوح مجھ کو شغلِ قدیمانہ مل گیا

مشکل کو سہل سہل کو مشکل بنا دیا

۲۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو اس طرح پر اسلامیہ ہائی اسکول جبل پور میں عظیم الشان مشاعرہ ہوا مجھے بھی عزیزی مجید خاں صاحب قادری خویش مرزا احمد جان صاحب الہ آبادی کے اصرار سے شریک ہونا پڑا مقامی شعرا کے علاوہ حیدر صاحب دہلوی۔ سید تجمل حسین صاحب جوہر ڈبائیوی الہ آباد سے جدت صاحب و حدت صاحب۔ شمشیدا صاحب نے شرکت کی۔ عزیز صاحب سلونی بھی دوران مشاعرہ میں پہنچ گئے تھے شروع سے آخر تک جناب کمشنر صاحب بھی رونق افروز رہے بعد ختم مشاعرہ تین روز تک مجھے قادری صاحب کا مہمان رہنا پڑا چوں کہ مرزا احمد جان صاحب بھی ساتھ تھے اس سبب سے بڑا لطف رہا قریب قریب تمام دن رات شعر خوانی ہوتی رہی اور ہر وقت شعرا کا مجمع رہتا تھا قادری صاحب نے دعوت کے اہتمام میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا چار وقت پر تکلف کھانے سامنے آتے تھے آخری دن یہاں کے مشہور مقامات یعنی بھیڑا گھاٹ وغیرہ کی سیر ہوئی یہ ایک آبشار ہے بلندی سے پانی نشیب میں بڑے زور سے گرتا ہے واپسی میں کار کے بے کار ہو جانے سے ہم اہل سب لوگوں کو پیدل چلنا پڑا اس موقع پر سب سے زیادہ تعجب قادری صاحب کی چھوٹی بچی پر آتا ہے کہ اس نے بھی نو دس سال کی عمر میں اتنا لمبا سفر پیدل ہی ہم لوگوں کے ساتھ طے کیا الہ آباد واپس ہونے کے وقت میری وہ بیاض چوری گئی جس میں ۳۰۰ غزلیں اور ۱۰۰ نظمیں تھیں تلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا لیکن نہ ملی قادری صاحب نے اس کا اثر بہت کچھ لیا لیکن ان کو یہ رنج فضول ہے کیوں کہ اس کو جانا ہی تھا تو میرے پاس سے بھی گم ہو جاتی کچھ دنوں کے بعد مل گئی

یہ غم ہمیں تھا کیوں متحمل بنا دیا
ناکامیِ حصول نے حاصل بنا دیا
برقِ نگاہِ ناز نے کامل بنا دیا
دیکھا تڑپ یہ پرتوِ حسن و جمال میں
پہلو نہ کیوں نثار ہو پیکانِ یار پر
رنج و غم و الم بھی نہ بیکار جا سکے
بدلا نظامِ حسنِ چمن کو بھی آپ نے
رنج و الم سے مل گئے آزار و اضطراب

ج

دل کی تڑپ نے دل کو مگر دل بنا دیا
ابھرا جو دل سے داغ اسے دل بنا دیا
جس شے میں کچھ تڑپ تھی اسے دل بنا دیا
ہر آئینے کو آئینۂ دل بنا دیا
خالی پڑی ہوئی تھی جگہ دل بنا دیا
قدرت نے جمع کر کے انھیں دل بنا دیا
جس پھول پر نگاہ پڑی دل بنا دیا
ان چار عنصروں نے مرا دل بنا دیا

ترمیم حسن و عشق یہ کیا حسب حال تھی — اچھا ہوا جو غم کی جگہ دل بنا دیا
میرے خیال میں یہ بڑی چوک ہو گئی — بنتا تھا جس کو روح اسے دل بنا دیا
یہ دل وہی کبھی خوب رہی دل بری کے ساتھ — پیکاں کو اس نے دل کی جگہ دل بنا دیا
جس کائناتِ عشق میں تھا رازِ مرگ و زیست — غم نے گھٹا بڑھا کر اسے دل بنا دیا
تخلیقِ اضطراب میں زحمت نہیں ہوئی — بجلی گلائی اور مرا دل بنا دیا
قربان کیوں نہ عشق نوازی کے جائیے — اس نے جگر کو بھی ہمہ تن دل بنا دیا
بھاری ہیں عز و جاہ میں دونوں جہاں پر — وہ دو حروف جن سے مرا دل بنا دیا
نقشِ قدم ہی پر نہیں موقوف یہ کمال — چاہا جہاں کسی نے وہیں دل بنا دیا

اسے نوحؔ کیا یہ معجزۂ شاعری نہیں
ہر قافیے کو ہم نے نیا دل بنا دیا

حسب فرمائش آزاد انصاری صاحب

ج

سرحدِ حسن سے نکل حلقۂ عشق اثر میں آ — دل کی نظر کو دیکھ کر دل میں سما نظر میں آ
تیرِ ادا تجھے قسم تیغِ نگاہِ ناز کی — شوقِ دل و جگر کو دیکھ جلد دل و جگر میں آ
شرم و حیا کو دور رکھ حسن کو بے نقاب کر — پردۂ رخ اٹھا کبھی دے دل میں پہنچ نظر میں آ
کب سے ترا ہوں منتظر خوب نہیں یہ اجتناب — اے اثرِ وفا و عشق نالۂ بے اثر میں آ
خانہ خرابیوں کے ساتھ خاک اڑا رہا ہوں میں — تو بھی حریمِ حسن سے عشق کی رہ گذر میں آ
پردۂ حسن جان کر گردشِ روزگار کو — شام میں آ سحر میں آ شمس میں آ قمر میں آ
صورتِ اشکِ آرزو دل سے نکل بھی سیلِ غم — ضبط کہاں تک اب کروں آ مری چشم تر میں آ
حسنِ کرشمہ ساز کا میرے لئے یہ حکم ہے — گوشۂ عافیت کو چھوڑ عالمِ شور و شر میں آ
وقت سے پہلے حشر اٹھے بانیٔ حشر کیا ضرور — تجھ کو یہ رائے کس نے دی قامتِ فتنہ گر میں آ

بحرِ وفا و جوششِ غم دونوں ہیں تیرے سامنے
نوحؔ کے آنسوؤں کو جانچ نوحؔ کی چشمِ تر میں آ

شاعر آگرہ کے لئے

ج

جو مرگ و زیست کے جھگڑوں سے بے نیاز رہا — وہ سرفروشِ محبت ہی سرفراز رہا
ہمارے دل میں نہاں دو طرح کا راز رہا — نگاہ باز رہا اور پاکباز رہا
کرم نواز بھی رہ کر ستم نواز رہا — ہزار ناز سے دل میں وہ تیرِ ناز رہا
نیازِ عشق میں حسنِ ادا و ناز رہا — اگر یہ سچ ہے تو محمود بھی ایاز رہا

ادھر اُدھر کے خیالات دل میں آ نہ سکے
نیاز مند ترا سب سے بے نیاز رہا

عیاں ہو رخ سے مرے دل کا درد کیا ممکن
بشکلِ راز رہے گا بشکلِ راز رہا

عجب طرح مری عمرِ دو روزہ ختم ہوئی
حیات و موت میں کچھ بھی نہ امتیاز رہا

یہ جان کر تپِ غم کا علاج سہل نہیں
الگ تھلگ مری بالیں سے چارہ ساز رہا

بشر کی عقل مشیت میں دخل دے نہ سکی
خدا کا راز جو تھا وہ خدا کا راز رہا

حرم سے جاتے ہیں اب رند مے کدے کی طرف
وہاں سر انھیں ہر سجدۂ نماز رہا

بتوں سے عشق کا انجام کار کیا کہئے
یہی سمجھ لو کہ اللہ کارساز رہا

ہوئی جو شام تو پھر شام سے سحر نہ ہوئی
فسانہ میری شبِ ہجر کا دراز رہا

بشر میں دیکھ لیا حسنِ سرمدی جس نے
حقیقتاً وہ بڑا صاحبِ مجاز رہا

بڑے مزے سے بسر ہو گئے شباب کے دن
کہ دل رہا مرے دل میں وہ دل نواز رہا

غریقِ بحرِ محبت جو ہو گیا اے نوح
وہ فکرِ ساحل و کشتی سے بے نیاز رہا

مشاعرہ آگرہ کے لئے

ج

سکونِ طبع کا پہلو سرِ محفل نہیں ملتا
نظر سے وہ نظر ملتی ہے دل سے دل نہیں ملتا

ہمیں سچا کوئی حامیِ دمِ بسمل نہیں ملتا
ملاتے ہیں بہت کچھ پھر بھی اُن کا دل نہیں ملتا

ملے گا رفتہ رفتہ آپ کا دل بھی مرے دل سے
یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ دل سے دل نہیں ملتا

توجہ کچھ تو کی ہوتی مرے حالِ پریشاں پر
تمہاری بے دلی ایسی ہے جس سے دل نہیں ملتا

جہانِ عشق میں دونوں کی صورت ایک ہی ٹھہری
نکل کر دم نہیں آتا بچھڑ کر دل نہیں ملتا

کہیں جا کر بڑی مدت میں دونوں ایک ہوتے ہیں
کسی کے دل سے فوراً ہی کسی کا دل نہیں ملتا

خدا جانے کہاں گم کر دیا قسمت کی گردش نے
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں لیکن دل نہیں ملتا

یہ کہہ کر چل دیئے وہ شکوۂ ترکِ محبت پر
ملیں گے اوپری دل سے ہمارا دل نہیں ملتا

وہ کیا جانے تسلی دے گئے کن خاص لفظوں میں
دماغِ حسن کی صورت مزاجِ دل نہیں ملتا

تڑپنے کا مزا اہلِ محبت ہی اُٹھاتے ہیں
دل آزاروں کو لطفِ اضطرابِ دل نہیں ملتا

وہ کہتے ہیں کہے جاؤ کہے جاؤ
نہیں ملتا نہیں ملتا ہمارا دل نہیں ملتا

کوئی رسماً اگر ملتا رہے تو اس سے کیا حاصل
نہیں ملتا مزا ملنے کا جب تک دل نہیں ملتا

مسرت کی توقع چاہیئے تقدیر والوں کو
ہمیں تو غم بھی حسبِ مدعا اے دل نہیں ملتا

وہی دل تیرے پہلو میں وہی دل میرے پہلو میں
مگر حیرت ہے میرے دل سے تیرا دل نہیں ملتا

جناب نوح شاید موجِ بحرِ عشق لے ڈوبی
کہ طوفانِ غم و حسرت میں اپنا دل نہیں ملتا

طرح یاد نہیں لیکن مشاعرہ کا نسٹہ کانفرنس الہ آباد میں شاطر صاحب کے اہتمام سے ہوا مقامی شعرا کے علاوہ باہر سے بھی بہت سے شعرا آئے اچھے اچھے شعر سنے گئے دس بجے رات سے شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا رمضان شریف کا زمانہ تھا

ج

لطف پورا تو جب آئے مجھے مے خانے کا — دل بھی ساقی کا ملے جوش بھی پیمانے کا
بڑھ گیا اِس سے وقار اور بھی مے خانے کا — آفریں اُس کو ہے موجد تھا جو پیمانے کا
کس قدر پاسِ ادب ہے مجھے مے خانے کا — بے وضو ذکر بھی کرتا نہیں پیمانے کا
مے کشوں پر بھی کھلا راز نہ مے خانے کا — ظرف عالی تھا وہ ساقی ترے پیمانے کا
رہ گئی کیفِ کی دنیا تہ و بالا ہو کر — رُخ اِدھر سے جو اُدھر پھر گیا پیمانے کا
گھونٹ دو گھونٹ میں تحقیر ہے مے خانے کی — دور چلتا رہے چلتے ہوئے پیمانے کا
چھا گئے رند اُبلتے ہوئے مے خانے پر — دیکھ کر رنگ چھلکتے ہوئے پیمانے کا
محفلِ کیف میں تفریق مراتب نہ رہی — جام اک اک کو ملا ایک ہی پیمانے کا
صورتِ شمس و قمر شمس و قمر ہی کی قسم — کوئی مرکز نہیں چلتے ہوئے پیمانے کا
دن بڑے کیف و مسرت میں گذارا میں نے — نام لے کر جو اٹھا صبح کو پیمانے کا
بادہ کش دوڑ کے آنکھوں سے لگاتے لیکن — دَور میں پاؤں نہ ٹھہرا کہیں پیمانے کا
تو نے خاص اپنے لئے جس کو بچا رکھا ہے — میں طلبگار ہوں ساقی اسی پیمانے کا
تذکرے بادۂ پُر جوش کے محدود نہیں — نام مے خانے سے باہر بھی ہے پیمانے کا
اور کیا اپنا پتہ تجھ کو بتاؤں ساقی — نام لیوا ہوں چھلکتے ہوئے پیمانے کا

نوح اک مے کدۂ شعر و سخن ہے یہ غزل
ربط دیکھے کوئی پیمانے سے پیمانے کا

ج

کب راہِ وفا میں آساں ہے غم سہہ لینا یا سہہ جانا — پہلے چلنا چل کر تھکنا تھک کر رُکنا پھر رہ جانا
جو آگ لگی تھی الفت کی کم ہو گئی وہ بالکل نہ بجھی — رونے میں ہمارے اشکوں کا کچھ رہ جانا کچھ بہہ جانا
دم بھر بھی مجھے آرام نہیں اور اس کے سوا کچھ کام نہیں — بے داد تمنا سہہ لینی آزارِ محبت سہہ جانا
ظالم نے عنایت مجھ پر کی لیکن کیسی ملنے کی خوشی — جاتا ہوں نہ اب میں آؤں گا یہ جاتے جاتے کہہ جانا
پہلے تو ذرا خاموش ہوئے بعد اس کے سراپا جوش ہوئے — آئینے میں اُن کا حیرت سے منہ دیکھ کر اپنا رہ جانا
اُن کو یہ گماں مجبوری ہے فریاد سے بھی معذوری ہے — میرا وہ دمِ بے دادِ ستم کچھ سوچ سمجھ کر رہ جانا

دریائے محبت کے ریلے کیوں کر ریلے رکنے دیتے
اے نوحؔ مرے ارمانوں کا طوفانِ الم میں بہہ جانا

طبع زاد

ج

زمانہ مصیبت کا ٹل جائے گا
ڈھلی رات تو دن بھی ڈھل جائے گا

جوانی کے سانچے میں ڈھل جائے گا
لڑکپن کا نقشہ بدل جائے گا

نکل جائے گا دم اس ارمان میں
کہ ارمان دل کا نکل جائے گا

اگر نزع میں بھی وہ آ جائیں گے
مری موت کا وقت ٹل جائے گا

یہی صرف ہوگا مری لاش پر
جو آئے گا وہ ہاتھ مل جائے گا

مرے دل کو جھوٹے دلاسے نہ دو
کوئی دن میں خود ہی بہل جائے گا

جسے قتل ہونے کی ہوگی ہوس
وہاں دوڑ کر سر کے بل جائے گا

یقیں کون کرتا ہے کہتے رہو
مریضِ محبت سنبھل جائے گا

وہ خنجر کے بدلے اٹھائیں نگاہ
مرا کام اس سے بھی چل جائے گا

دلِ زار کی فکر میں کیا کروں
سنبھلنا جو ہوگا سنبھل جائے گا

یہ مانا کہ گھر سے نہ نکلیں گے وہ
مگر نام ان کا نکل جائے گا

ہماری مصیبت کو دیکھے گا کون
جو سن لے گا وہ بھی دہل جائے گا

بھڑکتی رہے گی اگر دل کی آگ
تو کم بخت پہلو بھی جل جائے گا

اٹھائیں گے اے نوحؔ طوفانِ اشک
بخار اپنے دل کا نکل جائے گا

طبع زاد

ج

پھر تو فرمائیے کوئی ہمیں پہچانے کیا
آپ اپنے کو سمجھتے ہیں خدا جانے کیا

ہو جو ان جانِ غمِ عشق کو وہ جانے کیا
عرض کیوں میری سنے بات مری مانے کیا

مجھ کو آغازِ محبت میں وہ پہچانے کیا
جانتے جانتے جانے گا ابھی جانے کیا

مہر ایثارِ کرم آپ کی فطرت میں نہیں
کوئی جانے کوئی مانے کوئی پہچانے کیا

سحر و اعجاز فقط حسنِ تبسم ہی نہیں
آپ کی شوخ نظر بھی ہے خدا جانے کیا

جاؤ بھی جاؤ بھی اے حضرتِ ناصح بس بس
ماننے کی جو نہ ہو کوئی اسے مانے کیا

نگہِ شوق نے دیکھا ہو تو پہچانے بھی
جس کو دیکھا ہی نہ ہو یہ اسے پہچانے کیا

کیا کہا آئیں نہ آئیں یہ خدا ہی جانے
آپ ہی جانیں تو جانیں یہ خدا جانے کیا

شیوۂ مہر و محبت سے خبردار نہیں
صیغۂ لطف و عنایت کو وہ گردانے کیا

چھوڑ کر بت کدہ جاتے نہیں تو گ... اور کہیں
پتھروں میں نظر آتا ہے خدا جانے کیا

بارِ فرقت نہ اُٹھانے کا بنے گا مجرم
جان دینے کی غمِ عشق میں دل ٹھانے کیا

چار چھ روپ نہیں روپ بدلنے والے
سیکڑوں بھیس میں کوئی تجھے پہچانے کیا

جو سمجھتا ہو یہ ہیں نقشِ کفِ پا میرے
حسن میں وہ مہ و خورشید کو گردانے کیا

اب اثر کچھ مری تقدیر کا ہوتا ہی نہیں
کہہ گئے دل سے تصور میں خدا جانے کیا

وہ پیمبر نہیں ہم نامِ پیمبر ہے ضرور
نوح کو آپ سمجھتے ہیں خدا جانے کیا

مشاعرہ کان پور

ج

تمام عمر میں ہم نے یہ ایک کام کیا
کہ زندگی کو ترے عشق میں سلام کیا

یہ اپنے شام کے وعدے کا احترام کیا
دمِ سحر بھی نہ اُس نے خیالِ شام کیا

زبان دی مجھے اور اپنے گھر قیام کیا
وہ کام تم نے کیا کام بھی تمام کیا

وہ بولے عشق سے کیا ہاتھ اُٹھا لیا تم نے
جو میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُنھیں سلام کیا

وہیں وہیں رہِ الفت میں آفتیں آئیں
جہاں جہاں دلِ ناشاد نے قیام کیا

کہا فسانۂ غم اُس نے اختصار کے ساتھ
تمام عمر میں جس نے اُسے تمام کیا

یہ برہمی ہے جو میرے سلام کرنے پر
ترے سلام کو بھی آج سے سلام کیا

پیام بر کسے کہتے ہیں نامہ بر کس کو
جو کچھ کیا وہ مرے جذبِ دل نے کام کیا

خدائی بھر کے ہوئے بندوبست شام و سحر
نہ آئے موت کچھ اس کا بھی انتظام کیا

کسی کے منھ سے شکایت نکل گئی ہوگی
خطا تھی خاص کی اور اُس نے قتلِ عام کیا

اُٹھے تو ہاتھ کسی کے مگر کھلی نہ یہ بات
مرا سلام لیا یا مجھے سلام کیا

خیال زہد کا رندوں کو مے کدے میں نہیں
جو آ گیا تو اُسے بھی سپردِ جام کیا

خدا کی شانِ کریمی کو دیکھنا تھا مجھے
قصور میں نے کیا اور لا کلام کیا

تلاشِ یار میں اتنا بھی ہم کو یاد نہیں
کہاں کہاں گئے کس کس جگہ مقام کیا

جھکا کے آنکھ چرا کر نظر پھرا کر منھ
عجب ادا سے کسی نے مجھے سلام کیا

وہ باز آئیں ستم سے مجھے یقین نہیں
یہی مدام کریں گے یہی مدام کیا

یہ اقتضائے حیا تھا کہ دوسرا نہ سنے
دبی زبان سے اُس نے مجھے سلام کیا

رہِ وفا میں یہ تہذیبِ غم کی شکل رہی
ملے جو خار تو اُن کا بھی احترام کیا

جناب نوح کو طوفان پر نہ فخر ہو کیوں
اسی نے تو انھیں مشہور خاص و عام کیا

طبع زاد ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۰ء

ج

جلوۂ حسنِ یار نے مجھ کو نشاط کر دیا — دامنِ ذوق و شوق کو لطف و کرم سے بھر دیا
کھینچ کر اک شبیہِ ناز حسن کا رنگ بھر دیا — میرے تخیلات نے مجھ کو تباہ کر دیا
دل کا گلہ نہ کیوں کروں دل کا ستم تو دیکھیے — مجھ سے یوں ہی خفا تھے وہ اس نے کچھ اور بھر دیا
فقرۂ حسن و عشق میں رہ گئی یہ بڑی کمی — لفظِ وفا کو آپ نے بیچ سے حذف کر دیا
جامِ نشاط کی ہوس ہم جو کریں تو کیا کریں — شیشۂ دل کو آپ نے بادۂ غم سے بھر دیا
دیکھیے بخت کیا دکھائے ہم سے یہ چوک ہو گئی — حسن کی یادگار میں عشق کا ذکر کر دیا
گوشۂ دل تھا تنگ تر اتنی جگہ نہ تھی مگر — آپ نے کھینچ تان کر خنجرِ ناز بھر دیا
غمزہ و ناز نے ترے جان مری نکال لی — کام نہ کچھ کیا مگر کام تمام کر دیا
حب کا یہ خاص ہے عمل حسنِ اثر میں شک نہیں — نقشِ وفا کو عشق نے خونِ جگر سے بھر دیا
ایک طرف ملال انھیں ایک طرف مرا خیال — دل سے نہ دور کر سکے بزم سے دور کر دیا
اب مجھے کچھ گلہ نہیں تیغِ نگاہِ ناز سے — دیدۂ التفات نے زخمِ جگر کو بھر دیا
اس میں نہ کوئی بات ہو بات یہ پیش آ گئی — پرسشِ بار بار نے مجھ کو خموش کر دیا
دورِ بہار میں یہی بادہ کشوں کا شغل ہے — ایک نے جام بھر لیا ایک نے جام بھر دیا
کثرتِ داغ ہائے دل ایک سے ایک متصل — حسنِ بہارِ عشق نے مجھ کو نہال کر دیا
کوچۂ یار میں جگہ بہرِ مزار مل گئی — ہم نے گڑھے کو کھود کر جسم سے اپنے بھر دیا
شوخ ہے بد خصال ہے نیک ہے خوش خیال ہے — میں نے کسی حسین کو دل کیوں نہ یہ جانچ کر دیا
مٹ گئے سیکڑوں مکیں لٹ گئے سیکڑوں مکاں — خانہ خراب عشق نے گھر نہ کسی کا بھر دیا

بحرِ الم میں ڈوب کر پا گئی ساحلِ نشاط
کشتیِ ذوق و شوق کو نوح نے غرق کر دیا

طبع زاد ۱۹ر جولائی ۱۹۴۲ء

ج

گلہ بھی عشق و وفا کے اثر نے کچھ نہ کیا — جگر میں چبھ گئے ناوک جگر نے کچھ نہ کیا
سوا ستم کے ستمگر نظر نے کچھ نہ کیا — فغاں سے کچھ نہ ہوا اور اثر نے کچھ نہ کیا
دل و جگر کے بھی جذبِ اثر نے کچھ نہ کیا — یہی کیا کہ اچٹتی نظر نے کچھ نہ کیا
نجات روز کی ایذا سے بخش دی مجھ کو — اجل نے یہ بھی کیا چارہ گر نے کچھ نہ کیا

متاعِ تاب و تواں لوٹ لی مرے دل کی
غلط ہے یہ کہ تمھاری نظر نے کچھ نہ کیا

دمِ سحر ہی وہ آتے مگر یہاں آتے
دعائے نیم شبی کے اثر نے کچھ نہ کیا

وہ جانتا تھا کہ مشکل ہے زندگی اِس کی
مرا علاج مرے چارہ گر نے کچھ نہ کیا

بجائے لطف و ترحم نئے ستم نئے جور
یہی کیا تو وفا کے اثر نے کچھ نہ کیا

کسی کا حسن پر انوار دیکھنا تھا اُنھیں
تمام دور میں شمس و قمر نے کچھ نہ کیا

ہزار جور اُٹھائے ہزار جبر سہے
علاوہ صبر کے میرے جگر نے کچھ نہ کیا

سمجھ رہے تھے جسے لوگ راست بازوں میں
کرم اُسی تری سیدھی نظر نے کچھ نہ کیا

وہی ہے دن کی مصیبت وہی ہے رات کا غم
سوادِ شام و نمودِ سحر نے کچھ نہ کیا

طریقِ عشق میں ہم سب سے بے نیاز رہے
سلوکِ نیک کسی ہم سفر نے کچھ نہ کیا

یہ اپنی اپنی پڑی کوچۂ محبت میں
کہ دل کا دھیان ہمارے جگر نے کچھ نہ کیا

اُٹھائے عشق میں طوفاں سیکڑوں اے نوحؔ
جفا کا خوف مری چشمِ تر نے کچھ نہ کیا

طبع زاد ۶ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء

ج

محبت میں روز ایک آزار دیکھا
دکھایا جو دل نے وہ ناچار دیکھا

مری سمت کب تم نے سرکار دیکھا
نہ دیکھا نہ دیکھا نہ زنہار دیکھا

اکیلے وہ کس کس کا درماں کریں گے
محبت میں لاکھوں کو بیمار دیکھا

کبھی جو نہ دیکھا تھا جلوہ کسی کا
اُسے میری آنکھوں نے سو بار دیکھا

وفا کی تمھیں قدر سچ مچ نہیں ہے
سنا تھا جو ہم نے وہ سرکار دیکھا

کسی کا تعلق نہیں اب خدا سے
خدائی کو تیرا پرستار دیکھا

وہ چلتے ہوئے میرے دل کو چُرا کر
نہ بے کار دیکھا نہ باکار دیکھا

لیا کام جب دیدۂ دل سے ہم نے
تو اپنے ہی میں جلوۂ یار دیکھا

نہ میں نے سرِ بام نظریں اُٹھائیں
نہ اُس نے کبھی زیرِ دیوار دیکھا

خدا سے نہیں مانگتے اور کچھ بھی
تمھارا ہی سب کو طلبگار دیکھا

تم آئے تھے کیا دیکھنے پوچھنے کو
نہ پوچھا نہ حالِ دلِ زار دیکھا

ہمیں دور و نزدیک سے کیا غرض تھی
یہی ہے بہت اُن کا دیدار دیکھا

کئی بار کوشش بھی کی دیکھنے کی
مگر اُس کو ہم نے نہ اک بار دیکھا

جہاں تک نظر میں نے ڈالی جہاں پر
مصیبت میں سب کو گرفتار دیکھا

جفا جو قسم ہے تجھے دیکھنے کی ۔۔۔ کوئی تو نے مجھ سا وفادار دیکھا
خدا وہ نہ دشمن کو میرے دکھائے ۔۔۔ جو میں نے مآلِ دلِ زار دیکھا

کہو نوح سے ان ردیفوں کو دیکھیں
کہیں ہو گیا ہو نہ بے کار دیکھا

ب

طبع زاد ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء

ہماری جب ہماری اب ہماری کب سے کیا مطلب ۔۔۔ غرض اُن کو غرض سے کیا غرض مطلب سے کیا مطلب
عزیز و اقربا پر بے سبب وہ ظلم ڈھاتا ہے ۔۔۔ خطا وارِ محبت تو ہمیں ہیں سب سے کیا مطلب
اگر ہم جان دیتے ہیں تو اُن کے حسنِ صورت پر ۔۔۔ ہمیں برتاؤ سے انداز سے یا ڈھب سے کیا مطلب
خدا کا نام بھی لیتے ہوئے ہیں ہچکچاتا ہوں ۔۔۔ وہ پوچھیں گے تمہارا نعرۂ یا رب سے کیا مطلب
وفا میں کیجئے پچھلی جفائیں بھول جائیں گی ۔۔۔ اگر مطلب ہے تو اب سے ہمیں ہے جب سے کیا مطلب
الگ آنا الگ جانا الگ رہنا الگ پھرنا ۔۔۔ رہِ اُلفت میں سب کو ہم سے ہم کو سب سے کیا مطلب
جو مضمونِ خطِ پُر شوق میرا وہ نہیں پڑھتا ۔۔۔ یہ مطلب ہے کہ مجھ کو معنی و مطلب سے کیا مطلب
اگر میں پوچھتا ہوں آپ میرے گھر کب آئیں گے ۔۔۔ تو وہ کہتے ہیں آئیں گے مگر اس کب سے کیا مطلب
نہ مذہب ہے نہ مشرب ہے کوئی ہم بادہ خواروں کا ۔۔۔ ہمیں مشرب سے کیا نسبت ہمیں مذہب سے کیا مطلب
خدا سے حشر میں کہہ دیں گے ہم دنیا کے جھگڑوں پر ۔۔۔ گئی وہ بات جب کے ساتھ جب کی اب سے کیا مطلب
امیر خود غرض ہی کو غرض مطلب سے مطلب ہے ۔۔۔ فقیرِ بے غرض کو ہے غرض مطلب سے کیا مطلب

زمانہ غرقِ بحرِ غم جو ہوتا ہے تو ہونے دو
تم اپنی خیر مانگو نوح تم کو سب سے کیا مطلب

یکم جنوری ۱۹۳۶ء

مجھ کو لحاظِ جرم و خطا اب نہ ہو تو کب ۔۔۔ وقتِ اخیر یادِ خدا اب نہ ہو تو کب
اُن کو خیالِ ناز و ادا اب نہ ہو تو کب ۔۔۔ عہدِ شباب میں بھی جفا اب نہ ہو تو کب
ساقی وہی بہار کا موسم پھر آ گیا ۔۔۔ شغلِ شرابِ صبح و مسا اب نہ ہو تو کب
محشر پہ اٹھ رہی تھی محبت کی چھیڑ چھاڑ ۔۔۔ عہدِ وفا کسی کا وفا اب نہ ہو تو کب
وعدہ کیا تھا رحمتِ پروردگار نے ۔۔۔ عفوِ گناہ روزِ جزا اب نہ ہو تو کب

ساقی کی چشمِ مست بنا ہر گُلِ چمن
کچھ اور رنگ اور فضا اب نہ ہو تو کب

دیتے ہیں وہ دعا بھی برابر دوا کے ساتھ
بیمار درد و غم کو شفا اب نہ ہو تو کب

لاکھوں طرح کے پھول کھلائے بہار نے
داغِ جگر کی نشو و نما اب نہ ہو تو کب

میں کیا بتاؤں کب ہو اگر اب جفا نہ ہو
وہ مجھ سے پوچھتا ہے جفا اب نہ ہو تو کب

آزارِ عشق نے مجھے بخشا کمالِ عشق
ہر آہِ نارسا بھی رسا اب نہ ہو تو کب

اے چشمِ حق نگر ترے ملنے کی دیر تھی
کوئی مجھی میں جلوہ نما اب نہ ہو تو کب

شکووں سے روکنے کا طریقہ بھی خوب تھا
وہ کہہ گئے کہ مشق جفا اب نہ ہو تو کب

یہ سنگِ در ترا ہے یہ میری جبینِ شوق
مجھ سے نمازِ عشق ادا اب نہ ہو تو کب

لطف و نشاط و عیش کی دنیا بدل گئی
آبِ بقا بھی زہرِ فنا اب نہ ہو تو کب

ظالم ترا شباب فسوں گر ترا جمال
سارا زمانہ محو ادا اب نہ ہو تو کب

وہ ہنس رہے ہیں گریۂ بے اختیار پر
طوفانِ اشک نوح بپا اب نہ ہو تو کب

پ

طبع زاد ۱۰ر جون ۱۹۳۱ء

ج

بے سمجھے ہوئے دم نہ ہمارا ابھی بھریں آپ
اندازہ کریں غور کریں جانچ کریں آپ

یہ میں نہیں کہتا نہ مجھے قتل کریں آپ
پہلے مرے سر پر کوئی الزام دھریں آپ

بہتر ہے یہی حال رہے خانۂ دل کا
آباد کروں میں اسے برباد کریں آپ

مظلوم کی فریاد الٹ دے گی زمانہ
دنیا سے ڈریں یا نہ ڈریں اس سے ڈریں آپ

کیا خوب یہ انصافِ محبت نظر آیا
بدنام تو ہو چرخ مگر ظلم کریں آپ

کس واسطے دیکھیں کسی سفاک کا رستہ
جن کو نہ ہو جینے کی تمنا وہ مریں آپ

کہنا تھا مجھے کچھ مگر اس واسطے چپ ہوں
ممکن ہے کہ منظور کریں یا نہ کریں آپ

اربابِ محبت کی خبر وہ نہیں لیتے
یہ اپنے مقدر سے جئیں آپ مریں آپ

کیوں لاؤں زباں پر غم و آزار کا شکوہ
ڈرتا ہوں کہیں ترکِ ستم بھی نہ کریں آپ

آئیں گے مگر آئیں گے کس روز مرے گھر
للہ اس اجمال کی تفصیل کریں آپ

شاید ہے یہی شوخیِ رفتار کا مطلب
برپا ہو وہیں حشر جہاں پانو دھریں آپ

یہ لطف و عنایت کی جگہ قہر و ستم کیوں
میں اُن سے یہ کہتا ہوں بس اب جی نہیں سکتا
پھر جذبِ دلِ زار میں شک رہ نہیں جاتا

کچھ بھی نہ کریں آپ تو کچھ بھی نہ کریں آپ
وہ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہیں جلد مریں آپ
تاثیرِ محبت کو جو تسلیم کریں آپ

وہ نوحؔ سے فرماتے ہیں اشکوں کی قسم ہے
طوفان اُٹھانے کا ارادہ نہ کریں آپ

ت

طبع زاد ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۲۲ء

واہ یہ لطفِ سوزِ الفت کس کی بدولت دل کی بدولت
دل میں ہے داغوں کی کثرت کس کی بدولت دل کی بدولت
سب سے الفت سب کی حسرت کس کی بدولت دل کی بدولت
پیشِ نظر رہتے ہیں باہم پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم
اُن کو بھی ہے میرا سودا اور مجھے بھی سودا اُن کا
دیکھ لیا کرتا ہوں اکثر یہ بھی عالم وہ بھی منظر
کرتا ہوں میں اپنا ماتم آتی ہے الفت میں پیہم
میں جو نہ بزمِ ناز میں جاتا کیوں غمزہ مجھ کو تڑپاتا
اہلِ وفا نے مجھ کو جانا اہلِ جفا نے بھی پہچانا
کیا ہو قصد نکل جانے کا گھر پایا کمرا بشاد ہے کیا کیا
اکثر مٹنا اکثر ابھرنا اکثر جینا اکثر مرنا

ج

دوزخ بھی ہے مجھ کو جنت کس کی بدولت دل کی بدولت
ایسی دولت اتنی دولت کس کی بدولت دل کی بدولت
ڈانواں ڈول ہے میری نیت کس کی بدولت دل کی بدولت
حسنِ کثرت نورِ وحدت کس کی بدولت دل کی بدولت
ایک ہوئی دونوں کی صورت کس کی بدولت دل کی بدولت
شامِ فرقت صبحِ قیامت کس کی بدولت دل کی بدولت
کس پر آفت مجھ پر آفت کس کی بدولت دل کی بدولت
ہنستے بولتے آگئی شامت کس کی بدولت دل کی بدولت
یہ ہے عزت یہ ہے شہرت کس کی بدولت دل کی بدولت
ارماں ارماں حسرت حسرت کس کی بدولت دل کی بدولت
رہتی ہے یہ میری صورت کس کی بدولت دل کی بدولت

اُٹھتے بیٹھتے رونا دھونا اشکوں سے دنیا کو ڈبونا
نوحؔ یہ ہے طوفان کی شدت کس کی بدولت دل کی بدولت

ٹ

طبع زاد ۲۴ اگست سنہ ۱۹۳۱ء

کوئی اُس ستمگر کو آگاہ کر دے کہ باز آئے آزار دینے سے جھٹ پٹ
کبھی پردہ داری کبھی خود نمائی کبھی کچھ رکاوٹ کبھی کچھ لگاوٹ

ج

اِدھر کی اُدھر آج ہوتی ہے دنیا مریضِ محبت بدلتا ہے کروٹ
تمھاری یہ چاروں ادائیں غضب ہیں یہ چاروں کریں گی ہزاروں کی چوپٹ

قیامت نہ اُٹھے کہ اُٹھے جہاں میں مگر بالیقیں ہے تو اُٹھوں گا جھٹ پٹ
کوئی کس طرح اِس کو تسلیم کر لے کہ دونوں اکیلے بسر کر رہے ہیں
خدا جانے آپس میں کیا پیش آئے یہ تاخیر و تعجیل کیا رنگ لائے
کہاں لطفِ بزمِ مسرت اٹھایا کہاں دور پر کیف گذرے نظر سے
اُدھر وہ بھی سرگرمِ ظلم و جفا ہے اِدھر ہم بھی مصروفِ آہ و بکا ہیں
یہ کیوں ہے تامل یہ کیوں ہے توقف یہ انکار کیا ہے یہ اغماض کیا ہے
بہت کچھ چھپایا بہت کچھ بچایا مگر پیش بندی نہ کچھ کام آئی
محبت میں یہ جھڑکیاں بھی عبث ہیں یہ فرقت کی دھمکیاں بھی عبث ہیں
بیانِ تمنا سنا اور سن کر بڑی دیر سے غور فرما رہے ہیں
ستم بھی اٹھائے ہزاروں طرح کے بلائیں بھی جھیلیں ہزاروں طرح کی
ترے عشق میں کھینچ نہ میں دل کو دوں کیوں جگر کے لیے کیوں نہ آہ کھینچوں
ہما غیرتِ آئینہ دل ہمارا غبار آئے کیوں کر کدورت رہے کیا
محبت کے رستے میں اے شوقِ منزل ملے گا عجب لطف پائے طلب کو
ترے عشق میں چین سے کیا رہوں میں ترے عشق نے دی نہ چین مجھ کو

تہِ قبر جس وقت مجھ کو ملے گی ہر قبر کچھ اُن کے قدموں کی آہٹ
ترے گرد تیری اداؤں کا مجمع مری حسرتوں کا مرے پاس جمگھٹ
ہمارا ارادہ کہ فوراً نہ دیں دل تمھاری تمنا کہ مل جائے جھٹ پٹ
مے ناب اور وں کے حصے میں آئی ہمارے مقدر میں تھی صرف تلچھٹ
کہیں بڑھتے بڑھتے نہ بڑھ جائے جھگڑا کہیں ہم سے ہوتے نہ ہو جائے کھٹ پٹ
لڑا دو بھی آنکھیں ملا دو بھی نظریں دکھا دو بھی مکھڑا اُٹھا دو بھی گھونگھٹ
کیے خنجرِ ناز نے چار ٹکڑے بالآخر ہوا دل محبت میں چوپٹ
کرم ہو کہ مجھ پر ستم ہو تمھارا نہ اُٹھوں گا در سے نہ چھوڑوں گا چوکھٹ
نہ آئیں گے یا میرے گھر آ ہی گئے تو جو ہونا ہوا ہو ارشاد ہو جائے جھٹ پٹ
ہوا تجربہ ہم کو یہ دل لگا کر حسینوں سے دل کا لگانا ہے جھنجھٹ
شب و روز کی مختلف آفتوں نے اسے کر دیا چیت اُسے کر دیا پٹ
مثل ہے وہ خس کم جہاں پاک والی نہ اس گھر میں کوڑا نہ اس گھر میں کرکٹ
اُدھر خار ہیں اور اِدھر آبلے ہیں اگر بند زباں ہیں تو یہ ہیں منھ پھٹ
نظر کا پلٹنا زباں کا بدلنا مقدر کی گردش زمانے کی کروٹ

یہ اے نوح کس نے تمھیں رائے دی تھی کہ طوفان اٹھاؤ زمیں دار ہو کر
اب اچھا تماشا نظر آ رہا ہے تہِ آب کھاتا ہے سر آب کھیوٹ

ث

طبع زاد ۲۲ مارچ ۱۹۳۷ء

ج

جو عندلیب کو اپنے کرے ملول عبث — ہزار کچھ ہو مگر پھر بھی ہے وہ پھول عبث
تمھارے حسن کے جلوے کہیں سما نہ سکے — یہ فوق و تحت ہیں بے کار عرض و طول عبث
ہزار کوس رہی دور منزلِ مقصود — اُڑائی وادیِ غربت کی ہم نے دھول عبث
جو آتے آتے وہ آئے تو آئے وقتِ سحر — دعائے نیم شبی اب ہوئی قبول عبث
ریاضِ دہر کو دیکھیں بنگاہِ غور سے ہم — نہ ایک خار عبث ہے نہ ایک پھول عبث
وہ اضطراب محبت کا لطف رہ نہ گیا — ہماری عرضِ تمنا ہوئی قبول عبث
تلافیِ ستمِ بے حساب ایک نگاہ — ذرا سی یاد ہے کافی بہت سی بھول عبث

وہ کہہ رہا ہے کہو جلد اختصار کے ساتھ
بیانِ شوق کو ہم دے رہے ہیں طول عبث

بہار کیا چمنِ بے ثباتِ عالم کی
کہ پھول پھول یہ کہتا ہے تو نہ پھول عبث

ستم کے شکوہ پر اُس نے کہا درست بجا
کرم کے ذکر پر اُس نے کہا فضول عبث

خزاں نے لوٹ لیا برق نے تباہ کیا
کھلے تھے باغ میں دو دن کو چار پھول عبث

ہم اُن کی یاد میں سارے جہاں کو بھول گئے
نہ اپنی یاد عبث ہے نہ اپنی بھول عبث

ہمیں یہ فخر کہ اپنا دل اُن کو سونپ دیا
انھیں یہ سوچ کہ ہم نے کیا قبول عبث

وہ بحرِ عشق کی موجوں کی قدر کیا جانیں
جو بیٹھ کر لبِ ساحل اُڑائیں دھول عبث

ستم کے بعد پشیمانیِ ستم کیسی
ملول کر کے مجھے تم ہوئے ملول عبث

بگڑ گئے جو گھروندے نقوشِ ہستی کے
بٹھا رہے ہیں بشر اُن کی چول چول عبث

وہ ہے مناسبِ بہتر جو شعر آپ اٹھائیں
جنابِ نوح کا طوفانِ بے اصول عبث

ج

طبع زاد ۱۰ / جون ۱۹۳۱ء

مہرباں کل تھے بدگماں ہیں آج۔ تم نے پایا عجب طرح کا مزاج
کچھ اِدھر شوخیاں اُدھر کچھ لاج۔ خوب دستور ہے یہ خوب رواج

پھر تو ہم اپنی جان نہ دیں۔ سعی سے اِس کی لوگ باز نہیں
دفترِ کائناتِ قدرت میں۔ کیسا ادخال اور کیا اخراج

رسمِ الفت نباہنی مشکل۔ باہمی ارتباط لاحاصل
شوخ طینت اِدھر ہمارا دل۔ اور اُدھر دلربا بھی شوخ مزاج

کوچۂ یار میں کروں پھیرا۔ محفلِ ناز میں کروں ڈیرا
بس یہی کام کاج ہے میرا۔ اور کوئی نہ مجھ کو کام نہ کاج

چین لیتا نہیں دلِ مضطر۔ ہو ذرا مہربانیوں کی نظر
اے مرے مونس اے مرے یاور۔ اے مرے مالک اے مرے سرتاج

حوصلے دل کے سب نکل جاتے۔ اِتنی زحمت گوارا فرماتے
پاس میرے کبھی چلے آتے۔ دور ہی سے وہ پوچھتے ہیں مزاج

اہلِ جوہر میں کیا ہو ربطِ بہم۔ آپ وہ ہیں کوئی سوا کوئی کم
لعل کے آگے کچھ نہیں نیلم۔ آگے نیلم کے کچھ نہیں پکھراج

سیکڑوں قسم کے ستم سہئے۔ کچھ نہ اپنی زبان سے کہئے
رات دن بے قرار ہی رہئے۔ عشق کا ہے یہی قدیم رواج

دردِ الفت کبھی ہوا نہ خفیف۔ کیا کرے ضبط آہ ایک نحیف
کل بھی پرسوں سے بیش تر تکلیف۔ کل سے تکلیف ہے زیادہ آج

حوصلے دل ہی میں مٹ گئے دل کے۔ دل کے ارمان چل دئے دل سے
کیا سمجھ کر غمِ محبت نے۔ اس بھرے گھر کو کر دیا تاراج

عشق میں کب ہوئی کسی کو شفا۔ چارہ سازی سے بڑھ گئی ایذا
کر رہا ہے جو دردِ دل کی دوا۔ عقل کا اپنی خود کرے وہ علاج

آپ کی انجمن میں شام و سحر۔ دیکھتے ہیں جو عاشقِ مضطر
نہیں آتا کہیں کسی کو نظر۔ وہ طریقہ وہ ضابطہ وہ رواج

شکوۂ رنج و غم سے کام نہ لیں۔ سر پہ آفت جو آئے اُس کو سہیں
اللہ اللہ احتشامِ چمن۔ تختِ طاؤس تختۂ گلشن
خلق میں ہم نے اور کیا دیکھا۔ اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا
روز و شب کثرتِ جفا و ستم۔ وہی آفت وہی غضب ہر دم
ہاتفِ غیب کہہ رہا ہے سنبھل۔ لطفِ ماضی کے واسطے نہ مچل
مثلِ فرہاد و صورتِ وامق۔ جو ہے ذوق و شوق میں صادق

گھر کریں آپ کیا نگاہوں میں۔ یہی اہلِ وفا کی ہے معراج
ساز و سامانِ نرگس و سوسن۔ اس طرح پھول جیسے شاہی تاج
حسن والوں کی ایک سمت سبھا۔ عشق والوں کی ایک سمت سماج
میری جانب کرم و نگاہِ کرم۔ ہوں نگاہِ کرم کا میں محتاج
کل باتیں وہ ختم ہو گئیں کل۔ آج کا حال دیکھ غور سے آج
خاک میں مل گئے وہ سب عاشق۔ نہ ملا پھر بھی ایک شوخ مزاج

نوح سیلابِ اشک کا ہیجان۔ پھیلتے پھیلتے بنا طوفان
بہ گئے اس کے ویں سب ایمان۔ رکھ لی اللہ نے تمہاری لاج

چ

طبع زاد ۱۵ ستمبر ۱۹۳۱ء

جب نہ ساقی ہو تو ہے پیمانہ ہیچ ‖ صرف پیمانہ ہی کیا ہے مے خانہ ہیچ
آپ کہتے ہیں کہ ہے ویرانہ ہیچ ‖ مطلب اس کا یہ ہوا دیوانہ ہیچ
جان دے کر بھی بہت ہوں منفعل ‖ حسن کے آگے یہ ہے نذرانہ ہیچ
گھر کو ان سے ان کو گھر سے کیا غرض ‖ اہلِ وحشت کے لئے کاشانہ ہیچ
جو ملے مانگے سے وہ کیسی شراب ‖ جو نہ چھلکے خود وہ ہے پیمانہ ہیچ
عشق میں فہم و خرد کا ذکر کیا ‖ جانتا ہے ان کو ہر دیوانہ ہیچ
اہلِ باطن کیوں کہیں جانے لگے ‖ دل کے آگے کعبہ و بتخانہ ہیچ
چاہئے تو پھر ہمیشہ چاہئے ‖ چار دن کے واسطے یارانہ ہیچ
تم نے مجھ کو داخلِ زنداں کیا ‖ اس لئے زنداں سے ہے کاشانہ ہیچ
شمع سے بلبل کو ہے کیا واسطہ ‖ جانتا ہے پھول کو پروانہ ہیچ
احترامِ حسن کرنا چاہئے ‖ عشق میں اطوارِ گستاخانہ ہیچ
موسمِ گل جب نہیں تو لطف کیا ‖ آرزوئے شیشہ و پیمانہ ہیچ
عشق میں ہے کام استقلال سے ‖ خودکشی اے ہمتِ مردانہ ہیچ
رند ایسی بات سن سکتے نہیں ‖ کیوں کہے کوئی کہ ہے مے خانہ ہیچ
دل لگا کر جان دی ہیں نے مگر ‖ جرم کے آگے ہے یہ جرمانہ ہیچ

نوحؔ اپنے نام کی عزت کرو
یہ تمھارا مشربِ رندانہ ہیچ

ح

طبع زاد ۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء

کوئی بے دیکھے ہوئے تسلیم کر لے کس طرح
اس طرح دل میں ہے الفت گل میں نکہت جس طرح

دیر و مسجد میں بسر کرتے ہیں اپنی کس طرح
اُس جگہ ہم اُس طرح اور اِس طرف ہم اس طرح

چرخ دشمن اس قدر قسمت مخالف اس طرح
بے وفا کا حال کہئے بے وفا سے کس طرح

سانس لینے پر کھٹکتی ہے کوئی شے کس طرح
رہ گئی ہو نوکِ نشتر دل میں چبھ کر کس طرح

کون دل ہے کون ناوک کچھ پتا چلتا نہیں
رفتہ رفتہ مل گئے آپس میں دونوں اِس طرح

خیر جو ہونی تھی اب تو وہ خطا ہو ہی گئی
دل ہمارا پھیر دو اُن سے کہیں یہ کس طرح

کیا دلِ گم گشتہ کے حالات پوچھیں اُن سے ہم
جیسے واقف ہی نہ ہوں چپ ہو گئے وہ اِس طرح

گو مرے ارمان ہیں لیکن مرے بس میں نہیں
تم نکالو تو نکالو میں نکالوں کس طرح

اے شبیہِ یار خاموشی کی حد بھی ہے کوئی
مجھ سے تو ہنس بول اب ہنس بول چاہے جس طرح

وہ بلا بھیجیں مجھے تشریف لائیں میرے پاس
دو ہی شکلیں زیست کی ہیں اُس طرح یا اِس طرح

تھے ہمارے دل میں لاکھوں نشترِ غم خارِ عشق
آپ آئے آپ بیٹھے آپ ٹھہرے کس طرح

غم نہیں اس کا جو گذری عیش میں یاروں کی عمر
ختم کر ڈالوں گا میں بھی ختم ہو گی جس طرح

کیا ضرورت ظلم کی جب لطف سے چل جائے کام
اُس طرح دل کو نہ لوٹو بلکہ لوٹو اِس طرح

واقعاتِ غم سے مجھ کو اور بھی ہوتا ہے غم
مل گیا میں خاک میں اب یہ نہ پوچھو کس طرح

رُخ پر اُس نے ڈال کر چہرے سے سرکائی نقاب
چاند ڈوبا اس طرح خورشید ڈوبا اِس طرح

التجاؤں سے خوشامد سے بیانِ حال سے
میں انھیں راضی کروں گا ہوں گے راضی جس طرح

کس طرح تم نے لیا دل میں یہ پوچھوں بار بار
اور وہ ہر بار دل لے کر بتائیں اس طرح

مجھ کو مرنے سے غرض قربان ہو جانے سے کام
اُس طرح میں جان دے دوں آپ کہہ دیں جس طرح

چارہ گو خوش ہم نے رکھا چارے سے خوش ہم رہے
چار دن کی زندگی اپنی گذاری اِس طرح

چھوڑ کر تم دریائے غم میں نوحؔ چلتے ہو گئے
ساحلِ مقصد کو پہنچے گا یہ بیڑا کس طرح

خ

طبع زاد ۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۱ء

کب اہلِ عشق تمھارے تھے اِس قدر گستاخ | ج | انھیں تمھیں نے کیا چھیڑ چھیڑ کر گستاخ
بہم یہ جمع ہوئے خوب اِدھر اُدھر گستاخ | کہ دل بھی میرا ہے تیری بھی ہے نظر گستاخ
ہمیں ملا بھی تو معشوق کس طرح کا ملا | جفا پسند بد اخلاق فتنہ گر گستاخ
ہم اپنے دل سے محبت میں بے خبر نہ رہیں | کہ ہے بہت کسی گستاخ کی نظر گستاخ
کسی نے مجھ کو رُلایا کوئی ہنسا مجھ پہ | جو تو ہوا تو ہوا تیرا گھر کا گھر گستاخ
کہا تھا میں نے کہ دل کو سزائیں آپ نہ دیں | یہ پیش تر سے ہوا اور بیش تر گستاخ
ادب سے کام وہ لیتے نہیں سرِ محفل | یونہیں ہو اور کوئی دوسرا اگر گستاخ
ہم اور ذکرِ محبت دل اور شکوۂ غم | خموشیوں نے تمھاری کیا مگر گستاخ
مجھے جواب یہ قبل از سوال دینے لگا | اب اِس سے ہوگا سوا کیا پیام بر گستاخ
دل و نظر کو لحاظ و حیا سے کیا مطلب | یہ بے ادب ہے سراسر وہ سر بسر گستاخ
کبھی کبھی جو تری شرمگیں نگاہ ملے | تو میں بناؤں اُسے چھیڑ چھیڑ کر گستاخ
یہ تجربے نے بتایا یہ عادتوں سے کھلا | وہ جس قدر ہے مہذّب اُسی قدر گستاخ

کہیں تمھیں بھی ڈبو دے نہ بحرِ الفت میں
بہت ہے نوح کا طوفانِ چشمِ تر گستاخ

د

۱۰ر اگست ۱۹۲۳ء

ملا بھی حشر کا موقع جو انتظار کے بعد | ج | مری پکار ہوئی آپ کی پکار کے بعد
پسِ نشاط ملے غم نہ کس لیے مجھ کو | خزاں بھی گلشنِ عالم میں ہے بہار کے بعد
جمالِ یار کا عالم یہ ہے کہ عالم ہے | وہی سنگھار سے پہلے وہی سنگھار کے بعد
جو موت آگئی تو خلد مجھ سے دور نہیں | کروں گا اُس کا نظارہ بھی کوئے یار کے بعد
مرا مزار مرے بعد وہ مٹاتے ہیں | مگر مٹائیں گے کیا اب مرے مزار کے بعد
ادا نے دل بھی لیا ناز نے جگر بھی لیا | بچا ہی کیا مرے پہلو میں لوٹ مار کے بعد

الم کے بعد خوشی کا نزول ہوتا ہے
خدا سکون ہمیں دے گا اضطرار کے بعد

جگر کے زخم سے کیوں کر بہے نہ خونِ جگر
اسی کی دھوم ہے اب چشمِ اشکبار کے بعد

مٹا دے دل کدورت کہ دل منوّر ہے
نکل ہی آئے گا خورشید اس غبار کے بعد

ابھی تو یہ ہے کہ ڈھائیں گے تین چار ستم
ستم کریں گے ہزاروں وہ تین چار کے بعد

جمالِ شمس و قمر لاکھ بار دیکھ چکے
ہے وہ بھی حسن مگر حسنِ روئے یار کے بعد

فقط بہار میں پیتے ہیں ہم نہیں پیتے
کبھی بہار سے پہلے کبھی بہار کے بعد

ہزار تک وہ مجھے بدعائیں دیتے ہیں
شروع ایک سے کرتے ہیں پھر ہزار کے بعد

بچے گی جانِ حزیں تیغِ ناز سے کب تک
وہ سانس دیکھتے ہیں ایک ایک وار کے بعد

عجب نہیں مجھے مر کر حیاتِ عشق ملے
وہ میرے دل میں رہیں میری جانِ زار کے بعد

وہ اضطراب ہے اچھا جو ہو سکون کے قبل
وہ اضطرار بُرا ہے جو ہو قرار کے بعد

ابھی وہ نوحؔ کی وقعت کریں کریں نہ کریں
پتہ چلے گا اُنھیں اس وفا شعار کے بعد

طبع زاد ۳۰ر اگست ۱۹۳۳ء

ج

فروغِ حسن میں کیا ہے ثباتِ دل کا وجود
وہ آفتاب یہ شبنم وہ آگ یہ بارود

زہے مدارجِ عرفان و لطفِ بزمِ شہود
ہمیں ہیں عبد ہمیں عبدیت ہمیں معبود

وہ بار بار محبت سے ذکرِ خیر کریں
شہیدِ غم کی یہی فاتحہ یہی ہے درود

سوادِ شامِ محبت ہے دودِ بے آتش
طلوعِ صبحِ تمنا ہے آتشِ بے دود

بلطف و عیش و نشاطِ جہاں مشو نازاں
دریں سرائے عدم آشنا چہ ہست و چہ بود

نگاہِ ناز کے جوہر یہ پائے کیا ممکن
فغاں بھی تیغ ہے لیکن ہے تیغِ زنگ آلود

اُٹھی گھٹا کی طرح چھا گئی فضا کی طرح
حدودِ حسن میں تاثیرِ عشقِ نا محدود

خدا کے جلوۂ قدرت کا پوچھنا کیا ہے
جدھر جدھر نظر اُٹھی اُدھر اُدھر موجود

طریقِ عشق میں کیوں بارِ غم اُٹھائے نہ دل
اِسی پہاڑ کے نیچے ہے منزلِ مقصود

تلے ہیں پھر مہ و انجم مجھے ستانے پر
دلِ حزیں وہی اک نالۂ فلک پیمود

غضب ہوا کہ مقدر نے مجھے وہاں لایا
جہاں سکون بھی ناپید لطف بھی مفقود

رہا یہ اپنی حیات و ممات کا عالم
کبھی وجود عدم تھا کبھی عدم تھا وجود

نگاہِ ناز میں دل کا کچھ اقتدار نہیں
اگر ابھی ہے یہ مقبول تو ابھی مردود

حواس و ہوش فرشتوں کے جس سے رہ نہ سکیں
فضا میں گونج رہا ہے وہ نغمۂ داؤد

بڑھائے وادیِ حسرت میں کیا قدم کوئی
کہ خضرِ راہ بھی گم اور راہ بھی مسدود

فروغِ حسنِ تغیر پسند کچھ بھی نہیں
ضیائے کرمکِ شب تاب کی ہے کوئی نمود

یہاں ادائے فرائض کی صورتیں ہیں جدا
نمازِ عشق میں واجب نہیں رکوع و سجود

پیامِ مرگ بھی پہنچا نویدِ زیست کے ساتھ
جو اتفاق سے امرت ملا تو زہر آلود

وفاؤ عشق کی دشواریاں خدا کی پناہ
عجب عجب ہیں شرائط عجب عجب ہیں قیود

تصرفاتِ محبت کے سب کرشمے ہیں
نہیں تو کیوں ہو تصدق ایازؔ بر محمود

عدم سے آئے تھے ہم اور پھر عدم کو گئے
یہ ہے حقیقتِ قبل از وجود و بعدِ وجود

ترا قلق بھی ترا درد بھی ترا غم بھی
ہمارے عشق کے اتنے گواہ ہیں موجود

خدا کرے کہ نہ دعوے کریں خدائی کا
سنا تو ہوگا بتوں نے نتیجۂ نمرود

بشر کو قوتِ احساس نے خراب کیا
جو یہ نہ ہو تو جہاں میں نہ پھر زیاں ہے نہ سود

رہِ طلب میں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
سنبھال یا مرے اللہ یا مرے معبود

نگاہ کرد ز قہر و عتاب فتنہ گرے
بایں توقفِ اندک حواس و ہوش ربود

جمالِ شاہدِ مطلق سے جس کو مطلب ہے
وہ دل سعید نظر اسعد آرزو مسعود

جنابِ نوحؑ کو طوفانِ غم سے خوف نہیں
کہ اختیار میں ان کے ہے کشتیِ مقصود

طبع زاد ۳۱ر اگست ۱۹۳۶ء

ج

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد
ملی زندگی مجھ کو مرنے کے بعد

ہوا یہ اثر میرے مرنے کے بعد
وہ رو یا کئے دفن کرنے کے بعد

رہا زندہ در گور مرنے سے قبل
خدا جانے کیا ہوگا مرنے کے بعد

مدد ایک کی ایک کو چاہیئے
دعا بھی کروں آہ کرنے کے بعد

ترے عشق کا خاتمہ ہو گیا
مرے کون اب میرے مرنے کے بعد

ابھی اس قیامت کو میں کیا کہوں
جو گذرے گی جی سے گذرنے کے بعد

عیادت کہوں یا اسے تعزیت
اب آیا کوئی میرے مرنے کے بعد

زمیں پر قدم پہلے رکھتے نہ تھے
اب اڑنے لگے تم سنورنے کے بعد

وہ ٹھکرا رہے ہیں مری لاش کیوں
دوبارا جیا کون مرنے کے بعد

جو ہم ہیں وہ تم ہو جو تم ہو وہ ہم
کھلا راز یہ غور کرنے کے بعد

مری قبر پر رونے آئے گا کون
بھلا دیں گے سب مجھ کو مرنے کے بعد

جو میت ہوئی غرقِ دریائے عشق — کنارے لگی وہ ابھرنے کے بعد
پرستارِ الفت کو چین آئے گا — نہ مرنے سے پہلے نہ مرنے کے بعد
پشیماں ہوئے بھی تو کیا فائدہ — وہ عہدِ وفا سے مکرنے کے بعد

جو طوفانِ غم سے ملی مخلصی
تو اے نوح کب ڈوب مرنے کے بعد

دل بھی ہے دولت مگر درد آشنا ہونے کے بعد

اسی طرح ۲۳ر جنوری ۱۹۴۳ء کو زیر صدارت جناب گلشن صاحب پنڈت برج نراین گرٹو صاحب ایڈوکیٹ نے الہ آباد میں ایک خاص مشاعرہ کیا منتخب شعرا نے شرکت کی حکام ہائی کورٹ کے علاوہ جناب سر تیج بہادر صاحب سپرو وغیرہ بھی تشریف فرما رہے بعد ختم مشاعرہ ٹی پارٹی ہوئی چار گھنٹے تک مشاعرہ قائم رہا اچھے اچھے شعر پڑھے گئے

ج

مجھ کو آجائے قضا بے آسرا ہونے کے بعد — یہ دعا بھی ہو سنا عشق ادا ہونے کے بعد
اب کھلا رازِ محبت مبتلا ہونے کے بعد — کیا خبر تھی پیش تر کیا ہوگا کیا ہونے کے بعد
وہ خدائی کر رہے تھے جب خدا ہونے سے قبل — تو خدا جانے کریں گے کیا خدا ہونے کے بعد
اب زمانے میں کوئی کرتا نہیں الفت کا ذکر — ہوگئی وہ بھی فنا میرے فنا ہونے کے بعد
خلق ہونے ہی نے مجھ کو کر دیا رسوائے خلق — کچھ نہ ہونے میں مزا تھا کچھ نہ تھا ہونے کے بعد
ہم نہ تھے دنیا میں پہلے قائلِ تاثیرِ حسن — کھل گئیں آنکھیں مگر محوِ ادا ہونے کے بعد
اے دلِ مضطر حسیں رہتے نہیں پابندِ وضع — مہرباں ہوگا کسی دن وہ خفا ہونے کے بعد
اُن کی محفل میں وہ میرا اشتیاق و اضطراب — سامنا ہونے سے پہلے سامنا ہونے کے بعد
گھر پہنچ کر بھول جاؤ گے مجھے تم بالضرور — کون کس کو یاد کرتا ہے جدا ہونے کے بعد
فہمِ انسانی میں آسکتے نہیں اسرارِ غیب — جو ہوا وہ ہوگیا کیا ہوگا کیا ہونے کے بعد
بڑھ گیا میری پرستش سے حسینوں کا وقار — اب خدائی بھی کریں گے یہ خدا ہونے کے بعد
آپ تو آنکھیں دکھا کر جا چھپے آنکھوں سے دور — اُف وہ میری بے کسی بے آسرا ہونے کے بعد
دل لگانے ہی سے پہلے کیا نشاط و غم کی بحث — مرحلے یہ ہوں گے طے اُن پر فدا ہونے کے بعد
تم نے ڈالی یا نہ ڈالی کچھ توجہ کی نگاہ — جا پہنچتا ہوں میں یہ سرگرمِ وفا ہونے کے بعد
اُن کو بے دیکھے پڑھا جب اس قدر ہیجانِ شوق — کیا ہمارا حشر ہوگا سامنا ہونے کے بعد
قیدِ غم سے چھوٹ کر بھی چھوٹ جانا تھا محال — پھنس گئے دامِ وفا میں ہم رہا ہونے کے بعد
رفتہ رفتہ دل نے بھی یہ کیا یوں انقلاب — جس طرح کوئی پرانا ہو نیا ہونے کے بعد

نوح طوفانی کو اب آتا نہیں لطفِ گناہ
با خدا بھی ہوگئے یہ نا خدا ہونے کے بعد

ڈ

۵/ جنوری ۱۹۲۳ء

دل ستانی دل ربائی پر گھمنڈ
آپ کو ہے خوش ادائی پر گھمنڈ

جانتا ہوں اس کا بہنا ہے محال
کیا ثمروں میں ہیں پارسائی پر گھمنڈ

ناز ہے قاتل کو اپنی تیغ پر
تیغ کو ہے کج ادائی پر گھمنڈ

رحم اُن کو حالِ غم پر آگیا
دل کرے بے دست و پائی پر گھمنڈ

عاصیوں کو رحمتِ حق پر غرور
زاہدوں کو جبہہ سائی پر گھمنڈ

گفتگو بھی مجھ سے تم کرتے نہیں
اس قدر اس خوش ادائی پر گھمنڈ

پردہ در پر کسی کو ناز ہے
ہم کو نظروں کی رسائی پر گھمنڈ

اب انھیں ہے دل نوازی کا خیال
تھا جنھیں تیغ آزمائی پر گھمنڈ

پھر گرفتارِ قفس ہو جاؤں گا
ہے عبث مجھ کو رہائی پر گھمنڈ

ہو گیا جس کے سبب سے میں اسیر
تھا مجھے اس خوش نوائی پر گھمنڈ

غرق کر دے گا انھیں طوفانِ عشق
نوح کو ہے ناخدائی پر گھمنڈ

ذ

طبع زاد ۲۰/ اگست ۱۹۳۲ء

آپ کے دل کا مرے دل کا نفاذ
کیا کرے مقتول و قاتل کا نفاذ

پھر گیا مجھ کو زباں دے کر کوئی
کھل گیا یوں اوپری دل کا نفاذ

جادۂ عشق و وفا میں چاہیے
رہ روؤں پر شوقِ منزل کا نفاذ

مر گئے لاکھوں گلا خود کاٹ کر
اللہ اللہ تیغِ قاتل کا نفاذ

ہم نے پایا ہم نے دیکھا جا بجا
عشقِ صادق حسنِ کامل کا نفاذ

پھر گئے ناوک بھی اُن کے دیکھ کر
میرے دل میں حسرتِ دل کا نفاذ

پہلے دیکھ آئینہ اسے آئینہ رو
جا بجا پھر مدِ مقابل کا نفاذ

پانو رکھنا مجھ کو مشکل ہو گیا
تھا یہ حکمِ میرِ محفل کا نفاذ

جذبِ کامل عشق میں ہے خاص چیز
اشک آنکھوں سے رکیں ممکن نہیں

ہو نہ کیوں کر جذبِ کامل کا نفاذ
دل ہی تک محدود ہے دل کا نفاذ

نوح غرقِ بحرِ الفت ہو گئے
کام آیا کچھ نہ ساحل کا نفاذ

ر

دم بخود ہیں اضطرابِ دل کا عالم دیکھ کر

۱۰ اپریل ۱۹۲۲ء کو پٹنہ عظیم آباد میں پہلا مشاعرہ۔ مسلمان سمجھا۔ حیران سمجھا۔ اس طرح پر ہوا جس کی غزل الف کی ردیف میں موجود ہے۔ دوسرا مشاعرہ ۱۱ اپریل ۱۹۲۲ء کو وہیں۔ ہم دیکھ کر۔ عالم دیکھ کر۔ اس طرح پر ہوا قریب قریب ہی سب شعرا تھے میں نے صرف ایک قافیے میں غزل پڑھی بے حد داد ملی مشاعرہ دس بجے رات سے شروع ہو کر تین بجے دن کو ختم ہوا

ج [illegible]

سیکڑوں آزار دیکھے اُن کا عالم دیکھ کر
مر گئے تعریف سن کر مٹ گئے ہم دیکھ کر

پاس آؤ تو چلے کچھ حسنِ سیرت کا پتہ
کیا کہیں صورت تمھاری دور سے ہم دیکھ کر

ہائے یہ اندازِ دل کش اُف یہ نازِ دل فریب
اب کسے دیکھیں زمانے میں تمھیں ہم دیکھ کر

بیمِ دشمن خوفِ درباں پاسِ عزت شوقِ وصل
رہ گئے کس یاس و حسرت سے انھیں ہم دیکھ کر

برق کو طور پر ترجیح دے دیں کس طرح
رائے یہ قائم کریں جلوہ ترا ہم دیکھ کر

لوگ کہتے ہیں حسینوں میں وفا ہوتی نہیں
دل لگائیں ایک سے دس بیس کو ہم دیکھ کر

اس طرح شاید کبھی تسکینِ خاطر ہو تو ہو
دیکھ لیں سن کر کسی کو جانچ لیں ہم دیکھ کر

دیکھنے کیوں کر انھیں محفل میں حیراں ہو گئے
بھیڑ اُن کے دیکھنے والوں ہی کی ہم دیکھ کر

کس قدر ہوتے ہیں ناخوش کس قدر ہوتے ہیں خوش
آپ ہم کو دیکھ کر اور آپ کو ہم دیکھ کر

کون ہے ظالم زیادہ بار بار اس واسطے
آسماں کو دیکھتے ہیں آپ کو ہم دیکھ کر

لطف تیرا چاہیے ہم کیا ہماری کیا خوشی
خوش اگر دیکھا تجھے خوش ہو گئے ہم دیکھ کر

یہ کہیں گے وہ کہیں کے پہلے یوں کہتے رہے
لیکن اب چپ ہو گئے تیور ترے ہم دیکھ کر

اتفاقاً مل گیا تھا آج کوئے یار میں
رو دئے اپنے دلِ گم گشتہ کو ہم دیکھ کر

دیکھ لے کوئی نہ محفل میں ہمارا دیکھنا
آپ کو دیکھیں مگر چاروں طرف ہم دیکھ کر

کم نگاہی میں بھی کیا پوری نکلتی ہے ادا
لوٹ جاتے ہیں کسی کا دیکھنا ہم دیکھ کر

سال کے بارہ مہینے انگلیوں پر کیوں گنیں
عید کر لیتے ہیں اپنی آپ کو ہم دیکھ کر

شوقِ نظارہ بڑھے گا جلوۂ دیدار سے
دیکھنے کا لطف دیکھیں گے آنکھیں ہم دیکھ کر

ماننا پڑتا ہے دنیا میں اب اُن کا بھی وجود
ہو گئے پریوں کے قائل آپ کو ہم دیکھ کر

دوزخ و جنت کو پہنچے داورِ محشر سلام
دیکھنے آئے تھے کیا جاتے ہیں کیا ہم دیکھ کر

بے سبب تیرا کرم ایسا کرم اِتنا کرم
پہلے دیکھا ہم نے پھر خوش ہو گئے ہم دیکھ کر

رات گذری عیش میں دن بھی گذرنے دیجئے
آج بستر سے اُٹھے منھ آپ کا ہم دیکھ کر

لے گیا وہ شوخ جو آیا تھا یہ کہتا ہوا
دل تمھارا تم کو دے دیں گے ابھی ہم دیکھ کر

یہ معمہ تو کھلا اب پہلے کیا معلوم تھا
آپ ہی کے ہو رہیں گے آپ کو ہم دیکھ کر

اِس تخلص سے انھیں سب جانتے تھے کہنہ سال
ہو گئے حیراں جناب نوح کو ہم دیکھ کر

کس کا منھ دیکھوں ہلالِ تیغ دل بر دیکھ کر

اسی طرح پر ۱۵ اگست سنہ ۱۹۲۲ء کو جناب سید حسن عسکری صاحب سب انسپکٹر تھانہ منجھن پور ضلع الہ آباد نے مشاعرہ کیا تھا مقامی شعرا کے علاوہ جناب ثاقب و جناب ضامن صاحب الہ آباد سے آئے تھے دس بارہ غزلیں پڑھی گئیں دو تین گھنٹے میں صحبت ختم ہو گئی پٹنہ کی طرح اور اِس طرح میں صرف قافیہ بدلا ہوا تھا در نہ وزن وہی ہے اور ردیف بھی وہی ہے۔

ج

یہ سماں یہ لطف یہ دلچسپ منظر دیکھ کر
ہو گئے بے گھر ہزاروں آپ کا گھر دیکھ کر

اِس طرف دل دیکھ کر اور اُس طرف سر دیکھ کر
پانو رکھنا چاہیے تم کو زمیں پر دیکھ کر

چین کیوں آنے لگا جلووں کو دم بھر دیکھ کر
پہلے دیکھوں گا انھیں پھر ہوں گا مضطر دیکھ کر

کھو گیا وہ میرے اُجڑے گھر کا منظر دیکھ کر
خاک پتھر شاد ہوں میں خاک پتھر دیکھ کر

اللہ اللہ اِس قدر تاثیر سودائے بہار
دل کی اِک اِک رگ پھڑک اُٹھتی ہے نشتر دیکھ کر

ہر گھڑی مجھ کو رہی صورت پرستی ہی کی دُھن
میں ہوا بے تاب اکثر حُسن کم اکثر دیکھ کر

حسرتِ نظارہ محشر میں ہمیں لائی تو ہے
کیا ہمارا حال ہو گا اُن کو دن بھر دیکھ کر

قتل کی اب کیا ضرورت ہم تو یوں ہی مر گئے
اُن کے نازک ہاتھ میں چھوٹا سا خنجر دیکھ کر

جو دعا دیتے تھے جینے کی مجھے وہ دوست بھی
اُٹھ گئے بالیں سے میرا حال ابتر دیکھ کر

قصد تھا ہو کر پلٹ آئیں گے اب ٹلتے نہیں
پانو پھیلانے لگے ہم کوئے دل بر دیکھ کر

دل انھیں دیں گے مگر ہم دیں گے اِن شرطوں کے ساتھ
آزما کر جانچ کر سُن کر سمجھ کر دیکھ کر

ایک منبر تھا وہاں دو چار تھے ظرفِ وضو
ہو گئی حیرت ہمیں اللہ کا گھر دیکھ کر

وہ سمجھتے ہیں یہ کوئی طالبِ دیدار ہے
سایۂ قامت کو بھی رستے میں اکثر دیکھ کر

دشت سے برسوں میں لائی تھی ہمیں حبِّ وطن
اور وحشت بڑھ گئی اجڑا ہوا گھر دیکھ کر

شش جہت کے غم سے مے خواروں کو چھٹکارا ملا
خم سبو شیشہ صراحی جام ساغر دیکھ کر

داورِ محشر کو اتنی جانچ کی فرصت کہاں
پھینک دے گا وہ مرے عصیاں کا دفتر دیکھ کر

بت پرستی تک پہنچتی ہے کہاں ناصح یہ بات
خوش ہوا کرتا ہوں میں خوش رنگ پتھر دیکھ کر

غم مجھے کیا ہو کہ تنہا مبتلائے غم نہیں
مطمئن ہے دل مرا دنیا کو مضطر دیکھ کر

میرے دل میں آئے وہ اپنے حریمِ ناز سے
تیسرا گھر اب نہ دیکھیں دوسرا گھر دیکھ کر

نوحؔ اس طوفان پر کیا ابر کو ترجیح دوں
پانی پانی ہے وہ جوشِ دیدۂ تر دیکھ کر

بجلیاں گرنے لگی ہیں خانۂ صیاد پر

پہلے اس طرح پر اردو ادب دہلی میں مشاعرہ ہو چکا تھا پھر یہی طرح ہندو بورڈنگ کالج الٰہ آباد میں قرار پائی اور ۲۴ر نومبر ۱۹۳۲ء کو مشاعرہ ہوا میں نے بھی غزل لکھی تھی لیکن عدیم الفرصتی سے شریک نہ ہو سکا

ج

رحم اب لازم ہے تجھ کو بلبلِ ناشاد پر
بازوؤں ہی میں رہ گئے گنتی کے اے صیاد پر

کیا عجب کچھ مہرباں ہوں وہ دلِ ناشاد پر
اب دعا کا بھی اضافہ میں کروں فریاد پر

کیا ہوں اربابِ وفا مائل کبھی فریاد پر
یہ ستم پر ہے ستم بے داد ہے بے داد پر

کانپ اٹھتے تھے جو پہلے شکوۂ آزار سے
اب وہی کستے ہیں آوازے مری فریاد پر

واہ کیا کہنا ترا اے ضبطِ آہِ آتشیں
گر پڑی بجلی ہمارے ہی دلِ ناشاد پر

فصلِ گل میں بھی ملا ہم کو نہ لطفِ آشیاں
اک نظر بھی باغباں پر اک نظر صیاد پر

اب دلِ مایوس نے ہر غم سے دلوائی نجات
کیا کرے گی برق گر کر خرمنِ برباد پر

آپ آئے بن پڑی میرے دلِ ناشاد کی
آپ بگڑے بن گئی میرے دلِ ناشاد پر

جس نے وقتِ نزع نے درد دل کو مضطر کر دیا
سو اثر صدقے مری اس آخری فریاد پر

جسم سے نکلے گی لیکن کب یہ کچھ کھلتا نہیں
روح کو حیرت ہے اپنی قید بے میعاد پر

پیش آئے لطف سے تو لطف کیا باقی رہا
کیجئے بے داد ہی اب خوگرِ بے داد پر

دیکھئے اب ہو چمن میں کیا مآلِ عندلیب
باغباں کی بھی طبیعت آ گئی صیاد پر

کوئی تو ان میں سے ہوگا جزو میری خاک کا
فاتحہ پڑھ دیں وہ اک اک ذرۂ برباد پر

مل گیا مجھ کو رگِ دل کی جراحت کا پتہ
ہے لہو کی بوند نوکِ نشترِ فصاد پر

کیا بتاؤں کس طرح گذرا زمانہ ہجر کا
موت کی بھی یاد آتی تھی تمھاری یاد پر

نوحؔ طوفانی سے یہ طوفان اٹھوائے ہیں کیوں

آفتیں آئیں گی ارباب الہ آباد پر

ہمارا نالۂ دل کیا کرے گا با اثر ہو کر

۱۷ فروری ۱۹۴۴ء کو اس طرح پر ایک عالی شان مشاعرہ الہ آباد میں زیر صدارت عالی جناب سر تیج بہادر سپرو جناب گلشن صاحب لاہوری کے اہتمام سے منعقد ہوا تھا گیارہ بجے دن کو شروع ہو کر ۹ بجے شب کو یہ نشست ختم ہوئی باہر کے شعرا میں سے طوطی ہند حضرت سائل دہلوی مدظلہ جناب یاس عظیم آبادی ثاقب صاحب ناوک صاحب پنڈت برج نراین صاحب چکبست لکھنوی قدسی صاحب صدق صاحب جائسی۔ جناب شبیر صاحب جون پوری مقامی شعرا میں سے ضامن صاحب قمر صاحب محمود صاحب ماجد صاحب سنبل صاحب اثر صاحب وفا صاحب سجاد صاحب وغیرہ موجود تھے قریب چار بجے شام کو بانی مشاعرہ کے حکم سے شعرا کے فوٹو بھی لیے گئے مشاعرہ البرٹ روڈ بنگلہ نمبر ۱۲ میں ہوا اور نہایت پرتکلف دعوت دی گئی یہ غزل میں نے وہیں پڑھی تھی بہت کچھ داد سامعین نے دی۔

ج

مزا جب تھا کہ دل میں گھر بناتا کارگر ہو کر
اِدھر ہو کر نکل جاتا ہے ناوک یا اُدھر ہو کر

ثبوت اس سے سوا میں اور کیا دوں جذب الفت کا
جگر میں تیر رہ جانے لگے جزوِ جگر ہو کر

شکایت پر بھی اہلِ عشق اب مجرم ٹھہرتے ہیں
یہ غم میں پھنس گئے آدابِ غم سے باخبر ہو کر

یہ آنا کوئی آنا ہے یہ جانا کوئی جانا ہے
مرے پہلو میں ٹھہرو آپ دل بن کر جگر ہو کر

طریقہ کیا بتاؤں میں تمھیں خلوت نشینی کا
سما جاؤ مرے دل میں تم اپنی ہی نظر ہو کر

چمن ہے سامنے لیکن چمن تک جا نہیں سکتے
جئے تو کیا قفس میں ہم جئے بے بال و پر ہو کر

طوافِ کوچۂ محبوب اپنا مشغلہ ٹھہرا
ضرورت سے کہیں جانا مگر جانا اُدھر ہو کر

بنی ہے میرے دم پر اب نہیں موقع تغافل کا
مناسب جو علاجِ دردِ دل اے چارہ گر ہو کر

مجھے زحمت میں ڈالا خود مری وقعت شناسی نے
جفا سہتا ہوں اسرارِ وفا سے باخبر ہو کر

دکھا کر دل مرا ناوک کو وہ یوں حکم دیتے ہیں
چلے جانا اِدھر ہو کر نکل جانا اُدھر ہو کر

کرم جوشِ محبت کا نوازش بدگمانی کی
پہنچتے ہیں وہاں ہم خود ہی اپنے نامہ بر ہو کر

اِدھر دل سے نکلتے ہیں اُدھر دل میں اترتے ہیں
دکھائیں کیا کرشمے اور نالے زود اثر ہو کر

اثر کے ڈھونڈ لانے کا یہ اک سیدھا سا رستہ ہے
چلی جائے فلک تک آہ بامِ یار پر ہو کر

نکلتے ہیں تو اُن کا گوشۂ دامن نہیں ملتا
کریں کیا لختِ دل یا اشکِ غم لعل و گہر ہو کر

الگ بیٹھے ہوئے اپنے خدا کا شکر کرتے ہیں
ہزاروں زحمتوں سے بچ گئے ہم بے ہنر ہو کر

وفا سے کام لیتے تو لقب کیا جانے کیا ملتا
عزیزِ خلق کہلاتے ہو تم بے داد گر ہو کر

جو آئیں میرے پہلو میں تو کیا جائیں ترے ناوک
رہیں داغِ جگر زخمِ جگر دردِ جگر ہو کر

نہیں معلوم اُس ظالم کے دل میں کیا خیال آیا
کہ پلٹا جلد قبرِ کشتۂ بے داد پر ہو کر

ہوا کا رُخ بدل جائے گا یہ میں کیا سمجھتا تھا
مجھی کو پھونک دے گی آہ میری پر شرر ہو کر

دم آخر مریضِ عشق نے یوں کروٹیں بدلیں
کہ دنیائے محبت رہ گئی زیر و زبر ہو کر

جنابِ نوحؔ کیا کہنا بہارِ بزمِ گلشن کا
جو شاعر آئے وہ پھولے پھلے شاخِ شجر ہو کر

۵ / ستمبر ۱۹۲۴ء

کیوں مبتلائے شوق نہ ہو میری جان اور
ہے تیری وضع تیری ادا تیری شان اور

جانِ حزیں بھی میں نے کسی پر نثار کی
کیا ہوگا میری چاہ کا اب امتحان اور

اب کون کس کو جھوٹ کہے کس کو سچ کہے
میرا بیان اور تمہارا بیان اور

میں کیا بتاؤں آپ ہی کچھ غور کیجئے
اِس جان کے سوا ہے مری ایک جان اور

کیوں آہ ایک ہی کو جلا کر ہو مطمئن
سر پر مرے ابھی ہیں کئی آسمان اور

مجھ کو تو یاد ہے وہی قصہ فراق کا
وہ کہہ رہے ہیں کہئے کوئی داستان اور

سمجھے تھے ہم کہ پا گئے زحمت سے مخلصی
ترکِ وفا سے پھنس گئی آفت میں جان اور

کرتا ہوں میں جو شکرِ عنایات باربار
مطلب یہ ہے کہ آپ ہوں کچھ مہربان اور

مجھ کو نکالتے ہو جو اپنے مکان سے
ایسا ہی تم بتا دو کسی کا مکان اور

کیوں اُن سے کہہ دیا مجھے حسرت ہے آپ کی
یوں ہی تھے بدگمان ہوئے بدگمان اور

اچھی کہی کہ دل تو دیا مر بھی جایئے
وہ امتحان اور تھا یہ امتحان اور

اے نوحؔ بحرِ عشق میں نالوں سے کام لو
کشتیِ دل کو چاہیئے اب بادبان اور

موتیوں سے بھر دیا شبنم نے دامانِ بہار

اس طرح پر کھائی مولوی عبدالوحید صاحب فدا شاگرد قدیم حضرت داغ دہلوی نے ۲۶ / دسمبر ۱۹۲۴ء کو گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں مشاعرہ کیا تھا لیکن میں اپنی عدیم الفرصتی سے نہ پہنچ سکا غزل بھیج دی تھی

کیا نہیں ہوا اعتبارِ شوکت و شانِ بہار
آج مہمانِ خزاں ہیں کل تھے مہمانِ بہار

یوں ترقی ہو جنوں میں وقتِ ہیجانِ بہار
اپنا دامن چھوڑ کر تھاموں گریبانِ بہار

محوِ حیرت ہو گئے ہم دیکھ کر شانِ بہار
یہ بہارِ بوستاں ہے یا گلستانِ بہار

جوش کھا کر خون کا دل کی رگوں میں دوڑنا
کچھ دنوں پہلے سے ہو جاتا ہے اعلانِ بہار

صنعتِ قدرت کے قائل ہو گئے اہلِ چمن
دیکھ کر اوراقِ گل پر شرحِ دیوانِ بہار

باغ میں آئی خزاں سے کہہ جدائی کا پیام
رہ چکے اتنے دنوں تک ہم بھی مہمانِ بہار

پتّے پتّے پر بنے ہیں مختلف قسموں کے نقش
یا خطِ گلزار میں لکھا ہے فرمانِ بہار

گل بداماں ہے چمن ساغر بکف ایک ایک گل
ہوش میں آئیں گے کیا اب مے پرستانِ بہار

ہو خزاں رخصت تو نکھرے خود بخود رنگِ چمن
ڈھونڈنے جاتا کیا فطرت کو سامانِ بہار

سیرِ گلشن سے انھیں دل بستگی ہوتی نہیں
جو سمجھتے ہیں تجھے روحِ چمن جانِ بہار

اور کس کام آئیں گے پھولوں کے یہ سادے ورق
خونِ بلبل سے لکھوں طغرائے عنوانِ بہار

وقت کی پابندیوں سے عشق کو مطلب نہیں
وہ جنوں کیسا جو ہو محتاجِ احسانِ بہار

جامۂ ہستی کے بھی پرزے اڑا دے بے دھڑک
ہم سے بڑھ کر کون ہوگا مردِ میدانِ بہار

کونپلوں کا پھوٹنا کلیوں کا ہنسنا کچھ نہیں
رت بدلنے ہی سے ہو جاتا ہے اعلانِ بہار

باغباں کس پھول پر کس پھول کو ترجیح دے
ایک ہے روحِ گلستاں دوسرا جانِ بہار

نوح سے کہہ دو سنبھالیں اپنی کشتی ردیف
اب زمینِ شعر پر آیا ہے طوفانِ بہار

مرا دل توڑتے ہو میرے دل کا آسرا ہو کر
دیوانہ ہے دنیا میں جو دیوانہ نہیں ہے

ان دونوں طرحوں میں بصدارت جناب احسن صاحب مارہروی بزم خیال بمبئی کا مشاعرہ ٹاؤن حال میں ۳۰ اور ۳۱ مارچ اور یکم اور ۲ اپریل سنہ ۱۹۳۴ء تک ہوتا رہا علاوہ مقامی شعرا کے بسمل صاحب عشقی صاحب الہ آبادی سعید صاحب مارہروی احمق پھپھوندوی بشار صاحب بدایونی حضرات ناطق۔ سخا۔ ندرت۔ وفا۔ صمد کانپوری۔ خیالی۔ حباب۔ صفا برہان پوری۔ سیماب صاحب۔ ساغر صاحب۔ جمال صاحب۔ رضا صاحب اکبر آبادی وغیرہ شریک تھے سامعین کا [illegible] ہوتا تھا

ج

خیال اپنا دیا محصورِ غم کب نارسا ہو کر
وہاں پہنچا اثر لے کر فغاں بن کر دعا ہو کر

تمنا تھی کہ چلتے راہِ الفت میں ہوا ہو کر
مگر غم نے بٹھایا ہم کو بیٹھے نقشِ پا ہو کر

ادائے بے نیازی کے سوا کچھ بھی نہیں آتا
خدائی کیا کرو گے تم خدائی میں خدا ہو کر

برنگِ گل بسر کی عمر کانٹوں میں تو کیا حاصل
مزا جب ہے گزر جا باغِ ہستی سے صبا ہو کر

مجھے ملتا نہ ملتا کچھ مگر تحریر تو ملتی
خطاوارِ محبت ہو گیا ہوں بے خطا ہو کر

اڑایا کچھ ہوا نے کچھ مٹایا راہ چلتوں نے
ہمیں حاصل ہوا کیا اس گلی میں نقشِ پا ہو کر

ترے بیمارِ غم کا حالِ غم دیکھا نہیں جاتا
اب ایسے میں مناسب جو دعا ہو یا دوا ہو کر

رہے گا تذکرہ اہلِ وفا میں رہتی دنیا تک
بقا کا مرتبہ حاصل کیا ہم نے فنا ہو کر

طریقِ عشق میں دل کو خدا جانے یہ کیا سوجھی
ہمیں رستہ بتاتا ہے ہمارا رہنما ہو کر

خبر کیا تھی کہ مثلِ نقشِ پا ہے نقشِ ہستی بھی
ملیں گے خاک میں ہم ان کے قدموں سے جدا ہو کر

خموشی کے مراتب تک ترے نغمے نہ پہنچیں گے
بسر کر محفلِ ہستی میں سازِ بے صدا ہو کر

ضرورت کیا ہے خنجر کی چھری کی تیر و نشتر کی
مرے دل میں سما جائیں وہ آپ اپنی ادا ہو کر

جسے ہم دیکھتے ہیں بس اُنھیں پر جان دیتا ہے
زمانے بھر میں وہ پھیلے زمانے کی فضا ہو کر

مقدر نے بنایا کیوں نہ ہم کو قطرۂ شبنم
گلوں میں جذب ہو جاتے گلوں ہی میں فنا ہو کر

جناب نوحؔ کو دریائے غم سے پار اُترنا تھا
ہوئے غرقابِ طوفانِ محبت ناخدا ہو کر

ج

ہزار افسوس اِس جوشِ جنونِ فتنہ ساماں پر
کہ حملے دونوں ہاتھوں کے ہیں اک میرے گریباں پر

اثر کی مہربانی تھی کہاں تک برقِ سوزاں پر
جلا میرا نشیمن اور آنچ آئی گلستاں پر

پھر اِس کے بعد آئے گی بلا تارِ رگِ جاں پر
کروں گا صاف اپنا ہاتھ پہلے میں گریباں پر

بیانِ غم سے اے لذتِ کشِ آزار کیا حاصل
مبادا رحم آ جائے اُنھیں حالِ پریشاں پر

سمجھ کر اُس کو بجلی کس قدر بے تاب ہوتا ہوں
چمکتا ہے کوئی جگنو جو دیوارِ گلستاں پر

بلا سے کچھ بھی ہو لیکن بہار آئے ضرور آئے
جو گذرے گی گذر جائے گی وہ میرے گریباں پر

یہ لذت بخشِ ایذا اور اک مجروح کی قسمت
نظر ہے زخمِ دل پر ہاتھ ہے اُن کا نمک داں پر

اِسی کا منتظر رہتا ہے میرا ذوقِ مے خواری
بہار آئے گلستاں میں گھٹا چھائے گلستاں پر

خدا جانے جنوں افزا بہارِ گل کب آئے گی
یونہیں بیٹھا ہوا ہوں ہاتھ رکھے ہیں گریباں پر

بڑھا یوں عالمِ وحشت میں عالم واقفیت کا
لکھا ہو جیسے میرا نام ہر خارِ بیاباں پر

مرے دل کو نہیں منظور اظہارِ ستم شاید
جو کرتا ہوں فغاں تو چوٹ پڑتی ہے رگِ جاں پر

دمِ جوشِ جنوں بھی اس قدر ہے پاسِ رسوائی
اٹھا لیتا ہوں اپنا ہاتھ رکھ رکھ کر گریباں پر

اسیرِ غم کے اطمینانِ خاطر کو یہ کافی ہے
وہ تاریخِ رہائی لکھ گئے دیوارِ زنداں پر

فنا کے بعد بھی اِتنا اثر تھا جوشِ وحشت کا
غبارِ قیس اُڑ کر چھا گیا سارے بیاباں پر

اُڑا لے جائے گی جیسے مجھے خواہش رہائی کی
قدم ہے صحنِ زنداں میں نظر دیوارِ زنداں پر

اسیرانِ قفس یہ جان لیں عہدِ بہار آیا
ہوا ہے سر سے اگر ہوں بازوؤں میں کچھ نمایاں پر

زمانہ بھول جائے نوحؔ لیکن ہم نہ بھولیں گے
برس پڑنا کسی کا وہ تمھارے ذکرِ طوفاں پر

طبع زاد

ج

فصلِ گل میں یہ ہوا سر پھوڑ کر
رکھ دیا ہم نے قفس کو توڑ کر

پھر نہ دیکھی قبر بھی منھ موڑ کر
چل دیے سب مجھ کو تنہا چھوڑ کر

آج تک میں نے وفائیں کتنی کیں
تم حساب اِن کا بتا دو جوڑ کر

زہد ہم سے اور نبھ جاتا پہ خوش
رل گئے رندوں میں توبہ توڑ کر

وہ مری مشکل نہ آساں کر سکی
رہ گئی تلوار بھی منھ موڑ کر

مجھ کو جینا مجھ کو مرنا بھی یہیں
میں کہاں جاؤں ترا در چھوڑ کر

عشق اگر چاہے تو نا ممکن نہیں
آسماں سے لائے تارے توڑ کر

دیکھتا ہوں میں مآلِ مرگ و زیست
اُس سرے سے اِس سرے کو جوڑ کر

کیا ستم ہے جن میں ہو شرحِ ستم
وہ پڑھیں خط اُتنی سطریں چھوڑ کر

آئینہ گر وہ ہے میری راستے میں
جو دکھا دے دل کے ٹکڑے جوڑ کر

کوہ کن لائے گا جوئے شیر کیا
جوئے خوں لائیں گے سر ہم پھوڑ کر

جن میں تھے کھِلنے کو گل ہائے نشاط
پھینک دیں غم نے وہ شاخیں توڑ کر

دل میں آنے کو ہے وہ تیرِ نگاہ
رنج و غم ہٹ جائیں رستہ چھوڑ کر

دستِ وحشت میں گریباں آ گیا
دل ہے خوش دونوں کا رشتہ جوڑ کر

لکھنے والے نے لکھا قسمت میں کیا
دیکھنا تھا یہ مجھے سر پھوڑ کر

ہو گئے فضلِ خدا پہ مطمئن
نوح بھی کشتی کا لنگر توڑ کر

ڑ

۱۰ر جنوری ۱۹۳۲ء

ج

عشق کے واسطے ہے دل کی آڑ
کوئی دیکھے یہ تل کی اوٹ پہاڑ

سرکشی وجہِ افتخار نہیں
قد میں شمشاد سے بڑا ہے تاڑ

ستیاناس ہو گیا دل کا
عشق نے خوب کی اُکھاڑ پچھاڑ

وہ خدا جانے گھر میں ہیں کہ نہیں
کچھ کھُلا اور کچھ ہے بند کواڑ

حسرتیں بعد مرگ جائیں کہاں
دفن کر مجھ کو اور اُنھیں بھی گاڑ

ناتواں دل اُٹھائے کیا غمِ عشق
اک طرف رائی ایک سمت پہاڑ

میری تقدیر کا مرے دل کا
اُن کے ہاتھوں میں ہے بناؤ بگاڑ

خاک میری بھی اِس میں شامل ہے
اپنے دامن سے گردِ راہ نہ جھاڑ

مال و زر دے دیا حسینوں کو
رہ گیا گھر میں صرف کاٹھ کباڑ

کاش اُٹھ جائے پردۂ ہستی
شعلۂ غم سے دل کا حال یہ ہے
چار دن وہ بناؤ رکھتے ہیں
وہ نہیں تو مری نگاہ میں ہے
رخت ہستی کے ہو چکے ٹکڑے

پھر سے اور اس کے بیچ میں ہے پہاڑ
جیسے پہلو میں جل رہا ہو بھاڑ
اور رکھتے ہیں آٹھ روز بگاڑ
باغ ویران اور شہر اُجاڑ
اے جنوں اب مرے کفن کو پھاڑ

نوح طوفانِ بحرِ الفت میں
کوہ جودی کی ڈھونڈتے ہیں آڑ

طبع زاد ۹ دسمبر ۱۹۲۳ء

ہمیشہ تمنا و حسرت کا جھگڑا ہمیشہ وفا و محبت کا ہلڑ
جو رازِ محبت کو جانے گا کوئی تو یہ جان لے وہ مچا دے گا گڑبڑ
مرے دل کے ہاتھوں سے ہجر و وفا میں مری زندگی تنگ ہو جائے گر بڑ
کہاں میں ہوں ایسا کہ تو مہرباں ہو کہاں قسمت ایسی کہ آساں ہو مشکل
بشر کیا فرشتے بھی بیٹھے ہیں منہ موڑ کر یوں کہ جیسے ہے رازِ نہفتہ دل کا
سر ہم سری حسن و ناز و ادا میں نہ رکھتا تھا کوئی نہ رکھے گا کوئی
بہار جوانی حیات جوانی نہ یہ غیر فانی نہ وہ غیر فانی
ہزاروں مرے ہیں ہزاروں لٹے ہیں ہزاروں مریں گے ہزاروں لٹیں گے
وہ عرض تمنا کو فریاد سمجھے وہ فریاد کو غم کی روداد سمجھے
ادھر عیش و عشرت ادھر یاس و حسرت جہاں والے دیکھیں یہاں کی دو رنگی
محبت نے چھوڑا یہ طرفہ شگوفہ بہار جوانی بھی دل نے نہ دیکھی
جو اک جنگ تھی اور اک صلح جو ہو تو جھگڑا نہ اٹھے بکھیڑا نہ اٹھے
کیے سیکڑوں عہد و پیمان الفت مگر خیر سے کوئی سچا نہ نکلا
مقدر میں لکھا تھا اُن کو بگڑنا کوئی کیوں مناتا کوئی کیوں نہ روٹھا
جو ناوک چلے اور تلوار نکلی تو قائم رہا میں ہی عہد وفا پر
سمجھتے ہیں آغاز و انجام اپنا وہ مر کر یہاں ہیں گے تیر سے آگے
خیال و تصور میں ہرگز نہ لانا ہنسی دل لگی میں ہمیشہ اُڑانا
جہاں دیکھتا ہوں وہاں دیکھتا ہوں جدھر دیکھتا ہوں اُدھر دیکھتا ہوں
مزا جب ہے آپس میں کچھ جنگ بھی ہو مزا جنگ میں تب ہے کچھ صلح بھی ہو

ج

تمہیں کیا طبیعت لگے کس طرح دل آفت وہ فتنہ یہ آندھی وہ جھکڑ
نظر کی طرح یہ نظر کی طرح رگ نظر کی طرح اہل نظر کی طرح لڑ
کبھی کثرت رنج و غم کا تھپیڑا کبھی جوش امید و حسرت کی اُدھیڑ
اگر اور گاہک نہیں کوئی پیارا تو اے تیغ ناز میرے گلے پڑ
ادھر آہ نکلی ہماری زباں سے اُدھر مچ گیا ساری دنیا میں ہلڑ
ترا عکس آئینہ ہے اور تو ہے جو لڑنا ہے تجھ کو تو اپنے ہی سے لڑ
عروس چمن کا اترتا ہے گہنا خزاں کے زمانے میں گرتی ہے پت جھڑ
وہ انسان نہیں اس کو سمجھو فرشتہ جو برداشت کر لے محبت کی اُدھیڑ
ذرا سی مری بات تھی لیکن اُس کا ہوا رفتہ رفتہ کہاں تک بتنگڑ
کہیں کوئی بہم بجاتا ہے بغلیں کوئی پیٹتا ہے کہیں سر دھڑا دھڑ
ابھی پھولنے پھلنے کے دن کہاں تھے مگر کٹ گئی نخل امید کی جڑ
دل و دل رہا میں سمجھے کیا محبت اُدھر وہ بھی ضد پر اِدھر یہ بھی اکھڑ
وہ کہتے ہیں ملنے کو اب حشر کے دن کہیں ہو نہ جائے جو اس دن بھی گڑبڑ
زمیں دور اہل زمیں ہو گئے سب بڑی آسماں سے وہ سر پہ پڑی تھی بھگدڑ
کسی نے کسی کو کبھی پھر نہ دیکھا بڑی امتحاں گاہ میں تھی ایسی بھگدڑ
ادھر سے اُدھر اُن کا پھر جائے گا منہ لگائے گی شیریں کی ایسا تبہ
مرے دعوئے عشق کی قدر کیا ہو وہ ہیں کہ سمجھتے ہیں مجذوب کی بڑ
محبت کی شورش محبت کی ادھم محبت کا غوغا محبت کا ہلڑ
دکھاتے ہیں تلون کا اپنے تماشا اِدھر لڑ اُدھر مل اِدھر مل اُدھر لڑ

بہایا مضامین کا تم نے دریا غزل میں بہت خوب اشعار لکھے
زمانے کو اے نوح حیرت نہ کیوں ہو کہ طوفان ایسا زمین ایسی گڑبڑ

ز

طبع زاد ۲۰ ستمبر ۱۹۲۲ء

مانا کہ مرا دل بھی جگر بھی ہے کوئی چیز
لیکن وہ نظر تیر نظر بھی ہے کوئی چیز

ممکن نہیں وہ چاہنے والوں کو نہ چاہیں
اخلاص و محبت کا اثر بھی ہے کوئی چیز

لٹ جائے کہ رہ جائے رہِ عشق و وفا میں
دل بھی ہے کوئی مال جگر بھی ہے کوئی چیز

اُن سے جو نہ اٹھا تھا اسے اس نے اٹھایا
قائل ہیں ملائک کہ بشر بھی ہے کوئی چیز

چھپنے کے لئے شوق سے پردے میں چھپیں آپ
اتنا رہے معلوم نظر بھی ہے کوئی چیز

یہ کثرتِ آزار و غم و رنج کہاں تک
اے شامِ شبِ ہجر سحر بھی ہے کوئی چیز

کہتے ہو ہم آئیں گے مگر ظلم کریں گے
سوچو تم اگر تو یہ مگر بھی ہے کوئی چیز

باقی نہ رہی ناوکِ دل دوز کی حاجت
ظالم تری سیدھی سی نظر بھی ہے کوئی چیز

نالے سے کہوں گا کہ پہنچ عرش بریں تک
اے تیز مسافر یہ سفر بھی ہے کوئی چیز

بے تاب اُدھر آپ پریشان اِدھر ہم
آپس کی محبت کا اثر بھی ہے کوئی چیز

چلتی ہوئی میرے دلِ بے تاب کو لے کر
لاکھوں میں وہ دزدیدہ نظر بھی ہے کوئی چیز

بے کار نہ جائے گا مرے دل کا تڑپنا
نالہ ہے کوئی شے تو اثر بھی ہے کوئی چیز

آنکھوں کے لئے ذوقِ نظر بھی ہے کوئی بات
پہلو کے لئے دردِ جگر بھی ہے کوئی چیز

اللہ رے ترے حسنِ ضیا بار کا جلوہ
یہ پیشِ نظر ہو تو نظر بھی ہے کوئی چیز

اے نوح شبِ ماہ میں پاس اُس کو بٹھا کر
کہتا ہوں مرا رشکِ قمر بھی ہے کوئی چیز

خیام لاہور کے لئے ۲۵ جولائی ۱۹۴۳ء

فرہاد کے خوں سے لکھوں افسانۂ پرویز

سہ حرفی الفاظ میں بغیر ترکیب فارسی کے (خون) نون کا اعلان ضروری ہے لیکن مصرع طرح میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا اس بحر میں (ز) کسی حد تک زیادہ ہے لہذا ہر پہلے مصرع میں بھی لحاظ رکھا گیا ہے

کیا اُن کے تلون سے ہو محفل طرب انگیز
پہلے نہیں کہتے ہیں پھر کہتے ہیں ہر چیز

پھر موسم گل میں ہو وہی شکلِ دل آویز
خالی نہ رہے ساغر و مینا سے کوئی میز

ہر ناز بھی سفاک ہر انداز بھی خوں ریز
دو چار تو کیا حسن میں ہیں سیکڑوں چنگیز

پھولوں کو نہیں قطرۂ شبنم سے سروکار
آنکھیں ہیں مری صحنِ گلستاں میں گہر ریز

پیدا ہو مرے دل میں نہ کیوں اور بھی ہیجان
ایک ایک ادا آپ کی ہے ولولہ انگیز

باتوں ہی سے بسمل مجھے کر دیں گے کسی روز
ہے صورتِ شمشیر حسینوں کی زباں تیز

مر جائیں گے بے اُن کے مریضانِ غمِ عشق
دم بھر جو بنا دے وہ ہے کس کام کا پرہیز

ڈرتا ہوں نہ انفاس کے پردے کہیں جل جائیں
دل ہے جو شرر گیر تو ہے عشق شرر ریز

انجامِ محبت نے کیا سب کو خبردار
فرہاد تو فرہاد ہے پرویز تو پرویز

گر ذبح مری قائم نہیں رہنے کی بہر طور
کم زور ترے ہاتھ ہیں لیکن ہے چھری تیز

ہیں غم بھی اُٹھا کر نہیں ہوتا کبھی مغموم
جو کام خدا کا ہے وہ ہے مصلحت آمیز

ڈھائے گی نیا قہر تری شوخیِ رفتار
کہتی ہے دمِ سیر قیامت سے کہ برخیز

ممکن نہیں میری نگہِ شوق ٹھہر جائے
جلوہ ہے ضیا پاش ضیا بار ضیا ریز

ملنا بھی گلے سے تو وہی صورتِ شمشیر
اللہ رے بے درد کا لطفِ ستم آمیز

کیوں خاک نہ اربابِ وفا کی رہے برباد
دنیائے غمِ عشق میں چلتی ہے ہوا تیز

اِن مختصر الفاظ میں ہے عشق کی تعریف
تکلیفِ سکوں خیز نشاطِ الم آمیز

پوچھے کوئی شیریں سے کد و کاوشِ فرہاد
فرہاد سے سمجھے کوئی بے مہریِ پرویز

دونوں کو تری شوخ نظر کر گئی مجروح
ایسا کوئی ناوک نہیں دل دوز و جگر بیز

وہ شوخ بھی کہتا ہے رہو نوح سے ہشیار
طوفان اُٹھانے میں یہ حضرت ہیں بہت تیز

س

طبع زاد ۲۰ جون ۱۹۳۲ء

جانے کو جائے فصلِ گل آنے کو آئے ہر برس
ہم غم زدوں کے واسطے جیسے چمن ویسے قفس

رخصت ہوا بیمارِ غم بالیں سے اُٹھے ہم نفس
تدبیر تو کرتے ہیں سب تقدیر پر کس کا ہے بس

محشر میں اُس بے درد سے کر پوچھ گچھ لے داد کی
آیا ہوں میں فریاد کو فریاد سن فریاد رس

ممکن نہیں میں چھٹ سکوں دامِ وفائے عشق سے
باندھے گئے سب دست و پا جکڑی گئی ایک ایک نس

قطعِ منازل میں کروں تو کس سہارے پر کروں
مفقود اہلِ کارواں مسدود آوازِ جرس

تو اور دعوئے عشق کا یہ بھی خدا کی شان ہے
منصور بننے کے لئے دل چاہئے اے بوالہوس

کہنے کو ہے سارا جہاں سچّے فدائی ہیں کہاں
دس میں نہ نکلے گا کوئی دس لاکھ میں نکلیں گے دس

جائے بہار آئے خزاں اِس کا تردد کچھ نہیں
ہیں لالہ و گل سے سوا مجھ کو چمن کے خار و خس

طولِ غم و آزار نے ناشاد مجھ کو کر دیا
ہے ایک گھنٹہ ایک دن ہے اک مہینہ اک برس

کم بخت مرنے کے لئے صیاد کے گھر آئے ہیں
دیکھیں گے اب کیا سیرِ گل چھٹ کر اسیرانِ قفس

پہنچے سرِ عرشِ بریں امید تو ایسی نہیں
ہاتھوں ہی تک محدود ہے میری دعا کی دسترس

قابو میں جب دل ہی تو کیا لکھوں میں دردِ دل
بڑھ کر ہے تیغ و تیر سے میرے لئے میرا نفس

سو بار دے کر جام و خم ممنون ساقی نے کیا
اُس کا تقاضا تھا کہ پی میری گزارش تھی کہ بس

اے خضر آئے لطف کیا مشرب الگ مسلک جدا
مرنے کی حسرت مجھ کو ہے تم کو ہے جینے کی ہوس

اِن کے علاوہ کون ہے میرے قریں کوئی نہیں
یادِ چمن یا ہیں آفتیں یا آرزوئیں پیش و پس

جام و سبو کا ذکر کیا بہتا پھرے خود مے کدہ
اے ابرِ رحمت ٹوٹ کر ایسا برس اِتنا برس

کیا ابتدا کیا انتہا جو آئے گا وہ جائے گا
دنیائے فانی کچھ نہیں اللہ بس باقی ہوس

لطف و کرم سے کیا غرض قہر و ستم سے کام لے
بربادیِ عشاق پر اپنی کمر مضبوط کس

کب تک یہ سیلِ اشکِ غم کب تک یہ طوفاں خیزیاں
دنیا فنا ہو جائے گی اے نوح بس اے نوح بس

طبع زاد ۱۸ر جولائی ۱۹۳۲ء

ج

میں ہوں ظالم کی آن بان سے خوش
ورنہ ہے کون آسمان سے خوش

ناخوشی کا خیال تھا لیکن
وہ ہوئے میری داستان سے خوش

اِس طرح بس میں آگیا کوئی
کر لیا میں نے پھول پان سے خوش

اُس قدر غم ہے میرے قاتل کو
جس قدر میں ہوں امتحان سے خوش

خاک پہنچے گا وہ سرِ منزل
جو مسافر ہوا تکان سے خوش

ایک کو جھڑکی ایک کو دھمکی
کون ہے آپ کی زبان سے خوش

چھوڑ کر دل کو درد جائے کہاں
یہ مکیں ہے اِسی مکان سے خوش

پاس کوئی پہنچ نہیں سکتا — اس لئے ہیں وہ پاسبان سے خوش
جان و دل دونوں آپ سے جائیں — میں ہوں سو دل ہزار جان سے خوش
ساقی سے مے فروش رہتا ہے — اپنی چلتی ہوئی دکان سے خوش

نوح کو چین عمر بھر نہ ملا
کیا ہوں وہ اپنے امتحان سے خوش

ص

طبع زاد ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۲ء

آپ ثابت یہ کریں کیوں ہے مرا دل ناقص — صرف کہہ دینے سے ہوتا نہیں کامل ناقص
کیوں کہوں میں کہ مری الفت کامل ناقص — تیری تردید سے بھی ہوگی بمشکل ناقص
کوئی عزت نہیں وقعت نہیں توقیر نہیں — ان کی نظروں میں ہے ارمان بھرا دل ناقص
سر ہمارا نہ ہوا تن سے جدا کیا باعث — دست قاتل تھا کہ تھا خنجر قاتل ناقص
تم نے کی عشق و وفا میں یہ نرالی تنقید — دل تو کامل ہے مگر آرزوئے دل ناقص
چودھویں رات کو دیکھا یہ مری آنکھوں نے — ہے ترے سامنے حسن مہ کامل ناقص
کھل گیا راز محبت کا تو کیا لطف رہا — ضبط غم سے جو نہ لے کام وہ ہے دل ناقص
سب نکل جائیں یہ تاکید تمہاری کیسی — اہل محفل نہ ہوں جس میں وہ ہے محفل ناقص
اک ستم ڈھانے میں فرد ایک ستم سہنے میں — الغرض ہے نہ تمہارا نہ مرا دل ناقص
آئینہ دیکھ مگر عکس کی تحقیر نہ کر — تو بھی ناقص ہے جو ہے مد مقابل ناقص
کیوں نہ سمجھوں اسے محرومی قسمت کا سبب — آپ کے پاس بھی رہ کر جو رہے دل ناقص
چاہئے یاس طلب ذوق طلب حسن طلب — نقص رہ رو میں اگر ہے تو ہے منزل ناقص
نقش حسرت و غم کیوں نہ مٹا لے تقدیر کو — ہو مرے دل میں اگر خون رگ دل ناقص
دیکھئے کس کی طرف اب نگہ ناز اٹھے — محفل یار میں سب جمع ہیں کامل ناقص
سب کا انداز الگ سب کا طریقہ بھی جدا — کوئی کامل تری الفت میں کوئی دل ناقص
سیکڑوں بار ترے تیر چلے تیغ چلی — رہ گیا پھر بھی مرا فیصلۂ دل ناقص

بحر الفت کے تلاطم سے خبردار رہو
جس میں کشتی نہ رکے نوح وہ ساحل ناقص

ض

طبع زاد ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء

آپ کو میرے ستانے سے غرض ۔۔۔ بے غرض بھی روٹھ جانے سے غرض
خود غرض معشوق رکھتے ہی نہیں ۔۔۔ ملنے جلنے آنے جانے سے غرض
تیغ اُٹھے یا تِرا ناوک چلے ۔۔۔ خون میں ہم کو نہانے سے غرض
توڑ کر پائے طلب بیٹھا ہوں میں ۔۔۔ اب نہ آنے کے نہ جانے سے غرض
جب نہ آپس کا تعلق رہ گیا ۔۔۔ پھر تمھیں میرے ستانے سے غرض
اپنے سر پیٹتا ہوں اوروں کا قصور ۔۔۔ عشق میں تعزیر پانے سے غرض
دیر ہو کعبہ ہو کوہِ طور ہو ۔۔۔ ہے انھیں جلوہ دکھانے سے غرض
عشق میں حور و پری کی شرط کیا ۔۔۔ اہلِ دل کو دل لگانے سے غرض
چاہتے ہو برق مجھ پر گر پڑے ۔۔۔ اور کیا ہے مسکرانے سے غرض
مجھ کو نظروں کے لڑانے سے ہے کام ۔۔۔ آپ کو آنکھیں دکھانے سے غرض
شمعِ محفل کی انھیں حاجت نہیں ۔۔۔ ہے مرے دل کے جلانے سے غرض
وہ کبھی بے کار بیٹھیں کیا مجال ۔۔۔ اک نہ اک فتنہ اُٹھانے سے غرض
رات ہو یا دن ہو سوتے جاگتے ۔۔۔ بس تمھیں ہے ڈھونڈھانے سے غرض
وہ بھلا کر یاد کیا مجھ کو کریں ۔۔۔ یاد کر کے بھول جانے سے غرض

نوح کو آتا نہیں کچھ اور کام
الغرض طوفان اٹھانے سے غرض

ط

طبع زاد ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء

کیوں ہم لکھیں کسی کو وفا کے اثر سے خط ۔۔۔ جائے اِدھر سے بھی اگر آئے اُدھر سے خط
انکار پر بھی آئے گا پھر کر اُدھر سے خط ۔۔۔ بیرنگ بھیجتا ہوں اُنھیں اس نظر سے خط
دوں گا جواب میں بھی بڑی شد و مد کے ساتھ ۔۔۔ لکھا ہے اُس نے مجھ کو بڑے کر و فر سے خط

بے کار تو نہ جائے مرا حالِ اضطراب
وہ دیکھتے ہیں لیکن اُچٹتی نظر سے خط

دیتے نہیں یہاں بھی مجھے چین اقربا
آتے ہیں روز وادیٔ غربت میں گھر سے خط

قاصد اگر نہیں تو نہیں مجھ کو غم نہیں
پہنچے گا اُڑ کر آپ وفا کے اثر سے خط

آوارہ گردِ عشق کو سب نے بھلا دیا
آیا نہ میرے نام کبھی میرے گھر سے خط

دیکھا تو پھر بھی اپنی جگہ نا تمام تھا
گو شام تک لکھا کئے اُن کو سحر سے خط

قاصد کے واقعاتِ سفر پھر سنوں گا میں
دے دے وہ پہلے کھول کر اپنی کمر سے خط

میں بھیجتا نہیں کبھی وہ بھیجتے نہیں
افشائے رازہائے محبت کے ڈر سے خط

سب مل کر ایک دفترِ غم ہو ہی جائیں گے
لکھے ہیں ہم نے اُن کو کئی مختصر سے خط

کیا دل کی بات اُن کو لکھوں یہ خیال ہے
رستے میں لے اُڑے نہ کوئی نامہ بر سے خط

رنگیں مزاجیوں کا ہماری یہ حکم ہے
اُس رشکِ گل کو لکھئے تو بلبل کے پر سے خط

بھیجوں بھی اُن کے پاس تو قاصد نہ جا سکے
لکھوں بھی میں انھیں تو پہنچے کبوتر سے خط

بے شبہ میرے حق میں کوئی تھی مفید بات
دے کر جو اُس نے پھیر لیا نامہ بر سے خط

طوفانِ ذوق و شوق میں لکھ کر بہا بھی دو
اے نوحؔ یوں تو گذرے گا اُن کی نظر سے خط

ظ

۱۰ر اگست سنہ ۱۹۳۱ء

سفینۂ نوح میں ایک غزل اور ہے

ج

تکلیف کا خیال کچھ آرام کا لحاظ
ہر وقت ہم کو چاہئے ہر کام کا لحاظ

کہتے نہیں وہ صاف کہ ہے بدنصیب کون
یوں ہے برائے نام مرے نام کا لحاظ

وہ دل فریبیاں تھیں کہ دل سے بھلا دیا
آغاز کے خیال نے انجام کا لحاظ

کیا جلد مِل کر آپ کی آنکھیں بدل گئیں
باقی رہا نہ صبح کو وہ شام کا لحاظ

کہنے کو میرے پاس جو تم آ گئے تو کیا
نکلے نہ کام جس سے وہ کس کام کا لحاظ

ہیں توبہ کر کے توڑ نہ ڈالوں تو کیا کروں
خم کا مجھے خیال مجھے جام کا لحاظ

جو وقت جائے گا وہ پلٹ کر نہ آئے گا
دن رات چاہئے سحر و شام کا لحاظ

خود کام اپنے کام سے رکھتے ہیں واسطہ
اِن کی بلا کرے کسی ناکام کا لحاظ

ہم نام پر بھی جلد ترا آتا ہے ٹوٹ کر
کتنا ہے مرے دل کو ترے نام کا لحاظ

پہلے ہے رنج اور مسرت ہے بعد رنج
تکلیف کیوں نہ دے ہمیں آرام کا لحاظ

کرتا نہیں جو پاس کسی نیک نام کا
پھر کیا کرے وہ عاشق بدنام کا لحاظ

توبہ نے پھر بہار میں پینے کی ٹھان لی
آ ہی گیا چھلکتے ہوئے جام کا لحاظ

جن کو طوافِ کوچۂ محبوب ہے پسند
کرتے نہیں وہ گردشِ ایام کا لحاظ

اے نوح تو نہ ہو کہ پیمبر ہو اس سے کیا
ہر شخص کو مگر ہے ترے نام کا لحاظ

طبع زاد ۱۹ ستمبر ۱۹۳۲ء

میرے اوسان کا خدا حافظ | ج | عشق میں جان کا خدا حافظ

سینکڑوں بد دعائیں ملتی ہیں
تیرے دربان کا خدا حافظ

دل ہوا شیفتہ ستم گر پر
ایسے نادان کا خدا حافظ

تیر دل میں چبھو کر اس نے کہا
اب تری جان کا خدا حافظ

وہ مجھے دھیان میں نہیں لاتے
جان پہچان کا خدا حافظ

جمع ہوں جس میں چند دیوانے
اس بیابان کا خدا حافظ

ترکِ الفت ہم ان سے کر بیٹھے
نفع نقصان کا خدا حافظ

میری خاطر سے کیا غرض ان کو
رخصتی پان کا خدا حافظ

خیر مجھ کو نظر نہیں آتی
عشق میں جان کا خدا حافظ

ایک کافر سے عشق ہے مجھ کو
میرے ایمان کا خدا حافظ

وحشتِ وحشت ہوا گلے کا ہار
اب گریبان کا خدا حافظ

فرض ہیں اہلِ عشق پر آداب
مجھ سے انجان کا خدا حافظ

نوح جو شعر ہے وہ ہے طوفان
تیرے دیوان کا خدا حافظ

ع

طبع زاد ۲۵ جولائی ۱۹۳۲ء

جلتی بھی ہے روتی بھی ہے چپ چاپ کھڑی شمع | ج | بے سمجھے ہوئے آگ میں کیوں کود پڑی شمع

جلتے ہوئے دیکھا نہ شبِ ہجر سحر تک
ہم سمجھے تھے دل سوز ہماری ہے بڑی شمع

یہ حسن کا جلوہ تو سحر تک نہ رہے گا
آتی ہے کوئی لحظے میں بجھنے کی گھڑی شمع

ہوتی نہ کسی شوخ کی محفل میں رسائی
جلنے کے سبب سے تری تقدیر لڑی شمع

اب چین نہ پائے گی پتنگوں کی طرف سے
زحمت میں انھیں ڈال کر آفت میں پڑی شمع

ممکن ہے شبِ ہجر بھی ختم ہو پہلے
شاید نہ سہے میری طرح آنچ کڑی شمع

تنہا جو شبِ ہجر جلا میں تو مزا کیا
دے اور مرا ساتھ ابھی دو چار گھڑی شمع

دعوے تھا بہت حسن کا لیکن سرِ محفل
اُس رخ کے مقابل میں دم بھر بھی اڑی شمع

پروانہ و عشاق کا عقدہ نہیں کھلتا
بے درد بڑے تم ہو کہ بے درد بڑی شمع

دل سوز کوئی اور شبِ غم نہیں ہوتا
بس حالِ زبوں پر مرے روتی ہے کھڑی شمع

وہ حال تھا میرا ابھی جو تیرا تھا شبِ غم
جلنے کے سوا بات کوئی بن نہ پڑی شمع

راتوں کو گھڑی بھر بھی نہ تکتے تجھے دیکھا
کیا بزمِ حسیناں میں تری بال گڑی شمع

طوفان جہاں نوح کے اشکوں نے اٹھایا
آگ اپنی بجھانے کو وہیں کود پڑی شمع

غ

۲۵ اگست ۱۹۳۲ء

مرے بلانے سے آئے کوئی دروغ دروغ
نہ آئے مجھ کو بلائے کوئی دروغ دروغ

پتہ کسی کا لگائے کوئی دروغ دروغ
بغیر گم ہوئے پائے کوئی دروغ دروغ

مری لگی کو بجھائے کوئی دروغ دروغ
کوئی گھڑی کو بھی آئے کوئی دروغ دروغ

ہمیشہ لطف و عنایت سے واسطہ رکھے
کبھی نہ ہم کو ستائے کوئی دروغ دروغ

ہزار ہاتھ کفِ حسرت ملا کریں لیکن
ستم سے ہاتھ اٹھائے کوئی دروغ دروغ

اسی لئے تو قیامت کا دن مقرر ہے
سزا کئے کی نہ پائے کوئی دروغ دروغ

پیام بر یہ ہیں خواب و خیال کی باتیں
خیال و خواب میں آئے کوئی دروغ دروغ

تمھاری تیغ سے سب کو لگاؤ رہتا ہے
مگر گلے سے لگائے کوئی دروغ دروغ

جو اہلِ دل کی نگاہوں میں خود سمائے ہیں
نظر میں اُن کی سمائے کوئی دروغ دروغ

وہ لاکھ منع کریں لیکن اُن کی محفل میں
نہ آئے کوئی نہ جائے کوئی دروغ دروغ

گذارشیں بھی کروں میں خوشامدیں بھی کروں / نقاب رُخ سے اُٹھائے کوئی دروغ دروغ
تمھیں نے آگ لگائی تمھیں بجھاؤ بھی آگ / بجھائے کوئی لگائے کوئی دروغ دروغ
تمھارے سامنے طوفانِ عشق ہیں اے نوح / کرامت اپنی دکھائے کوئی دروغ دروغ

ف

طبع زاد ۲۲ر جون ۱۹۲۵ء

ج

وہ کریں گے مرا قصور معاف / ہو چکا کر چکے ضرور معاف
حسن کو بے قصور کہتے ہیں / ہے قصور آپ کا قصور معاف
میں نے یہ جان کر خطائیں کیں / ہر خطا ہوگی بالضرور معاف
وہ ہنسی آگئی ترے لب پر / ہوگیا وہ مرا قصور معاف
بے خودی میں جو ہو خطا ہم سے / کم سے کم وہ تو ہو ضرور معاف
خامشی اُن کی مجھ سے کہتی ہے / اب ہوا اب ہوا قصور معاف
پھر نہ تم بخشنا کبھی مجھ کو / پہلی تقصیر ہو ضرور معاف
ہاتھ بھی جوڑے پاؤں پر بھی گرا / اب تو کہہ دو کیا قصور معاف
ہے یہی کام اُس کی رحمت کا / ہوں گے میرے گنہ ضرور معاف
اور عادت مری خراب ہوئی / کاش کرتے نہ وہ قصور معاف
خود یہ اقرار جرم کرتے ہیں / کیجیے نوح کو ضرور معاف

ق

طبع زاد ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۲ء

ج

سب کی سمجھ میں آسکے کیوں کر محبت کا سبق / انشا بلند املا گراں مضموں اہم معنی ادق
نکلے گی کیا حسرت مری جائے گا کیا میرا قلق / آرام کا ہوں ملتجی تکلیف کا ہوں مستحق

حسنِ تصور کا مزا پوچھے مرے دل سے کوئی
جب دونوں آنکھیں بند کیں تو کھل گئے چودہ طبق

قدرت کی رنگ آمیزیاں ظاہر اسی سے ہوگئیں
وقتِ سحر کیوں گل کھلے کیوں شام کو پھولی شفق

اُن کے جوابِ صاف کی تشریح بالاجمال ہے
لکھ کر لفافے پر پتہ بھیجا مجھے سادہ ورق

اچھی طرح واقف ہوں میں مجھ سے نہ قسمیں کھائیے
ہاں آپ کا ہر قول سچ ہاں آپ کی ہر بات حق

تکلیف وقتِ نزع کی میں اب زیادہ کیا کہوں
سمجھا اُسے بحرِ فنا نکلا جو ماتھے پر عرق

میرے غم و آزار کا عالم نہ مجھ سے پوچھیے
دل مضمحل اوسان گم سینہ بھی شق چہرہ بھی فق

کوئی شناور کیا کرے کوئی مسافر کیا کرے
بحرِ وفا ذخار ہے صحرائے الفت لق و دق

آگاہ کوئی ہو سکے تقدیر کے لکھے سے کیا
فقرے بھی نامربوط سب مضمون بھی سارا ادق

جو چیز تھی جس کے لیے وہ چیز اُسے بخشی گئی
سر میں جنوں دل میں طلب کہتے ہیں اس کو حق بحق

اُٹھی نگاہِ سحر فن غارت گری کے واسطے
ہوش و حواس و عقل کا ابتر ہوا نظم و نسق

گورِ غریباں کی طرف بے کار میں جاتا نہیں
ایک ایک لوحِ قبر سے لیتا ہوں عبرت کا سبق

شاید رُخ اُن کے تیر کا گردوں کی جانب پھر گیا
اے شامِ غم کھلتا نہیں کیوں خوں اُگلتی ہے شفق

لطف و نشاط و عیش پر میں مطمئن ہوں کس طرح
پلٹی جہاں تیری نظر اُلٹا زمانے کا ورق

حسنِ اثر کی وجہ سے تنویر کتنی بڑھ گئی
یوں دل میں تیری یاد ہے جیسے نگیں میں ہو طبق

خنجر نے وقتِ امتحاں دونوں طرف ڈھایا ستم
میں خون میں تر ہو گیا اور آ گیا اُن کو عرق

آدابِ حسن و عشق سے تھی آگہی منصور کو
کہہ کر انا الحق ہو گیا ناحق سزا کا مستحق

دنیا کے شاکی سب رہے لیکن رہا یہ فرق بھی
جتنا تعلق جس کو تھا اُتنا ہوا اُس کو قلق

سیلابِ غم میں ڈوب کر بحرِ فنا میں ڈوبنا
اے نوحؔ اب تک یاد ہے سب کو وہ طوفانی سبق

ک

طبع زاد ۲۵ فروری ۱۹۲۶ء

ج

جہاں میں ہر شے ہے آنی جانی نشاطِ غم اضطراب کب تک
یہ جوش کب تک امنگ کب تک ترنگ کب تک شباب کب تک

جو ہے انھیں شوقِ خود نمائی تو آہی جائیں گے سب کے آگے
رہیں گے پردے میں وہ کہاں تک نبھے گا اُن کا حجاب کب تک

کہاں وہ ساغر کہاں وہ مینا مگر وہی تشنگی ہماری
شراب نوشی کی حد ہے کوئی پلائے کوئی شراب کب تک

ہمیں ذرا بھی خبر نہیں ہے کہ آگیا آفتاب سر پر
جو دل ہو بیدار تو یہ سوچیں سکون و آرام و خواب کب تک

یہ ہم لڑکپن میں چاہتے تھے کہ جلد آ جائے کہیں جوانی
شباب میں اب یہ سوچتے ہیں کہ ٹھہرا اپنا شباب کب تک

نقاب چہرے سے وہ اٹھائیں کہ حسن ان کو خدا نے بخشا
عیاں نہ ہو ماہتاب کیوں کر نہاں رہے آفتاب کب تک

سکونِ خاطر کے واسطے ہم دوا کریں گے دعا کریں گے
ہمیں محبت میں دیکھنا ہے نہ جائے گا اضطراب کب تک

جو ہوگی تحصیلِ علم کی خواہش تو شوق بھی ہوگا درسِ غم کا
پڑھیں گے الفت کے مدرسے میں ہم ابتدائی کتاب کب تک

اگر ہو ملنا تو ہم سے ملئے نہ ہو جو ملنا تو صاف کہئے
سلام کب تک پیام کب تک سوال کب تک جواب کب تک

کہیں نہ آ جائے جہاں پر آفت کہیں نہ ہو جائے غرق عالم
جنابِ نوح اپنے اشک روکیں یہ جوشِ طوفانِ آب کب تک

گ

طبع زاد ۴ ستمبر ۱۹۳۴ء

کیا کہوں ہم نشیں یہ میرا بھاگ
ایک جان اور سیکڑوں کھٹراگ

پھر کبھی مے سے توبہ کر لوں گا
اب تو بوتل کا کھل گیا ہے کاگ

دیدہ و دل کی بجھ نہیں سکتی
اُس میں پانی ہے اور اِس میں آگ

کر کے وہ ذکرِ جور ڈھائیں گے
تار بولا کہ ہم نے بوجھا راگ

اب خزاں میں کہاں وہ رنگِ چمن
جلد تر لُٹ گیا دُلھن کا سہاگ

مفلسی میں ہے دل امیروں کا
ہم لنگوٹی میں کھیلتے ہیں پھاگ

دل ہمارا بتوں کو بھول گیا
اب نہ کاشی نظر میں ہے نہ پراگ

چور سے کہہ رہے ہیں چوری کر
اور وہ کہہ رہے ہیں ساہ سے جاگ

شعلہ رو میں نے کیوں کہا اُن کو
اور بھی ہو گئے وہ سُن کر آگ

بزمِ عیش و نشاط ہو گئی ختم
اب کہاں راگنی کہاں وہ راگ

کیوں سنبھلتا نہیں مزاج اپنا
ہے دوا و مرض میں شاید لاگ

سب ترے دوست سب مرے دشمن
اک مرا بخت ایک تیرا بھاگ

کوئی لحظے کو بھی نہیں رُکتا
توسنِ عمر کی ہے ڈھیل باگ

قول دے کر ترا مکر جانا
مجھ سے اِتنا لگاؤ اتنی لاگ

ہے جدھر میری منزلِ مقصود
میں اُدھر جا رہا ہوں بھاگا بھاگ

میں نے دیکھا یہ بزمِ عالم میں
اپنی ڈفلی ہے اور اپنا راگ

موسم گل ابھی نہیں آیا — چل دیئے گھر میں ہم لگا کر آگ
روز ملتے ہیں منہ پر اپنے بھبوت — عشق میں ہم نے لے لیا بیراگ
دل لگا کر مجھے ہوا معلوم — عشق میں ہیں بڑے بڑے کھٹراگ

ان کو طوفانِ خلق سے کیا ڈر
حضرتِ نوح ہیں پرانے گھاگ

ل

۱۹ر دسمبر ۱۹۲۸ء

ج

بہار میں نہ پیئے ہر شجر بھی کیوں کر پھول — شراب اوس ہے مے خانہ باغ ساغر پھول
کھلے بھی خلق میں مرجھا گئے بھی اکثر پھول — یہ بے ثبات چمن ہے نہ اس چمن پر پھول
صبا یہ خوشی خبری دے گئی کھلا کر پھول — کہ باغ باغ ہوا باغ باغ کا ہر پھول
کبھی نکھار رنگ کسی کا کبھی کسی کی بہار — ریاضِ حسن میں کھلتے رہے برابر پھول
نگاہِ غور سے دیکھے کوئی حسینوں کو — یہی ہیں چرخ پر انجم یہی زمیں پر پھول
بہار آ گئی بن جائے اب عروسِ بہار — چمن کے واسطے ہر شاخ ہر کلی ہر پھول
یہ نازکی یہ لطافت یہ رنگ اُن میں نہیں — تمھارے سامنے آئیں گے خاک پتھر پھول
برائے شرکت ماتم فرشتے آ پہنچے — کسی شہیدِ محبت کے ہیں مقرر پھول
فنا کے بعد بھی دو ہیں خواہشیں میری — جلا دے شمع کوئی قبر پر چڑھا کر پھول
ہم اپنے داغ جگر کو جگر سے کیوں نہ لگائیں — کہ باغ عشق وفا میں یہی ہے بہتر پھول
نہ خاک اُڑائی نہ وحشت میں خاک ہی چھانی — گئے ابھی سے مرے ہاتھ پانو کیوں کر پھول
تری نگاہ میں ہر خار گل ہے اے بلبل — مرے خیال میں کانٹا ہے باغ کا ہر پھول
بیانِ آتشِ الفت تمام ہی نہ ہوا — مری زبان سے نکلا کئے برابر پھول
ریاضِ حسن میں یہ امتیاز ناممکن — وہ پھول سے ہیں فزوں تر کہ اُن سے بہتر پھول
ہمارے داغ جگر کو فنا نے شہرت دی — مہک چمن سے ہے باہر چمن کے اندر پھول
بہار آئی کہ فرمانِ مے کشی آیا — چمن میں مست ہوا پھول پھول پی کر پھول
تمھارے سامنے میری نظر میں کچھ بھی نہیں — چراغ آئینہ خورشید ماہ اختر پھول
جنوں میں خوفِ گراں باری جفا کیسا — ہمارے واسطے ہیں کنکر اور پتھر پھول

جو فرقِ عز و مراتب روا نہیں رکھتے
نظر تو آتے ہیں لیکن نظر نہیں آتے

وہ یہ بھی کہہ دیں کہ چاندی کے ہیں برابر پھول
زمین پہ کبھی تارے کبھی فلک پہ پھول

جنابِ نوحؔ نے اکیس ۲۱ گل کھلائے ہیں
مگر ہے رنگ میں ہر پھول سے جدا ہر پھول

پوچھتے رہتے ہیں وہ خود اپنے دیوانے کا حال

۳۰؍ دسمبر ۳۳ء کو دوسرا مشاعرہ بھرجی بی کالج مظفر پور میں ہوا۔ کچھ پتہ راہ کا نہ منزل کا مفصل حالات مشاعرہ اس غزل کے عنوان پر درج ہیں

کس طرح دل سے بھلا دیں اپنے ویرانے کا حال | ج | یہ ہے ماضی یہ ہے مستقبل یہ دیوانے کا حال
کیا کہوں اے محتسب میں تجھ سے مے خانے کا حال | آتے جاتے دیکھ چلتے پھرتے پیمانے کا حال
گل بھی رخصت شمع بھی غائب عزاداری بھی ختم | پھر ہیں ظاہر ہوا لوگوں کے یارانے کا حال
قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری | جانتے ہیں ساقی و مے کش ہی پیمانے کا حال
شمعِ سوزاں نے لگا دی آگ سب کے سامنے | اہلِ محفل پر نہ کیوں روشن ہو پروانے کا حال
آٹھویں دسویں نکل جاتا ہوں جب میں اس طرف | کعبے والے پوچھتے ہیں مجھ سے بت خانے کا حال
خود بخود رونا کبھی پھر خود بخود ہنسنا کبھی | مختصر لفظوں میں ہے یہ تیرے دیوانے کا حال
موسمِ گل میں نکالے مے کدے سے ہاتھ پاؤں | ہو گیا اب اور سے کچھ اور پیمانے کا حال
ماجرائے قیس میرے ذہن میں محفوظ ہے | ایک دیوانے سے سنیئے ایک دیوانے کا حال
فصلِ گل میں قلقلِ مینا کے نغمے قہر تھے | وجد وہ توبہ کا اے ساقی وہ پیمانے کا حال
ایک اک ذرّہ گرفتارِ مصائب آپ ہے | ہم کہیں ایسے میں کس سے اپنے ویرانے کا حال
حال اُن کا پوچھتا پھرتا تھا دیوانہ کبھی | لیکن اب وہ پوچھتے پھرتے ہیں دیوانے کا حال
کیا کہیں زاہد کی تسبیحِ ریائی دیکھ کر | ہم کو ہے معلوم اس کے ایک اک دانے کا حال
بات گھر کی خاص گھر والوں سے چھپ سکتی نہیں | پھر ہمیں جانا ہے اپنے بت خانے کا حال
کام کر جائیں گی جوشِ عشق کی ناکامیاں | ہوگا وہ بے حال جو دیکھے گا دیوانے کا حال
سب خیال و خواب تھا وہ ارتباطِ حسن و عشق | ہے یہ دو فقروں میں اگلے پچھلے یارانے کا حال

خم لنڈھا کر نوحؔ نے طوفان برپا کر دیا
کون کہہ سکتا ہے اب کیا ہوگا مے خانے کا حال

حسبِ فرمائش گراموفون کلکتہ ۲؍ جون ۱۹۳۴ء

چاہتا ہے مبتلا سے دردِ دل | ج | دردِ دل ہو خود دوائے دردِ دل

بہرے کہنے تیرے سننے کے لئے
ہے وہی اک ماجرائے دردِ دل

حضرتِ عیسےٰ تو پہنچے چرخ پر
پوچھئے کس سے دوائے دردِ دل

دردِ دل کو کس لئے الزام دوں
میں ہوا خود مبتلائے دردِ دل

چپ ہمیشہ کے لئے ہم ہو گئے
اُن سے کہہ کر ماجرائے دردِ دل

اور ہوتا ہے یہ درماں سے سوا
کیا کرے کوئی دوائے دردِ دل

ہم نے مانا دردِ دل مٹ جائے گا
سوزِ دل ہوگا بجائے دردِ دل

کچھ محبت آپ نے کچھ ہم نے کی
یوں ہوئی نشوونمائے دردِ دل

اس کے سننے کو کلیجا چاہیئے
سُن چکے وہ ماجرائے دردِ دل

ہوگیا سارا جہاں بیمارِ عشق
چل گئی ایسی ہوائے دردِ دل

خوگرِ آزار مجھ سا کون ہے
ہوں ازل سے مبتلائے دردِ دل

غرقِ طوفانِ مصائب ہو گئے
نوحؔ تھے ناآشنائے دردِ دل

م

طبع زاد ۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء

ج

ربط اگر ہو آپس میں تو نہ اذیت پائیں ہم
جائیں ہم بلوائیں وہ آئیں وہ بلوائیں ہم

بے دردوں کی محفل میں جی کیوں کر بہلائیں ہم
آنا جانا بند ہوا اب خاک آئیں جائیں ہم

رازِ وفا و الفت پر کب پہنچی اوروں کی نظر
سمجھو تم سمجھا نہ دل سمجھے دل سمجھائیں ہم

شام کو آیا ہے کوئی صبح کو اٹھ کر چل دے گا
اترانے کی بات بھی ہو اس پہ کیا اترائیں ہم

نقشِ محبت سوزِ دل داغِ تمنا دردِ جگر
اِن کے مٹنے سے پہلے دنیا سے مٹ جائیں ہم

جانتے ہو تم خود اِتنا اب اتنے نادان نہیں
کیا ہے بری کیا بات اچھی کیا اس کو سمجھائیں ہم

حسن و عشق کی دنیا میں اپنی اپنی قسمت ہے
دل لے کر اتراؤ تم دل دے کر پچھتائیں ہم

تم جو یہ اکثر کہتے ہو لطف نہیں اب جینے کا
اور اِس سے مطلب کیا ہے کچھ کھا کر مر جائیں ہم

دل لے جاؤ شوق سے تم لیکن قولِ وفا دے کر
کچھ بے تابی کچھ ہو سکوں کچھ کھوئیں کچھ پائیں ہم

مٹ گئے سب اسبابِ طرب خون ہوا امیدوں کا
کیا کہہ کر اپنے دل کو ایسے میں سمجھائیں ہم

عذرِ ستم اقرارِ وفا یہ تو روز کے قصے ہیں
اور کچھ ایسی بات کہو جس سے خوش ہو جائیں ہم

ہر انسان کو موقع پہ ہنسنا رونا آتا ہے
پھول اُدھر برسائیں وہ اشک اِدھر برسائیں ہم

بے ہوشی کا درماں کب دور سے ہوتے دیکھا ہے
آپ قریب آ سکتے ہی نہیں آپ میں کیوں کر آئیں ہم

کیوں طوفان اُٹھاتے ہو غرقِ فنا کیوں کرتے ہو
نوحؔ جو ہم کو مل جائیں تو یہ انھیں سمجھائیں ہم

طبع زاد ۳ر جنوری ۱۹۴۲ء

رکھتے ہی نہیں اور حسینوں کی خبر ہم
دنیائے محبت میں جدھر آپ اُدھر ہم

پھرتے رہے بے کار اِدھر اور اُدھر ہم
دل میں نظر آتا کوئی کرتے جو نظر ہم

اے بے خودیِ جلوہ گہ ناز بتا دے
ہم کو نہیں معلوم کدھر دل ہے کدھر ہم

کعبہ ہو کہ بت خانہ ہو اے حضرتِ واعظ
جائیں گے جدھر آپ نہ جائیں گے اُدھر ہم

دنیا میں ہزاروں ہیں ترے چاہنے والے
کوئی بھی نہیں خوگرِ بیداد مگر ہم

دل میں تو نہ تھا پہلے سے کعبے کا ارادہ
پہنچے ہیں بھٹکتے ہوئے اللہ کے گھر ہم

دو گھونٹ بھی مے تیسرے چوتھے نہیں دیتا
ساقی کا یہ مطلب ہے پئیں خونِ جگر ہم

مانا کہ رسائی نہ ہوئی قربِ مکاں تک
کیا کم ہے یہی جان گئے آپ کا گھر ہم

آنکھیں تو ملیں سیرِ دو عالم کے لئے دو
رکھتے ہیں مگر سب کی طرف ایک نظر ہم

اوقاتِ نوازش جو مقرر نہ ہوئے تھے
بیٹھے رہے محفل میں تری آٹھ پہر ہم

کھل جائے بھرم عشق میں آدابِ وفا کا
بھولے سے بھی ہوں مائلِ فریاد اگر ہم

ہر دم وہی بیداد وہی ذوق وہی عشق
کس درجہ نڈر تم ہو نڈر دل ہے نڈر ہم

آئینے کی تقدیر خدا کیوں نہیں دیتا
یعنی رہیں ہر وقت ترے پیشِ نظر ہم

وہ جلوہ گہ ناز ہیں تشریف جو لائے
سب سے ہوئے پہلے ہدفِ تیرِ نظر ہم

وہ کہتے ہیں گھر سے جو ہمارے نہیں جاتے
تو اس سے غرض کیا ہے رہیں آپ کے گھر ہم

شعلہ وہ اٹھا دل سے کہ ٹھنڈے ہوئے جل کر
اے شامِ شبِ ہجر تھے کیا شمعِ سحر ہم

اِس سمت اگر دیر تو اُس سمت حرم بھی
سالک یہ کھڑے سوچتے ہیں جائیں کدھر ہم

اے نوحؔ محبت ہمیں وہ دن نہ دکھائے
زخمِ دلِ بے تاب ہو شرمندۂ مرہم

مشاعرہ شاہ جہاں پور ۴ر اپریل ۱۹۴۲ء

کس لئے پینے کو مانگیں بادہ و پیمانہ ہم
ہو گئے بدمست ساقی دیکھ کر مے خانہ ہم

کیوں کہیں اپنے کو سوزِ عشق سے بیگانہ ہم
تم جلاؤ ہم جلیں تم شمع ہو پروانہ ہم

کچھ دنوں صحرا الصحرا اب اڑائیں خاک بھی
مدتوں پھرتے رہے ویرانہ در ویرانہ ہم

وہ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں فرماتے رہیں
لیکن اپنے کو کہیں کس واسطے دیوانہ ہم

اس قدر بھر جائے پی کر جس قدر خالی کریں
چاہتے ہیں کوئی اس ترکیب کا پیمانہ ہم

اس طرح احساس آدابِ مقامی اٹھ گیا
بزم میں بلبل سے گل زار ہیں پروانہ ہم

سر بسجدہ کیوں نہ ہوتے اپنے دل کے سامنے
سن چکے تھے واقعاتِ کعبہ و بت خانہ ہم

قبلِ اظہارِ محبت دل طلب کرتے ہیں آپ
جرم سرزد ہو نہ ہو دے دیں مگر جرمانہ ہم

محفلِ ساقی کے چکر بے سبب ہوتے نہیں
ڈھونڈتے رہتے ہیں اپنے نام کا پیمانہ ہم

آرزوئیں چند نکلیں حسرتیں چند آ گئیں
خانۂ دل کو سمجھتے ہیں مسافر خانہ ہم

بزمِ سوز و ساز میں یہ بھی ہے دل سوزی کوئی
سیکڑوں پروانے جل جائیں کریں پروانہ ہم

مے کدے میں ہر گھڑی ساغر چھلکتا ہی رہے
جان لیں کیوں اس کو اپنی عمر کا پیمانہ ہم

جان بھی اب اُن کو دے دیں دل تو پہلے دے چکے
کیا کریں اس کے سوا اے ہمتِ مردانہ ہم

حسنِ مطلق کا نشاں کعبے میں تو ملتا نہیں
احتیاطاً آؤ چل کر دیکھ لیں بت خانہ ہم

اور کیا پیرِ مغاں دیتا سخاوت کا ثبوت
پا گئے خم مے کدے میں مانگ کر پیمانہ ہم

اس طرح سمجھا رہے ہیں وہ ہمیں آدابِ عشق
جیسے ہوں بالکل ہی ان اسرار سے بیگانہ ہم

گل بدامن ہے چمن ساغر بکف ہر شاخِ گل
کیوں نہ ایسے میں کریں اک نعرۂ مستانہ ہم

کشمکش دیر و حرم کی کس سے جھیلی جائے گی
ہے یہی بہتر کہ رکھیں مشربِ رندانہ ہم

دل کسی کو سونپ کر کیا دل کا غم اب کیجئے
لے چکے سودائے الفت دے چکے بیعانہ ہم

کیوں فلک سے آشیاں پر ٹوٹ کر گرتی نہیں
برقِ سوزاں کو سمجھتے ہیں چراغِ خانہ ہم

عمر بھر پامال یارانِ چمن کرتے رہے
گلشنِ ہستی میں تھے کیا سبزۂ بیگانہ ہم

ہو جو ان لفظوں میں وہ عہدِ محبت کچھ نہیں
نبھ سکے گا تو نباہے جائیں گے یارانہ ہم

بجھ چکی تھی شمعِ محفل اٹھ چکے تھے اہلِ بزم
کس سے کہتے قصۂ خاکسترِ پروانہ ہم

وقت جو گذرے جنوں میں قدر اس کی چاہیے
جوشِ وحشت تک ہے سب کچھ پھر نہ یہ صحرا نہ ہم

عمر بھر دریائے ذوق و شوق میں بہتے رہے
نوح اس طوفان سے رکھتے نہ کیوں یارانہ ہم

ن

طبع زاد

ہم عشق میں اُن مکاروں کے بے فائدہ جلتے بھُنتے ہیں
ہم کچھ نہ کسی سے کہتے ہیں ہم کچھ نہ کسی کی سُنتے ہیں
الفت کے فسانے پر دونوں سر اپنا اپنا دُھنتے ہیں
دل سا بھی کوئی ہم درد نہیں ہم سا بھی کوئی دل سوز نہیں
تقدیر کی گردش سے نہ رہا محفوظ ہمارا دامن بھی
آج آئیں گے کل آئیں گے کل آئیں گے آج آئیں گے
آہیں نہ کبھی منھ سے نکلیں نالے نہ کبھی آئے لب تک
مرغانِ چمن بھی میری طرح دیوانے ہیں لیکن فرق یہ ہے
ہو بزم طرب یا بزمِ الم ہر مجمع میں ہر موقع پر
گل زارِ جہاں کی نیرنگی آزار جنھیں پہنچاتی ہے
آزار و ستم کے شکووں کا جھگڑا بھی چکے قصہ بھی مٹے
گھبرا کے جو میں اُن کے در پر دیتا ہوں کبھی آواز انھیں

ق

مطلب جو ہمارا سُن سُن کر کہتے ہیں ہم اونچا سُنتے ہیں
بیٹھے ہوئے بزمِ کشش میں بس دل کے ٹکڑے چُنتے ہیں
ہم سُنتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم کہتے ہیں وہ سُنتے ہیں
ہم جلتے ہیں تو دل جلتا ہے دل بھُنتا ہے تو ہم بھُنتے ہیں
چُنتے تھے کبھی ہم لالہ و گل اب کنکر پتھر چُنتے ہیں
مدت سے یہی وہ کہتے ہیں مدت سے یہی ہم سُنتے ہیں
ہو ضبطِ تپِ الفت کا بُرا ہم دل ہی دل میں بھُنتے ہیں
میں دشت میں تنکے چُنتا ہوں وہ باغ میں تنکے چُنتے ہیں
ہم شمع کے شعلے کی صورت جلتے بھی ہیں سر بھی دُھنتے ہیں
کانٹوں کو ہٹا کر دامن میں وہ پھول چمن کے چُنتے ہیں
تم سے جو کہے کچھ بات کوئی کہہ دو اسے ہم کب سُنتے ہیں
تو کہتے ہیں وہ ٹھہرو دم لو آتے ہیں ابھی افشاں چُنتے ہیں

اے نوحؔ کہاں وہ جوش اپنا وہ طور اپنے وہ بات اپنی
طوفان اُٹھاتے تھے پہلے اب حسرت سے سر دُھنتے ہیں

لئے جاتا ہے پھر شوقِ اسیری مجھ کو زنداں میں

اس مشاعرے کا اعلان جو ۲۸ اگست ۱۹۱۸ء کو شاہ جہاں پور میں ہونے والا تھا ایک مہینہ پہلے بڑی دھوم دھام کے ساتھ منظور علی صاحب ارشادؔ نے کیا لیکن باہر سے شعرا بہت کم آئے اور جو تلہر وغیرہ سے لوگ آئے بھی اُن کو سخت تکلیف اُٹھانی پڑی مقامی شعرا میں سے سید تصدق حسین صاحب قرارؔ و حکیم منشی ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ کے علاوہ جناب بےباکؔ، رسواؔ، ارمانؔ اسحرؔ وغیرہ اور بدایوں سے جناب عطاؔ و خلیلؔ و زلالیؔ وغیرہ موجود تھے غزلیں قریب قریب سب اچھی تھیں لیکن مشاعرے کا رنگ خراب رہا کچھ دنوں کے بعد دوسرا مشاعرہ اسی طرح پر جناب مرزا عثمان غنی صاحب غنیؔ نے اپنی شادی میں کیا حسن منزل بیرون ٹولہ الہ آباد میں دس بجے رات کو شروع ہو کر پانچ بجے صبح کو ختم ہوا مقامی شعرا کے علاوہ جناب گوہرؔ اور ذرہؔ کان پور سے آئے تھے

اگر یہ جانتے تو ہم نہ روتے عشقِ جاناں میں
یہ کیسا تو ڑ تھا اُن کے نکیلے تیرِ مژگاں میں
جو نکلے حکمِ جاناں سے جو نکلے بزمِ جاناں میں
یہ دے گا کام اور اس پر جنوں کی پردہ پوشی کا
یہی دستور تھا پہلے یہی معمول ہے اب بھی

ق

جنابِ نوحؔ کی کشتی بھی ہوگی غرق طوفاں میں
چبھا میری رگِ دل میں رگِ دل سے رگِ جاں میں
وہی حسرت ہیں حسرت ہے وہی ارماں ہے ارماں میں
گریباں ڈال کر دیکھے تو منھ اپنا گریباں میں
اِدھر نکلا اُدھر پھر آ گیا میں بزمِ جاناں میں

خزاں میں پتی پتی دے رہی ہے درس عبرت کا
بھرے ہیں سیکڑوں مضموں ان اوراق پریشاں میں

ہمارے دل سے کیا ارمان سب اک ساتھ نکلیں گے
کہ قیدی مختلف میعاد کے ہوتے ہیں زنداں میں

جو اہلِ ذوق ہیں وہ لطف اٹھا لیتے ہیں چل پھر کر
گلستاں کا گلستاں میں بیاباں کا بیاباں میں

کسی کے وعدۂ فردا کو برسوں ہو گئے لیکن
چلی جاتی ہیں چوٹیں آج تک امید و حرماں میں

بڑھے دستِ جنوں تو ہم نے یہ کہہ کر انہیں روکا
گریباں ہی گریباں ہے نہیں کچھ بھی گریباں میں

عنادل کی تمنا اور کیا اس کے سوا ہو گی
خزاں جائے گلستاں سے بہار آئے گلستاں میں

جھجکتے ہیں اُدھر جاتے ہوئے اب راہ چلتے بھی
قیامت چھاؤنی چھائے پڑی ہے کوئے جاناں میں

اِدھر حسرت اسیری کی اُدھر کھٹکا رہائی کا
مناسب ہے مجھے چنوا دیں وہ دیوار زنداں میں

وطن جا کر وطن والوں سے کیا دل بستگی ہو گی
بڑا حصہ تو میری عمر کا گذرا بیاباں میں

اُدھر بجلی بھی دشمن اور اِدھر صیاد دو ہر بھی
خداوندا ہمیں کانٹا ہیں کیا سارے گلستاں میں

نکلتا ہوں اُدھر سے تو صدا رونے کی آتی ہے
ابھی کچھ مرنے والے جی رہے ہیں کوئے جاناں میں

چمن میں قطرۂ شبنم کی ہستی کوئی ہستی ہے
نہ ہونے کے برابر ہے مرا ہونا بیاباں میں

نکل کر اور قیدی تو سب اپنے گھر پہنچے
ہمیں اک رہ گئے آزار و غم سہنے کو زنداں میں

نتیجہ اشک باری کا جو یہ نکلا تو کیا نکلا
بہے جاتے ہیں خود بھی اب جنابِ نوح طوفاں میں

طبع زاد ۳۰ر جولائی ۱۹۱۸ء

کچھ لختِ جگر کچھ خونِ جگر کھا پی کے یہی ہیں جیتا ہوں
کیا کھاتا ہوں یہ کھاتا ہوں کیا پیتا ہوں یہ پیتا ہوں

سن سن کے مری تکلیفوں کو اوروں کے حواس اُڑ جاتے ہیں
مجھ کو تو اسی کی حیرت ہے میں عشق میں کیوں کر جیتا ہوں

کرتا ہوں گریباں کے ٹکڑے بعد اس کے اٹھاتا ہوں میں سے
پھر کر کے بہم ان پرزوں کو ان سب ٹکڑوں کو سیتا ہوں

توقیر محبت والوں سے پوچھیں وہ محبت والوں کی
جو دیکھ کر اُن کو مرتا ہے میں دیکھ کر اُن کو جیتا ہوں

جلسے کبھی گھر پہ ہوتے تھے ہر وقت چھلکتے تھے ساغر
اب آٹھویں دسویں بیسویں دن مے خانے میں چھپ کے پیتا ہوں

ق

اب اور کوئی دم ساز نہیں اب اور کوئی غم خوار نہیں
دل دیکھ کے مجھ کو جیتا ہے میں دیکھ کے دل کو جیتا ہوں

اوروں کو وہ ساغر دیتے ہیں اوروں کو ساغر دیتے تھے
میں گھونٹ لہو کے پیتا تھا میں گھونٹ لہو کے پیتا ہوں

اب بھی نہ اگر مانو مجھ کو تو قہر و غضب یہ ہے کہ نہیں
ہر شرطِ وفا و الفت کی تم ہارے ہو میں جیتا ہوں

طوفان بھرا ہے آنکھوں میں تیار ہیں آنسو بہنے پر
اے نوح اسی باعث سے میں اب اپنی پلکیں سیتا ہوں

طبع زاد ۵ر جنوری ۱۹۱۹ء

ق

ہزاروں رنج دل دے دے کے معشوقوں کو جھیلے ہیں
یہ پاپڑ کس نے بیلے ہیں یہ پاپڑ ہم نے بیلے ہیں

کسی کے عشق میں آزار کیا کیا ہم نے جھیلے ہیں
ہزاروں ہیں اگر کھٹراگ تو لاکھوں جھمیلے ہیں

یہ صورت ہے تو مشکل تر ہے ساحل آشنا
مرے دشمن مرے طوفانِ بحرِ غم کے ریلے ہیں

ضعیفی میں ہماری تلخ کامی بڑھتی جاتی ہے
یہ پچھلی عمر کے دن کس قدر کڑوے کسیلے ہیں

کبھی دل دے دیا ہم نے کبھی دل لے لیا ہم نے
محبت میں ہزاروں اِس طرح کے کھیل کھیلے ہیں

وہی عالم رہا مرقد میں بھی فرقت نصیبوں کا
یہ بے چارے اکیلے تھے یہ بے چارے اکیلے ہیں

قیامت میں نہیں سامان کچھ تفریحِ خاطر کا
سیہ کاری کی پرسش ہے گنہگاروں کے میلے ہیں

اگر شک ہو تو سمجھادوں اگر کہہ دے تو گنوا دوں
تری خاطر سے ہیں نے رنج دنیا بھر کے جھیلے ہیں

شہیدِ آرزو کا عرس شاید یوں ہی ہوتا ہے
ہماری قبر پر یاس و غم و حسرت کے میلے ہیں

وہ کہتا ہے نکلوا کر اِنھیں تم پھینک دو باہر
مری آنکھوں کے ڈھیلے کیا کوئی مٹی کے ڈھیلے ہیں

خدا جانے کیامت آئے کیا اہلِ قیامت پر
یہ وہ میلا ہے جس میلے میں لاکھوں ہی جھمیلے ہیں

اب اُن کا ذکر کرنا بھی مجھے تکلیف دیتا ہے
جگر نے غم اٹھائے ہیں جو صدمے دل نے جھیلے ہیں

عجب کیا اب جنابِ نوح کی کشتی بھی بہہ جائے
کہ طوفانِ محبت کے قیامت خیز ریلے ہیں

طبع زاد ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء

ق

سونا ہے مکان آپ کا معلوم نہیں کیوں
وہ بھیڑ نہیں شور نہیں دھوم نہیں کیوں

واقف ہے مرے دردِ محبت سے زمانہ
معلوم نہیں یہ تمھیں معلوم نہیں کیوں

بے ربط بہت ہے خطِ قسمت کی عبارت
اِس کا کوئی مطلب کوئی مفہوم نہیں کیوں

کیا کہتے ہو مجھ کو نہیں معلوم ترا حال
معلوم ہے معلوم ہے معلوم نہیں کیوں

کیا مر گئے کچھ کھا کے ترے چاہنے والے
اب نالہ و فریاد کی وہ دھوم نہیں کیوں

لینا تھا سبق ہم کو بھی آدابِ ستم کا
ظالم ترے در پر کوئی مظلوم نہیں کیوں

کیا مل گئی تھوڑی سی جگہ اُن کی گلی میں
پہلو میں مزارِ دلِ مرحوم نہیں کیوں

وہ پوچھتے ہیں مجھ سے وفا کہتے ہیں کس کو
سب کچھ تو ہے معلوم یہ معلوم نہیں کیوں

کہتے تھے کہ مرنے پہ ترے غم نہیں ہوگا
اب مر جو گیا میں تو وہ مغموم نہیں کیوں

الطاف و کرم میں ترے تخصیص یہ کیسی
محروم کوئی ہے کوئی محروم نہیں کیوں

سنتے ہیں کہ آرام پسِ مرگ ملے گا
گھبراتا ہے دل موت سے معلوم نہیں کیوں

ہو بھی تو زمانے میں کوئی پوچھنے والا
اسرارِ حقیقت ہمیں معلوم نہیں کیوں

لازم تو یہ تھا آپ ہی آکر وہ اٹھاتے
عاشق کے جنازے پہ کوئی دھوم نہیں کیوں

اے نوحؔ وہ بولے مرے قاصد سے بگڑ کر
شاعر کا یہ نامہ ہے تو منظوم نہیں کیوں

باقی ابھی کچھ خون کے قطرے ہیں جگر میں

اس طرح میور کالج الہ آباد کے ہندو بورڈنگ ہاؤس میں ۱۶ر نومبر ۱۹۱۹ء کو زیر صدارت پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی مشاعرہ ہوا کالج کے طلبا کے علاوہ سید محمد فاخر صاحب بیخودؔ، سید ماجد علی صاحب ماجدؔ وکیل الہ آبادی و جوہر صاحب زید پوری و مولانا نامری صاحب لکھنوی وغیرہ نے بھی اپنی اپنی غزلیں پڑھیں اس مشاعرے میں ہائی کورٹ کے تمام وکلا اور شہر کے معزز اصحاب عہدہ دار و اہل کا موجود تھے اور دو ہزار سے زیادہ آدمیوں کا مجمع تھا لیکن بدنظمی بھی بہت تھی اس میری غزل میں کچھ ہمارے اشعار اس غزل کے بھی ہیں جو پہلے دیوان سفینۂ نوح میں بہت زمانہ ہوا شایع ہو چکی ہے

کہتے ہیں جو کچھ ہو تو کہیں بھی وہ نظر میں
اللہ ہی اللہ ہے اللہ کے گھر میں

ق

تکلیف انھیں ہو نہیں سکتی مرے گھر میں
دل میں رہیں آنکھوں میں رہیں وہ کہ نظر میں

اتنا تو اثر آئے تری شوخ نظر میں
ناوک ہیں جگر ہو کبھی ناوک ہو جگر میں

یہ شرم انوکھی ہے یہ پردہ ہے نرالا
چھپتے ہیں وہ آنکھوں سے جو پھرتے ہیں نظر میں

شاید وہ کبھی سوزنِ مژگاں سے نکالیں
ہم پھانس چبھو لیتے ہیں خود اپنے جگر میں

کہنے کو تو دونوں کی وہی ایک نظر ہے
ہے فرق مگر میری نظر اُن کی نظر میں

آنکھوں میں پہنچ کر کبھی بن جائیں گے آنسو
جتنے یہ مرے خون کے قطرے ہیں جگر میں

تم جاؤ مرے دل سے کہ ہوتا ہے مجھے وہم
کیا گھر نہیں ان کے جو یہ ہیں اور کے گھر میں

تصویر سے کھلتی ہے مصور کی حقیقت
اللہ کی قدرت نظر آتی ہے بشر میں

جو مٹ نہیں سکتا کبھی جو بھر نہیں سکتا
وہ داغ مرے دل میں ہے وہ زخم جگر میں

اے نوحؔ پڑھو اور بھی کوئی غزل ایسی
جو دل میں اُتر جائے سما جائے نظر میں

کیوں کر اسے مانوں کہ ہے دل اُن کی نظر میں
رکھتا ہی نہیں مال کوئی لوٹ کا گھر میں

فرماتے ہیں وہ دیکھ کے حیراں مجھے گھر میں
دیوار کہاں سے یہ کھڑی ہو گئی در میں

کیا ہو مری توقیر لٹیروں کی نظر میں
کوڑی بھی کفن کو نہیں محتاج کے گھر میں

یہ حسن یہ انداز یہ صورت یہ جوانی
تم خود نہ سما جاؤ کہیں اپنی نظر میں

مسجد میں مناسب نہیں مے خوار کو پینا
اوّل تو بُرا کام پھر اللہ کے گھر میں

فریاد بھٹکتی ہی پھری دل سے نکل کر
ملتا نہیں آرام مسافر کو سفر میں

مشتاق نگاہیں رہیں جلوے سے بھی محروم
دولت ہے ترے حسن کی آئینے کے گھر میں

تلوار کمر سے نہ بندھی ہے نہ بندھے گی
قدرت وہ خدا کی ہے جو آہی نہیں سکتی
دیکھے کوئی اُس وقت پتنگوں کا تماشا
رُکتے ہوئے تنتے ہوئے لڑتے ہوئے دیکھا

کیوں کر وہ لگائیں گے گرہ تار نظر میں
اور ایک بشر فہم بشر عقل بشر میں
جب کچھ بھی نہ رہ جائے ضیائے شمع سحر میں
تھوڑی سی برائی بھی ہے آنکھوں کی نظر میں

اے نوحؔ جو میں روؤں تو بہتی پھرے دنیا
طوفان بھرا ہے وہ مرے دیدۂ تر میں

انجاز اہر وہہ کے لئے ۸ مئی ۱۹۲۱ء کو یہ غزل کہی گئی

قیامت کا کلیجا آپ کے پنجے رکھتے ہیں
ہم اپنے دل کے پردے میں تری تصویر رکھتے ہیں
فغاں میں آہ میں فریاد میں تاثیر رکھتے ہیں
جو انداز نظر میں قوتِ تسخیر رکھتا ہے
کبھی زنداں میں پھر شاید ضرورت پیش آجائے
کلیجے کے قریں آنکھوں کے آگے دل بہلنے کو
انھیں احساس ہی تکلیف و راحت کا نہیں ہوتا
بتوں سے دوستی کیا ہو بتوں سے واسطہ کیوں ہو
یہ ممکن تھا کہ اقرار زبانی سے مکر جاتے
لڑیں جس سے نگاہیں پھر اُسے زندہ نہیں دیکھا
اب اور اِس سے زیادہ احترامِ حسن کیوں کر ہو

ج

کوئی ترکش میں رکھتا ہے یہ دل میں تیر رکھتے ہیں
بڑے تقدیر والے ہیں بڑی تقدیر رکھتے ہیں
زمیں والے بھی کیا کیا آسمانی تیر رکھتے ہیں
وہ سن رکھے کہ ہم بھی آہ میں تاثیر رکھتے ہیں
ہم اپنے پاؤں کی اُتری ہوئی زنجیر رکھتے ہیں
کوئی رکھے نہ رکھے ہم تری تصویر رکھتے ہیں
خدا رکھے عجب دل عاشقِ دلگیر رکھتے ہیں
پرستش کے لئے ہم آپ کی تصویر رکھتے ہیں
سند میں ہم تمھارے ہاتھ کی تحریر رکھتے ہیں
حسینانِ جہاں آنکھوں میں کیا تاثیر رکھتے ہیں
کہ دل کے آئینے میں ہم تری تصویر رکھتے ہیں

نہیں معلوم انھیں تم دیکھتے ہو کیوں حقارت سے
جنابِ نوحؔ بھی تھوڑی بہت جاگیر رکھتے ہیں

رہ گئی ایک تمنا ہی تمنا دل میں

۶ر فروری ۱۹۲۳ء کو لشکر گوالیار میں ایک مشاعرہ عزیزی بدری پرشاد سلمہٗ خلف جناب عمدۃ الشعرا ناثر الملک منشی نارائن پرشاد مہر جانشین حضرت داغ دہلوی رح کی شادی کے موقع پر قاضی ریاض الدین صاحب ریاضؔ جیوری کے اہتمام سے ہوا مقامی شعرا میں سے جناب قمر مولوی ناصر حبیب صاحب ناصرؔ نبیرہ جناب مومنؔ دہلوی رح دریا صاحب دعا صاحب ہاشمی صاحب تاباں صاحب ڈاکٹر ضیا صاحب نازؔ صاحب موجؔ صاحب رعدؔ صاحب وغیرہ اور باہر کے مشہور شعرا میں سے دلؔ گیر صاحب اکبرآبادی وامقؔ صاحب جائسی و مخمور صاحب دہلوی وغیرہ موجود تھے صدارت کے لئے مجھے لوگوں نے تجویز کیا میں نے آخر میں غزل پڑھی۔

وہی عالم وہی عالم کا بکھیڑا دل میں
کوئی ہنگامۂ الفت نہ ہو برپا دل میں

ق

ایک دنیا میں ہے دل ایک ہے دنیا دل میں
آپ دل لے کے یہ اب چاہتے ہیں کیا دل میں

اُن کا پیکاں جو چُبھا میں یہی سمجھا دل میں
دل ہوا اور بھی شاید کوئی پیدا دل میں

دور سے پوچھتے ہو دل میں تمھارے کیا ہے
آ کے آغوش میں پوچھو کبھی ہے کیا دل میں

دل دیا تجھ کو اگر میں نے تو کس دل سے دیا
تو نے جانچا کبھی سوچا کبھی سمجھا دل میں

ہم سے وہ جلد ملے چھُپ کے ملے کھُل کے ملے
آج بھی دل میں یہ ہے کل بھی یہی تھا دل میں

دم نہیں جوش نہیں ذوق نہیں شوق نہیں
دل ہی دل اب ہے فقط پہلے تھا کیا کیا دل میں

کچھ رہے یا نہ رہے جی کے بہلنے کو رہے
شوق کا شوق تمنا کی تمنا دل میں

اور ہیں اِس کے سوا اِن کا ادب کیا کرتا
تیغ کو سر پہ لیا تیر کو رکھا دل میں

ناوکِ ناز نکل جائے کوئی پھانس نہیں
یہ مرے دل میں رہا ہے یہ رہے گا دل میں

تیر چھوٹے ہوئے ملنے کے نہیں اور کہیں
یا کلیجے میں مرے پاؤ گے تم یا دل میں

ہو گیا خارِ محبت کا نکلنا مشکل
یہی کانٹا ہے جگر میں یہی کانٹا دل میں

یہ بتاتے ہوئے آتا ہے کلیجا منھ کو
کیا مرے دل سے گیا اور رہا کیا دل میں

منھ سے تو کہتے ہو اچھا بھی بُرا بھی لیکن
تم بُرا مجھ کو سمجھتے ہو کہ اچھا دل میں

کثرتِ یاس سے اِس گھر کو بھی برباد کیا
اب وہاں غم ہے جہاں شوق کبھی تھا دل میں

رازِ الفت جو کھُلے گا تو ندامت ہوگی
فیصلہ کیوں نہیں کرتا کوئی دل کا دل میں

دعوتِ خارِ تمنا کی مجھے فکر ہوئی
کوئی قطرہ جو کبھی خون کا دیکھا دل میں

جان جائے گی غضب آئے گا مر جائیں گے
ہم نے دل دیتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا دل میں

آپ حسرت کو نکالیں بھی تو کیا ہوتا ہے
اِس سے رہنا اسے جینا اسے مرنا دل میں

بے دھڑک اہلِ محبت سے تو کرتے ہو طلب
دل ہے کیا چیز کبھی تم نے یہ سوچا دل میں

حضرتِ نوح بھی روکیں تو ہے رکنا دشوار
ہے وہ طوفان مرے دیدۂ دریا دل میں

طبع زاد ۱۴؍ ستمبر ۱۹۲۰ء

اُس بتِ کافر کو اِن کا دھیان کیا ہے کچھ نہیں
دین کیا ہے کچھ نہیں ایمان کیا ہے کچھ نہیں

ق

نذر کرنے کے لیئے سامان کیا ہے کچھ نہیں
جان ہے اب اور میری جان کیا ہے کچھ نہیں

خاک سے پیدا ہوا یہ خاک میں مل جائے گا
خاکدانِ دہر میں انسان کیا ہے کچھ نہیں

چاہتا ہوں میں کہ چاہیں آپ بھی دل سے مجھے
ہے یہی ارمان اور ارمان کیا ہے کچھ نہیں

ہر گھڑی ظلم و ستم ہر دم وہی قہر و عتاب
آپ کے نزدیک میری جان کیا ہے کچھ نہیں

میں فقیرِ بے غرض ہوں بے غرض کے واسطے
نفع کیا ہے کچھ نہیں نقصان کیا ہے کچھ نہیں

مرنے والے لُٹنے والے مِٹنے والے کے لئے
جان کیا ہے آن کیا ہے شان کیا ہے کچھ نہیں

تیغ نے گردن جدا کی موت نے لی جانِ زار
میرے سر پر آپ کا احسان کیا ہے کچھ نہیں

جب کہو قربان کردوں جب کہو کردوں نثار
یہ ذرا سا دل ذرا سی جان کیا ہے کچھ نہیں

کیا کہا ہم کو بہت کچھ غم زدوں کا دھیان ہے
تم کو اپنے غم زدوں کا دھیان کیا ہے کچھ نہیں

ہر حسیں پر اس کو مرنا اور لُٹے غم جھیلنا
دل سلامت ہے تو میری جان کیا ہے کچھ نہیں

سر پٹکنے کو فقط دو چار پتھر رکھ لئے
اور میرے گھر میں اب سامان کیا ہے کچھ نہیں

خیر جو ظلم و ستم کرنے تھے وہ تم نے کئے
پچھلی باتوں کا ہمیں اب دھیان کیا ہے کچھ نہیں

میں یہ ان سے کیوں کہوں تم عاشقوں کی جان ہو
جانتا ہوں عاشقوں کی جان کیا ہے کچھ نہیں

ہوگئی غرقاب دنیا بہہ گیا سارا جہاں
اب تو کہئے نوح کا طوفان کیا ہے کچھ نہیں

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس طرح یہ ۸ اپریل ۱۹۴۲ء کو الہ آباد میں میرے شاگرد بابو سکھ دیو پرشاد بسمل نے مشاعرہ کیا مقامی شعرا اور رؤسائے شہر سب موجود تھے

ق

گو ساتھ اُٹھا ساتھ چلا ساتھ پھرا میں
سائے کی طرح پھر بھی رہا اُن سے جدا میں

مجھ کو یہ تمنا تھی نہ ہوں ان کے جدا میں
پہلو سے چلے آپ تو دنیا سے چلا میں

اشکوں کی طرح آپ نے آنکھوں سے گرایا
اِس سے مجھے معلوم ہوا کچھ بھی نہ تھا میں

سر ہی نہ ہو تو کیا سرِ تسلیم جھکاؤں
دل ہی نہ ہو تو دوں اُنھیں کس دل سے دعا میں

ناراض اُدھر وہ بھی اِدھر دل بھی مخالف
جینے کی یہ شکلیں تھیں تو کیوں مر نہ گیا میں

دنیا نہیں کہتی نہ کہے دل تو کہے گا
برباد کیا آپ نے برباد ہوا میں

نکلا تو وطن میں کبھی پہنچا نہ پلٹ کر
اٹھا تو جنازے کی طرح گھر سے اٹھا میں

ہاتھوں کا اُٹھانا بھی ہوا جرم میں داخل
مطلب یہ ہے اللہ سے مانگوں نہ دعا میں

پھر بھی نہ ہوا ختم محبت کا فسانہ
سُنتے ہی رہے تم اِسے کہتا ہی رہا میں

دیکھیں نگہِ غور سے اربابِ تماشا
سب کچھ تھا مگر بعدِ فنا کچھ بھی نہ تھا میں

اِن میں سے کوئی دل کی تباہی کا سبب ہے
یا حسن ہو یا عشق ہو یا آپ ہوں یا میں

مقدار تو معلوم ہو تعداد تو کھل جائے
ایک ایک جفا تم گنو ایک ایک وفا میں

اپنا جنھیں سمجھے تھے انھیں اپنوں سے مل کر
بدنام ہوئے آپ کہ بدنام ہوا میں

تھا بھی تو کسی آنکھ کا ٹپکا ہوا آنسو
ہوں بھی تو کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا میں

انصاف سے فرمائیے ایمان سے کہئے
بے درد نہیں آپ تو بے درد ہوں کیا میں

گھر سے جو یکایک کوئی باہر نکل آیا / پردے کی طرح اُٹھ کے گرا گر کے اُٹھا میں

جینے کی دعا عشق میں دیتے ہیں مجھے خضر / کیا چاہتے ہیں دوں اُنھیں مرنے کی دعا میں

تھا حشر پہ موقوف جو دیدار کسی کا / انگڑائیاں لیتا ہوا مرقد سے اُٹھا میں

کہتے ہو ترا دل مری مٹھی میں کہاں ہے / آؤ تو مرے سامنے دیکھوں تو ذرا میں

آدابِ محبت میں کبھی فرق نہ آیا / جب تم سے ملا دل سے ملا جی سے ملا میں

اب تک ہے مجھے پاس وہی رسمِ وفا کا / دیتا ہوں اُنھیں مر کے بھی جینے کی دعا میں

محفل میں اگر حشر اُٹھانے کو وہ بیٹھے / طوفان اٹھانے کے لئے نوح اُٹھا میں

طبع زاد ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء

ج

مرے دل کی خطائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں / خطاؤں پر سزائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

کہاں سے میں کہاں آیا کہاں سے دل کہاں پہنچا / محبت کی ہوائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

نہیں معلوم کیا روزِ جزا پیش آنے والا ہے / قیامت میں سزائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

کوئی جیتا ہے اِن سے اور مرتا ہے کوئی اِن پر / لگاوٹ کی ادائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

علاجِ عشق سے اے چارہ گر تکلیف بڑھتی ہے / مرے حق میں دوائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

یہی کہتا ہے سُن سُن کر وہ اہلِ غم کے نالوں کو / فقیروں کی صدائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

اِدھر میری طبیعت بھی نہیں رکتی نہیں تھمتی / اُدھر اُن کی ادائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

چلو رندو بڑھو آؤ پیو پھر فصلِ گل آئی / یہ ساقی کی صدائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

کہیں ایسا نہ ہو بڑھ جائے پہلے سے جنوں میرا / گھٹائیں بھی ہوائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

قیامت کے جو منکر ہوں وہ دیکھیں میری آنکھوں سے / حسینوں کی ادائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

دمِ بے داد وہ اے نوح دل میں یہ سمجھ رکھئے / ہماری بددعائیں بھی قیامت ہیں قیامت ہیں

طبع زاد ۱۰ مئی ۱۹۲۲ء

ج

میں کسی شوخ کی گلی میں نہیں / زندگی میری زندگی میں نہیں

ہم وفا کی امید کیا رکھیں / کس میں ہو گی جو آپ ہی میں نہیں

کوئی کیسا ہے کوئی کیسا ہے / آدمیت ہر آدمی میں نہیں

تذکرہ ہی وفا کا سنتا ہوں / یہ کسی میں ہے یا کسی میں نہیں

اُس کا ملنا ہے اپنے کھونے پر
فی الحقیقت خدا خودی میں نہیں

کس سے پوچھوں کہ رات کیا گذری
اہلِ بزم اپنے ہوش ہی میں نہیں

وہ گھٹا آسمان پر اٹھی
عذر اب مجھ کو مے کشی میں نہیں

گفتگو اُن کی دوستی میں ہے
شک نہیں اُن کی دشمنی میں نہیں

بے خودی اور بے خودی کچھ اور
بے خودی کا مزہ خودی میں نہیں

کوئی چلمن اُٹھائے بیٹھا ہے
کوئی اپنے حواس ہی میں نہیں

غور سے دیکھئے تو سب کچھ ہے
کون سی بات آدمی میں نہیں

یہ بھی ہو وہ بھی ہو تو لطف آ جائے
کچھ نہیں لاگ اگر لگی میں نہیں

کون سا وصف کون سی خوبی
حضرتِ نوحؔ ناروی میں نہیں

مثالِ نقشِ پا میں کوئے جاناں میں ابھرتا ہوں

۹ مارچ ۱۹۲۱ء

یہ مشاعرہ بانکی پور پٹنہ میں درگاہ حضرت سید شاہ ارزاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ باہتمام جناب سید شاہ حامد حسین صاحب حامدؔ سجادہ نشین قریب گیارہ بجے رات کو شروع ہو کر پانچ بجے صبح کو ختم ہوا اس سال بہ نسبت سال گذشتہ کے مجمع بہت کم تھا اول تو تمام شہر میں وبائی شکایت تھی دوسرے آپس میں کچھ خانگی جھگڑے تھے تیسرے بوجہ شادی باہر کے شعرا نہیں بلائے گئے مقامی حضرات میں سے وحیدؔ صاحب سالکؔ صاحب مضطرؔ صاحب حسرتؔ صاحب شیداؔ صاحب شبیرؔ صاحب کاملؔ صاحب عزیزؔ صاحب اور باہر کے شعرا میں سے عیشؔ صاحب داناپوری آزادؔ صاحب سہسرامی جناب بدرؔ صاحب قتیلؔ صاحب فگارؔ صاحب سیفؔ صاحب آروی نویدؔ صاحب اعظمؔ صاحب الہ آبادی وغیرہ موجود تھے قریب قریب سب کی غزلیں اچھی رہیں اس بحر کی غزل میں پہلی یہ خصوصیت ہے کہ سب اشعار مطلع ہیں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی قافیہ میں پوری غزل ہے تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پہلے مطلع کے پہلے مصرع میں وہی ہر مطلع کے ہر پہلے مصرع میں قافیہ ہے چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اگر پہلے مصرع کو دوسرا مصرع اور دوسرے مصرع کو پہلا مصرع قرار دیا جائے جب بھی ربط عبارت اور ترکیب الفاظ اور خوبیٔ بندش کے لحاظ سے ہر مطلع با معنی اور اپنی جگہ درست ہو جاتا ہے پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اگر ہر مطلع کے پہلے مصرع کو دوسرا مصرع اور دوسرے مصرع کو پہلا مصرع مانا جائے تو اس صورت میں بھی تمام مطلع ایک ہی قافیہ میں ہوں گے

کسی کے عشق میں یوں خضر کی تردید کرتا ہوں
جو وہ جینے پہ مرتے ہیں تو میں مرنے پہ مرتا ہوں

ق

ترے آگے کبھی شکوہ کبھی میں آہ کرتا ہوں
یہ کیوں کرتا ہوں اس باعث سے کرتا ہوں کہ مرتا ہوں

چلو یوں ہی سہی میں اس سے کب انکار کرتا ہوں
جو مرتا ہوں تو مرتا ہوں نہیں مرتا تو مرتا ہوں

دفورِ ناتوانی سے کہاں فریاد کرتا ہوں
وہ عالم ہے کہ اب میں سانس لینے میں بھی مرتا ہوں

کہوں کیا عالمِ حیرت میں کیا میں کام کرتا ہوں
نہ ہنستا ہوں نہ روتا ہوں نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں

دفورِ ناامیدی میں قضا کو یاد کرتا ہوں
مرا مرنا عجب مرنا ہے میں مرنے پہ مرتا ہوں

یہ میں نے کب کہا ترکِ وفائے عشق کرتا ہوں
کسی پر جب بھی مرتا تھا کسی پر اب بھی مرتا ہوں

حسینوں سے زیادہ عاشقوں کی قدر کرتا ہوں
محبت میں جو مر جاتے ہیں میں تو اُن پہ مرتا ہوں

تڑپ جاتا ہوں میں اُن سے جو ترکِ عشق کرتا ہوں
یہ عادت بھی عجب شے ہے نہیں مرتا تو مرتا ہوں

لبِ جاں بخش سے یہ خوش مذاقی روز کرتا ہوں
وہ مجھ کو پھر جلا دیتا ہے میں پھر اُس پہ مرتا ہوں

خیالِ یار کو دل سے کہاں میں دور کرتا ہوں
اِسی کے ساتھ جیتا ہوں اِسی کے ساتھ مرتا ہوں

محبت میں جواب مرنا پڑا تو آہ کرتا ہوں
تماشا جانتا تھا پہلے کہہ دیتا کہ مرتا ہوں

جو کستے ہیں وہ آوازے تو میں افسوس کرتا ہوں
شبِ غم کس لئے جیتا رہا اِس غم میں مرتا ہوں

کسی کی آرزو میں زندگی برباد کرتا ہوں
زمانہ موت سے مرتا ہے میں بے موت مرتا ہوں

دعائیں صدقِ دل سے وقتِ آخر بھی یہ کرتا ہوں
مرے اللہ وہ جیتے رہیں میں جن پہ مرتا ہوں

جفا و جور کی فریاد میں کب اُن سے کرتا ہوں
نہیں ملتا جو غم مجھ کو تو اِس غم میں بھی مرتا ہوں

تغافل سے گلہ اغماض سے فریاد کرتا ہوں
وہ فرماتے ہیں کل میں آؤں گا میں آج مرتا ہوں

محبت ہے مری تم کو بھی میں تصدیق کرتا ہوں
یہی سنتا ہوں مرتے ہو یہی کہتے ہو مرتا ہوں

کہاں میں بےخودیِ شوق میں فریاد کرتا ہوں
مجھے یہ بھی نہیں معلوم جیتا ہوں کہ مرتا ہوں

شبِ غم سیکڑوں آزار سہہ کر صبح کرتا ہوں
نہ مجھ کو موت آتی ہے نہ میں بے موت مرتا ہوں

جو دیتا ہے مجھے تو حکم میں وہ کام کرتا ہوں
ترے کہنے سے جیتا ہوں ترے کہنے سے مرتا ہوں

سفر نارے سے پٹنے کا جو یوں ہر سال کرتا ہوں
خلوصِ حضرتِ حامد پہ میں اے نوحؔ مرتا ہوں

طبع زاد ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء

ج

ہم اِس خیالِ وفا میں رہیں رہیں نہ رہیں
بتوں کا ظلم خدا سے کہیں کہیں نہ کہیں

جو دردِ دل ہو تو آنسو کہیں بہیں نہ بہیں
یہ نکلیں نکلیں نہ نکلیں بہیں بہیں نہ بہیں

ابھی وہ حال دلِ بے قرار کا سن لے
کہ اپنے ہوش میں پھر ہم رہیں رہیں نہ رہیں

اُجاڑا گریۂ پیہم نے آشیاں میرا
جو سیل آئے تو تنکے بہیں بہیں نہ بہیں

جہاں کو دیدۂ عبرت سے دیکھ اے غافل
یہ منظر آج کے کل تک رہیں رہیں نہ رہیں

پہنچ گئے مرے دل سے نکل کر آنکھوں تک
اب اختیار ہے آنسو بہیں بہیں نہ بہیں

دل و جگر کو تمہارے سپرد کرتا ہوں
خبر نہیں کہ سلامت رہیں رہیں نہ رہیں

خیالِ ضبط کسے تابِ انتظار کہاں
بہیں گے لختِ دل آنسو بہیں بہیں نہ بہیں

کبھی جو حالِ مریضانِ غم کہا تو کہا
مری بلا سے وہ زندہ رہیں رہیں نہ رہیں

ادائے یار ذرا یہ مزاجِ یار سے پوچھ
ہم اپنے دل کی حقیقت کہیں کہیں نہ کہیں

وہ کہہ گئے کہ رہیں گے ترے گھر آئیں گے
اب آئیں آئیں نہ آئیں رہیں رہیں نہ رہیں

کبھی یہ سوچ ہے وہ کچھ سُنیں سُنیں نہ سُنیں
کبھی یہ فکر ہے کچھ ہم کہیں کہیں نہ کہیں

خوشی کی موت بھی دنیا میں ہے بشر کے لئے
ہم اُن کے سامنے زندہ رہیں رہیں نہ رہیں

فراقِ یار میں طوفان تو اُٹھے گا ضرور
جنابِ نوحؔ کے آنسو بہیں بہیں نہ بہیں

جلوۂ یار میرٹھ کے لئے ۲۵ر مئی ۱۹۲۲ء

ج

محفلِ یار اگر حشر کا میدان نہیں
تو مرے واسطے کیوں پھول نہیں پان نہیں

حسن والوں کا جسے پاس نہیں دھیان نہیں
وہ مری رائے میں حیوان ہے انسان نہیں

اور باتوں میں تو ہشیار ہو نادان نہیں
اہلِ عشق اہلِ ہوس کی تمھیں پہچان نہیں

دیکھنا تھا جو زمانے میں وہ ہم دیکھ چکے
مرگ کا شوق ہے اب زیست کا ارمان نہیں

سر بھی الفت میں گیا دل بھی گیا جی بھی گیا
جو بھرا جائے کسی سے یہ وہ نقصان نہیں

یوں ہوا محوِ خیالات کہ اللہ اللہ
دل تو کیا چیز ہے اپنا بھی مجھے دھیان نہیں

آپ کے عشق میں کیا خیر منائے کوئی
غم ہے تو دل نہیں جب دل نہیں تو جان نہیں

یہ غلط ہے کہ بُلانے سے چلے آئیں گے
ہیں وہ نادان مگر اتنے بھی نادان نہیں

دیکھ کر اسے نگہِ ناز بتانا مجھ کو
دل میں ارمان کوئی ہے کہ اب ارمان نہیں

دل نوازی کا مزا یہ ہے کہ دل ہی میں رہے
جو نکالے سے نکل جائے وہ ارمان نہیں

ہم نے یہ دیکھ لیا جانچ لیا جان لیا
جو رہی کر کے کوئی دل میں پشیمان نہیں

دل اُٹھا کر بھی وہی آپ دل آزار رہے
واقعہ یہ ہے کہ انسان ہر انسان نہیں

نوحؔ کے دوسرے دیوان کو بھی آپ پڑھیں
جو زمانے کو ڈبو دے یہ وہ طوفان نہیں

طبع زاد ۸ر ستمبر ۱۹۲۲ء

ج

تمھارے سامنے میں آہ آہ کیوں نہ کروں
جو دل میں راہ نہ پاؤں تو راہ کیوں نہ کروں

فلک جو مجھ کو ستائے تو آہ کیوں نہ کروں
تباہ ہو کر اُسے میں تباہ کیوں نہ کروں

لحاظ و پاس اب ایسا بھی کیا سرِ محفل
کوئی نگاہ کرے میں نگاہ کیوں نہ کروں

وفورِ غم میں یہ اکثر خیال ہوتا ہے
کہ آہ آہ کروں آہ آہ کیوں نہ کروں

وہ میرے سامنے آئے ہیں اور بیٹھے ہیں
نگاہ کیوں نہ اُٹھاؤں نگاہ کیوں نہ کروں

بہت دنوں سے تو ہے مرگ و زیست کا جھگڑا
اب اِس خیال کو بیں رو براہ کیوں نہ کروں

یہ باغ بانِ حقیقی کی یادگاریں ہیں / چمن میں وقعتِ برگ و گیاہ کیوں نہ کروں

نظر ملے جو نظر سے تو دل بھی دل سے ملے / تری نگاہ کی جانب نگاہ کیوں نہ کروں

بشر کے واسطے دونوں ہیں لازم و ملزوم / ثواب کیوں نہ کماؤں گناہ کیوں نہ کروں

وہی تو ہے مری ایذا کا دیکھنے والا / شبِ فراق خدا کو گواہ کیوں نہ کروں

یہ اختیار تو ہے اختیار سے باہر / چبھے جو تیر کلیجے میں آہ کیوں نہ کروں

قصور وار کو شرمِ قصور لازم ہے / کروں گناہ تو عذرِ گناہ کیوں نہ کروں

اسی لئے تو خدا سے ملی ہیں دو آنکھیں / جہاں میں سیر سفید و سیاہ کیوں نہ کروں

حریصِ لذتِ آزار میں ہوں ہر ساعت / شکایتِ ستم گاہ گاہ کیوں نہ کروں

لغت میں نوحؔ کے معنی جو ہیں وہ ظاہر ہیں / یہ نام ہو تو پھر نہیں آہ آہ کیوں نہ کروں

طبع زاد ۱۳ / مئی سنہ ۱۹۲۱ء

اہلِ الفت سے تنے جاتے ہیں / روز روز آپ بنے جاتے ہیں

ذبح تو کرتے ہو کچھ دھیان بھی ہے / خون میں ہاتھ سنے جاتے ہیں

روٹھنا اُن کا غضب ڈھائے گا / اب وہ کیا جلد منے جاتے ہیں

کچھ اِدھر دل بھی کھنچا جاتا ہے / کچھ اُدھر وہ بھی تنے جاتے ہیں

کیوں نہ غم ہو مجھے رسوائی کا / وہ مرے ساتھ سنے جاتے ہیں

دل نہ گھبرائے کہ وہ روٹھ گئے / چار فقروں میں منے جاتے ہیں

ہے یہ مطلب نہ چھیڑے کوئی / بیٹھے بیٹھے وہ تنے جاتے ہیں

بے وفاؤں سے وفا کی امید / نوحؔ نادان بنے جاتے ہیں

طبع زاد ۱۰ / اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء

مری فغاں میں اثر ہے بھی اور ہے بھی نہیں / اِدھر کسی کی نظر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

کوئی ملے گا یہ کیا ہم کہیں یقین کے ساتھ / برائے دل کی خبر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

ملا تھا حسن تو رہنا تھا دور دور اُسے / وہ رشکِ شمس و قمر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

امید و بیم میں الفت نے ہم کو ڈال دیا / علاجِ دردِ جگر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

کرم کے ساتھ ستم تھا جفا کے ساتھ وفا / نظر میں اُن کی نظر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

مرے خیال میں آؤ مری نظر میں پھرو / یہ اک طرح کا سفر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

جو پوچھتا ہوں تو اختر شناس کہتے ہیں | کہ شامِ غم کی سحر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

جنابِ نوح یہ کیا بار بار کہتے ہیں
وہ جوششِ دیدۂ تر ہے بھی اور ہے بھی نہیں

چلمن سے آپ رہیں کچھ مری پروا نہ کریں

اس طرح پر بسم اللہ کی تقریب میں جناب سید شاہ حامد حسین صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت سید شاہ ارزاں صاحب رح مقام بانکی پور پٹنہ عظیم آباد نے ۲۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو مشاعرہ کیا تھا نشست دس بجے رات کو شروع ہو کر تین بجے دن کو ختم ہوئی سامعین اور شعرا ملا کر چھ سات سو آدمی رہے ہوں گے

اہلِ الفت غم و آزار کا شکوا نہ کریں | ہوں جو ایسے وہ کبھی بھول کر ایسا نہ کریں

جس سے کم ظرف بنیں کام ہم ایسا نہ کریں | خم کے ہوتے ہوئے کیوں حسرتِ پیمانہ کریں

اس سے بے قدریِ آزار و جفا ہوتی ہے | ہر کسی پر ستم و جور وہ ڈھایا نہ کریں

دردِ عشق اور بھی درماں سے زیادہ ہوگا | خیر اسی میں ہے کہ تکلیف مسیحا نہ کریں

چپ رہو چپ رہو محشر میں یہ کیا خوب کہی | آج اور آج بھی ہم آپ کا شکوا نہ کریں

چشمِ مشتاق سے چہرے کا چھپانا کیسا | اس کے معنی یہ ہوئے ہم انھیں دیکھا نہ کریں

جلوۂ محفلِ عالم کے تماشائی ہوں | لیکن اتنا کہ ہم اپنے کو تماشا نہ کریں

اور کیا راز ہے چلمن میں یہی راز تو ہے | ہم کو دیکھا کریں وہ ہم انھیں دیکھا نہ کریں

عکس پر ہونے لگا وہم تماشائی کا | ہے یہ صورت تو وہ آئینہ بھی دیکھا نہ کریں

عشق اچھا ہے مگر عشق سے موت اچھی ہے | جان لے لیں وہ مرے دل کا تقاضا نہ کریں

گرم بازاریِ الفت کا سبب ہے تپِ عشق | اشک اس جلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا نہ کریں

آپ پوچھیں تو کبھی دل سے فسانہ دل کا | پھر ہم اظہارِ غمِ عشق کریں یا نہ کریں

اس توجہ کو عنایت کو نوازش کو سلام | اور یہ دل سے مرا حال وہ پوچھا نہ کریں

کتنے معذور ہیں بت خانے کے رہنے والے | سامنے ان کے ہو کعبہ بھی تو سجدا نہ کریں

ہو کوئی بات مگر میرے ستانے کے لئے | غیر ممکن ہے کہ وہ ظلم کا چرچا نہ کریں

اُن کو یہ فکر کہ دیکھے نہ یہ صورت میری | اور مجھ کو یہ تمنا کہ وہ پروا نہ کریں

گھونٹ دو گھونٹ سے کیا ہوگا ہمیں اے ساقی | اتنی دے آج کہ اندیشۂ فردا نہ کریں

ہے سکونِ دلِ بے تاب کی تدبیر یہی | چارہ گر دردِ محبت کا مداوا نہ کریں

اشک باری سے نکل جاتی ہے کچھ دل کی بھڑاس
کیا کریں نوح جو طوفان اُٹھایا نہ کریں

بارش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

۱۹ر اگست ۱۹۲۲ء کو اس طرح پر کرنیل گنج کان پور میں زیر صدارت جناب فصاحت لکھنوی مشاعرہ ہوا نو بجے رات سے شروع ہو کر یہ مشاعرہ پانچ بجے صبح تک رہا مشاہیر شعرا میں سے علاوہ فصاحت صاحب کے لیاقت صاحب خلف جناب فصاحت لکھنوی منشی امیر محمد خاں صاحب امیر مولوی عبدالحق صاحب عروج ابوالخیال جناب گوہر صاحب کان پوری۔ نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی وغیرہ شریک تھے بارش کی وجہ سے مجمع کم تھا پھر بھی چھ سات سو آدمی تھے

ج

"تکلیفِ عشق لائقِ شرح و بیاں نہیں
ہیں مبتلائے بارِ مصائب کہاں نہیں
آنسو نکل رہے ہیں تو نالے بھی ہوں بلند
جا بجو مجھے بھی میرے تصور کو جانچ کر
گردش ہے چرخ کو انھیں تنکوں کے واسطے
آتی ہزار بار قیامت جہان میں
روشن ہے مثلِ شمع مرے دل میں داغِ عشق
یہ کیوں کہا فلک کی شکایت فضول ہے
تخصیص کیا ہے اس کے لئے کوہِ طور کی
ہیں سو مصیبتوں میں گرفتار ہو گیا
کھل جائے رازِ عشق کبھی یہ مجال ہے
وہ حکم دے گئے تھے جو افشائے راز کا
صیاد آئے برق گرے آندھیاں اٹھیں
باغِ جہاں میں پھول تو سب ہیں خراب حال
کیا آپ پوچھتے ہیں مرے دل کے واقعات
ظالم کہا جو تم کو تو ہم نے بجا کہا
دیر و حرم میں خاک اڑانے سے فائدہ
میری فغاں نے پہلے ہی بڑھ کر جلا دیا

منہ میں زبان ہے مرے دل میں زباں نہیں
زیرِ زمیں تو ہوں جو تہِ آسماں نہیں
ہے کارواں مگر جرسِ کارواں نہیں
ہیں اس جہاں میں ہو کہ جہاں یہ جہاں نہیں
بجلی سے جو بچے وہ مرا آشیاں نہیں
مشکل یہ ہے کہ اُن کا قدم درمیاں نہیں
اس بند گھر میں پھر بھی ذرا سا دھواں نہیں
کیا آپ کا شریکِ ستم آسماں نہیں
آنکھیں جو ہوں تو اُس کی تجلی کہاں نہیں
آرام سے وہ ہیں جو ترے راز داں نہیں
آ جائے جو سمجھ میں وہ دل کی زباں نہیں
ہے دل میں درد اور زباں پر فغاں نہیں
ہیں مطمئن ہوں جب سے مرا آشیاں نہیں
تصویرِ گل کے واسطے خوفِ خزاں نہیں
یوں مٹ گیا کہ اب کوئی نام و نشاں نہیں
اس کا یقین بھی ہے گماں ہی گماں نہیں
پہلے یہ جانچ لوں وہ کہاں ہے کہاں نہیں
اب صرف ہے یہ حدِ نظر آسماں نہیں

اٹھتے ہیں بحث کیسے ہیں جو طوفاں سیکڑوں
اے نوح کیا خدا کی خدائی یہاں نہیں

سر بکف پھرتے ہیں ہم لیکن کوئی قاتل نہیں

گیا میں کانگریس کے موقع پر منشی جگیشور پرشاد صاحب خستہ نے ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو ایک جنرل مشاعرہ کیا تھا

جمعیۃ العلما کے پنڈال میں یہ مشاعرہ گیارہ بجے شب کو شروع ہو کر پانچ بجے صبح کو ختم ہوا داخلے کا ٹکٹ ایک روپیہ تھا علاوہ مقامی شعرا کے بسملؔ صاحب غنیؔ صاحب ڈاکٹر بانکے لال صاحب الٰہ آبادی مولوی تمنا صاحب پھلواروی جناب شفقؔ صاحب عماد پوری جناب سرؔ یر صاحب کابری شاہ واجد حسین صاحب وجدؔ مضطرؔ حسرتؔ وغیرہ روسائے پٹنہ وغیرہ موجود تھے آغاز مشاعرہ سے پہلے مولانا سلیمان صاحب ندوی نے شاعری کے متعلق ایک لمبی چوڑی تقریر فرمائی ہیں نے اپنی اسی غزل پر مصرع لگائے تھے مشاعرہ میں خمسہ ہی میں نے پڑھا تھا جو بہت پسند کیا گیا گورنمنٹ کی جانب سے بہت سے رپورٹر بھی تھے مشاعرے کا آغاز بسملؔ صاحب الٰہ آبادی کی غیر طرح غزل سے ہوا

اختلاف رنگ سے وہ رونق محفل نہیں
اب تمیز نیک و بد اے اضطراب دل نہیں
بزم ہستی میں ٹھہر کر ہم نے دیکھا ہر طرح
غرق ہو کر ڈوبنے والے کنارا پا گئے
اپنی حاجت بر کرے اوروں کی حاجت کا لحاظ
شوق کہتا ہے تجھے دنیا میں رہنا چاہئے
اے تمنائے شہادت خیر دیکھا جائے گا
یوں کبھی تو ہوتا ہے ظاہر اختلاف باہمی
بات ہی وہ کیا ہے جس کا اس قدر ہے انتشار
خوش مذاقی منحصر ہے انبساط طبع پر
رہ رو الفت کو مرقد ہی میں آئے گا قرار
جور پیہم باعث تسکین خاطر ہو گیا
عشق کی ایذا اٹھائے ہجر کی سختی سہے
بحر غم میں کشتی دل ہو ہی جائے گی تباہ
میں کروں ترک جفا کا ذکر تو کیا جان کر
بات بن کر بگڑتی ہے تو ہے اس میں یہ بات
روح نکلی اور خالی جسم میرا رہ گیا
کھینچئے آ کر ذرا پہلو سے تو کھل جائے راز
تیغ حاضر آپ بھی آمادہ دل بھی بے قرار
روشنی پھیلی تھی جس کی وہ ہے آنکھوں سے نہاں
وادی الفت میں رہ رو کس لئے ہوں بد حواس
ایک کے دم سے جہاں میں دوسرے کا ہے وجود

ج

دل تو ہے پہلو میں سب کے ایک سب کا دل نہیں
کچھ تصور ایسے میں ہو تو حرم میں شامل نہیں
اور ہے سب کچھ مگر ہاں انبساط دل نہیں
آشنا کہتے تھے بحر عشق میں ساحل نہیں
یوں ہمارا یوں تمہارا یوں کسی کا دل نہیں
عقل کہتی ہے مسافر یہ تری منزل نہیں
حیلہ جو قاتل ہے لیکن خنجر قاتل نہیں
متحد رسم کتابت میں حروف دل نہیں
حشر میں کہہ دیجئے گا ہم ترے قاتل نہیں
کیا لگاؤں دل کسی سے اب وہ میرا دل نہیں
یہ وہ منزل ہے کہ اس کے بعد پھر منزل نہیں
وہ ستم ایجاد میرے حال سے غافل نہیں
کھینچئے کا کلیجا اور دل کا دل نہیں
اس طرف یہ جا رہی ہے جس طرف ساحل نہیں
آپ کہہ دیں گے مری عادت میں یہ داخل نہیں
ڈالتے تھے جو اثر دل پر وہ اہل دل نہیں
محمل لیلیٰ تو ہے وہ لیلیٰ محمل نہیں
آپ کہتے ہیں کہ میرا تیر جز و دل نہیں
اب مری مشکل کی آسانی کوئی مشکل نہیں
اہل محفل کیا کریں شمع سر محفل نہیں
منزل مقصود ان کی اب کوئی منزل نہیں
دل نہیں تو ہم نہیں حسرتؔ نہیں تو دل نہیں

ہوگیا پیش اب ہمارے مرنے جینے کا سوال
یہ ہمیں مشکل ہو شاید وہ ہمیں مشکل نہیں

آپ کے غمزوں کو بھی آتے ہیں کیا کیا توڑ جوڑ
دل نہیں پہلو میں لیکن پھر بھی ہیں بے دل نہیں

اے دلِ مایوس بر آئے گی تیری آرزو
کوششیں ہیں شرط گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں

آپ اِس کو جانتے ہیں نوح میرا نام ہے
ساری دنیا کا ڈبو دینا مجھے مشکل نہیں

تڑپتے لوٹتے رہتے ہیں لاکھوں کوئے قاتل میں

۶ نومبر ۱۹۲۳ء کو اس طرح پر کرسچین کالج الہ آباد میں مشاعرہ ہوا مقامی شعرا قریب قریب سب موجود تھے

پھنسایا حسنِ عالم گیر نے اُن کو بھی مشکل میں
کہ دل ایک ایک کے پہلو میں وہ ایک ایک کے دل میں

ہزاروں قطرۂ خوں ہیں مری اک اک رگِ دل میں
کہاں تک جذب ہوں گے دامنِ شمشیرِ قاتل میں

مدائے عشقِ صادق پھنس گئے ہم سخت مشکل میں
کہ اُتنے نشترِ غم ہیں رگیں جتنی نہیں دل میں

یہ مطلب ہے کہ مضطر ہی رہوں میں بزمِ قاتل میں
تڑپنا لوٹنا داخل ہوا آدابِ محفل میں

اٹھیں کچھ آپ نے دیکھا ہمارے جذبِ کامل کا
اُدھر چھوٹے کماں سے اور اِدھر تیر آ گئے دل میں

بنے بے درد وہ بھی جو مرے ہمدرد بنتے تھے
بڑی مشکل سے کام آتا ہے کوئی سخت مشکل میں

اِدھر آ کر ذرا آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے
وہ نکتہ تو بتا دے جس سے دل ہم ڈال دیں دل میں

الٰہی کس سے پوچھیں حال ہم گورِ غریباں کا
کہ سارے اہلِ محفل چپ ہیں اس خاموش محفل میں

وہ سن کر نالہ و فریاد اُن کا مجھ سے فرمانا
یہ کیا معلوم تھا چھریاں بھری ہیں آپ کے دل میں

بدل دے اس طرح اے چرخ حسن و عشق کا منظر
پسِ محمل ہو لیلیٰ قیس ہو لیلیٰ کے محمل میں

بندھے شرطِ وفا کیوں کر نبھے رسمِ وفا کیوں کر
یہاں کچھ اور ہے دل میں وہاں کچھ اور ہے دل میں

جہاں پہنچے وہیں دو چار عاشق کر لئے پیدا
تمہاری دل فریبی نے پھنسایا ہم کو مشکل میں

یہ پیارے ناز یہ بانکی ادا یہ موہنی صورت
سما سکتے تو رکھ لیتا اٹھا کر میں تمہیں دل میں

ہمارے دل کی دنیا رہ گئی زیر و زبر ہو کر
قیامت ڈھا گیا زانو بدلنا اُن کا محفل میں

یہ کیا اندھیر ہے یہ کیا غضب ہے کیا تماشا ہے
مٹا دو بھی اسی دل کو رہو بھی تم اسی دل میں

تماشا ہم بھی دیکھیں ڈوب کر بحرِ محبت کا
اپاہج کی طرح بیٹھے ہیں کیا آغوشِ ساحل میں

دلِ ایذا طلب اپنا جو ٹھہرے گا تو ٹھہرے گا
کسی بے درد کے گھر میں کسی ظالم کی محفل میں

طریقہ اس سے آساں اور کیا ہے گھر بنانے کا
مری آغوش میں آ کر جگہ کر بیٹھئے دل میں

بڑھا اے نوح جب طوفان دریائے حوادث کا

تو غوطے دجلۂ غم نے دئے افکار ساحل ہیں

طبع زاد ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۴ء

بے تابیِ دل سے ہم یوں دشت میں پھرتے ہیں
گر گر کبھی اٹھتے ہیں اٹھ کر کبھی گرتے ہیں

اِس راہ میں گرتے ہیں اُس راہ میں گرتے ہیں
دل ہم کو نہیں ملتا ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں

ہر خارِ چمن سر پر رکھے انھیں پھرتے ہیں
پتے بھی درختوں سے گلشن میں جو گرتے ہیں

دنیا کے فریبوں سے کیا ہو انھیں آگاہی
دل ہی میں جو رہتے ہیں آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں

بے وجہ نہیں کھوتے جان اُن کے تمنائی
جب چاہ ستاتی ہے تو چاہ میں گرتے ہیں

دل کا یہ تقاضا ہے لے چلئے وہاں مجھ کو
عشاق جہاں جا کر زندہ نہیں پھرتے ہیں

اشکوں کے ٹپکنے پر تصدیق ہوئی اس کی
بے شک وہ نہیں اٹھتے آنکھوں سے جو گرتے ہیں

دنیا کی ہواؤں نے چکر میں انھیں ڈالا
جس سمت پھراتی ہیں اُس سمت وہ پھرتے ہیں

کیا باغ میں پھولوں پر گلچیں نے ستم توڑا
پر بازوئے بلبل سے بے ساختہ گرتے ہیں

ہیں فرطِ مسرت میں زندہ نہیں رہنے کا
کیوں قول مجھے دے کر وہ قول سے پھرتے ہیں

معلوم نہیں تم کو وقعت مرے اشکوں کی
پلکوں سے اٹھاتا ہوں آنکھوں سے جو گرتے ہیں

ہے خاتمہ ہونے کو تکلیف کی راتوں کا
اے نوح کوئی دن میں دن اب ترے پھرتے ہیں

ہمارا نام ہے مشہور دل لگانے میں

۱۷ر جنوری ۱۹۲۶ء کو اپنے کے ڈی کلب الہ آباد میں منشی گوری شنکر صاحب وغیرہ نے ایک مشاعرہ اس طرح پر کیا۔ شعرا بھی تھے جو غنی صاحب ایک مشاعرہ منعقدہ ۲۴ر جنوری ۱۹۲۶ء میں تھے یہ نشست بارہ بجے دن سے شروع ہو کر پانچ بجے شام کو ختم ہوئی ہزار بارہ سو آدمی تھے اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں

یہ تفرقہ یہ ستم یہ غضب زمانے میں
بہار باغ میں ہے میں ہوں قید خانے میں

خیالِ قدرتِ حق چاہیے زمانے میں
کہ ایک ایک ہے نخل ایک ایک دانے میں

وفا کو ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا زمانے میں
تمھیں یہ لفظ ملے گا مرے فسانے میں

یہ جان لو کہ خزاں آ گئی زمانے میں
چہل پہل نہ رہے جب شراب خانے میں

وہ کہہ رہا ہے جو کی ہو وفا تو میں بھی کروں
کسی کے ساتھ کسی نے کسی زمانے میں

یہ داغِ عشق یہ داغِ ستم یہ داغِ فراق
کئی طرح کے ہیں سکے مرے خزانے میں

چلو خوشی نہ ملی ہم کو رنج و غم ہی ملے
کسی طرح تو بسر ہو گئی زمانے میں

جو آئے گا بھی تو کیا لے گا وہ بت کافر
خدا کا نام ہے میرے غریب خانے میں

بُرا زمانے کو ہم اس لئے نہیں کہتے
کوئی ملول کوئی بدگماں کوئی مشتاق
بہارِ عمر کوئی باغ کی بہار نہیں
بنگاہِ غور سے میں دیکھتا ہوں تاروں کو
ہمیں ہیں وجہِ مسرت ہمیں ہیں باعثِ غم
بنگاہِ زاہدِ بدبیں پہنچ نہیں سکتی
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز
جگہ حرم میں نہ ہم کو ملی تو بیٹھ گئے

کہ ہے شمار تمھارا کبھی تو زمانے میں
اثر ہے تین طرح کا مرے فسانے میں
گئی زمانے سے اور آ گئی زمانے میں
یہ اُن کے ذرّے ہیں جو مٹ گئے زمانے میں
اگر ہمیں نہیں تو کچھ نہیں زمانے میں
شراب جم میں ہے خم ہے شراب خانے میں
رہے خیال زمانے کا ہر زمانے میں
بچھا کر اپنا مصلّےٰ شراب خانے میں

یہ واقعہ نہیں دنیا کو بھولنے والا
زمانہ غرق ہوا نوح کے زمانے میں

ہم سیر بھگوت باغ سے پہسروربہت کچھ رہتے ہیں

اس طرح ۲۴ جون ۱۹۲۶ء کو بھگوت باغ الہ آباد میں بسمل صاحب نے اپنا سالانہ مشاعرہ کیا اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں مقامی شعراء میں سے ضامن صاحب محمود صاحب بیدل صاحب گدا صاحب توبہ صاحب سید سر انوانی اعظم صاحب کراروی رونق صاحب گیاوی باہر کے لوگوں میں سے برق صاحب داناپوری و عابد صاحب گورکھپوری وغیرہ شریک مشاعرہ اکر ہوئے تھے

کب چرخ کا شکوہ کرتے ہیں قسمت کو بُرا کب کہتے ہیں
آ بیٹھے کبھی ان کی محفل میں منھ ان کا دیکھتے رہتے ہیں
کروٹ کے بدلنے پر اندا ہم اور زیادہ سہتے ہیں
تاریکیِ غم کی تکلیفیں آپس میں چمک کر سہتے ہیں
اقرارِ وفا پر دم بھر بھی مشکل سے وہ قائم رہتے ہیں
دریائے غمِ الفت میں ہم لہروں کے تھپیڑے سہتے ہیں
ہم تھپلیں سکھے ہم اُٹھائیں گے کہنے کو یہ سب کہتے ہیں
اور اہلِ وفا کب میری طرح محفل میں تری غم سہتے ہیں
ناکامیِ قسمت کا چرچا سن کر بھی بہت چپ رہتے ہیں
وہ چرخ ستم گر سے ہٹ کر ڈر کر دب کر کب رہتے ہیں
ہم اُٹھتے بیٹھتے محفل میں آزار اُٹھاتے سہتے ہیں
کیا اہلِ جفا و اہلِ وفا بے فکر و تردد رہتے ہیں
وہ میرے دل کے داغوں کو مُردہ غم کیوں کہتے ہیں

ج

غم ہو کہ خوشی ہو کچھ بھی ہو ہر حال میں ہم خوش رہتے ہیں
کس باعث سے اس باعث سے کیا راز وہ کس لیے کہتے ہیں
ناسور ہیں اپنے دل میں کئی کچھ رستے ہیں کچھ بہتے ہیں
انجم سے نہیں کم اشک ان کے راتوں کو جو ٹپکے رہتے ہیں
کچھ دل میں ہے کچھ منھ میں ہے کچھ کرتے ہیں کچھ کہتے ہیں
ہر وقت یہ کھٹکا رہتا ہے اب ڈوبتے ہیں اب بہتے ہیں
لیکن نہ سہے گا کوئی انھیں جو ظلم و ستم ہم سہتے ہیں
خوش آتے ہیں خوش جاتے ہیں خوش ہوتے ہیں خوش رہتے ہیں
میں نے تو کہا جو کہنا تھا اب دیکھیے وہ کیا کہتے ہیں
جو ظلم تمھارے سہتے ہیں بیداد تمھاری سہتے ہیں
رہنے کو تو رہتے ہیں لیکن رہنے کی طرح کب رہتے ہیں
جو سننا ہے جو کہنا ہے وہ سنتے ہیں وہ کہتے ہیں
ہو موسمِ گل یا عہدِ خزاں یہ پھول شگفتہ رہتے ہیں

حسن کہ مری الفت کا قصہ خاموش نہیں وہ رہتے ہیں — کچھ اور کہو کچھ اور کہو کچھ اور کہو یہ کہتے ہیں
تیروں کو نکالے بے پروا ہم خاص سبب سے کہتے ہیں — آج اس دل میں کل اس دل میں کس دل میں تم گھر کرتے ہیں
مانا کہ تغافل ناز حیا اوروں سے بھی کرتے رہتے ہیں — کہتی ہے اگر دنیا تو کہے ہم کیوں انھیں ظالم کہتے ہیں
صحرائے غم الفت میں ہم دن رات اذیت سہتے ہیں — یا ذرے گنتے رہتے ہیں یا تارے گنتے رہتے ہیں
آزار و ستم کے شکوؤں پر کیوں آپ بگڑتے رہتے ہیں — کہنے کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ کہنے والے کہتے ہیں

اے نوحؔ یہ برگ غنچہ و گل سب کھل کھل کر کہتے ہیں
خوش بھگوتی اُن سے رہتی ہے جو بھگوت باغ میں بستے ہیں

درد باقی غم سلامت ہے مگر اب دل کہاں

بشیر صاحب عابد صاحب محشر صاحب وغیرہ نے محتشم گنج الہ آباد میں ۲۶ جون ۱۹۲۶ء کو اس طرح پر ایک مشاعرہ کرنا چاہا تھا لیکن دو روز پہلے کچھ شورش ہندو مسلمان میں ہو گئی اس باعث سے میں نہیں گیا کچھ دنوں کے بعد یہی طرح اسلامیہ اسکول الہ آباد میں قرار پائی لکھنؤ سے ظریف صاحب آئے تھے لیکن طرح پر انھوں نے کچھ نہیں پڑھا اور شعرا نے غزلیں اپنی اپنی پڑھیں

بحر ذوق و شوق میں لطف سکون دل کہاں — ج — ناخدا کیسا سفینہ کس طرف ساحل کہاں
وہ مرے پہلو میں آئے بھی تو یہ کہتے ہوئے — دل کہاں ہے دل کہاں ہے دل کہاں ہے دل کہاں
پھر رہا ہوں سوزن ساعت کی صورت ہر طرف — یہ نہیں معلوم مجھ کو ہے مری منزل کہاں
آپ دیکھیں تو سہی پہلو ہمارا چیر کر — دل میں ہوگا اور ہوگا جوشش خون دل کہاں
آرزوئے قتل میں مجھ کو رہی یہ بے خودی — پوچھتا تھا خود ہی قاتل سے کہ ہے قاتل کہاں
اس قدر ہے یاد جاتے وقت وہ پہلو میں تھا — یہ نہیں معلوم بھول آئے ہم اپنا دل کہاں
اے تمنائے شہادت لوٹ لینی چاہیے — ہم تو پہنچے قتل گہ میں رہ گیا قاتل کہاں
خاک کر ڈالا جلا کر سوز عشق یار نے — داغ ہے دل کی جگہ پہلو میں اب ہے دل کہاں
سالکان جادۂ الفت کو اس سے کیا غرض — پہلی منزل کس طرف ہے دوسری منزل کہاں

اب خدا پر دھیان رکھو ناخدائی ہو چکی
نوحؔ بحر عشق میں کشتی کدھر ساحل کہاں

طبع زاد ۸ اگست ۱۹۲۶ء

قبر میں بھی مجھ کو آسائش نہیں تو کچھ نہیں — ج — آسماں کچھ ہو تو ہو لیکن زمیں تو کچھ نہیں
چارہ گر غم خوار مونس ہم نشیں تو کچھ نہیں — اُن کو لاتے مجھ کو لے جاتے نہیں تو کچھ نہیں
دست وحشت سے یہ کہتا ہے مرا جوش جنوں — جیب و دامن کی خبر لے آستیں تو کچھ نہیں
کس کی الفت کس کی حسرت کس کا غم کس کا خیال — دل ہی تک سب کچھ تھا جب دل ہی نہیں تو کچھ نہیں

دیکھنا ہے اب ہمیں تیر نگاہ ناز کو
یہ تمہارا خنجر چین جبیں تو کچھ نہیں

کیا کریں اہل جہاں کی بے ثباتی پر نگاہ
دیکھتے ہیں خود ہم اپنے کو ہمیں تو کچھ نہیں

بیخود وحشت کو رکھے اپنی حد میں کس طرح
نام ہی نام اس قدر ہے آستیں تو کچھ نہیں

ہم سے دنیا سے الگ دیکھا تری عقل کا رنگ
بس یہ ہنگامے یہیں تک ہیں کہیں تو کچھ نہیں

پھر بھی مل جاتی ہے مر کر اہل الفت کو جگہ
دیکھنے میں کوئے جاناں کی زمیں تو کچھ نہیں

تم کو ہوگی لاگ مجھ سے ہوگا اوروں سے لگاؤ
کیا بھروسہ اس نہیں کا یہ نہیں تو کچھ نہیں

دامن تر کو جلا کر پھونک دی فرد عمل
اے مرے ساقی شراب آتشیں تو کچھ نہیں

ظاہری اخلاق پر ہے مطمئن ہوں کس طرح
آپ کے دل میں مری الفت نہیں تو کچھ نہیں

چین کیا آرام کیسا یہ ہے سب کہنے کی بات
خاک ہونے کے سوا زیر زمیں تو کچھ نہیں

چاہ میں برتاؤ میں عادات میں اطوار میں
کیا کہیں اب دوسرے دل کو ہم کہیں تو کچھ نہیں

کیا کہا ہم بے بلائے آپ کے گھر آئیں گے
بات ہے دل چسپ لیکن دل نشیں تو کچھ نہیں

ہر طرف ہے جمع بزم یار میں سامان عیش
کیا سمجھ کر ہم کہیں جائیں کہیں تو کچھ نہیں

اور بھی درکار ہے کچھ بیہودہ میں حاضر کر دیا
یہ مری جان حزیں جان حزیں تو کچھ نہیں

خلد میں آتا ہے مجھ کو بزم جاناں کا خیال
تھی یہاں کی اس قدر شہرت یہیں تو کچھ نہیں

لوح سے طوفان اٹھا کر حشر برپا کر دیا
کچھ نہیں انسان اگر انجام بیں تو کچھ نہیں

فیض آباد ۲۷ ستمبر ۱۹۲۳ء

ج

ہم دشت نوردی سے پہلے کانٹے کھٹکتے ہیں
دریا کہیں تھمتا ہے رہرو کہیں تھکتے ہیں

برسات کی راتوں میں کیوں آپ جھجکتے ہیں
تارے جو ہیں پوشیدہ جگنو تو چمکتے ہیں

کیا لطف چمن آئے مشغوم محبت کو
خاروں کی طرح گل بھی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں

ساقی ترے ہاتھوں میں کیا جانئے شے کیا ہے
جو تم سے نہ چھلکے تھے ساغر سے وہ چھلکتے ہیں

جو بہتے تھے آنسو وہ کیسے نہ رکے تھے
آنکھوں سے نکل کر وہ مژگاں میں اٹکتے ہیں

کیا عشق کے داغوں سے جلنے لگے مرے دل کو
معلوم یہ ہوتا ہے انگارے دہکتے ہیں

[illegible]
رہ رہ کے تو کیا چھپا رہ پر بھی بھٹکتے ہیں

ہوں نزع کے عالم میں پوچھیں نہیں یاروں کا
سب دیدۂ حسرت سے صورت مری تکتے ہیں

[illegible]
مرغان چمن پھنس کر بے کار پھڑکتے ہیں

صحرا ہو کہ دریا ہو کاٹے ہوں [illegible]
اٹھائے کوئی لیکن وحشی کب اٹکتے ہیں

کیا داغ جگر میرے گل ہائے وفا ٹھہرے | جتنا وہ مسلتا ہے اُتنے یہ مہکتے ہیں

دریائے محبت میں ساحل ہی نہیں ہوتا
ہر سمت لیے کشتی کیوں نوح بھٹکتے ہیں

میری شب فراق کی شام ہے تو سحر نہیں

یہ طرح کوئنس کالج بنارس میں مقرر ہوئی تھی لیکن مشاعرہ ملتوی کر دیا گیا

ج

تاب نہیں سکوں نہیں دل نہیں اب جگر نہیں | اپنی نظر کدھر اُٹھے کوئی اِدھر اُدھر نہیں
روز و شب اُٹھتے بیٹھتے اُن کی زبان پر نہیں | کوئی نہیں کی حد نہیں شام نہیں سحر نہیں
کون یہاں سے چل دیا رونق بام و در نہیں | دیکھ رہا ہوں گھر کو میں گھر ہے مگر وہ گھر نہیں
اپنی خبر تو ہے ضرور لے گئے دل وہ چھین کر | کیا ہوا اُس کا پھر آگے اِس کی مجھے خبر نہیں
ایک اِدھر اُدھر بھی ہے ایک حدود میں رہے | تیری نظر تو ہے نظر میری نظر نظر نہیں
مجھ سے بگڑ کے اپنے گھر جائیے جب جائیے | آپ نے یہ سمجھ لیا آہ میں کچھ اثر نہیں
دیر کو ہم گھٹائیں کیوں کعبے کو ہم بڑھائیں کیوں | کیا ہے خدا کا گھر یہی کیا وہ خدا کا گھر نہیں
پردے سے باہر آئیے رخ سے نقاب اُٹھائیے | تاب جمال لا سکے اپنی مری نظر نہیں
مجھ کو خیال روز و شب خاک رہے مزار میں | ایسی جگہ ہوں جس جگہ شام نہیں سحر نہیں
تیغ کہو سناں کہو قہر کہو بلا کہو | اہل نظر کی رائے میں اُن کی نظر نظر نہیں
ڈر گئے اہل انجمن تیر جو آپ کا چلا | اِس نے کہا اِدھر نہیں اُس نے کہا اُدھر نہیں
وعدۂ حشر کر چکے تم مجھے قول دے چکے | پھر بھی بتا دو صاف صاف اب تو اگر مگر نہیں
میرے گھر آ ہی جائیں وہ انجمن اپنی چھوڑ کر | نالہ و آہ میں اثر ہے مگر اِس قدر نہیں
روز کے غم نے اِس طرح خوگر ضبط غم کیا | درد ہمارے دل میں ہے شکوہ زبان پر نہیں
پوچھتے ہیں وہ حال دل طول سخن سے فائدہ | سو کی یہ ایک بات ہے کہہ دوں مجھے خبر نہیں

آن میں کچھ اور بات تھی ان میں کچھ اور بات ہے
حضرت نوح کا گماں حضرت نوح پر نہیں

ہیں اسیران قفس کی دل شکن فریادیں

یہ طرح بھائی حضرت احسن نے عرس کے موقع پر مارہرہ میں تجویز کی تھی لیکن وہاں مشاعرہ نہ ہو سکا بلکہ دو برس بعد کے ڈی کلب الہ آباد میں اسی طرح پر مشاعرہ ۲۴ فروری ۱۹۲۳ء کو ہوا قریب دو ڈھائی ہزار آدمیوں کے تھے مقامی شعرا کے علاوہ باہر کے شعرا میں سے قدسی صاحب جائسی اور ذرہ صاحب کان پوری نے بھی شرکت کی جناب محمد ولی خان صاحب اسپیشل مجسٹریٹ کی صدارت میں مشاعرہ ۱۲ بجے دن سے شروع ہو کر ۸ بجے رات کو بخیر و خوبی ختم ہوا

ج

کیوں نہ میں بیداد سہہ کر مائلِ بیداد ہوں
دل جلا ہوں دل جلوں کی دل جلی فریاد ہوں

اس سے کیا مطلب انہیں برباد یا آباد ہوں
شاد ہوں میں شاد ہوں ناشاد ہوں ناشاد ہوں

کیا کہوں حالِ چمن میں آشیاں برباد ہوں
ابتدا ہی سے اسیرِ خانۂ صیاد ہوں

دشت میں ذرہ ہوں لیکن ذرۂ آشفتہ حال
باغ میں نکہت ہوں لیکن نکہتِ برباد ہوں

خود پسندی نے اسیرِ خود پرستی کردیا
آپ ہی میں صید ہوں اور آپ ہی صیاد ہوں

کانپتا ہے آسماں مجھ سے لرزتی ہے زمیں
عاشقوں کی آہ معشوقوں کی میں بیداد ہوں

رفتہ رفتہ بھول بیٹھے اہلِ بزمِ ذوق و شوق
پوچھئے ان میں سے شاید میں کسی کو یاد ہوں

دوسرے کے سر کا الزام اپنے سر لیتا ہے کون
کیوں یہ کہہ دوں تم نہیں ہو میں ستم ایجاد ہوں

وہ مرے پہلو سے جاتے ہیں مگر جانے نہ پائیں
اے دلِ ناشاد ہاں جذبِ دلِ ناشاد ہوں

کوچۂ دلبر میں بھی حاصل سکونِ دل نہیں
اب کہاں جاؤں کہاں ٹھہروں کہاں آباد ہوں

حافظے پر زور ڈالو شکل دیکھو غور سے
تم تو مجھ کو یاد ہو میں بھی تمہیں کچھ یاد ہوں

پیشتر اتنا تعلق بھی تھا اُن کو ناگوار
اب وہ کہتے ہیں مجھے ناشاد اس سے شاد ہوں

عاشقِ شورِ عنادل قدر دانِ رنگ و بو
یہ نہیں کھلتا کہ میں گلچیں ہوں یا صیاد ہوں

حسنِ معنی تک پہنچ سکتی نہیں سطحی نگاہ
فہمِ انسانی سے جو ہے دور وہ روداد ہوں

آپ نے یہ کیا کہا مجھ سے کہ تم کچھ بھی نہیں
کچھ نہیں ہوں پھر بھی جزوِ عالمِ ایجاد ہوں

بے تامل اپنے دل میں وہ جگہ دینے لگے
ہو گیا معلوم اس سے میں کسی کی یاد ہوں

خاک اُڑانے کے لئے ہیں اور بھی لاکھوں مقام
کیا ضرورت ہے کہ راہِ عشق میں برباد ہوں

آدمی کے واسطے راحت بھی ہے تکلیف بھی
چار دن میں شاد ہوں میں چار دن ناشاد ہوں

نوحؔ ان میں بے وفائی کے سوا کچھ بھی نہیں
کیا فدائے خوب رویانِ الہ آباد ہوں

طبع زاد ۲۹ مارچ ۱۹۲۶ء

ج

دم نکلتا ہے بات کرنے میں
اب نہیں دیر میرے مرنے میں

کوئی مشتاقِ دید مرتا ہے
کوئی مصروف ہے سنورنے میں

کثرتِ غم سے فرق کچھ بھی نہیں
میرے جینے میں میرے مرنے میں

بات بھی مجھ سے تم نہیں کرتے
کیا برائی ہے بات کرنے میں

تیرے در پر مروں تو کیوں نہ ملے
لطف جینے کا مجھ کو مرنے میں

عشق کرنے میں مجھ کو عذر نہ تھا
عذر ہے ترکِ عشق کرنے میں

اور کوئی مرا رفیق نہیں
دل ہی شامل ہے جینے مرنے میں

ضبط الفت کی مصلحت کیا ہے
کچھ نہ ہونے میں کچھ نہ کرنے میں

وعدۂ شام کا نتیجہ کیا
صبح کر دیں گے وہ سنورنے میں

کیوں نہ بجلی گرے مرے دل پر
برق ہیں آپ ظلم کرنے میں

کتنے پرکیف تھے شباب کے دن
لطف آتا تھا ہم کو مرنے میں

شوق ہم کو کلام کرنے کا
شرم اُن کو سلام کرنے میں

حضرت نوح جانتے ہی نہیں
کیا ہے تکلیف ڈوب مرنے میں

کیوں مرے قلب کو قرار نہیں
کس بلا کا سوز اے بلبل ترے شیون میں ہے

ان دونوں طرحوں پر ۱۰ اپریل ۱۹۲۷ء کو فتح پور میں مشاعرہ ہوا علاوہ مقامی شعرا کے بسمل صاحب شاطر صاحب الہ آبادی صفدر صاحب مرزا پوری تاباں صاحب بدایونی ثاقب صاحب کان پوری محبی محی الدین خاں صاحب تحصیل دار کل ڈپٹی کلکٹر اور خود کلکٹر صاحب موجود تھے

ج

اب وہ سرمستی بہار نہیں
نشہ کیسا مجھے خمار نہیں

اہل محفل کو دیکھتے رہیے
کون ہے کون بے قرار نہیں

دشمنی ہو کہ دوستی اُن کی
مجھ کو دونوں کا اعتبار نہیں

کیا مرے دل سے برق کو نسبت
ہے مگر اتنی بے قرار نہیں

شوخیوں نے بنا دیا بجلی
اب انھیں اک جگہ قرار نہیں

زندگی پر زمانہ مرتا ہے
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

جا رہے ہیں شباب کے ایام
میرے کہنے میں یہ بہار نہیں

آپ کہہ لیں ذلیل و خوار مجھے
عشق لیکن ذلیل و خوار نہیں

جھلملاتے ہوئے چراغ ہیں سب
بزم ہستی کا اعتبار نہیں

کچھ دلوں سے ہوا ہے شوق مجھے
ہیں قدیمی شراب خوار نہیں

کیا خبر سانس کب اُکھڑ جائے
اِس ہوا پر کچھ اختیار نہیں

لوگ کہتے ہیں ناخدائے سخن
نوح دنیا میں بے وقار نہیں

طبع زاد ۶ جولائی ۱۹۲۷ء

یا وفا سب خوب رو ہیں یہ خیال اچھا نہیں
ہر کسی سے دل لگانے کا مآل اچھا نہیں

دیکھ کر وہ بھی جسے فرمائیں حال اچھا نہیں
اس قدر غم ہے بُرا اتنا ملال اچھا نہیں

تجربہ کہتا ہے الفت کا مآل اچھا نہیں
ہوگا مستقبل پھر اچھا کیا جو حال اچھا نہیں

کیا نظامِ زندگی کیا اعتبارِ زندگی
ہے ابھی اچھا ابھی دم بھر میں حال اچھا نہیں

ہو مناسب تو مریضِ ہجر کو دیکھ آئیے
پہلے اچھا تھا مگر اب اُس کا حال اچھا نہیں

دل میں دل کی آرزو دل میں تو ہے دل کی طلب
اور کہتے ہو زباں سے تم یہ مال اچھا نہیں

لاگ ہوتی باغباں کو شکر کر اے عندلیب
آشیاں تیرا ہے جس پر وہ نہال اچھا نہیں

پھیر کر میرے گلے پر تیغ اب کیسا سکوت
تھا جو ہونے کو ہوا یہ انفعال اچھا نہیں

ظلم اُٹھاتے جائیں ہم آزار سہتے جائیں ہم
کچھ کبھی ہو ترکِ محبت کا خیال اچھا نہیں

رنج و غم میرے لیئے جب ہیں تو پھر میرے لیئے
کوئی دن کوئی مہینہ کوئی سال اچھا نہیں

ہیں برا تم کو کہوں تم مجھ کو اس سے فائدہ
آؤ بل جاؤ لڑائی کا خیال اچھا نہیں

وہ ہمارا مدعا سُن کر یہ فرمانے لگے
موت کے معنی میں ہی لفظِ وصال اچھا نہیں

کچھ دنوں میں خود وہ میری راہ پر آجائیں گے
آج ہی اظہارِ الفت کا خیال اچھا نہیں

پیش تو سارا زمانہ غرق ہو کر رہ گیا
نوح اب طوفان اُٹھانے کا خیال اچھا نہیں

۲۳؍ اکتوبر ۱۹۲۷ء

ہم بھی دمِ گدازشِ دل کی مراد پائیں
اے کچھ نہ سُننے والے سُن لے کچھ التجائیں

ساقی کے سامنے ہیں رندوں کی یہ صدائیں
دستِ سبو سنبھالے جب پاؤں لڑکھڑائیں

پرساں ہے کون اِن کا نظر دل میں کیا سمائیں
مفلس کی آرزوئیں بے کس کی التجائیں

یہ بھی ہے خوب پردہ یہ بھی عجب ادائیں
آئیں تو وہ نظر میں لیکن نظر نہ آئیں

ہم کیوں نہ وقتِ آخر آہوں سے باز آئیں
کیا دل میں گھر کریں گی اکھڑی ہوئی صدائیں

یہ حسن یہ جوانی یہ ناز یہ ادائیں
کیوں تم کو دیکھ کر ہم بے موت مر نہ جائیں

داغِ جگر کھلے تو عالم کا رنگ بدلا
آہیں ہوئیں جو اونچی چلنے لگیں ہوائیں

پھر شاہدِ ازل نے چھیڑا وہی ترانہ
سازِ الست بن کر ہاں ہیں ہاں ملائیں

گذری ہیں چند گھڑیاں مجھ پر کبھی اس طرح کی
میں آہ کر رہا تھا خاموش تھیں فضائیں

گر دل پر ابر اٹھا گلشن میں پھول پھولے
یہ جام [illegible] آؤ پئیں پلائیں

کیا ضبطِ اشکِ غم کا اس کے سوا ہے مطلب
دل میں اُٹھیں جو شعلے آنسو انھیں بجھائیں

تکفیرِ غسلِ میّتِ قاتل نہیں گوارا
کیا خون میں نہا کر پانی سے ہم نہائیں

حسن و شباب میں بھی تاثیر کس قدر ہے
گذرا وہ جس طرف سے ملنے لگیں دعائیں

جن کے لئے ہے کافی گوشہ ہمارے دل کا
ممکن نہیں وہ جلوے کونین میں سمائیں

افسوس فصلِ گل میں محرومِ لطف ہم ہوں
بادِ صبا کے جھونکے کلیوں کو گدگدائیں

مرقد کے رہنے والو تہذیب ہے یہ کیسی
کب سے پکارتا ہوں دیتے نہیں صدائیں

اُس بانیِ ستم نے اِن پر نظر نہ ڈالی
دنیائے آرزو میں رکھتی رہیں وفائیں

بزمِ خیال میں بھی آتا ہے وجد مجھ کو
سنتا ہوں سازِ دل سے وہ رس بھری صدائیں

دنیا کو یوں بھی دیکھا دنیا کو ووں بھی دیکھا
اِس باغ میں ہیں دونوں اچھی بری ہوائیں

اے موت جلد آکر قصہ تمام کر دے
مرنا ہی جب ہمیں ہے تو دیر کیوں لگائیں

محشر میں جوش آیا وہ رحمتِ خدا کو
ایک ایک کر کے بخشیں ایک ایک کی خطائیں

شاید اثر ہو اِن کا کچھ اُن کی برہمی پر
چھٹنے اگر بلا ہیں تو بھیجئے بلائیں

آئے بہار کے دن زنجیر پاؤں میں ہے
پہلے اسی پر اپنی قوت ہم آزمائیں

ہر بار طرزِ نو سے ہے شکوہ بھی ستم کا
آہیں نہ پھر زباں پر نکلی ہوئی دعائیں

اے نوحؔ رزم گہ میں اب دیر ہو رہی ہے
طوفان تم اُٹھاؤ تلوار وہ اُٹھائیں

اِس غزل میں پرانے اشعار بھی شامل ہیں

ج

کسی طرح کا اثر نالہ و فغاں میں نہیں
ترے یقین میں یہ ہے مرے گماں میں نہیں

خوشی کا ذکر کہیں دورِ آسماں میں نہیں
تلاش ہم کو ہے جس شے کی وہ جہاں میں نہیں

چمن کی سمت چمکتی ہے کس طرح بجلی
ہزار شکر ہم اِس وقت آشیاں میں نہیں

یہ کیا کہا کہ یہاں سے بھی تم نکل جاؤ
ہم اپنے گھر میں ہیں کچھ آپ کے مکاں میں نہیں

بیانِ دردِ جگر پر انھیں سکوت رہا
کسی طرح کا اثر میری داستاں میں نہیں

کوئی چھپائے کوئی درد و غم کا راز کبھی
جو خوبیاں مرے دل میں ہیں وہ زباں میں نہیں

تری گلی کو ملاؤں بہشت سے کیوں کر
یہ اُس جہاں میں نہیں ہے وہ اِس جہاں میں نہیں

ملے جو حکم تو درباں کا خاتمہ کر دوں
مکاں میں تم ہو یہ کہتا ہے وہ مکاں میں نہیں

غم و ملال کے شکوے جگہ جگہ موجود
نشاط و لطف کا چرچا کہیں جہاں میں نہیں

ہزار بار سنیں آپ لاکھ بار سنیں
کسی طرح کی بھی لغزش مرے بیاں میں نہیں

اِدھر یہ شوق مرا دل ہے ہدف جھٹ پٹ
اُدھر یہ ڈھیل ابھی تیر تک کماں میں نہیں

نظر پر اُن کی مرے اعتراض ہیں لاکھوں
مگر کلام مجھے نوحؔ کی زباں میں نہیں

طبع زاد ۱۵ ر فروری ۱۹۲۸ء

درد الفت کو آپ کیا جانیں — ج — اِس مصیبت کو آپ کیا جانیں
اب وفا ہو چکی جفا کے بعد — ترکِ عادت کو آپ کیا جانیں
دل سے باہر کبھی نہیں نکلی — میری حسرت کو آپ کیا جانیں
میں بتاؤں گا پوچھئے مجھ سے — رازِ الفت کو آپ کیا جانیں
کعبہ و دیر سے ہوا ہے دل — دل کی عظمت کو آپ کیا جانیں
جب محبت کسی سے کی ہی نہیں — تو محبت کو آپ کیا جانیں
عمر کتنی ہے تجربہ کتنا — رنج و راحت کو آپ کیا جانیں
جو ہماری نظر میں پھرتی ہے — اُس قیامت کو آپ کیا جانیں

حضرتِ نوحؔ سے خدا کی پناہ
اِن کی عادت کو آپ کیا جانیں

طبع زاد ۱۸ ر مئی ۱۹۲۸ء

تیری نظروں میں کوئی چیز نہیں — ج — اِس لئے دل مجھے عزیز نہیں
حسن تیرا جسے عزیز نہیں — وہ نظر باز و خوش تمیز نہیں
دل بڑی چیز ہے زمانے میں — آپ کہتے ہیں کوئی چیز نہیں
میں ہوں قربان تیری صورت پر — حسنِ یوسف مجھے عزیز نہیں
عہدِ باطل کا تذکرہ کیسا — بدگماں میں ہوں بد تمیز نہیں
کام کرنے کی عقل ہم میں کہاں — بات کرنے کی بھی تمیز نہیں
یہ بڑی مشکلوں سے ملتے ہیں — خوب رو ایسی ویسی چیز نہیں
جسمِ خاکی سے دم جہاں نکلا — پھر کسی کا کوئی عزیز نہیں
مدعا کیا ہے مدعی کیا ہے — اُن کو اِتنی ابھی تمیز نہیں
اُس کے آگے مری حقیقت کیا — میں حقیقت میں کوئی چیز نہیں
تو گرفتارِ غم ابھی میں ہوں — شکوہ و آہ کی تمیز نہیں
آپ سے آسماں بھی ڈرتا ہے — میں ہوں کیا چیز کوئی چیز نہیں
اُن کا شکوہ خدا سے کرتے ہیں — داد خواہوں کو بھی تمیز نہیں

کیوں ستایا کرے انھیں کوئی
حضرتِ نوح ایسی چیز نہیں

طبع زاد ۲۶ مئی ۱۹۲۸ء

میرے اطوار تیرے ڈھب کچھ ہیں
حسن و صورت میں کوئی کچھ بھی نہیں
سالہا آٹھویں کرم کیسا
یہ نہ کہئے کہ ہم نہیں کچھ بھی
عمر بھر میں نے غم سہے لاکھوں
سو میں کہ دوں ہزار میں کہ دوں

ج

پیشتر کچھ تھے اور اب کچھ ہیں
چشم بد دور آپ سب کچھ ہیں
وہ رضامند ہم سے اب کچھ ہیں
کچھ نہ ہونے پہ آپ سب کچھ ہیں
لیکن آثار نیک اب کچھ ہیں
ہم نہیں کچھ بھی آپ سب کچھ ہیں

کوئی تو ان میں بھی ہے خاص کمال
مہرباں نوح بمد وہ جب کچھ ہیں

طبع زاد ۴ جولائی ۱۹۲۸ء

میں ابھی یہ کہ نہیں سکتا وہ خاطر کیا کریں
قول دے کر بھی جو وہ پھر جائے تو پھر کیا کریں
دل میں لاکھوں ناوکِ غم اور تھوڑا سا لہو
پھر وہی ہم ہیں وہی ہنگامۂ گفت و شنید
تیرہ بختی منزلِ مقصد سے ٹکرانے لگی
دل بھی ہم نے دے دیا اپنا جگر بھی دے دیا
اِس سے پہلے تو نہ سمجھے کچھ مآلِ زندگی
واقعاتِ عشق ہم سے داورِ محشر نہ پوچھ
ناتوانی مانعِ اظہارِ ذوق و شوق ہے
اِس میں ہے تقصیر اپنی کچھ نہیں اُن کا قصور
گور کی منزل میں راحت پاتے ہی سب سو گئے
آپ نے اچھا نکالا یہ علاجِ دردِ دل
رازداروں نے تو کھولا میرے دل کا ماجرا
ہم تری محفل سے اُٹھ جائیں مناسب ہے یہی
پاسباں ہشیار دیواریں بھی زنداں کی بلند

ج

پہلے میرے دل کو چھینیں چھین کر پھر کیا کریں
اے امید و یاس اپنے ہیں ہم آخر کیا کریں
ہم سے مفلس اپنے مہمانوں کی خاطر کیا کریں
دیکھئے پھر کیا سنیں پھر کیا کہیں پھر کیا کریں
جب نہ سوجھے راہ تو چل کر مسافر کیا کریں
اور تم کیا مانگتے ہو اور حاضر کیا کریں
آخرت کی فکر اب ہم وقتِ آخر کیا کریں
آج تک جن کو چھپایا اُن کو ظاہر کیا کریں
گفتگو ہم کر نہیں سکتے فغاں پھر کیا کریں
نذرِ جیب ایماں نہیں کرتے تو کافر کیا کریں
زندگی بھر کے تھکے ماندے مسافر کیا کریں
جب کہا مرتا ہوں میں تو کہ دیا پھر کیا کریں
اور جو مخبر ہیں کیا جانیں وہ مخبر کیا کریں
بارِ خاطر ہو کر اطمینانِ خاطر کیا کریں
ناتواں قیدی امیدِ مخلصی پھر کیا کریں

صرف جلووں سے کوئی حسرت نکل سکتی نہیں
دیکھ کر حسن و جوانی کے مناظر کیا کریں

عشق میں شکوہ شکایت کے علاوہ کچھ نہیں
اوّل اوّل کیا کریں ہم آخر آخر کیا کریں

نوحؔ ضبطِ اشک پر طوفان برپا ہو گیا
بے دھڑک آنسو جو بہنے پائیں تو پھر کیا کریں

طبع زاد ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۸ء

ج

انتظارِ جلوۂ دیدار میں گھبرا گئیں
کام نظروں سے لیا اتنا کہ آنکھیں آ گئیں

نارسا آہیں مری اوجِ مراتب پا گئیں
دل سے نکلیں لب تک آئیں آسماں پر چھا گئیں

نزع میں دل سے نکل کر جو زباں تک آ گئیں
وہ صدائیں کچھ نہ تھیں لیکن قیامت ڈھا گئیں

اے نگاہِ دل نواز اٹھ اور میرے دل کو دیکھ
جتنی نکلی تھیں تمنائیں پھر اتنی آ گئیں

کیا مرے دل کو قرار آئے گا بس اب آ چکا
ایک ایک رگ میں وہ نظریں بجلیاں دوڑا گئیں

میں امیدِ غنچہ و گل اب کروں تو کیا کروں
کونپلیں پھوٹی تھیں جن شاخوں میں وہ مرجھا گئیں

خانۂ دل میں یہ عالم آرزوؤں کا رہا
چند نکلیں چند ٹھہریں کچھ گئیں کچھ آ گئیں

واقعاتِ زیست پر ڈالی جو تنقیدی نگاہ
اپنی وہ بھولی ہوئی باتیں ہمیں یاد آ گئیں

جلوہ گاہِ ناز میں یہ ناز ہم دیکھا کئے
اس طرف آنکھیں لڑیں اور اس طرف شرما گئیں

سب سے جانا ایک اپنا ہم وطن کم ہو گیا
غم اگر نکلا تو دل کی حسرتیں گھبرا گئیں

کس لیے کلیوں کا ماتم کر رہا ہے باغباں
وقت پر اپنے کھلیں بے وقت پر مرجھا گئیں

آرزوئیں دل میں ٹھہریں حسرتیں دل میں رہیں
میں انھیں اب کیا نکالوں آ گئیں تو آ گئیں

ہر گھڑی آنکھوں کے آگے جلوۂ بت خانہ تھا
پتھروں کو اس قدر پوجا کہ خود پتھرا گئیں

غم نہیں اس کا جو روزِ حشر جھیلے ہم نے غم
اچھی اچھی صورتیں تو دیکھنے میں آ گئیں

صورتِ سیلاب مضموں کا اثر بڑھتا گیا
نوحؔ طوفانی کی غزلیں خوب شہرت پا گئیں

طبع زاد ۱۶ مئی ۱۹۲۹ء

ج

لطف و کرم میں بے رخی رنج و غم التفات میں
ایک نہ ایک بات ہے آپ کی بات بات میں

اس کو شمار کیجئے چال میں دم میں گھات میں
نام ہے التفات کا کچھ نہیں التفات میں

نکتہ نواز داد دیں عفو طلب خطا پسند
جمع ہیں کتنی خوبیاں ایک خدا کی ذات میں

موت مری بتا گئی زیست کا فلسفہ مجھے
میں نے یہ اب سمجھ لیا کچھ بھی نہ تھا حیات میں

دیکھ رہا ہے دل مرا ڈھونڈھتی ہے نظر مری
عشق کے سانحات کو حسن کے واقعات میں

شمس و قمر بھی چھپ رہے جلوۂ یار دیکھ کر
پھر بھی ہے خوف حشر کا ہم نہیں مطمئن ہنوز
واسطۂ ذوق و شوق سے جانِ حزیں لٹی
میری نظر کے سامنے کچھ نہیں وسعتِ جہاں
روزِ جزا ہم اس طرح پہنچے خدا کے سامنے
عمر بھر آفتیں رہیں غم سے نہ چین پائیں ہم
اب وہ کہاں ہیں بت پرست وہ کہاں خدا پرست
عشق کے احترام کو شکوۂ غم نے کھو دیا
شام سے ہم کو صبح تک کوئی گھڑی نہ آئی نیند

ختم ہوا یہ مرحلہ ایک دن ایک رات میں
عمر تمام ہو گئی آرزوئے نجات میں
اُن کے شہید آرزو ڈوب گئے فرات میں
چین سے کیا بسر کروں اتنی سی کائنات میں
شکوۂ غم زبان پر دامنِ یار ہات میں
جوڑ دو اس کڑی کو بھی سلسلۂ حیات میں
دونوں کے دونوں بے طرح پھنس گئے واقعات میں
بڑھ گئیں چند دقتیں اور بھی مشکلات میں
سیکڑوں رنج و غم ملے چار پہر کی رات میں

اور سے التجا عبث غیر کا آسرا فضول
کام خدا ہی آئے گا نوح کی مشکلات میں

حسب فرمائش جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب
۱۳ اگست ۱۹۲۹ء

ج

ہونے کو ہونکا ہے لاکھوں ہیں لیکن میرے قابل کوئی نہیں
انداز سے اک اک دل میں خواہش اغماض سے کوشش دل کوئی نہیں
نازاں ہو تم اپنی صورت پر دعوے ہے بہت یکتائی کا
غمزوں کی طرف بھی دھیان کرو عشووں کی طرف بھی غور کرو
ہم کس پہ اٹھا لیں اپنا آدابِ وفا سے دور ہیں سب
کیا ڈھونڈنے صحرا میں جا کر دل اہلِ جنوں کا بہلے گا
جو عشق و وفا میں جھیل سکے یہ جوش یہ ہمت کس میں ہے
بدلی بھی اٹھی بارش بھی ہوئی شیشے بھی تھمے ساغر بھی چلے
برما یا جگر کو ناوک نے زخمی کیا دل کو خنجر نے
اے حسن نکل آ خلوت سے توقیر بڑھا دے جلوت کی
ہیں ترکِ وفا کا قصد کروں وہ ترکِ جفا پر مائل ہو
یارانِ جہاں کو دیکھ لیا اخلاص و وفا کو جانچ لیا
وہ مجھ سے خفا دل سے بھی خفا اپنے پرائے سب بھی خفا
کم بخت کی ہمت کو دیکھو آزارِ محبت کو دیکھو

مدفن کے علاوہ دنیا میں آرام کی منزل کوئی نہیں
جس قسم کی تیری محفل ہے اس قسم کی محفل کوئی نہیں
یہ شمع یہ گل یہ آئینہ کیا مدِ مقابل کوئی نہیں
اتنے تو ہمارے قاتل ہیں تم کہتے ہو قاتل کوئی نہیں
جو درد بھرے کا درد سنے یوں درد بھرا دل کوئی نہیں
محمل تو ہزاروں ہیں اب بھی ہاں لیلیٰ محمل کوئی نہیں
دل ہو کہ جگر ہو کوئی ہو غم سہنے کے قابل کوئی نہیں
ہشیار سب اپنے کام سے ہیں کہنے کو ہیں غافل کوئی نہیں
لیکن ہے مرے قاتل کا گماں دونوں میں بسمل کوئی نہیں
محفل میں سب اہلِ محفل ہیں رونق وہ محفل کوئی نہیں
بہت سے زیادہ مشکل ہے جیسی یہ ہے مشکل کوئی نہیں
آرام کے ساتھی کتنے تھے تکلیف میں شامل کوئی نہیں
کیا عشق و وفا کی دنیا میں احسان کے قابل کوئی نہیں
اُس کا متمنی دل ہے مرا جس کا متحمل کوئی نہیں

وہ رنگ محبت ہے وفا وہ زخم ستم وہ داغ الم
زندانِ محبت کے قیدی آزاد ہمیشہ رہتے ہیں

جتنے نظر آئے غنچہ و گل اُن میں سے مرا دل کوئی نہیں
مجبورِ سلاسل ہو کر بھی پابندِ سلاسل کوئی نہیں

اے نوح ڈبو دے گا تم کو امواجِ محبت کا طوفاں
ہر بحر میں ساحل ہیں لیکن اس بحر میں ساحل کوئی نہیں

۳۰ ستمبر ۱۹۲۹ء

حسن کی شہ جو پا گئیں آنکھیں — تیری آنکھیں چرا گئیں آنکھیں
لٹ گیا دولت ان کے لوٹنے سے — دو دلوں کو ملا گئیں آنکھیں
ہم نے جلوہ تو آن کا دیکھ لیا — آ گئیں خیر آ گئیں آنکھیں
ہائے وہ شرم وہ حیا وہ حجاب — میں نے چھیڑا لجا گئیں آنکھیں
جلوہ ہے شبابِ عالم — بند ہو کر دکھا گئیں آنکھیں
تاکنے جھانکنے سے کام رہا — دل کے کہنے میں آ گئیں آنکھیں
میں نے اشکوں سے بھر لیا دامن — دولت اپنی لٹا گئیں آنکھیں
کیوں نہ اب دیکھ لیں نظر بھر کر — ہم کو موقع سے پا گئیں آنکھیں
کھل گیا رازِ غم مرا سب پہ — حال دل کا بتا گئیں آنکھیں
جن سے لطف و کرم کی تھی امید — وہ بھی آنکھیں دکھا گئیں آنکھیں
ہو گیا نام آنسوؤں سے گہر — خون دل میں نہا گئیں آنکھیں
رات بھر جاگنا پڑا ہم کو — وہ نہ آئے تو آ گئیں آنکھیں

ضبطِ سیلابِ غم بھی کرنے پر
نوح طوفان اٹھا گئیں آنکھیں

تمام دنیا جھکی ہوئی ہے جدھر وہ آنکھیں جھکا رہے ہیں

۱۱ رمئی ۱۹۳۱ء کو تحصیل سراتھو ضلع الہ آباد میں جناب حقیر مچھلی شہری نائب تحصیل دار کے اہتمام سے ایک مختصر مشاعرہ ہوا
طرح اوپر کا مصرعہ تجویز ہوا تھا

سرِ نیاز اس لئے ہم اپنا بتوں کے آگے جھکا رہے ہیں — قسم خدا کی کبھی حرم میں بھی بجائے خدا رہے ہیں
ہمیشہ شغل ہے کہ اپنا اپنا غضب ہے اہلِ وفا رہے ہیں — [illegible] بیٹھے ہیں تو کیا غم ہیں جو [illegible] کیا رہے ہیں
بہت دنوں سے منانے والے بہت کچھ ان کو منا رہے ہیں — مگر خموشی یہ کہہ رہی ہے خفا نہیں تھے خفا رہے ہیں
وہ ابر اٹھا وہ برق چمکی کہاں کی توبہ کہاں کا تقویٰ — [illegible] اہلِ جام و ساغر کہ ہوش میں پھر قدم رہے ہیں
قدم قدم پہ بنا رہی ہے نفس نفس پر مجاہدہ بھی — خدائی کیوں کر انھیں نہ ملتی جو تجھ کو یادِ خدا رہے ہیں

شرف یہ مرکر ہوا بسترِ وفا نے اپنا اثر دکھایا
جو ناز اُٹھوا رہے تھے ہم سے وہ اب جنازہ اُٹھا رہے ہیں

گلہ جو کرتا تو آفت آتی مصیبت آتی قیامت آتی
خفا ہو کیوں اتنے پوچھنے پر وہ مجھ سے یوں خفا رہے ہیں

جنھیں جلایا تھا سوزِ غم نے اُڑائی تھی جن کی خاک تم نے
چراغ بن بن کے اُن کے ذرّے اِدھر اُدھر جگمگا رہے ہیں

یہ ظلم جھیلو وہ ظلم جھیلو یہ ناز اُٹھاؤ وہ ناز اُٹھاؤ
رہا ہے پہلو میں کوئی جب تک غضب میں ہم مبتلا رہے ہیں

اگر مناسب ہو کارواں کو تو ساتھ والوں کو ساتھ لے لے
جو ناتواں رہ گئے تھے پیچھے وہ گرتے پڑتے اب آ رہے ہیں

نہ حسنِ گل سے کوئی تعلق نہ عشقِ بلبل سے کوئی مطلب
رہے ہیں باغِ جہاں میں ہم بھی مگر برنگِ حنا رہے ہیں

کبھی بتوں کا مکاں تھا کعبہ مگر ہوا انقلاب ایسا
وہاں بھی اب ایک ہی خدا ہے جہاں ہزاروں خدا رہے ہیں

شبِ گذشتہ کا لطفِ محفل بزمِ سحر ہم سے اب نہ پوچھو
چراغ کچھ رہ گئے ہیں باقی ہوا میں وہ جھلملا رہے ہیں

کسی کے دل پر اثر جو ہوتا تو یہ بھی تھا عشق میں مناسب
جناب نوحؔ آپ کیا سمجھ کر فضول طوفاں اُٹھا رہے ہیں

طبع زاد ۲۰ ؍ مئی سنہ ۱۹۳۰ء

ج

عشق میں عقل بھی میں نذر کیے دیتا ہوں
جان دینے کے لیے جان دیے دیتا ہوں

باہمی ربط کو مضبوط کیے دیتا ہوں
اپنا دامن ترے دامن میں سیے دیتا ہوں

کھو گیا دل اگر اُن سے تو نہ افسوس کریں
دوسرا آئینہ میں مول لیے دیتا ہوں

رہ نوردی سے نہیں پائے طلب کیا ممکن
دشت و گلشن کو ابھی ایک کیے دیتا ہوں

وہ تو کہتے ہیں نہ لیں گے دلِ شیدا تیرا
میں سمجھتا ہوں بڑی چیز دیے دیتا ہوں

کیا بخیلوں کو یہ فرمان خدا یاد نہیں
مال و دولت تمھیں دینے کے لیے دیتا ہوں

پھر گزارش کا مجھے وقت ملے یا نہ ملے
جو مرے دل میں ہے وہ عرض کیے دیتا ہوں

حسن کا حسنِ طلب دیکھیے کیا کرتا ہے
جان سی چیز اُسے مفت دیے دیتا ہوں

وہ دمِ عرضِ تمنا یہ کسی کا کہنا
صبر کر صبر ترے ہونٹ سیے دیتا ہوں

ہے مناسب کہ رہے ساتھ نگہبان کوئی
دل کو میں آپ کے ہمراہ کیے دیتا ہوں

پاس کیوں آئیں مجھے دور سے مجروح کریں
تیغ کے بدلے انھیں تیر دیے دیتا ہوں

کوئی مرتا ہے مگر یہ نہیں کہتا کوئی
چاک دل رشتۂ الفت سے سیے دیتا ہوں

اب وہ طوفان دوبارہ نہ اُٹھائیں گے کبھی
حضرتِ نوحؔ سے تاکید کیے دیتا ہوں

طبع زاد ۲۰ ؍ اگست سنہ ۱۹۳۰ء

ج

ہم بھی حسنِ مجسم کا نظارہ کر لیں
وہ نظر پائیں کہ دیدار تمھارا کر لیں

قتل کرنے ہی کی زحمت وہ گوارا کر لیں
ہم کو مطلب ہے نظارہ سے نظارا کر لیں

چاہنا حور و پری کا ہمیں دشوار نہیں
یہ تو جب ہو تری تحقیر گوارا کر لیں

غرق ہو جائیں گے ہم اس کے سوا کیا ہوگا
کس لیئے بحرِ محبت سے کنارا کر لیں

اے اجل اس لیئے دل ہم نے ستم گر کو دیا
جی تو سکتے نہیں مرنے کا سہارا کر لیں

جادۂ عشق و تمنا سے گذرنے والے
چلتے پھرتے ہوئے دیدار تمھارا کر لیں

جلوۂ یار کوئی جلوۂ محدود نہیں
ہم اگر چاہیں تو اپنے میں نظارا کر لیں

کیا یقیں ہم کو نیا ہے نہ نیا ہے کوئی
احتیاطاً اسے تصدیق دوبارا کر لیں

اُف یہ دریا کا تلاطم یہ جوانی کی امنگ
کس طرح ہم مے و ساقی سے کنارا کر لیں

دائمی رنج اُٹھانا ہمیں منظور نہیں
چند روزہ ہو تو خیر اُس کو گوارا کر لیں

کل نہیں آج سہی بلکہ اسی وقت سہی
امتحاں عشق و وفا میں وہ ہمارا کر لیں

وقتِ آخر مری بالیں سے یہ جانا کیسا
آپ انجام محبت کا نظارا کر لیں

بن گئی ترکِ محبت سے ہمارے دم پر
کیوں نہ پیدا وہی آزار دوبارا کر لیں

باز آجائیں ستم سے مجھے امید نہیں
آپ اور آپ یہ تکلیف گوارا کر لیں

خاکسارانِ وفا نقشِ کفِ پا بن کر
کوچۂ یار میں رہنے کا سہارا کر لیں

جب یہ غم ہیں تو خوشی کی ہمیں امید نہیں
جب یہ جینا ہے تو مرنا ہی گوارا کر لیں

بحرِ الفت میں اگر چاہتے ہیں خیر اپنی
نوحؔ طوفانِ حوادث سے کنارا کر لیں

ہم طرح نواب عزیز یار جنگ صاحب عزیزؔ حیدرآباد دکن

ج

دل جو پہلو میں تڑپتا ہے فغاں رکتی نہیں
کھل گئی تو کھل گئی کھل کر زباں رکتی نہیں

روکنے سے بھی یہ زیرِ آسماں رکتی نہیں
کتنی ہی کمزور ہو لیکن فغاں رکتی نہیں

ہیں قفس میں ہوں قفس پر بوٹے ہیں غلاف
لیکن اس پر بھی ہوائے بوستاں رکتی نہیں

ایک جانب بادِ صرصر ایک جانب بارِ غم
دو گھڑی بھی اپنی شاخِ آشیاں رکتی نہیں

دل سے کھنچی میرے لب پر لب سے پہنچی عرش پر
ہیں فغاں کو کس طرح روکوں فغاں رکتی نہیں

آہی جاتی ہیں یہ دونوں اپنے اپنے وقت پر
فصلِ گل تھمتی نہیں بادِ خزاں رکتی نہیں

ہائے کیا شے ہے ہوائے منزلِ مقصود بھی
کارواں کے ساتھ گردِ کارواں رکتی نہیں

اک کو بے تابی سے مطلب اک کو بدگوئی سے کام
دل مرا تھمتا نہیں تیری زباں رکتی نہیں

عاشقوں کی بھی طبیعت برقِ عالم سوز ہے
روکنے سے یہ بلائے ناگہاں رکتی نہیں

جانتا ہوں باعثِ غم ہوگا اظہارِ خیال
لیکن اُن کے سامنے میری زباں رکتی نہیں

موت کا آنا طبیعت کا بھی آنا ہو گیا
بالیقیں تھمتی نہیں یہ بے گماں رکتی نہیں

چار دن کی نوجوانی چار دن کی ہے بہار
وقت پورا کر کے یہ اے مہرباں رکتی نہیں

ناخدا کیا کر سکے گا یہ خدا کے بس میں ہے
نوح اپنی کشتیِ عمرِ رواں رکتی نہیں

دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب کی

میری صدارت میں ۲۷ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ڈبائی ضلع بلند شہر میں اس طرح پر جنرل مشاعرہ ہوا قرب و جوار کے شعرا کے علاوہ مشاہیر میں سے جناب حافظ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور جناب یوسف صاحب سکریٹری سکندرہ راؤ موجود تھے اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں دوسرے دن حافظ محمد صدیق صاحب کے اصرار سے غیر طرحی مشاعرہ بھی ہوا

ج

ساقی کا عکسِ رخ نہیں جامِ شراب میں
یہ ماہ تاب ڈوب گیا آفتاب میں

ملتا رہا سکوں کا مزا اضطراب میں
یادش بخیر وقت جو گذرا شباب میں

دن ہو کہ رات ہیں ہوں اسی پیچ و تاب میں
فکرِ ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

ساقی بھی ہے شریک جو شربِ شراب میں
اب اور چار چاند لگے آفتاب میں

جب آئے گی بہار تو پینے کا ذکر کیا
نکلوں گا مے کدے سے نہا کر شراب میں

تاریخ روز وقتِ ملاقات سب غلط
کہنا تھا کچھ وہ کہہ گئے کچھ اضطراب میں

اے شانِ عفو کم سے کم ان کو نوازش دے
جتنے گناہ میں نے کئے ہیں شباب میں

پہلے لکھا کچھ اور پھر اس نے لکھا کچھ اور
یوں آئے دو خط اک مرے خط کے جواب میں

منزل بھی پیچھے رہ گئی ساتھی بھی چھٹ گئے
پہنچا ہوں میں کہاں سے کہاں اضطراب میں

ساغر کے ساتھ دستِ طلب کانپنے لگے
شاید کسی کی روح کھنچ آئی شراب میں

اللہ ری تیرے حسن کے جلووں کی تجلیاں
یہ کیا خبر تھی طور چھپا ہے نقاب میں

روزِ جزا نجات کی صورت نکل سکے
ایسی ہو بھول چوک ہمارے حساب میں

عجلت پسند ہیں مگر اب اس قدر نہیں
وہ تار بھیج دیں مرے خط کے جواب میں

ساقی کے ساتھ جمع ہوئے ہر طرح کے رند
ملوا دے کچھ نئی بھی پرانی شراب میں

قیدی کو حسبِ مرتبہ زنداں بھی چاہئے
توبہ کو بند کیجئے جامِ شراب میں

اظہارِ شوق اس نے کیا بھی تو کس طرح
بھیجا مرا ہی خط مرے خط کے جواب میں

شکرِ جفا و جور تو کرنا ضرور تھا
یہ بھی نہ ہم کو یاد رہا اضطراب میں

لیلیٰ کے ساتھ قیس کو پڑھنا نہ کیوں لگاؤ
پہلا سبق پڑھا تھا یہی پہلی کتاب میں

اے نوح رو سکنے سے بھی آنسو نہ رک سکے
طوفانِ غم کا جوش تھا چشمِ پُرآب میں

طرحِ ثانی ۲۰ مئی ۱۹۳۱ء

عذرِ ستم پر اپنی زباں کھولتے نہیں
کیا حشر ہے وہ حشر میں بھی بولتے نہیں

ج

مجھ سے دمِ عتاب و ستم بولتے نہیں
اِس زہر میں وہ شہد کبھی گھولتے نہیں

اُن کا یہ خوف ہے کہ زباں کھولتے نہیں
میرے رقیب میری طرف بولتے نہیں

کھل جائے سب کا فرقِ مراتب جدا جدا
میزانِ امتیاز ہیں وہ تولتے نہیں

نکلیں جو رنج و غم تو ہو پیدا کچھ اور فکر
ہم اِس سبب سے فال کبھی کھولتے نہیں

ہے بولنا یہ آپ کا کہنا بھی بار بار
کوئی ہزار پوچھے ہم بولتے نہیں

عقدے تو سب سلجھ گئے بندِ نقاب کے
جو دل میں ہے گرہ اسے وہ کھولتے نہیں

ہم ہاتھ مل رہے ہیں یہ ہو کر اسیرِ دام
پرواز کے خیال سے پر تولتے نہیں

کیا دل شکستگانِ محبت فغاں کریں
ٹوٹے ہوئے رباب کبھی بولتے نہیں

رہتی ہے جن کو منزلِ مقصد کی جستجو
وہ رہ گذر میں اپنی کمر کھولتے نہیں

اللہ رے بتوں کا یہ اندازِ تمکنت
کوئی انہیں بلائے مگر بولتے نہیں

عشق و وفا کا وزن نگاہوں سے کیجئے
رکھ کر ترازوؤں میں انہیں تولتے نہیں

اُن کو حیا و شرم کا اتنا خیال ہے
وہ عالمِ خیال میں بھی بولتے نہیں

اے دستِ شوق پردہ رخ کو ہٹا بھی دے
سنتا ہوں میں وہ آپ سے منہ کھولتے نہیں

اظہارِ ذوق و شوق پہ اغماض اس قدر
سنتے ہو چپ کھڑے ہوئے کچھ بولتے نہیں

چتون کر اور دیدۂ پُرنم برس پڑے
موتی اگر ہیں اشک تو کیوں رولتے نہیں

طوفان کے خیال نے خاموش کر دیا
ہے یہ سبب جو نوح سے وہ بولتے نہیں

۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

مدت ہوئی ترکِ الفت کو اب ذہن میں وہ روداد نہیں
کیا تم نے کہا کیا ہم نے سنا کیا دل نے کہا کچھ یاد نہیں

ج

اے دیدۂ ظاہر بیں تجھ کو کیا میرے مراتب یاد نہیں
کانٹا ہوں گر یوں پھولوں میں پژمردہ ہوں مگر برباد نہیں

دنیا کے طلسموں سے بڑھ کر دلچسپ کوئی روداد نہیں
آرام بھی ہے تکلیف بھی ہے آزاد ہوں اور آزاد نہیں

پابندِ قفس ہونے سے مرے مسرور ہوئے مرغانِ چمن
جب میں تھا وہاں صیاد بھی تھا اب میں ہی نہیں صیاد نہیں

پہلے تری محفل میں ہم نے دوڑائیں نگاہیں جلووں پہ
پھر دیکھ کر ان کو یہ دیکھا پہلو میں دلِ ناشاد نہیں

کیوں رو رہے ہو اے خون اتنا اس میں تو فقط ہے بات اتنی
بے داد و ستم کی پرسش پر کہہ دیجئے گا کچھ یاد نہیں

معشوق ستائے عاشق کو تقدیر کہاں یہ عاشق کی
بے دل کئے جا تو مجھ پر ہے بیداد تری بے داد نہیں

اے جذب محبت کھینچ ان کو اے طالع خفتہ کروٹ لے
تاثیر دکھائے نالۂ دل سب شاد ہیں ہم ہی شاد نہیں

ناشاد ہے برباد ہے مر جائے کوئی مٹ جائے کوئی
قاتل کی ستم گر نظروں میں بے داد مگر بے داد نہیں

ہیں عشق و وفا سے چھوٹ سکیں مشکل نظر آتا ہے مجھے
اس قید میں دل نے ڈال دیا جس کی کچھ میعاد نہیں

محصور مصائب ہو کر بھی جو آن تھی وہ قائم رہتی
اللہ رے ہے فریاد مگر مجبور تری فریاد نہیں

کیا شکوۂ غم کیا شکوۂ ستم کیا ذکر دعا کیا حرف وفا
ہم دیکھ کر ان کے تیور کو سب بھول گئے کچھ یاد نہیں

تا دل جو کبھی تکلیف کرے تو خانۂ دل کا راز کھلے
وہ کہتے ہیں آباد ہے یہ میں کہتا ہوں آباد نہیں

یہ قہر کرے وہ ظلم کرے یہ خاک کرے وہ قید کرے
صیاد سے بڑھ کر بجلی ہے بجلی سے سوا صیاد نہیں

ہم عشق میں گنوائیں کیوں کر گنتی سے ہماری باہر ہیں
اتنے دئے تم نے رنج و الم تعداد بھی ان کی یاد نہیں

پامال ستم کچھ لوگ ہوئے محصور الم کچھ لوگ رہے
ان سب کا خلاصہ اتنا ہے دنیا میں کوئی دل شاد نہیں

پھر عشق و وفا کی دنیا میں طوفان اٹھا دینا کیسا
اے نوح وہ جوشش گریۂ غم ہے یاد اسے کیا یاد نہیں

طبع زاد ۲۵ جولائی ۱۹۳۲ء

ج

یہ وہی ہو گیا عجب رہتے تھے جس کی تاک میں
تم نے اک پتھر کو بخشی جگہ فتراک میں

اے فغاں دل سے نکل کر ڈوب جا افلاک میں
روز کا ماتم سہتے سہتے آ گیا دم ناک میں

واقعات زندگی کا ہے خلاصہ اس قدر
خاک سے پیدا ہوا تھا مل گیا پھر خاک میں

ہم سمجھتے تھے یہاں آ کر بہل جائے گا دل
اور وحشت بڑھ گئی صحرائے وحشت ناک میں

ہو گیا دنیا سے دل کا تجربہ مرنے کے بعد
آ گئے اسرار مرگ و زیست اب ادراک میں

ہم کہاں جائیں چمن سے اب نشیمن چھوڑ کر
زندگی گذری انہیں خار و خس و خاشاک میں

فاتحہ پڑھنے کو آئے وہ نہ میری قبر پر
مل گئی یہ عمر بھر کی آرزو بھی خاک میں

کر سکے امواج بحر آرزو کا سامنا
اس قدر باقی رہا دم اب کہاں تیراک میں

جو نکلے غازی ہوئے جو جل بسے ٹھہرے شہید
مرنے جینے کا مزا ہے کوچۂ سفاک میں

ہوں اگر دو چار رستے تو کروں بھی ان کو بند
رہ نہیں سکتیں مری آہیں دل صد چاک میں

آہ جو نکلی مرے دل سے وہ پھر پلٹی نہیں
جذب ہو کر رہ گئی گویا دامن افلاک میں

لیجئے عشق مجازی سے حقیقی کا پتہ
دیکھئے اللہ کو انسان کی پوشاک میں

ایک ہی مطلب ہے دونوں کا مگر شکلیں جدا
میں ہوں ان کی تاک میں وہ میرے دل کی تاک میں

سالکانِ جادۂ احساس رک گئے ہی نہیں
بارِ احسان و کرم سے لاش میری دب گئی

بکھر رہے ہیں جستجوئے منزلِ ادراک میں
یہ اثر کیا تھا تری دو چار مشتِ خاک میں

غرق کر دینا زمانے کا جسے مشکل نہیں
نوح وہ طوفانِ غم ہے دیدۂ نمناک میں

سخن وہی ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں

چہرۂ مہر وش ہے ایک کاکل مشک فام دو

ان دونوں طرحوں پر جی بی بی کالج مظفر پور میں ۱۶ر نومبر ۱۹۳۲ء کو بڑے پیمانے پر مشاعرہ ہوا مقامی حضرات میں جناب مظفر و جناب اختر نے اچھے اچھے شعر پڑھے باہر کے لوگوں میں سے جناب کشتہ گیاوی انجم صاحب بانکی پوری تمنا صاحب پھلواروی انجم صاحب گیاوی تمنا صاحب دربھنگوی بسمل صاحب الہ آبادی وغیرہ موجود تھے مشاعرہ بہت کامیاب رہا تمنا صاحب دربھنگوی مظہر الحق صاحب و ہنر صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ ان کی کوشش ہر طرح کامیاب ہوئی

ج

کسی شمار کسی مد کسی چلن میں نہیں
ہم انجمن میں ہیں یوں جیسے انجمن میں نہیں

مصیبتوں کا گذر تیری انجمن میں نہیں
یہ وہ فلک ہے جہاں چاند بھی گہن میں نہیں

جو پوچھ گچھ ہو تو جائیں بھی پیش سر یک بھی ہوں
کسی کی آؤ بھگت اُن کی انجمن میں نہیں

یہ جذب وادیٔ غربت یہ گردشِ تقدیر
وطن میں اور ہیں سب اک ہمیں وطن میں نہیں

یہ نذرِ قبر مرا اضطرابِ شوق بڑھا
کبھی کفن میں ہے میت کبھی کفن میں نہیں

جفائے برق سے اب اک جو رہ گیا محفوظ
سبب یہ ہے کہ مرا آشیاں چمن میں نہیں

کسی غریب کو بے کار کون یاد کرے
جو ہم نہیں تو مرا ذکر بھی وطن میں نہیں

بہار اور مرے داغ ہائے دل کی بہار
اگر نہیں ہے خزاں تو اسی چمن میں نہیں

برس کر ابرِ کرم نے ملا دیا پانی
مئے کہن کی وہ تلخی مئے کہن میں نہیں

سیاہی تہِ مرقد سے ہو گئی زائل
برائے نام سفیدی مرے کفن میں نہیں

بہارِ عمر و نشاطِ بہارِ عمر کہاں
چمن بھی دل میں نہیں دل بھی اب چمن میں نہیں

لگاؤں آگ مگر جب کہیں مکاں بھی ہو
اڑاؤں خاک مگر خاک بھی وطن میں نہیں

خزاں کا ظلم اٹھانا محال تھا مجھ کو
بڑی بہار یہی ہے کہ میں چمن میں نہیں

مجال کیا بھڑک اٹھے جو عشق کا شعلہ
یہ ضبطِ خاص مری شمعِ انجمن میں نہیں

فرشتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں جسمِ زار مرا
سوال کس سے کریں وہ کوئی کفن میں نہیں

بہارِ عالمِ فانی کا حشر کیا ہوگا
سکونِ دل مجھے پہلے پہلے چمن میں نہیں

کوئی پیئے کوئی پلوائے کوئی مے سے نہائے
نہیں نہیں مرے ساقی کی انجمن میں نہیں

بنے تو بلبلِ شیدا کی یادگار مگر — گرا پڑا ہوا پر بھی کوئی چمن میں نہیں

وہ حشر اٹھاتے ہیں طوفان یہ اٹھاتے ہیں
جنابِ نوح بھی کم اُن سے بانکپن میں نہیں

لہو کا ایک قطرہ ہے جسے ہم دل سمجھتے ہیں

اس طرح پر ۱۰ر مارچ ۳۳ء کو نمائش مین پوری میں بڑے اہتمام سے مشاعرہ ہوا مشاہیر شعرا میں سے طپش صاحب دلگیر صاحب احسن صاحب مارہروی قابل صاحب باندوی، افسر صاحب ظہیر صاحب نصیر صاحب منصف باندوی حفیظ صاحب مدیر مجیب فرخ آبادی وغیرہ موجود تھے سامعین کی تعداد دو تین ہزار تھی۔ یہ مشاعرہ دس بجے رات سے شروع ہو کر آٹھ بجے دن کو ختم ہوا احسن صاحب وغیرہ کے بے حد اصرار سے صدارت مجھے قبول کرنی پڑی

ج

نکلوانا نکل جانا بہت مشکل سمجھتے ہیں — ہم اُن کے ناوکِ دل دوز کو بھی دل سمجھتے ہیں
وہ دنیائے محبت سے ہمیں غافل سمجھتے ہیں — مگر ہم ہیں کہ ماضی حال مستقبل سمجھتے ہیں
ہم اپنی جان اپنی آرزوئے دل سمجھتے ہیں — خدا ہی اُن سے سمجھے جو ہمیں قاتل سمجھتے ہیں
وہ میری رائے ہیں کب رتبۂ قاتل سمجھتے ہیں — جو اپنے سر کو سر اور اپنے دل کو دل سمجھتے ہیں
عدوئے دل عدوئے مدعائے دل سمجھتے ہیں — کوئی سمجھے نہ سمجھے ہم تمہیں قاتل سمجھتے ہیں
مری ہمدرد آہوں کو بھی لاحاصل سمجھتے ہیں — یہ میں کیوں کر سمجھ لوں وہ زبانِ دل سمجھتے ہیں
چمن ہم کو وہ منظر غنچہ و گل کا دکھاتا ہے — تری محفل نہیں لیکن تری محفل سمجھتے ہیں
اگر ایسا نہ ہوتا تو تأمل کار کیا ہوتا — غنیمت ہے وہ میرے دل کو اپنا دل سمجھتے ہیں
رہِ الفت میں مرنا اور مر کر خاک ہو جانا — اُسے پہلی اِسے ہم دوسری منزل سمجھتے ہیں
جو پہنچے بامِ جاناں تک فلک تک عرشِ اعظم تک — اُسی فریاد کو فریادِ اہلِ دل سمجھتے ہیں
عجب دستور دیکھا مے کدے میں ہم نے رندوں کا — جسے غفلت نہیں ہوتی اُسے غافل سمجھتے ہیں
یہ خود رائی یہ خودداری یہ بے باکی یہ سفاکی — کسی کا دل بھی ہو اُس کو وہ اپنا دل سمجھتے ہیں
بجائے شکوہ میں شکرِ ستم سے کام لیتا ہوں — یہ اُن کی مہربانی ہے جو اِس قابل سمجھتے ہیں
چلانا تیر کا عادت میں داخل ہو گیا ورنہ — جگر کو وہ جگر کہتے ہیں دل کو دل سمجھتے ہیں
معاذ اللہ ہمت ہار کر رستے سے پھر جانا — سمجھے ہم اسے فریبِ دوریِ منزل سمجھتے ہیں
شناور یا مسافر اک طرح کے سب نہیں ہوتے — ہمیں جادہ کو منزل موج کو ساحل سمجھتے ہیں
فسانہ قیس و لیلیٰ کا سنائے کیا انھیں کوئی — نہ وہ ناقہ سمجھتے ہیں نہ وہ محمل سمجھتے ہیں
یہی کعبہ یہی بت خانہ اُن کے واسطے ٹھہرا — حقیقت در حقیقت دل کی اہلِ دل سمجھتے ہیں
محبت کر کے چاہیں داد کیا اُن سے محبت کی — ہم اپنے دل لگانے ہی کو لاحاصل سمجھتے ہیں

ہزاروں قسم کے طوفان بحرِ عشق میں اُٹھے
جناب نوح کہ قیدِ کشتی و ساحل سمجھتے ہیں

طبع زاد ۲۱ اگست سنہ ۱۹۳۳ء

حسنِ خرام و خوبیِ تقریر کچھ نہیں
سب کچھ ہے تو مگر تری تصویر کچھ نہیں

توقیر کیا کرے کوئی تاثیر کچھ نہیں
نالہ مرا وہ تیر ہے جو تیر کچھ نہیں

زنداں میں بھی کسی کی جھلک دیکھتا ہوں میں
پائے نظر کے واسطے زنجیر کچھ نہیں

سب کچھ وہ چشمِ عاشقِ دلگیر میں سہی
اُس کی نظر میں عاشقِ دلگیر کچھ نہیں

اہلِ گناہ شرمِ معاصی سے کام لیں
بخشائشِ قصور میں تاخیر کچھ نہیں

کیا ہوگا سعی و کوششِ پیہم سے فائدہ
تقدیر کہہ رہی ہے کہ تدبیر کچھ نہیں

چاہا ہو تم کو جس نے سزا بھی اُسی کو دو
دل کا قصور ہے مری تقصیر کچھ نہیں

وہ بھی مری طرح شبِ غم بے قرار ہیں
کیوں کر کہوں کہ آہ میں تاثیر کچھ نہیں

دیوانگانِ عشق کو وہ رکھ چکے اسیر
جوشِ جنوں یہی ہے تو زنجیر کچھ نہیں

گذرے ادھر ادھر سے وہ پہلو کو چھوڑ کر
کچھ ہو مگر وہ دل کے لئے تیر کچھ نہیں

دنیا ہلی مگر وہ ہلیں اپنے مقام پر
سب کچھ ہے اور نالۂ شبگیر کچھ نہیں

تدبیر و سعی پہ مجھے ایسا غرور ہے
گویا مرا نوشتۂ تقدیر کچھ نہیں

سب کچھ ہے یوں تو اہلِ نظر کے خیال میں
ہاں تیرے سامنے تری تصویر کچھ نہیں

باہر کے لوگ جانتے ہیں اُن کا مرتبہ
اہلِ وطن میں نوح کی توقیر کچھ نہیں

خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں

ایک طرحی مشاعرہ میں جو ۱۱ فروری [illegible] کو ہونے والا تھا [illegible] مشاعرہ کرنے والے تھے لیکن وہ ۱۵ جنوری کو زلزلہ آنے سے ملتوی ہوگیا

ملے جو اوّل و آخر سے وہ صدا ہوں میں
کہ ربطِ حرفِ مشدّد کا بن گیا ہوں میں

طلسمِ محفلِ ہستی میں اور کیا ہوں میں
صدائے بے اثر و سازِ بے صدا ہوں میں

بشکلِ سایہ جدا کر دیا جدا ہوں میں
مگر تمہارے قدم سے لگا ہوا ہوں میں

اثر [illegible] طرح کا ہو پھر بھی کیا ہوں میں
جو ٹوٹے دل سے نکلتی ہے وہ صدا ہوں میں

[illegible] پھرتی ہے عشق کی دنیا
کسی کے حسنِ تصور سے کھیلتا ہوں میں

[illegible]
خدا وہ دن نہ کرے منکرِ خدا ہوں میں

مرے خیال نے پہنچا دیا کہاں سے کہاں
کہ آنکھیں بند ہیں اور ان کو دیکھتا ہوں میں

مجھے مٹاؤ مگر پیش تر مٹانے سے
یہ سوچ لو کہ تمھارا ہی نقشِ پا ہوں میں

وفورِ بےخودیِ شوق میں خبر ہی نہیں
کہاں رہوں گا ابھی تک کہاں رہا ہوں میں

حریصِ لذتِ آزار چاہتا ہے یہی
خطا کوئی بھی کرے موردِ سزا ہوں میں

فضائے حسن کی رعنائیاں خدا کی پناہ
حدودِ عشق سے آگے نکل گیا ہوں میں

مرا وجود عدم ہے مرا عدم ہے وجود
نہ ابتدا ہوں کسی کی نہ انتہا ہوں میں

ہجومِ شوق میں ہوتا ہے اس طرح معلوم
وہ آرہے ہیں اور اُن کو بُلا رہا ہوں میں

حصارِ چرخ و زمیں کی بساط ہی کتنی
بہوش باش کہ اب قوت آزما ہوں میں

دئے ہیں بخت نے راہِ طلب میں وہ چکمے
کہ اپنی منزلِ مقصد سے ہٹ گیا ہوں میں

خطا معاف خطائے علاج اب کیسی
دوا کا وقت نہیں طالبِ دعا ہوں میں

کیا جو عشق تو پاسِ وفا بھی لازم ہے
بلا سے دم نہ رہے یار سے نبھا ہوں میں

جیوں تو شرمِ محبت مروں تو ننگِ وفا
عجب طرح کی مصیبت میں مبتلا ہوں میں

تلاشِ جلوۂ گل کا مجھے خیال نہیں
کہ آپ اپنی لطافت میں کھو گیا ہوں میں

شریکِ عشق نہ چوتھا نہ پانچواں کوئی
بنائے دردِ مرا دل ہے تم ہو یا ہوں میں

وہ دل کہاں وہ امنگیں کہاں وہ جوش کہاں
بدل گیا ہے زمانہ بدل گیا ہوں میں

مجبورِ غیرتِ محبت سے رہ گئے محروم
وہ نوحؔ جن کو یہ دعوےٰ تھا ناخدا ہوں میں

طبع زاد ۱۳ / مارچ ۱۹۳۲ء

تمھیں وفا کے شرائط کا دھیان کچھ بھی نہیں
وہ خود بھی کچھ نہیں جس کی زبان کچھ بھی نہیں

یہ کیا مری رہِ الفت میں شان کچھ بھی نہیں
کہ اتنی دور چلا ہوں نشان کچھ بھی نہیں

وفا کے جوش میں دونوں کا دھیان کچھ بھی نہیں
ذرا سا دل مری ننھی سی جان کچھ بھی نہیں

فغانِ دل کے قریں پائے شوق کے آگے
زمین کچھ بھی نہیں آسمان کچھ بھی نہیں

ہمارا قول ہماری زبان سب کچھ ہے
تمھارا قول تمھاری زبان کچھ بھی نہیں

ذرا سا دل ہے مگر دل میں حسرتیں لاکھوں
مکیں تو اِتنے ہیں لیکن مکان کچھ بھی نہیں

غرورِ حسن و جوانی سے احتراز رہے
جو بے ثبات ہو وہ آن بان کچھ بھی نہیں

جہاں میں آیا جہاں میں رہا جہاں سے گیا
علاوہ اِس کے مری داستان کچھ بھی نہیں

دیا تھا قول جس اپنی زبان سے مجھ کو
اُسی زبان سے کہہ دو زبان کچھ بھی نہیں

وہ مجھ کو قتل کی دھمکی فضول دیتے ہیں
مرے خیال میں یہ امتحان کچھ بھی نہیں

ہم اپنی جان انھیں کو سمجھ رہے ہیں مگر
وہ جانتے ہیں یہی اِن کی جان کچھ بھی نہیں

جو نالہ ہم نے کیا اُس کا ذکر بہم ہے
جو تم نے غم دیے اُن کا بیان کچھ بھی نہیں

کمالِ عشق نے پہنچا دیا وہاں ہم کو
جہاں ہراس تو ہم گمان کچھ بھی نہیں

کہو ذرا وہ ہمارے خیال کو روکے
جو یہ محال ہے تو پاسبان کچھ بھی نہیں

کسی نے لوٹ لیا دل ادا سے داورِ حشر
یہی ہے اور ہمارا بیان کچھ بھی نہیں

جفا شعار و وفادار سب برابر ہیں
بُرے بھلے کا محبت میں دھیان کچھ بھی نہیں

جنابِ نوحؔ کے باطن کا حال کیا معلوم
بظاہر ان میں پیمبر کی شان کچھ بھی نہیں

طبع زاد ۱۲ر جون سنہ ۱۹۳۴ء

ج

یہ اور کیا ہے جو عشق و وفا کا زور نہیں
کہ دل کے چور کو میں کہہ رہا ہوں چور نہیں

جو تم بجھاؤ تو پہلے سے ہو سوا روشن
چراغِ عشق ہمارا چراغِ گور نہیں

خطا معاف ملا اس ادا سے دل کا سراغ
چُرا رہے ہیں نظر کیوں جو آپ چور نہیں

نگاہِ دل سے جو شانِ خدا کو دیکھ سکا
وہ کور بھی ہے تو میری نظر میں کور نہیں

ہجومِ حسرت و ارماں کو چپ الم نے کیا
ہمارے دل میں یہ شمع ہے اور شور نہیں

درازیِ شبِ غم کے گلے سے کیا حاصل
مریضِ عشق کی تقدیر ہی میں بھور نہیں

فغاں نے سر پہ اٹھایا کبھی آسمان تو کیا
جو میرے کام نہ آئے وہ زور زور نہیں

مجھی سے وہ کسی مجمع میں کھو گیا ہوگا
خدا نخواستہ تم میرے دل کے چور نہیں

مری وفا نے کیا اُن کو آشنائے وفا
نہیں نہیں کا وہ اگلا سا زور شور نہیں

مآلِ ہستیِ معدوم ہم نے دیکھ لیا
نشانِ زیست کہاں اب نشانِ گور نہیں

زمانہ آج کل ایسا ہے انحطاط پذیر
جنابِ نوحؔ کے طوفان میں بھی زور نہیں

حسب فرمائش جناب دعا صاحب ڈبائیوی

ج

مری فغاں سے فلک تھرتھرائے جاتے ہیں
زمین پر کوئی لحظے میں آئے جاتے ہیں

بیانِ عشق میں لطف ایسے پائے جاتے ہیں
کوئی سُنے نہ سُنے ہم سنائے جاتے ہیں

شرارتوں سے وہ کب باز آئے جاتے ہیں
ستائے جائیں گے مجھ کو ستائے جاتے ہیں

مقامِ قرب کہاں رہروانِ عشق کہاں
ابھی سے پائے طلب ڈگمگائے جاتے ہیں

کبھی جو مشقِ ستم کا خیال آتا ہے
تو سب سے پہلے وہاں ہم بلائے جاتے ہیں

نگاہِ شوق کو حیرت میں ڈالنے کے لیے
طرح طرح کے تماشے دکھائے جاتے ہیں

حریمِ قرب نے پایا عجب کمالِ شرف
یہاں بشر سے فرشتے بنائے جاتے ہیں

دوا بھی کیجیے پرہیزِ عشق بھی رکھیے
یہ چارہ گر تو مجھے اور کھائے جاتے ہیں

نگاہِ شوق نے اک حشر اٹھا دیا اٹھ کر
وہ میرے دل کی رگوں میں سمائے جاتے ہیں

ہوسِ نفس باشش دل بے قرار و جلوہ طلب
مقامِ قدس کے پردے اٹھائے جاتے ہیں

مریضِ عشق پھر آ گئے بچے نہ بچے
ابھی تو زیست کے آثار پائے جاتے ہیں

پیامِ جلوۂ دیدار چہ ندیدوں کو
کلیم و طور کے قصے سنائے جاتے ہیں

ہزار شکر تغافل شعار آپ نہیں
کہ اٹھتے بیٹھتے مجھ کو ستائے جاتے ہیں

نہ دل دہی نہ تسلی نہ درگذر نہ کرم
وہ جھوٹ موٹ کے احساں جتائے جاتے ہیں

تری گلی میں نہیں لطفِ زیست اسے کافر
کہ بعدِ مرگ بھی مُردے جلائے جاتے ہیں

یہ جان کر بھی کہ انجامِ کار کچھ بھی نہیں
انھیں ہم اپنی مصیبت سنائے جاتے ہیں

یہ کیا خیال گناہوں کا آ گیا دمِ نزع
کہ ہاتھ پاؤں مرے تھرتھرائے جاتے ہیں

وہ کہہ رہا ہے زمانے کو تم نہ غرق کرو
مگر ہیں نوح کہ طوفاں اٹھائے جاتے ہیں

۸ ستمبر ۱۹۳۴ء

ج

آئی خزاں گئی بہار اب وہ جنوں نہیں نہیں
ہاتھ ہے آستین میں ہاتھ میں آستیں نہیں

مجھ کو یقین ہو تو ہو دل کو مگر یقیں نہیں
لطف و کرم سے لیں گے کام آئیں گے وہ نہیں نہیں

دل میں ترے جگہ ملی رنج و الم سے چھوٹ گیا
اب تو وہاں ہوں میں جہاں چرخ نہیں زمیں نہیں

رازِ حقیقتِ خدا فہمِ بشر میں آئے کیا
ہر کہیں وہ ہے جلوہ گر پھر ہے کہاں کہیں نہیں

میان سے نکلے باہر آئے قتل کرے چلے پھرے
آپ اگر ہیں نازنیں تیغ تو نازنیں نہیں

میری وفائے جذب اثر لائے گی ان کو کھینچ کر
لاکھ کہیں نہیں نہیں کچھ بھی نہیں نہیں نہیں

کوچۂ ذوق و شوق میں ٹھوکریں کھائے ہیں سب
پست و بلند اس طرح اور کوئی زمیں نہیں

نالہ کروں تو ہو غضب شکوہ کروں تو ہو ستم
آپ کی بزمِ ناز میں جائے چناں چنیں نہیں

تم سے سوا جہان میں تم سے سوا گمان میں
تم سے زیادہ آن میں اور کوئی حسیں نہیں

خلقِ خدا میں اور بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں
مجھ کو نشاط و صرفِ غم صرف تمھیں ہمیں نہیں

دل کا بڑا دباؤ تھا اس کو بھی یہ جلا چکا
اب مرے اختیار میں نالۂ آتشیں نہیں

جوششِ سرشکِ غم کو اب جذب کرے کہاں جنوں
ہاتھ ہی ہاتھ ہیں فقط ہاتھ میں آستیں نہیں

میں نے کہا کب آؤ گے اس نے کہا محال ہے	میں نے کہا کہاں ملوں اس نے کہا کہیں نہیں
ہو گا مآلِ عشق کیا مجھ کو یہ فکر کب رہی	چشمِ نگاہ بار ہے دیدہ دوربیں نہیں
گریۂ غم کا رخ ادھر آہ کا زور اس طرف	کوئی گھڑی میں دیکھنا چرخ نہیں زمیں نہیں
بحث و قسم سے فائدہ اس میں ہے بات کون سی	ہم نے ستم نہیں سہے تم نے جفائیں کیں نہیں
سب کو ہے تجھ پر افتخار کرتے ہیں سب ترا وقار	جس کا وقار تو کرے ایسا کوئی حسیں نہیں
سجدۂ شوق بار بار سنگِ درِ حبیب پر	اور ذلیل و خوار میں ایسی مری جبیں نہیں
رنگِ حریمِ ناز سے گردشِ بخت کھل گئی	کل تھے ہمیں کوئی نہ تھا آج ہیں سب ہمیں نہیں

بحرِ وفا کے جوش میں چلتی ہے سطحِ آب پر
کشتیِ ذوق و شوق نوح خیر سے نشیں نہیں

۷ اکتوبر ۱۹۳۴ء

ج

ہزاروں قسم کے اوہام اشکوں کی روانی میں	مجھے بھی دیکھنا یہ ہے کہ تم ہو کتنے پانی میں
مرے مر کر جئے پھر مر گئے جی کر جوانی میں	بہی ہیں چند باتیں اہلِ الفت کی کہانی میں
لکیریں جس طرح بن کر بگڑ جاتی ہیں پانی میں	امنگیں مٹ گئیں امواجِ غم سے یوں جوانی میں
ثباتِ عمر کیا طفلی میں پیری میں جوانی میں	کہ ہے اول فنا آخر فنا دنیائے فانی میں
کیا صادر یہ حکمِ عام دربارِ محبت نے	تمنا کی پرستش ہو وفا کی راج دھانی میں
جو میں روتا ہوں تو آنکھوں سے گرم آنسو نکلتے ہیں	خدا جانے لگا دی آگ کیوں کر تم نے پانی میں
خیالِ زہد و تقویٰ ہر کسی کو چاہئے لیکن	نہیں آتا نہیں ہوتا نہیں رہتا جوانی میں
ہزاروں کام دنیا کے بہت کم زندگی میری	مرا جاتا ہوں میں فکرِ حیاتِ جاودانی میں
ذرا جلوہ دکھا کر بجلیاں مجھ پر گرا دینا	مزا ملتا نہیں اب طور و موسیٰ کی کہانی میں
اٹھایا فائدہ کیا دل نے ضبطِ گریۂ غم سے	یہ پانی ہو گیا گھل مل کر آخر خود بھی پانی میں
دمِ پیری خیال آتا ہے یوں عشقِ گذشتہ کا	کہ خوابِ ناتمام اک ہم نے دیکھا تھا جوانی میں
اثر کے ڈھونڈنے کو میرے دل سے آہ نکلی تھی	مگر خود کھو گئی جا کر فضائے آسمانی میں
مرے حالاتِ غم ہوں گے مکمل دم نکلنے پر	ابھی ہے خاتمہ لکھنے کو باقی اس کہانی میں
مجھے سوزِ عشق و گریۂ غم کا نہیں کھلتا	الٰہی آگ میں پانی ہے یا ہے آگ پانی میں
پتنگوں نے شناسن کر جلے جل کر ہوئے ٹھنڈے سے	پھر اٹھا سوزِ غم کیا شمع کی آتش زبانی میں
دل آزردی یہاں تک بے بیانِ شوق پیدا کر	کہ ان کو بھی مزا آنے لگے میری کہانی میں
ذرا ضبطِ الفت کو ڈبویا دیدۂ تر نے	ہماری آبرو پانی ہوئی پانی ہی پانی میں

نہیں معلوم تصویر آج کس کی کھینچنے والی ہے
ہم سرگوشیاں ہوتی ہیں کچھ ہمراز دہانی میں

مرے ہر اشک کا قطرہ طلسم زندگی ٹھہرا
یہی پانی ہے دانہ میں یہی دانہ ہے پانی میں

کرم کا آسرا اس جنگ جو سے کیا کرے کوئی
بسر ہوتی ہو جس کی زندگی چنگیز خانی میں

چھپیں گے کیا مرے حالاتِ غم خاموش پہنچے پر
نگاہ یاس کہہ دے گی زباں سے بے زبانی میں

ہوا و ابر کی محتاج فطرت رہ نہیں سکتی
امنگیں خود بخود ہوتی ہیں پیدا نوجوانی میں

عجب کیا واقعاتِ رنج و غم وہ اس طرح سن لے
ملا دوں اس کے بھی حالات کچھ اپنی کہانی میں

سنوارا نازنیں انداز نے عزت نے عشوے نے
لگے اب چار چاند اور آپ کے حسنِ جوانی میں

دکھائے جوش اپنا موجِ بحرِ عشق اٹھ اٹھ کر
سفینہ غرق ہو سکتا نہیں اے نوح پانی میں

۹ اکتوبر ۳۲ء

ساغر بدست ہوں میں
مست الست ہوں میں

جو کچھ نہ ہے نہ تھی کچھ
وہ بود و ہست ہوں میں

دل ہے بلند باطن
ظاہر میں پست ہوں میں

کثرت سے کیا تعلق
وحدت پرست ہوں میں

کہہ دو بہار آئے
دامن بدست ہوں میں

ساقی کو بھول بیٹھا
اس درجہ مست ہوں میں

کیوں کر کوئی بھلائے
عہدِ الست ہوں میں

غم بھی خوشی میں شامل
فتح و شکست ہوں میں

کہتے ہیں نوح مجھ کو
طوفاں پرست ہوں میں

۴ر اپریل ۱۹۳۵ء

ج

نہ سرگوشیاں ہیں نہ سرجوشیاں ہیں
محبت کی ساری فسوں کوشیاں ہیں

ہم آغوشیوں میں ستم کوشیاں ہیں
قیامت کسی کی ہم آغوشیاں ہیں

وہی بزم ساقی وہی دور ساغر
وہی میں وہی میری مے نوشیاں ہیں

وجود و عدم میں کوئی دخل کیا دے
یہ قانونِ فطرت کی سرجوشیاں ہیں

ہماری پشیمانی خدا کی وہ رحمت
خطا کوشیاں ہیں خطا پوشیاں ہیں

اٹھائیں بھی احباب مل کر جنازہ
مری ہمت سے اب سبکدوشیاں ہیں

کسی اور کی یاد کا ذکر کیسا
ترے عشق میں خود فراموشیاں ہیں

وہ آتے نہیں میری نظروں کے آگے
کسی مصلحت سے یہ روپوشیاں ہیں

ملیں مجھ کو موسے تو میں اُن سے پوچھوں
یہ کیسی مرے دل کو بے ہوشیاں ہیں

جو منظور ہے دل کسی کو چُرانا
تو ہر وقت تجھ سے ہم آغوشیاں ہیں

نہیں تابِ نظّارہ میری نظر کو
وہ ہیں روبرو اور روپوشیاں ہیں

ڈبو دیں جو لے نوحؑ کشتی تمہاری
وہ طوفانِ الفت کی سرجوشیاں ہیں

آئے ہیں بے نقاب وہ میرے خیال میں

۵/ اپریل ۱۹۳۵ء کو اس طرح پر ریاست ججھ پور میں مشاعرہ ہوا لیکن میں اپنے ایک مقدمے کے سبب سے شریک نہ ہو سکا۔

کامل ہے تیغ ابرو بھی حسن و جمال میں
میں دیکھتا ہوں بدر کا جلوہ ہلال میں

کیا ہو مطابقت مرے اُن کے خیال میں
میں اور حال میں وہ کسی اور حال میں

کیا وہ نہ آئیں گے دلِ آشفتہ حال میں
پوشیدہ ہے جواب بھی میرے سوال میں

ممکن نہیں کہ میری فغاں کا اثر نہ ہو
اے اضطرابِ شوق وہ ہیں کس خیال میں

مہتاب و آفتاب بھی نظروں سے گر گئے
چمکا وہ یوں نمائشِ حسن و جمال میں

کوئی خیال و خواب میں بھی ٹھہر جائے گا
یہ بات تو نہ تھی مرے خواب و خیال میں

پہلے سنیں وہ دردِ مرا پھر کریں لحاظ
دُہری قباحتیں ہیں اک اظہارِ حال میں

نقشے طرح طرح کے بنے اور مٹ گئے
سب کچھ ہے پھر بھی کچھ نہیں بزمِ خیال میں

اعلیٰ کو دیکھئے مگر ادنا کو دیکھ کر
وہ بدر میں نہیں جو شرف ہے ہلال میں

کیا جائے گا وہ دل سے نظر سے خیال سے
جو بس گیا ہے دل میں نظر میں خیال میں

کوتاہی نصیب نے دیکھا نہ آج تک
دامن مراد کا مرے دستِ سوال میں

تصویرِ عشق مجھ کو وفا نے بنا دیا
رہتا ہوں میں خموش کسی کے خیال میں

بے شبہ کوئے یار بھی محشر سے کم نہیں
ایک ایک مبتلا ہے یہاں اپنے حال میں

میں دیکھتا ہوں جلوۂ جاناں کو بار بار
رہتا ہے حسن ہی مرے حسنِ خیال میں

شاید نہ مل سکے کوئی ممکن ہے مل بھی جائے
گذری تمام عمر مری احتمال میں

مجھ کو کبھی قفس پہ وہی حاصل ہے اختیار
جو فرق ہے زمانۂ ماضی و حال میں

ملتے ہیں کیوں مرے تنِ لاغر کو رنج و غم
بڑھتے ہوئے گہن نہیں دیکھا ہلال میں

تقدیر بھی خلاف ہے تدبیر بھی خلاف
کیا ہاتھ ڈالئے کسی امرِ محال میں

پھینچا دیا یہ کھہ کر انھیں ہم نے عرش تک
حوروں سے آپ بڑھ گئے حسن و جمال میں

ساقی تکلفات سے اپنے معاف رکھ
بھر کر پلادے تو مجھے جامِ سفال میں

بحرِ کرم کو جوش خدا جانے آئے کب
ڈوبیں ہم اپنے ہی عرقِ انفعال میں

بیٹھے جہاں اٹھاوہیں طوفان ذوق و شوق
اے نوح کس کو شک ہے تمھارے کمال میں

طبع زاد ۱۸؍ جون ۱۹۳۵ء

رسمِ الفت نباہتا ہوں میں
وہ بھی چاہیں یہ چاہتا ہوں میں

ظلم سہہ کر بھی چاہتا ہوں میں
قولِ الفت نباہتا ہوں میں

آپ ہی سوچئے سبب اِس کا
رات دن کیوں کراہتا ہوں میں

جو گذر جائے لطف سے اے خضر
زندگی ایسی چاہتا ہوں میں

مٹ گئے ذوق و شوق یہ نہ مٹا
دردِ دل کو سراہتا ہوں میں

دل نے مجبور کر دیا ایسا
بے وفا سے نباہتا ہوں میں

شوقِ اظہارِ ذوق و شوق نہیں
چپکے چپکے کراہتا ہوں میں

ہے یہ اُن کو نہ چاہنے کا سبب
عاقبت اپنی چاہتا ہوں میں

مجھ سے جب تک نباہی جاتی ہے
تیری الفت نباہتا ہوں میں

پوچھتا ہے جو کوئی میرا حال
سب سے پہلے کراہتا ہوں میں

وہ نہیں چاہتا کوئی چاہے
پھر بھی سو دل سے چاہتا ہوں میں

ایک طوفان روز اٹھا دینا
نوح تم کو سراہتا ہوں میں

طبع زاد ۱۰؍ ستمبر ۱۹۳۵ء

شکرِ آزار و ستم کرتے ہیں
کون کرتا ہے جو ہم کرتے ہیں

اُس قدر عشق سوا ہوتا ہے
جس قدر ہم اِسے کم کرتے ہیں

میں تو ہوں خیر خطاوار اُن کا
وہ کرم پر بھی ستم کرتے ہیں

جادۂ عشق میں رکنا کیسا
سو کا ہم ایک قدم کرتے ہیں

رازِ الفت نہ ہمارا کھل جائے
گفتگو اِس لئے کم کرتے ہیں

دل نے یوں ہم کو بنایا خوگر
غم جو ملتا نہیں غم کرتے ہیں

دفعتاً ترکِ محبت کیا خوب
رفتہ رفتہ اِسے کم کرتے ہیں

اہلِ تقویٰ نے بھی ستم گر کے لیے
نفس پر اپنے ستم کرتے ہیں

دیکھئے کیا ہو محبت کا مآل
ہم بڑھاتے ہیں وہ کم کرتے ہیں

ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں تم
تم جو کہتے ہو وہ ہم کرتے ہیں

[illegible] تقلیدِ ستم کرنا ہے
آپ ایجادِ ستم کرتے ہیں

ہم بتائیں گے تواریخ وفا
روز کا حال رقم کرتے ہیں

جس گھڑی رو دئے طوفان اُٹھا
نوح یہ کارِ اہم کرتے ہیں

ابھی کوچۂ قاتل سے میں آ رہا ہوں

اس طرح پر ریاست رام پور میں ۸ رجون ۱۹۳۶ء کو مشاعرہ ہوا میں نے مہتمم مشاعرہ کی خواہش پر یہ غزل لکھ کر بھیج دی تھی

شبِ وعدہ یوں دل کو بہلا رہا ہوں
ادھر جا رہا ہوں ادھر آ رہا ہوں

مقدر کی گردش سے گھبرا رہا ہوں
کدھر تھا ارادہ کدھر جا رہا ہوں

قیامت میں تم عذر پہلے وداد کرنا
یہ میں دور کی بات سمجھا رہا ہوں

مرے عندیہ دل کو خبر کوئی دے دے
وہ فرما رہے ہیں کہ میں جا رہا ہوں

بھروسہ کچھ ایسا ہے فضلِ خدا پر
گنہگار ہو کر بھی اِترا رہا ہوں

نہ دل اُن کو دیتا نہ صدمے اُٹھاتا
یہ اپنے کئے کی سزا پا رہا ہوں

خیالِ وفا مجھ کو بہلا رہا ہے
مآلِ محبت سے گھبرا رہا ہوں

قیامت میں حالاتِ غم پھر کہوں گا
ابھی تو بڑی دور سے آ رہا ہوں

تمنا ہیں امیدیں ہیں آرزو ہیں
مٹا تھا مٹوں گا مٹا جا رہا ہوں

جدھر دل مرا مجھ کو لے جا رہا ہے
اُدھر ہاتھ باندھے چلا جا رہا ہوں

دوبارا مجھے کیوں نہ جلوہ دکھاتے
وہ سمجھے کہ میں ہوش میں آ رہا ہوں

جہانِ وفا بھی ہے قدموں کے نیچے
قضا کی طرح چرخ پر چھا رہا ہوں

پھر اُن کی تمنا پھر اُن کی گلی میں
لئے جا رہی ہے چلا جا رہا ہوں

پسِ توبہ اب یہ مرا مشغلہ ہے
پلاتا نہیں ہوں تو پلوا رہا ہوں

خدا جانے کیا ظلم ڈھائے کسی پر
فغاں کر کے میں دل میں پچھتا رہا ہوں

عجب کیا پھر اس سے نوح طوفان اُٹھے
کہ میں اشک آنکھوں سے برسا رہا ہوں

صاف کہہ دیجئے ملنا ہمیں منظور نہیں

پہلے یہ طرح نمائش لکھنؤ کے مشاعرے میں قرار پائی تھی چوں کہ وہاں شریک نہیں ہو سکا اس لئے میرے کہنے سے مرزا احمد جان صاحب و منشی محمد حسین صاحب زبیری نے اپنے سالانہ مشاعرہ ریلوے انسٹیٹیوٹ الہ آباد میں یہی طرح دے کر ۶ مارچ ۱۹۳۳ء کو بڑے پیمانے پر مشاعرہ کیا مقامی شعرا کے علاوہ تاباںؔ صاحب بدایونی ریاضؔ صاحب چیوری و صدیقؔ صاحب مارہروی انجمؔ صاحب اکبرآبادی وغیرہ شریک ہوئے مشاعرہ ایک صورت پر ۹ بجے رات سے چار بجے صبح تک قائم رہا اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں

کیوں کہوں عشق میں مرنا مجھے منظور نہیں	ج	ہیں جو زندہ ہوں تو یہ وقت بھی کچھ دور نہیں
یہ کمی ہے کہ نگاہوں سے مری دور نہیں		حسن و صورت میں ہو تم حور مگر حور نہیں
قابلِ عفو خطائے دلِ رنجور نہیں		آپ کی بندہ نوازی سے مگر دور نہیں
اب کہاں جلوۂ حسن اب وہ کہاں چشمِ کلیم		طور ہی طور ہے کچھ اور سرِ طور نہیں
اے فغاں دل سے نکل اور جلا دے بڑھ کر		چرخ ہے دور مگر تیرے لئے دور نہیں
پچھ سنے حال مرا کچھ کہے روداد اپنی		اُن کی تصویر کو یہ بات بھی منظور نہیں
اور ساری نظر آتی ہیں بلائیں مجھ کو		عرصۂ حشر میں لیکن شبِ دیجور نہیں
ہم نے اُس بزم کی تہذیب نرالی دیکھی		ایک سے بات کرے ایک یہ دستور نہیں
سرفروشی کا مزا کوچۂ اسرار میں ہے		کلمۂ حق سے جو پھر جائے وہ منصور نہیں
جادۂ عشق میں کہتے ہیں یہ آثارِ نشاط		آ گئی منزلِ محبوب بس اب دور نہیں
یہ جہاں چاہتے ہیں جلد پہنچ جاتے ہیں		میں ہوں مجبور خیالات تو مجبور نہیں
پا ہیں مر کر جسے ہم اُس کی تمنا ہے فضول		تم تو موجود ہو دنیا میں اگر حور نہیں
ہے یہ ممکن کہ سلامت رہے دامن اپنا		آستیں پنجۂ وحشت سے مگر دور نہیں
حسرتِ قتل مری جان لئے لیتی ہے		اتنی زحمت بھی اُٹھانی اُنھیں منظور نہیں
گر نہ پڑتے رہِ الفت میں چلے جائیں گے		ننگِ ہمت ہے یہ کہنا بھی کہ مقدور نہیں
پھر دوبارہ مجھے وہ جلوہ دکھا دیں اپنا		طور کچھ بھی نہیں جب شمعِ سرِ طور نہیں
چاہئے دھیان بھی کچھ فرقِ مراتب کا مجھے		ہر طلب گار ترا سرمدؔ و منصور نہیں
لالہ و گل کا یہ عالم مہ و انجم کا یہ حسن		جلوۂ یار کسی بھیس میں مستور نہیں
موت کی جلوہ گری کا یہ اک آئینہ ہے		شمعِ کشتہ بھی مری رائے میں بے نور نہیں
بے دلی اُس کے تغافل سے ہمیں ہو کیوں کر		جانتے ہیں کہ وہ خوددار ہے مغرور نہیں
درحقیقت سحرِ روزِ قیامت کے سوا		اور کوئی بھی علاجِ شبِ دیجور نہیں

ضبطِ طوفانِ محبت کی بھی کیا خوب رہی

نوح سے کہہ دو نمائش کا یہ دستور نہیں

طبع زاد ۱۰ اگست ۱۹۳۷ء

میرے جینے کا طور کچھ بھی نہیں
سانس چلتی ہے اور کچھ بھی نہیں

زندگی دیکھنے میں سب کچھ ہے
جب سمجھئے بغور کچھ بھی نہیں

دل لگا کر پھنسے ہم آفت میں
بات اتنی ہے اور کچھ بھی نہیں

دور دورہ ہو جس میں تقوے کا
وہ زمانے کا دور کچھ بھی نہیں

کچھ نہیں حسن پھر بھی سب کچھ ہے
عشق سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں

جس طرح چاہوں اس طرح پی لوں
بادہ نوشی کا طور کچھ بھی نہیں

آپ ہیں آپ سب کچھ ہیں
اور ہیں اور اور کچھ بھی نہیں

ہم اگر ہیں تو جھیل ڈالیں گے
دل اگر ہے تو جور کچھ بھی نہیں

چند غم چند داغ چند ارماں
خانۂ دل میں اور کچھ بھی نہیں

فکر تشویش غور عشق میں کیا
فکر تشویش غور کچھ بھی نہیں

روز طوفان اٹھاتے رہتے ہیں
نوح میں وصف اور کچھ بھی نہیں

اس زمین میں ایک غزل اور بھی اسی دیوان میں ہے ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء

میں اٹھاؤں لطف اب جینے کا اس قابل نہیں
وہ جوانی وہ طبیعت وہ جگر وہ دل نہیں

لاکھ فکروں سے کہوں آسان آسانی کے ساتھ
جان لوں مشکل کو میں مشکل تو پھر مشکل نہیں

پوچھتے ہیں لوگ مجھ سے واقعاتِ زندگی
میں کسی قابل کبھی تھا اب کسی قابل نہیں

ظالم و مظلوم کا رہنا بہم دشوار تھا
ناوکِ دل دوز اگر پہلو میں ہے تو دل نہیں

پھر نئے سر سے جگہ دے اضطرابِ شوق کو
اے وفورِ یاس دل اپنا اب اس قابل نہیں

واہ کیا کہنا ترا اے وسعتِ دریائے عشق
دیکھتا ہوں ہر طرف ساحل کو میں ساحل نہیں

اور بڑھنا چاہئے آگے حدِ ادراک سے
جس کو میں سمجھا ہوں منزل وہ مری منزل نہیں

ہو گیا وہ بھی تماشا کوئی لحظہ کے لئے
خنجرِ قاتل نہیں اب گردنِ بسمل نہیں

رات بھر کے جاگنے والوں کو نیند آنے لگی
ہو گیا یہ پچھلا پہر ہنگامۂ محفل نہیں

ہر قدم کو جانتا ہوں میں کہ ہے پہلا قدم
شوقِ منزل میں خیالِ دوریِ منزل نہیں

نوح کیوں طوفان اٹھائیں ضبطِ غم سے کام لیں
اشک باری عشق کے آداب میں داخل نہیں

طبع زاد ۱۰/نومبر ۱۹۳۷ء

دل کا سودا کسی سے ہم نہ کریں
جمع سامانِ رنج و غم نہ کریں

کیا کہا شکوۂ ستم نہ کریں
تم کرو ظلم آہ ہم نہ کریں

میں ستم کو کرم سمجھتا ہوں
وہ ستم ہی اگر کریں کرم نہ کریں

فتنۂ حسن چاہتا ہے یہی
عشق کا ذکرِ خیر ہم نہ کریں

اور شاخیں ہزار پھوٹیں گی
نخلِ حسرت کو وہ قلم نہ کریں

زندگی کیا ہے زندگی کیا تھی
زندگی کا خیال ہم نہ کریں

آپ کیوں آئیں روز میرے گھر
آپ اپنا وقار کم نہ کریں

تم ہمارا خیال کرتے ہو
کیوں تمھارا خیال ہم نہ کریں

واسطہ کیا مری مصیبت سے
مر بھی جاؤں تو آپ غم نہ کریں

جائزہ ہیں نشاط و عشرت کا
رنج و غم کا شمار ہم نہ کریں

رازداری کا اقتضا یہ ہے
دل کو بھی ہم شریکِ غم نہ کریں

جاں دے دیں تری اداؤں پر
موت کا انتظار ہم نہ کریں

سوزِ دل اور ضبطِ اشک یہ کیا
آگ پانی کو ہم بہم نہ کریں

کیا یہی ہے مری وفا کا صلہ
ظلم کرنا بھی آپ کم نہ کریں

اِس سب سے کرم وہ کرتا ہے
جان دینے میں عذر ہم نہ کریں

نوحؔ طوفانِ اشک روکیں بھی
رائیگاں ضبط کا بھرم نہ کریں

طبع زاد ۱۰/نومبر ۱۹۳۷ء

طریقِ عشق میں کب خضر کو ہم ساتھ لیتے ہیں
وہ کوئی اور رہرو ہیں جو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں

سکون و صبر کا رہنا بہت دشوار ہوتا ہے
متاعِ خانۂ دل بھی وہ دل کے ساتھ لیتے ہیں

کمر سے کھینچنا خنجر کا اِس ناز و نزاکت پر
قدم لینے کے بدلے سب تمھارا ہاتھ لیتے ہیں

دمِ آخر کی آہیں بجلیوں سے کم نہیں گردوں
کوئی لحظے میں تجھ کو بھی ہم اپنے ساتھ لیتے ہیں

حرم والوں کو اے ساقی تکلف کچھ نہیں ہوتا
ترے ہاتھوں سے وہ بھی جام ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں

مرا دل رہ چکا ثابت جگر بھی رہ چکا قائم
وہ لے کر تیغ دونوں کی خبر اک ساتھ لیتے ہیں

ہزاروں ہاتھ بڑھ جاتا ہے اُن کے عشق کا رتبہ
ترے کوچے میں مر کر جو زمیں دو ہاتھ لیتے ہیں

رقیبوں سے تعلق دور کا بھی رہ نہیں جاتا
عدم کے جانے والے کب کسی کو ساتھ لیتے ہیں

خدا جانے مرے دل سے انھیں کیسا توہم ہے
کبھی ناشاد کہہ دینا کبھی ناکام کہہ دینا

اِدھر اِس ہاتھ دیتے ہیں اُدھر اُس ہاتھ لیتے ہیں
ہمارا نام وہ کس کس ادا کے ساتھ لیتے ہیں

جنابِ نوحؔ کے اسمِ گرامی کا یہ صدقہ ہے
جہاں جاتے ہیں ہم کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں

طبع زاد ۵ / اپریل ۱۹۳۸ء

ج

محبت کے برتاؤ کیا بے سبب ہیں
وہ ناراض مجھ سے نہ جب تھے نہ اب ہیں

حسینوں میں قدرت کے آثار سب ہیں
یہی فضلِ مولا یہی قہرِ رب ہیں

اِدھر کچھ اُدھر کچھ کہیں کچھ کہیں کچھ
تمھاری بھی باتیں غضب ہیں عجب ہیں

چلے مجھ کماں سے جو ناوک تمھارے
مرے دل میں پیوست وہ سب کے سب ہیں

کہاں تک کوئی اپنے دل کو سنبھالے
ترے چلتے پھرتے اشارے غضب ہیں

سناؤں تو عشق و وفا کا فسانہ
مگر میری باتوں کے قائل وہ کب ہیں

یکایک مرے کعبۂ دل کو ڈھایا
کسی کی نگاہیں بڑی بے ادب ہیں

زمانہ مجھے بے خطا کیوں ستاتا
یہ تیری ہی سازش کے تیرے ہی ڈھب ہیں

محبت میں راحت کی سب کو ہوس ہے
مگر وہ ہمیں ہیں جو ایذا طلب ہیں

سرِ حشر انھیں ساری دنیا نے گھیرا
ستم کب کئے تھے پشیمان اب ہیں

ہوا تجربہ یہ محبت میں ہم کو
حسیں جتنے ہیں وہ دل آزار سب ہیں

مرتب ہو گیا زندگی کا صحیفہ
جدا ایک سے ایک اوراق سب ہیں

یہی غنچہ و گل یہی ماہ و انجم
حسینوں کے بھی اچھے اچھے لقب ہیں

جو تم بھول جاؤ تو ہاں بھول جاؤ
ہمیں یاد وہ اپنے آزار سب ہیں

ملے گی خوشی عشق میں غم اٹھا کر
وہ ایذا طلب ہوں جو راحت طلب ہیں

کروں گا نہ منسوب انھیں اس لقب سے
وہ بے درد ہوں بھی تو بے درد کب ہیں

کہاں حضرتِ نوحؔ کو تم نے دیکھا
خدا رکھے وہ آدمی ہی عجب ہیں

طبع زاد ۱۵ / جون ۱۹۳۸ء

ج

ادا و ناز میں ہوتا تھا نیک نام انھیں
مرا سلام بھی لیتے نہیں سلام انھیں

خیالِ مشقِ جفا و ستم سے کام انھیں
نہ صبح ہوتی ہے معلوم اب نہ شام انھیں

کسی کی قبر نہ پامال ناز ہو جائے
خیال چاہیے اس کا دمِ خرام انھیں

جگر میں تیر کے چبھنے سے ہم نے جان لیا
نگاہِ ناز کا آتا ہے انتظام انھیں

بیانِ ظلم سے کیا اور مدعا میرا
یہ مدعا ہے کہ چاہیں نہ خاص و عام انھیں

اب اِس قدر بھی مناسب تو تہمات نہیں
وہاں قیام کریں وہ جہاں ہو شام انھیں

جنھیں زبان سے ناکام کہہ دیا تم نے
مری نگاہ نے دکھیانہ شاد کام انھیں

مری نگاہ میں کیوں کر پھریں نہ دیر و حرم
ملے ہیں دل کے سوا اور دو مقام انھیں

وہ کہہ گئے کہ محبت میں پختہ کام نہیں
مری طرف سے یہ کیسا خیالِ خام انھیں

شمار کرتے رہیں اپنے مرنے والے کا
نہیں اب اِس کے سوا اور کوئی کام انھیں

مرے خیال میں اللہ استقامت دے
یہ چاہتا ہوں کہ چاہا کروں مدام انھیں

ستم بھی قہر بھی اغماض بھی تغافل بھی
بتا دئیے مری الفت نے چند کام انھیں

نگاہِ ناز سے بچنا مرا محال ہوا
خدا نے دی یہ عجب تیغ بے نیام انھیں

جنابِ نوح نے بدنام نوح کو بھی کیا
ملا تھا اِس کے سوا کیا نہ اور نام انھیں

مشاعرہ دریا آباد ۷ اگست ۱۹۳۸ء

جنوں میں دھجیوں کا ساز و ساماں دیکھ لیتا ہوں
ج گریباں کو گریباں در گریباں دیکھ لیتا ہوں

ہجومِ رنج و غم میں دل کو نالاں دیکھ لیتا ہوں
وہ ہنس لیتے ہیں میں حالِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

یہ نیرنگِ جنونِ حشر ساماں دیکھ لیتا ہوں
کہیں دامن میں پیوندِ گریباں دیکھ لیتا ہوں

نہیں آسان سورج پر نگاہوں کا ٹھہر جانا
مجھے حیرت ہے کیوں کر روئے تاباں دیکھ لیتا ہوں

گلستاں کا نظارہ تو کہاں میرے مقدر میں
قفس میں چند اوراقِ گلستاں دیکھ لیتا ہوں

مرا جوشِ جنوں پابندِ زنداں رہ نہیں سکتا
یہاں بھی خاک اڑا کر میں بیاباں دیکھ لیتا ہوں

جفا کر کے جفا کی اب تلافی کر نہیں سکتے
یہی کیا کم ہے میں اُن کو پشیماں دیکھ لیتا ہوں

اٹھاتا ہوں نظر پہلے گلوں کے چاک دامن پر
لگے ہاتھوں پھر اپنا بھی گریباں دیکھ لیتا ہوں

قدم رکھنے نہیں دیتا زمیں پر ڈر اسیری کا
نشیمن ہی سے میں رنگِ گلستاں دیکھ لیتا ہوں

وہ اکثر بال بکھرا کر مرے گھر آتے جاتے ہیں
یہ دسویں بیسویں خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

طوافِ کوئے جاناں سے مجھے فرصت نہیں ملتی
دمِ جوشِ جنوں رسماً بیاباں دیکھ لیتا ہوں

جمالِ روئے رنگیں سے نظر میری نہیں ہٹتی
بیک وقت اس طرح پورا گلستاں دیکھ لیتا ہوں

ہزاروں لطف صدقے حسرتِ آوارہ گردی پر
اُسی کے دم قدم سے میں بیاباں دیکھ لیتا ہوں

نشاطِ عمرِ فانی پر بھروسہ میں نہیں کرتا
مآل اس کا سرِ گورِ غریباں دیکھ لیتا ہوں

اثر اس سے زیادہ کیا دکھا دیتی پریشانی
پریشاں کرنے والے کو پریشاں دیکھ لیتا ہوں

جناب نوح سے اشعارِ جوش انگیز سن کر
غزل کے بھیس میں امواجِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

۱۵ ستمبر ۱۹۳۶ء

ج

دیکھ کر ساون کو اشک آنکھوں میں بھر لاتا ہوں میں
ابر برساتا ہے پانی ابر برساتا ہوں میں

دھجیاں جب دامنِ فریاد کی پاتا ہوں میں
اپنی اک اک حسرتِ مردہ کو کفناتا ہوں میں

رفتہ رفتہ اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہوں میں
موجِ دریا ہوں مگر ساحل سے ٹکراتا ہوں میں

آتشِ الفت نے بخشا مجھ کو یہ طرفہ عروج
برق بن کر ابر کے پردے میں لہراتا ہوں میں

مجھ کو خودداری مری ہلنے نہیں دیتی مگر
کوئی طاقت کھینچ لے جاتی ہے کھنچ جاتا ہوں میں

دیکھ کر بزمِ جہاں کا سوز و ساز بے ثبات
شعلۂ شمعِ سحر کے ساتھ تھراتا ہوں میں

جو بلا آئے گی وہ پہلے مجھی پر آئے گی
ساتھیوں کو چھوڑ کر آگے بڑھا جاتا ہوں میں

اُن کے آگے منہ سے کچھ کہنا بھی ٹھہرا ننگِ عشق
اپنے دل کو کھو کر اپنے جی میں پچھتاتا ہوں میں

ہجر کی شب اتفاقاً مرتے مرتے رہ گیا
ورنہ یہ عالم تھا اب جاتا ہوں اب جاتا ہوں میں

جو حدودِ عشق سے بڑھ جائے وہ سودا نہیں
دیکھ کر صحرا کی وسعت پاؤں پھیلاتا ہوں میں

دیر و مسجد تک نہیں محدود انوارِ جہاں
جلوہ گاہِ طور کی جانب بھی ہو آتا ہوں میں

کھینچ کر مجھ کو جو لے جاتے ہیں بزمِ دوست تک
دولتِ دارین انھیں قدموں سے ٹھکراتا ہوں میں

اے ہوائے شوقِ منزل کچھ سہارا دے مجھے
کارواں سے چھوٹ کر پیچھے رہا جاتا ہوں میں

شورِ محشر سے کوئی کہہ دے ذرا ساکت رہے
واقعاتِ غم کو اپنے آج دہراتا ہوں میں

سختیِ تقدیر مجھ میں دیکھتی ہے اپنی شکل
ہوں تو آئینہ مگر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

کم نہیں حسنِ تبسم سے اثر میں سوزِ عشق
پھول برساتے ہو تم اور آگ برساتا ہوں میں

شمعِ محفل کی طرح جلنا نہیں آتا مجھے
آہ کرنے ہی سے پہلے خاک ہو جاتا ہوں میں

چاہیئے فطرت کو سازِ سرمدی پھر چھیڑ دے
بے خودی کم ہو چلی اب ہوش میں آتا ہوں میں

اب حیا پرور نگاہیں مجھ سے اٹھ کر مل چکیں
سر جھکا کر کہہ دیا اس نے کہ شرماتا ہوں میں

کس نے آکر قبر پر مانگی دعائے مغفرت
گلشنِ جنت میں اپنی روح کو پاتا ہوں میں

اس تمنا میں کہ شاید دیکھ لوں اس کا جمال
ہر طرف اپنی نگاہِ شوق دوڑاتا ہوں میں

مل گئے ہم راز کیا اچھے کراماً کاتبین
واقعاتِ غم انھیں دونوں سے لکھواتا ہوں میں

اپنے بندے کی دعا اللہ کرتا ہے قبول
یہ سمجھ کر اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں میں

مے کدے پر دیکھ کر بدلی کو دیکھا چاہیئے
آج پیتا ہوں پلاتا ہوں کہ پلواتا ہوں میں

نوحؔ اپنی ناخدائی سے مجھے رکھیں معاف
غرق ہو کر بحرِ غم کی تھاہ پا جاتا ہوں میں

طبع زاد ۱۷ر جنوری ۱۹۳۹ء

ج

فقرے نئے طریق کے ڈھلتے ہیں رات دن
وہ میرے حق میں زہر اُگلتے ہیں رات دن

بن ٹھن کر اپنے گھر سے نکلتے ہیں رات دن
شمس و قمر کی چال وہ چلتے ہیں رات دن

اک شمع ہے کہ شام سے جلتی ہے صبح تک
اک ہم ہیں سوزِ عشق میں جلتے ہیں رات دن

میرے علاوہ سب چمنِ روزگار میں
ہو کر نہال پھولتے پھلتے ہیں رات دن

میں سرگذشتِ حضرتِ دل کیا بیاں کروں
پہلو میں بے سبب بھی مچلتے ہیں رات دن

عیش و خوشی میں وقت کی تخصیص کچھ نہیں
ارمان میرے دل سے نکلتے ہیں رات دن

کیا مجھ سے دوستی وہ نباہیں گے عمر بھر
وعدے بھی صبح و شام کے ٹلتے ہیں رات دن

دم بھر بھی ہم کو بسترِ غم پر نہیں قرار
کروٹ اِدھر اُدھر کی بدلتے ہیں رات دن

کس وقت دیکھیئے اُسے نزدیک و دور سے
خنجر کے ساتھ تیر بھی چلتے ہیں رات دن

ہر وقت سوتے جاگتے لاؤں کہاں سے دل
دن ہو کہ رات آپ مچلتے ہیں رات دن

سوزِ دل و جگر یہ بڑھا عشقِ یار میں
شعلے مرے دہن سے نکلتے ہیں رات دن

پھر بھی نہیں امید نہیں ختم ہو سفر
چلنے کو راہِ شوق میں چلتے ہیں رات دن

کیوں کر تری گلی میں ہمارا قدم جمے
چشمے یہاں ستم کے اُبلتے ہیں رات دن

ایسے میں امتیاز کرے کیا نگاہِ شوق
وہ سو طرح کے روپ بدلتے ہیں رات دن

پیدا ہوئیں یہ حسنِ تصور میں خوبیاں
آنکھوں کے سامنے وہ ٹہلتے ہیں رات دن

اے خوش خرام کیا ترے فتنوں کا پوچھنا
سانچے میں ظلم و جور کے ڈھلتے ہیں رات دن

کیوں کر ہوں بے حجاب اشارے نگاہ کے
شرم و حیا کی گود میں پلتے ہیں رات دن

اے نوحؔ بے سبب نہیں ہر دم خوشامدیں
طوفانِ اشک سے وہ دہلتے ہیں رات دن

طبع زاد ۱۰ر اپریل ۱۹۳۹ء

ج

اور کیوں اشکبار ہوتا ہوں
تم رُلاتے ہو مجھ کو روتا ہوں

ہے وہی میری زندگی کا سبب
جس کی حسرت میں جان کھوتا ہوں

حکم تھا بے قرار ہونے کا
دیکھیئے بے قرار ہوتا ہوں

گذری راتوں کو پچھلی باتوں کو — یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں
تم تو کرتے نہیں کسی کو ہلاک — خون میں ہاتھ میں ڈبوتا ہوں
قبر میں کون اب جگائے گا — میں قیامت کی نیند سوتا ہوں
حسن مجبور مجھ کو کرتا ہے — خود بخود کیا نثار ہوتا ہوں
اب ہے دیوانگی کا یہ عالم — خود ہی ہنستا ہوں خود ہی روتا ہوں
بحر الفت کی تھاہ لینے کو — ناؤ منجدھار میں ڈبوتا ہوں
دل سے ذوق خلش نہیں جاتا — ناوک کر تیر میں چبھوتا ہوں
جان جاتی ہے وہ عشق کا رتبہ — اس تمنا میں جان کھوتا ہوں
اُس طرف دل بھی مجھ کو روتا ہے — اِس طرف میں بھی دل کو روتا ہوں
تیغ قاتل کے گھاٹ پر میں بھی — خون سے ہاتھ پاؤں دھوتا ہوں

ہے مرا نام نوح یاد رہے
ساری دنیا کو میں ڈبوتا ہوں

۱۲ر جولائی سنہ ۱۹۳۹ء

ج

خیال میں اک اک مزے کی نئی کہانی ہے اور ہم ہیں — ابھی تمنا ہے اور دل ہے ابھی جوانی ہے اور ہم ہیں
غریق بحر ستم نہ کیوں ہوں یہ جاں فشانی ہے اور ہم ہیں — کہ آپ ہیں آپ کی چھری ہے چھری کا پانی ہے اور ہم ہیں
دم اخیر اس کو اب سوچیں یہ سوچنا چاہیے تھا پہلے — مآل کیا ہوگا زندگی کا جہانِ فانی ہے اور ہم ہیں
یہ عشق پر حسن کی عنایت یہ حسن سے عشق کی ارادت — ہماری حسرت ہے اور تو ہے تری جوانی ہے اور ہم ہیں
نگاہِ الفت بھی ہو چلی کچھ ستم بھی کرنے لگا وہ ظالم — اگرچہ بھی مہربانیاں ہیں تو کامرانی ہے اور ہم ہیں
ادا نے چھیڑا نظر نے تاکا ستم نے لوٹا غضب نے مارا — زباں حبیب سے کھلی ہماری بھی کہانی ہے اور ہم ہیں
بقا کا چرچا جہان بھر میں مگر بقا سے جہان خالی — خیال عیش مدام کیسا جہانِ فانی ہے اور ہم ہیں
ابھی سے توبہ ابھی سے تقوی ابھی سے کیا فکر دین و عقبیٰ — نئی امنگیں نئی ترنگیں نئی جوانی ہے اور ہم ہیں
پہنچ پہنچ کر فلک پہ آہیں کریں نہ انجم میں کیوں اضافہ — کہ شام سے صبح تک شبِ غم شرر فشانی ہے اور ہم ہیں
کسے توقع تھی آئیں گے وہ یقیں کسے تھا بلائیں گے وہ — یہ خاص ان کی ہے مہربانی کہ مہربانی ہے اور ہم ہیں
اٹھا ہی دیں گے نقاب اپنی دکھا ہی دیں گے وہ اپنا جلوہ — نبھے گی کب تک یہ لن ترانی یہ لن ترانی ہے اور ہم ہیں
بھرے ہوئے چشمِ تر میں آنسو جگر میں بھڑکی ہوئی ہے آتش غم — یہ آگ ہے اور یہ ہے پانی یہ آگ پانی ہے اور ہم ہیں
فغاں تو آخر فغاں ہی ٹھہری گلہ تو آخر گلہ ہی ٹھہرا — محال ہے ضبط میں سانس لینی وہ ناتوانی ہے اور ہم ہیں
نہ ہنستے گوفے نہ کیوں کھلائیں جو غنچہ و گل کو دیکھ پائیں — بہار تو ہے چمن کی رانی چمن کی رانی ہے اور ہم ہیں

کبھی تو ہم یہاں وہاں کے کبھی تصور ادھر ادھر کا
جتا چکے درد دل کو اپنے جواب جتائیں تو کیا جتائیں

سکوں و راحت سے کیا تعلق کہ بدگمانی ہے اور ہم ہیں
کہی ہوئی بھی سنی ہوئی بھی وہی کہانی ہے اور ہم ہیں

بہت سے الفت میں آئے طوفاں رہا کئے نوح بھی پریشاں
مگر وہی پیہم آنسوؤں کی ابھی روانی ہے اور ہم ہیں

کوئی نہیں کسی کا ایام بے کسی میں

پروفیسر ڈاکٹر رام کشن لال صاحب موج کے زیر اہتمام عبدالحفیظ صاحب عیش بیاتوری و منشی انوارالحسن صاحب نور آزادی کی تحریک سے ۲۲ فروری ۱۹۴۲ء کو سنیما ہال بازار دانا پور میں اس طرح پر مشاعرہ ہوا مقامی شعرا میں حضرات رحمت شاداب رحمان بدر قتیل باہر کے لوگوں میں مائل صاحب انجم صاحب حسرت صاحب شمس صاحب حمید صاحب عظیم آبادی کشتہ صاحب گیاوی وفا صاحب جدت صاحب الہ آبادی وغیرہ شریک تھے میں صدر ہونے کے سبب سے چار بجے صبح کو طرحی غزل پڑھی لوگوں کے اصرار سے پانچ غزلیں اور غیر طرح بھی پڑھنی پڑیں مشاعرہ نو بجے سے شروع ہو کر ۵ بجے صبح کو ختم ہوا

ج

ممنون منصفی کے ہوتے ہم اپنے جی میں
تھوڑا سا غم جو ملتا تھوڑی سی زندگی میں

لاکھوں بناؤ دیکھے اک تیری سادگی میں
بڑھ کر بلائیں لے لوں یہ آرہا ہے جی میں

عمر دو روزہ غم گذری مری راستی میں
ناکامیوں کو رونا ہے کام زندگی میں

پایا نہ فرق کچھ بھی سوچا جو ہم نے جی میں
دانا کی دشمنی میں ناداں کی دوستی میں

رخ سے نقاب الٹ کر مجھ سے نظر ملاؤ
بجلی کو ڈھونڈتا ہوں میں سورج کی روشنی میں

نیرنگی جہاں پر بنیاد تھی جہاں کی
آزار و لطف مل کر دونوں رہے اسی میں

موسیٰ سے اور مجھ سے جلووں کی بحث کیسی
وہ کوہ طور پر ہیں میں ہوں تری گلی میں

عمر ابد کی خواہش اسے خضر کیا کریں ہم
لاکھوں الم اٹھائے دو دن کی زندگی میں

بے کاری شب غم دل سے یہ کہہ رہی ہے
داغوں کو اپنے گن لے تاروں کی روشنی میں

اظہار آرزو پر تم کچھ نہ دھیان کرنا
اک بات میں نے یوں ہی کہہ دی ہنسی ہنسی میں

جیسے نہ کچھ تو ہم ہیں جیسے نہ کچھ تردد
اٹھے ہم اپنے گھر سے پہنچے تری گلی میں

فطرت کا ہر کرشمہ اپنی جگہ چمن ہے
رنگینیاں کلی کی دیکھیں پھولوں کی سادگی میں

یوں ان کے ساتھ ہم نے دن لطف سے گذارے
کچھ کہہ دیا ہنسی سے کچھ سن لیا ہنسی میں

قہر کرم نما نے کھولا یہ راز مجھ پر
ہے دشمنی بھی داخل آداب دوستی میں

اے داغ دل شب غم حد سے سوا نہ بڑھنا
آتی ہے نیند مجھ کو مدھم سی روشنی میں

ممکن ہے اس سبب سے کوئی بلا نہ آئے
میں اپنے دل کو دے دوں ان کی سپردگی میں

غنچہ تو گل بنے گا گل کچھ نہ بن سکے گا
وہ پھول میں کہاں ہے جو بات ہے کلی میں

اچھی کہی بھلا دو کیوں کر کوئی بھلا دے
سو دن کی دشمنی کو دس دن کی دوستی میں

سیرت تو کیا ملے گی صورت نہ مل سکے گی
ہے کس قدر تفاوت ایک ایک آدمی میں

وقتِ نشاط کم ہے لطفِ نشاط جب تھا
دونوں جہان ملتے دو دن کی زندگی میں

تم تند خو نہیں ہو تم حیلہ جو نہیں ہو
ہاں ہاں ضرور بے شک یہ عیب ہیں مجھی میں

کیا روزِ حشر کا ڈر ہیں تو یہ جانتا ہوں
تاریکی شبِ غم آئی ہے روشنی میں

کیا واسطہ وفا سے خوبانِ بے وفا کو
امید تو نہیں ہے شاید یہ ہو کسی میں

مجھ کو نگاہِ بد کا کھٹکا لگا ہوا ہے
تھوڑا سا غم بھی یارب شامل ہے خوشی میں

شاید وہ پھر بگڑ کر طوفان تو اٹھا دیں
تم نوح کو نہ چھیڑو بس خیر ہے اسی میں

طبع زاد

ج

شکوۂ غم مجھے روا بھی نہیں
اور پھر حکم آپ کا بھی نہیں

دل تو میرا حریمِ ناز میں ہے
میں جدا ہوں مگر جدا بھی نہیں

کیا کروں آرزو نشیمن کی
مجھ کو تنکے کا آسرا بھی نہیں

خاک ہو کر ہی ہم پہنچ جاتے
اُس طرف کی مگر ہوا بھی نہیں

پھر گئے سب تمہارے پھرنے سے
میری جانب مرا خدا بھی نہیں

حسنِ خود دار کا یہ حسنِ سلوک
عشق کو اذنِ التجا بھی نہیں

ہم سے ہر دم خفا وہ رہتے ہیں
اور کہتے ہیں ہم خفا بھی نہیں

طور پر کیا گیا کلیم کو غش
سامنے کوئی تھا کہ تھا بھی نہیں

کب سے بے موت مر رہا ہوں میں
میری تقدیر میں قضا بھی نہیں

سجدۂ شوق کیا کرے کوئی
نقشِ پا اُن کا دیرپا بھی نہیں

ہم بڑی دیر سے یہ دیکھتے ہیں
اِس طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں

تیغ بن کر جو دل کو تڑپائے
وہ ادا ہے مگر ادا بھی نہیں

مجھ سے وہ دور دور رہتے ہیں
پاسِ الفت اُنھیں ذرا بھی نہیں

وہ مری قبر دیکھ کر ہیں خموش
مغفرت کے لئے دعا بھی نہیں

مجھ کو حور و پری سے کیا مطلب
واسطہ اُن سے دور کا بھی نہیں

جس قدر تم برا سمجھتے ہو
اُس قدر دل مرا بُرا بھی نہیں

عشق میں سو طرح کے وہم بھی ہیں
پھر کوئی وہم کی دوا بھی نہیں

ڈر ہے افشائے رازِ الفت کا
زور سے میں کراہتا بھی نہیں

با خدا نوحؔ بھی تو ہے بخدا!
تم یہ کہتے ہو ناخدا بھی نہیں

طبع زاد

دنیائے آرزو میں کہیں عافیت نہیں
اوروں کی ہو تو ہو مگر اپنی کھپت نہیں

یہ بات ہے درست کوئی من گھڑت نہیں
اٹکے جو دل تو جان تو اب عافیت نہیں

آزار پر بھی شکرِ عنایات چاہیئے
جو کام ہے خدا کا وہ بے مصلحت نہیں

قدرت سے انحرافِ مشیت کو دیکھ کر
معبودیت وہی ہے مگر عبدیت نہیں

اپنے پرائے سب ترے کوچے میں بس گئے
لیکن نہیں تو صرف ہماری کھپت نہیں

خوفِ عذاب نے مری مٹی خراب کی
اچھے وہی ہیں جن کو غمِ عاقبت نہیں

اے دل مآلِ ذوق پہ اپنے نگاہ کر
سب کچھ تو عشق میں ہے مگر عافیت نہیں

حور و پری کو دور سے کرتا ہوں میں سلام
کچھ بھی نہیں جب اُن میں کچھ انسانیت نہیں

دیکھوں کسی کے حسن کو میں حسبِ آرزو
سکتے کا یہ سبب ہے کہ اتنی سکت نہیں

سب کہہ رہے ہیں دل کا لگانا گناہ ہے
لیکن مرے خیال میں یہ معصیت نہیں

جو کچھ ہے وہ ہے اپنے ہی اعمال کی جزا!
تیرا کرم ہو یا ہو ستم بے جہت نہیں

بھیجوں پیامِ شوق انھیں اے پیامبر
منظور ایسی بات تمہی معرفت نہیں

آئے مزاج میں تو انھیں بخش دیجیے
دو چار ہیں قصور مرے اَن گنت نہیں

ذکرِ وفا پہ اور وہ بگڑیں خدا کرے
میں جانتا ہوں نا رہے یہ تمکنت نہیں

مرنے کے بعد پھر بھی مرے کام آسکے
سرمایۂ حیات میں اتنی بچت نہیں

طوفانِ غم میں کشتیِ دل غرق ہو گئی
اے نوحؔ ذوق و شوق کی اب عافیت نہیں

طبع زاد

کیا کہتا ہوں کیا سُنتا ہوں
سر پٹکے پچھلے دُھنتا ہوں

جب پھول چمن کے چُنتا تھا
اب دشت میں کانٹے چُنتا ہوں

اے شمع یہ مجھ کو یاد نہیں
میں کب سے جلتا بھُنتا ہوں

مانا کہ ستمگر آپ نہیں
وہ کہتا ہوں جو سُنتا ہوں

وہ کہتے ہیں سُنتے جاؤ
میں حال تمھارا سُنتا ہوں

کس زور کی آندھی آئی ہے
جب خاک کے ذرّے چھنتا ہوں

وہ شوقِ شہادت ہے مجھ کو
خنجر کے لئے سر دھنتا ہوں

رہتی ہے یہ اُن کی محفل میں
ہیں شمع سے جلتا بجھتا ہوں

طوفان اٹھاؤ نوح کوئی
تعریف تمھاری سنتا ہوں

کسی رسالے کے لئے

ج

ایک ہو دو کہ تین چار ہیں تو شمار میں نہیں
جلوۂ حسن آپ کا سو میں ہزار میں نہیں

سیرِ چمن کی آرزو اہلِ نگاہ کیوں کریں
مجھ میں جو ہے بہارِ حسن خود وہ بہار میں نہیں

ساتھ تمام عمر کا مرنے کے بعد چھٹ گیا
جسم تو ہے مزار میں روح مزار میں نہیں

میرے جانِ شوق کو یاس نے کر دیا تباہ
دل ہی دل اب تو ہے فقط کچھ دلِ زار میں نہیں

دردِ جگر بڑھے کچھ اور ہے یہی عشق کا مزا
کہتی ہیں بے قراریاں لطف قرار میں نہیں

اُن کی نظر کے پھرتے ہی رنگِ جہاں بدل گیا
لیل و نہار کا سماں لیل و نہار میں نہیں

رہ رہِ ذوق و شوق دیکھ اپنی نظر کے سامنے
منزلِ آرزو نہاں گرد و غبار میں نہیں

رنگِ چمن کو بندگی خندۂ گل کو بھی سلام
برقِ جمالِ یار اگر ابرِ بہار میں نہیں

مرنے کے بعد مجھ کو بھی عیش و نشاط کی ہوس
خاک ہے خاک کے سوا خاک مزار میں نہیں

اصل تو پھر بھی اصل ہے نقل تو پھر بھی نقل ہے
غنچہ و گل کی تازگی نقش و نگار میں نہیں

تم نے یہ کس طرح کہا اہلِ وفا کے ذکر پر
اور ہیں سب شمار میں نوح شمار میں نہیں

طبع زاد

ج

مانا کہ زمانے میں ہوں بے نام و نشاں میں
لیکن یہ رہے یاد جہاں آپ وہاں ہیں

دم بھر بھی رہا عشق سے بے فکر کہاں میں
کیوں ہو نہ جواں ذوق جواں دل ہے جواں ہیں

پچھم سے نکلنے کو ہے خورشیدِ قیامت
کرتا ہوں شبِ ہجر بہت آہ و فغاں میں

اظہارِ تمنا تو ہے اظہار تمنا
لو بات نہ کرنے کی بھی دیتا ہوں زباں میں

پابندِ مراتب نہیں اسرارِ محبت
مجھ کو ہے یہ تسلیم کہاں تم ہو کہاں میں

روداد محبت کبھی بھولے سے نہ کہنا
سنتے ہیں اگر آپ تو کرتا ہوں بیاں میں

عنقا کی طرح عشق نے بخشی مجھے شہرت
اس کے ہیں یہ معنی نہ نہاں ہوں نہ عیاں میں

سب رہ گئے رکھے وہ زمانے کے مصائب
پہنچا ہوں کہاں سے نہیں معلوم کہاں میں

لکھتے ہیں انہیں اہلِ وفا صفحۂ دل پر
اسرارِ غمِ عشق جو کرتا ہوں بیاں میں

اے شمع تجھے حال مرا کیا نہیں معلوم
گرنے کو جو آنسو ہوں تو اٹھنے کو دھواں میں

پوشیدہ رہا عشق اگر تو ہے مزا کیا
وہ درد اٹھے کر نہ سکوں ضبطِ فغاں میں

سب پر ہے نوازش تری مجھ پر بھی کرم کر
یارب نہیں کیا شاملِ اربابِ جہاں میں

مشغولِ ستم کون ہے مشغولِ ستم آپ
مصروفِ فغاں کون ہے مصروفِ فغاں میں

ڈھاتا ستم و جورِ فلک اور زیادہ
اچھا ہے کہ دنیا میں ہوں بے نام و نشاں میں

اے اہلِ جہاں مجھ سے کوئی خوش نہیں رہتا
صحرا میں ہوں صرصر چمنستاں میں خزاں میں

اچھا ہوا برقِ نگہِ ناز نے پھونکا
کب تک دلِ بے تاب کا رہتا نگراں میں

اے ضبطِ تپِ عشق فغاں دل ہی میں رہ جائے
اس آگ سے اٹھتے ہوئے دیکھوں نہ دھواں میں

یہ نوح کا ارشاد غلط ہو نہیں سکتا
طوفان اٹھے گا دہن پھونکوں گا جہاں میں

طبع زاد

اسرارِ ستم حشر میں اب کھول رہے ہیں
بہتر ہے کہ وہ چپ رہیں ہم بول رہے ہیں

بے وجہ محبت سے نہیں بول رہے ہیں
وہ باتوں ہی باتوں میں مجھے کھول رہے ہیں

آتا ہی نہیں اُن کو یقیں میری وفا کا
میزانِ محبت میں اسے تول رہے ہیں

ہوگا نہ اگر زہر تو امرت بھی نہ ہوگا
کیا جانئے وہ میرے لئے کیا کھول رہے ہیں

سنتا ہوں جو میں غور سے باتیں کبھی دل کی
معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ بول رہے ہیں

میعادِ اسیری کا معمہ نہیں کھلتا
ہم اپنے پر و بال مگر کھول رہے ہیں

دامن میں جگہ پا گئے آنکھوں سے ٹپک کر
یوں بھی تو مرے اشکِ غم انمول رہے ہیں

بارِ غمِ الفت نہ اٹھے گا کہ اٹھے گا
ہم اپنی طبیعت کو ابھی تول رہے ہیں

تم ہیچ سمجھتے ہو جن اشکوں کی حقیقت
موتی مرے دامن میں وہی رول رہے ہیں

دھو جائیں نہ کس واسطے الفاظِ تمنا
پانی میں وہ نامے کو مرے گھول رہے ہیں

ایسا تو نہ ہو اور بھی الجھن وہ بڑھا دیں
ہم اپنے مقدر کی گرہ کھول رہے ہیں

یا فصلِ گل آئے گی اب یا آ گئی ہوگی
مرغانِ قفس اڑنے کو پر تول رہے ہیں

ہاں پھر تو ہو ارشاد سنائیں گے نہ تجھ کو
کیا آپ یہ سچ کہتے ہیں سچ بول رہے ہیں

ہم سے دمِ طوفانِ سخن جب کبھی جا پہنچا
اشعارِ غزل نوح کے انمول رہے ہیں

اظہارِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں
جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

ہجوِ شرابِ ناب کئے جا رہا ہوں میں
نیت مگر خراب کئے جا رہا ہوں میں

ان کی جفائیں میری وفاؤں سے بڑھ نہ جائیں
یہ عشق میں حساب کئے جا رہا ہوں میں

فردِ عمل کو دامنِ تر کیا سمجھ لیا
آلودہ شراب کئے جا رہا ہوں میں

بیگانگی اثر سے ڈرے جا رہے ہیں وہ
فریاد کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

ناراضگی کا ڈر خفگی کا اثر نہیں
شکوہ بہم عتاب کئے جا رہا ہوں میں

کہنا پڑے گا ہیں صحرائیں دیکھ کر
تقلیدِ آں جناب کئے جا رہا ہوں میں

دل کو سکوں میں لطف نہ آئے گا عشق کا
مائل با اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

چمکیں گے داغ ہائے محبت ابھی کچھ اور
اک اک کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

تعدادِ بے شمار کا کھٹکا نہیں رہا
تقصیرِ بے حساب کئے جا رہا ہوں میں

آؤں گا اس سبب سے تجھے یاد بار بار
برپا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

سچ یہ ہے جیسے آتش نگاہوں کے سامنے
یوں نام شباب کئے جا رہا ہوں میں

عفوِ خطا نے خوگرِ عصیاں بنا دیا
جرموں کا ارتکاب کئے جا رہا ہوں میں

پہلے بھی شرحِ درد سے تھا مجھ کو احتراز
اور اب بھی اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

اے نوح میرے بعد کوئی کیا اٹھائے گا
طوفاں کا سدِ باب کئے جا رہا ہوں میں

بے پر و بالی پہ بھی ہم عاشقِ صیاد ہیں

۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو جناب خان بہادر سید ابو محمد صاحب ڈسٹرکٹ کلکٹر نے الہ آباد میں اس طرح پر دعوت کے ساتھ خاص مشاعرہ کیا مقامی شعرا کے علاوہ اوجی صاحب، جمیل شمری، آل رضا صاحب، ملا صاحب لکھنوی ممتاز حضرات میں سے عالی جناب اقبال صاحب چیف ملا صاحب جج صاحب جج ہائی کورٹ جناب سر تیج بہادر صاحب سپرو جناب گلشن صاحب وغیرہ موجود تھے اس ردیف و قوافی پر میری ایک غزل سفینۂ نوح دیوان اول میں بھی تھی کچھ ترمیم کے ساتھ وہ اشعار اور کچھ نئے اشعار غزل میں شامل کئے گئے ہیں

کیا کہوں کیا واقعاتِ گلشن ایجاد ہیں
صید بھی اڑنے نہیں جتنے یہاں صیاد ہیں

یہ غلط ہے نارسا ہیں اور بے بنیاد ہیں
میری اک اک آہ پر گردوں کئی سو صاد ہیں

رنج و غم سہہ کر بھی ہم مجبورِ مبارکباد ہیں
شاد ہیں یا نوشاد ہیں ناشاد ہیں یا شاد ہیں

کون ہم کو یاد کرتا ہے کسے ہم یاد ہیں
واقعہ گزرا ہوا بھولی ہوئی روداد ہیں

چرخ سے بڑھ کر حسینانِ جہاں جلاد ہیں
وہ ستم ایجاد کیا ہے یہ ستم ایجاد ہیں

عشق کامل ہو تو پھر کیسی دوئی کیسا فراق
ہاتھ اٹھانے کی ادا بھی کبھی نہیں قاتل سے کم
ابتدا کے بعد دیکھی انتہا بھی عشق کی
اِن کا وعدہ اِن کا پیماں اِن کا اقرار اِن کا قول
بھول جاؤں عیش میں وہ غم یہ ممکن ہی نہیں
کیا خبر آ گئے جنوں صورت کرے کیا اختیار
ایک تم ہو دل بھی لے کر کچھ نہ رحم آیا تمھیں
باندھ رکھا ہے ہوا کو کس نے بیڑی ڈال کر
باغِ عالم میں ملی عزت ہمیں ذلت کے ساتھ
عشق میں کیا مطمئن ہو کر کوئی رکھتے قدم
کیا قضا آنے سے پہلے جیتے جی میں مر گیا
میں ابھی بھولا نہیں بھولا نہیں بھولا نہیں
تم کو اِس تکرار نے بے درد ثابت کر دیا
گوشۂ راحت نہ سمجھیں کس لئے زنداں کو ہم
دل میں گھٹ گھٹ کر انھیں رہتے زمانہ ہو گیا
ہاتھ رکھا جس کے دل پر وہ ہوا فوراً ہلاک
بخت کیا افلاک کیا دل کیا نظر کیا شوق کیا
لطف جب آئے قیامت میں خدا کے سامنے
میں ترے جادو بھرے فقروں میں آنے کا نہیں

خود ہمیں شیریں ہیں خود اپنے ہمیں فرہاد ہیں
اُن کے دو بازو مجھے دو خنجرِ بے داد ہیں
مختصر یہ ہے کہ ہم برباد کرتے برباد ہیں
جتنی باتیں ہیں حسینوں کی وہ سب بے بنیاد ہیں
یاد ہیں سب یاد ہیں سب یاد ہیں سب یاد ہیں
وحشیوں کے دم سے ویرانے ابھی آباد ہیں
ایک ہم ہیں دل بھی دے کر موردِ بے داد ہیں
جو گرفتارِ رہیں وہ کب پابستہ صیاد ہیں
گل اب تو پژمردہ ہیں نکہت ہیں تو برباد ہیں
یہ وہ صحرا ہے جہاں کے صید بھی صیاد ہیں
آج سنتا ہوں وہ مصروفِ مبارک باد ہیں
تیری باتیں تیری چالیں تیری گھاتیں یاد ہیں
کیا کہا پھر تو کہو ہیں ہم ستم ایجاد ہیں
قید ہو کر سیکڑوں افکار سے آزاد ہیں
میری فریادیں بھی اب آمادۂ فریاد ہیں
تیری پانچوں انگلیاں بھی خنجرِ بے داد ہیں
عشق میں ہم اپنے ہاتھوں آپ ہی برباد ہیں
سب کہیں جلاد ہو تم وہ کہیں جلاد ہیں
ایسے ایسے سیکڑوں ہتھکنڈے بھی یاد ہیں

نوحِ طوفانی کو بھی نارے سے بلوا لے کوئی
جمع اک مرکز پہ احباب الہ آباد ہیں

حسبِ فرمائش پنڈت پرتھی ناتھ صاحب شوق الہ آبادی ۲۰ دسمبر ۱۹۲۱ء

حسن کو شکلیں دکھانی آ گئیں
سر میں سودا دل میں درد آنکھوں میں اشک
بھٹک جاتا تھا پاؤں پر کبھی
دل میں لاکھوں داغ روشن ہو گئے
برق و باراں کے جلو میں بدلیاں

ج

شوخیاں لے کر جوانی آ گئیں
بستیاں ہم کو بسانی آ گئیں
اب اسے باتیں بنانی آ گئیں
عشق کو شمعیں جلانی آ گئیں
ساتھ لے کر آگ پانی آ گئیں

اے دل راحت طلب ہشیار باش — ساعتیں اب امتحانی آ گئیں
دل لگا کر پھنس گئے زحمت میں ہم — تھیں بلائیں جتنی آنی آ گئیں
مسکرا دینا قیامت ہو گیا — بجلیاں تم کو گرانی آ گئیں
ڈر رہے تھے جن سے اربابِ جہاں — وہ بلائیں آسمانی آ گئیں

نوح وہ کہتے ہیں پھر طوفان اٹھے
قوتیں اب آزمانی آ گئیں

طبع زاد ۲۳ اپریل ۱۹۴۲ء

ج

دل میں ہر دم جو رہنے والے ہیں — چند غم ہیں وہ چند نالے ہیں
جو مرے زوردار نالے ہیں — کب وہ گردوں سے دبنے والے ہیں
کچھ مرے حوصلے نکالو گے — کچھ مرے حوصلے نکالے ہیں
ایک دو عاشقوں کا ذکر نہیں — سیکڑوں تم نے مار ڈالے ہیں
اتنے تارے نہیں فلک پر بھی — میرے تلووں میں جتنے چھالے ہیں
مرنے والوں کو بھی سکون نہیں — جینے والے تو جینے والے ہیں
تشنگی خارہائے صحرا کی — سوکھی سوکھی زباں نکالے ہیں
آسمانوں سے پوچھئے تو ذرا — کتنے اونچے ہمارے نالے ہیں
کیا جھکیں میری التجاؤں پر — وہ بڑے آن بان والے ہیں
چاک دامن نہ ہو سکا جن سے — سر گریباں میں وہ ڈالے ہیں
آپ درماں کریں گے کس کس کا — سیکڑوں روگ ہم نے پالے ہیں
کام اپنے درست ہوں کہ نہ ہوں — اب یہ تقدیر کے حوالے ہیں
آپ نے اس قدر نزاکت پر — سیکڑوں عہد توڑ ڈالے ہیں
پھر بھی داد چاہیے داد — تم انوکھے ہو ہم نرالے ہیں
رنج و غم میں مری گزرتی ہے — بس یہی آس پاس والے ہیں
دیکھ لو دیدہ ہائے پرنم کو — دو چھلکتے ہوئے پیالے ہیں

ناروی اس سبب سے ہیں مشہور
نوح نالے کے رہنے والے ہیں

طبع زاد ۱۵ مئی ۱۹۴۲ء

ج

لطفِ نگاہِ یار کبھی ہے کبھی نہیں — یعنی مجھے قرار کبھی ہے کبھی نہیں

پامالِ روزگار کبھی ہے کبھی نہیں
قائم مرا مزار کبھی ہے کبھی نہیں

کیا جانے عذر پیش کریں وقت پر وہ کیا
وعدے کا اعتبار کبھی ہے کبھی نہیں

اکثر جمالِ یار سے ہوتا ہوں شاد کام
قسمت میں یہ بہار کبھی ہے کبھی نہیں

اللہ ری کسی کی تلون مزاجیاں
گویا مرا وقار کبھی ہے کبھی نہیں

مٹ جائیں داغ ہائے دلِ زار کیا عجب
ہر باغ میں بہار کبھی ہے کبھی نہیں

وہ میرے بس میں آئیں گے کیوں کر یہاں تو دل
دل پر بھی اختیار کبھی ہے کبھی نہیں

میں دیکھتا ہوں منظرِ یاس و امید کو
جینے کا اعتبار کبھی ہے کبھی نہیں

پیتا ہوں میں تو محفلِ ساقی میں رات دن
دنیا شراب خوار کبھی ہے کبھی نہیں

آسودگانِ خاک عجب کشمکش میں ہیں
پہنچی نگاہِ یار کبھی ہے کبھی نہیں

چھالوں کو آرزو کہ کھٹک ہر گھڑی رہے
پیوست نوکِ خار کبھی ہے کبھی نہیں

بچھڑے ہوئے چمن سے زمانہ گذر گیا
اب ذہن میں بہار کبھی ہے کبھی نہیں

اے ذوق و شوق چرخِ ستم گر کو پھونک دو
کیوں آہ شعلہ بار کبھی ہے کبھی نہیں

جورِ کرم نما کا اثر اس قدر ہوا
دل آپ پر نثار کبھی ہے کبھی نہیں

دنیائے عشق میں مجھے کس پر ہو اعتبار
دل بھی صلاح کار کبھی ہے کبھی نہیں

دل آئینہ بنا تو مگر مثلِ آئینہ
پیشِ نگاہِ یار کبھی ہے کبھی نہیں

طوفانِ ذوق و شوق سے ہر وقت کام لے
کیوں نوح اشک بار کبھی ہے کبھی نہیں

و

کسی دن مار ڈالے گا دلِ اندوہ گیں ہم کو

اس طرح پر ۶ر نومبر ۱۹۲۷ء کو منشی سکھ دیو پرشاد صاحب بسمل نے الہ آباد میں ایک مشاعرہ کیا مقامی شعرا قریب سب تھے
چھ سات گھنٹے پر لطف شعر خوانی رہی
علاوہ اس غزل کے میری ایک غزل اور طوفانِ نوح میں ہے لیکن اس میں ردیف ہم کو ہے
اور اس میں ردیف مجھ کو ہے

وفورِ ضعف میں ان کی بھی حاجت کچھ نہیں ہم کو
تسلی دے کوئی کچھ بھی مگر یہ ہے یقیں ہم کو

ق

کمر یہاں طوق ہے اب ہتھکڑی ہے آستیں ہم کو
وہ ملنے کے نہیں ہم سے وہ ملنے کے نہیں ہم کو

یہیں رہنا بھی مرکر دفن ہونا بھی یہیں ہم کو
نہ چھوڑیں گے زمیں کو ہم نہ چھوڑے گی زمیں ہم کو

اُٹھائے کیوں ترے در سے دلِ اندوہگیں ہم کو
اگر تسکین ہوتی ہے تو ہر پھر کر یہیں ہم کو

جگہ دے دے جو اپنے دل میں وہ ناز آفریں ہم کو
دبائے کیوں فلک ہم کو مٹائے کیوں زمیں ہم کو

کریں شکرِ جفا بھی ضبطِ غم بھی ترکِ الفت بھی
وہ ہم سے کام تم لیتے ہو جو آتے نہیں ہم کو

یہ کیسی روح پھونکی قیس نے زیرِ زمیں جا کر
نظر آتے ہیں اب ذرّوں میں بھی محمل نشیں ہم کو

خیالِ عیش و راحت کیا کریں وقفہ کہاں اتنا
دفورِ غم میں اب مرنے کی بھی فرصت نہیں ہم کو

کہاں پریاں کہاں حوریں نہ پریاں ہیں نہ حوریں ہیں
اگر ہم دیکھ لیں آنکھوں سے تو آئے یقیں ہم کو

سمجھ لو انتہائے رنج و غم کی یہ علامت ہے
تمہارے بھی ہنسانے پر ہنسی آتی نہیں ہم کو

بہارِ گلشنِ عالم سے ہو دل بستگی کیوں کر
نظر آتے ہیں کچھ کانٹے بھی پھولوں کے قریں ہم کو

ہم اپنی زندگی میں آسماں سے بھی نہ دبتے تھے
مگر اب بعد مرنے کے دبا بیٹھی زمیں ہم کو

ترا کوچہ ہے تیری انجمن ہے تیری چوکھٹ ہے
ٹھہرنے کا ٹھکانا مل ہی جائے گا کہیں ہم کو

یہاں آنے نہیں دیتے وہاں جانے نہیں دیتے
تمہارے ہم نشیں تم کو ہمارے ہم نشیں ہم کو

یہی عالم رہے گا تو کسی دن ساتھ چھوڑے گی
جہاں سے زندگی لائی تھی پہنچا کر وہیں ہم کو

کیا اب خوگرِ غم اس طرح آزارِ الفت نے
زبردستی بھی ہنسنے پر ہنسی آتی نہیں ہم کو

نہ وہ آئیں نہ بلوائیں نہ دم نکلے نہ جی بہلے
بتا ایسے میں کرنا چاہیئے کیا ہم نشیں ہم کو

یہ کس نے سر جھکایا شوخیِ رفتارِ جاناں پر
ملے نقشِ قدم کے پاس کچھ نقشِ جبیں ہم کو

زمانے میں ہزاروں عاشق و معشوق تھے لیکن
ملے قسمت کی خوبی سے ہمیں تم کو تمھیں ہم کو

یہاں تو بڑھ گیا کچھ اور بھی دھڑکا قیامت کا
سمجھتے تھے ملے گا چین اب زیرِ زمیں ہم کو

کسے غلماں کی حسرت ہے کسے حوروں کا ارماں ہے
ملے تو داورِ محشر ملے وہ نازنیں ہم کو

کہیں ایسا نہ ہو لالچ میں آکر آپ یہ کہہ دیں
جنابِ نوح دے دو اِس غزل کی بھی زمیں ہم کو

سر جھکا ہو پائے قاتل پر کھنچی تلوار ہو

اس طرح پر آرہ میں ۹ر نومبر سنہ ۱۹۲ء کو سید امیر حسن صاحب بدرؔ کے اہتمام سے ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا چھپرہ آرہ پٹنہ عظیم آباد۔ بانکی پور وغیرہ کے تمام مشاہیر شعرا جمع تھے صفدر صاحب مرزا پوری بھی لکھنؤ سے آئے تھے الٰہ آباد سے بسملؔ صاحب اقبالؔ صاحب شوکتؔ صاحب توبہ صاحب برادرِ عزیز منشی عبد الحمید صاحب بھی گئے تھے دو روز میں یہ مشاعرہ ختم ہوا بغیر واوِ عطف و اضافت

کیوں کماں سے تیر اُن کا چھوٹ کر بے کار ہو
ق
یا مرے دل میں رہے یا میرے دل کے پار ہو

ہم جو مر جائیں تو پورا وعدۂ دیدار ہو
ہاتھ لانا واہ کیا کہنا بڑے ہشیار ہو

رکھ لئے ہیں اپنے آگے ہم نے چُن کر چند پھول
کیا عجب وہ اِن کے لالچ سے گلے کا ہار ہو

حسن کے جلوے کو محشر کی خصوصیت نہیں
جمع ہوں گاہک جہاں قائم وہیں بازار ہو

کُھل گیا دل کا بھرم تو بات ہی کیا رہ گئی
زخم بھی ایسا لگاؤ وہ جو دامن دار ہو

جان دینے کے لئے دل نذر کرنے کے لئے
میں کہوں تیار ہوں پوچھے کوئی تیار ہو

کہہ گیا وہ اپنی حق گوئی کا اچھا فیصلہ
عشق جیسی دار ہو منصور سا سردار ہو

اب خبر لیتے نہیں وہ بھی یہ جن کا قول تھا
ہم تجھے کر لیں گے اچھا پہلے تو بیمار ہو

فرق اِن لفظوں میں کیا ہے صرف ہے اک حرف کا
یار سے عیار تم بن جاؤ پھر بھی یار ہو

میں جو کانٹا ہوں تو گل کو پاس رہنا چاہیئے
تم نے یہ کیا کہہ دیا میں پھول ہوں تم خار ہو

نزع میں آنکھوں کی گردش نے یہ ثابت کر دیا
چاہتا ہے دل کہ اُن کا آخری دیدار ہو

وہ یہ کہتے ہیں نہ دیں گے ہم تمھارا دل تمھیں
یہ نہیں کہتے تم اپنی چیز کے مختار ہو

حشر میں کہتے تجھے مل جانے کو اب مل جائیے
کیوں ذرا سی بات پر سرکار ہو دربار ہو

تیغ ہے وہ تیغ دل کے جو کئی ٹکڑے کرے
تیر ہے وہ تیر جو اِس پار سے اُس پار ہو

پہلے اُن کو تیغ دے دی پھر یہ میں نے کہہ دیا
اب جو ہونا ہو مرے حق میں وہ لے سرکار ہو

سر بھی حاضر دل بھی حاضر جان بھی ایمان بھی
شوق سے وہ چیز لے لو جو تمھیں درکار ہو

اُف یہ مایوسی یہ محرومی یہ مجبوری مری
دل سے بھی میں کہہ نہیں سکتا کہ تو غم خوار ہو

کوئی کہتا ہے کہ بے کاری سے گھبراتا ہے دل
آیئے حجت کریں اب آیئے تکرار ہو

کیا ٹھکانا اے دلِ ناکام ایسے کام کا
جو مجھے دشوار تھا دشوار ہے دشوار ہو

حسن پر میری نظر رہتی ہے اے حسن آفریں
کیا عجب اِس کے ہی پردے میں ترا دیدار ہو

دور ساحل سر پہ طوفاں اور دریا کا یہ جوش
نوح دیکھیں کس طرح اپنا سفینہ پار ہو

ہر شعر میں اضافت ہے

ق

فیصلہ جو کچھ بھی اِس کا اے دلِ غم خوار ہو
جان پر ہم کھیلتے ہیں جیت ہو یا ہار ہو

دل اگر اظہارِ سوزِ عشق پر تیار ہو
آہ تو ہے آہ اک اک سانس آتش بار ہو

پھر سزائے دار سے کیوں کر مجھے انکار ہو
لفظ میں دل دار کے داخل جو لفظِ دار ہو

چین پائیں ہم جو ترکِ آرزوئے یار ہو
کس لئے اصرار ہو انکار ہو تکرار ہو

کُھل گیا ہم پر کسی کے منھ چھپانے کا سبب
مدعا یہ ہے کہ دنیا طالبِ دیدار ہو

رات کچھ دن کچھ سحر کچھ دوپہر کچھ شام کچھ
حضرتِ دل ہو نہ ہو تم بھی مزاجِ یار ہو

لذتِ غم نے کیا مجھ کو جراحت آشنا
ہو کسی کا تیر لیکن میرے دل سے پار ہو

اب علاجِ دردِ دل میں یہ لگا دی اس نے شرط
ہو اگر کوئی تو ہم سے پوچھ کر بیمار ہو

اے نگاہِ شرمگیں اٹھ اور اپنا کام کر
اس کے اُس کے اِن کے اُن سب کے دل سے پار ہو

الفتِ ساقی نے مجھ میں یہ اثر پیدا کیا
دیکھ لوں جس گھر کو وہ گھر خانۂ خمار ہو

اہلِ زر بیمار رہ کر بھی حریصِ زر رہے
چاہتے ہیں یہ دوا میں شربتِ دینار ہو

چارۂ آزارِ الفت ننگ ہے میرے لئے
دردِ دل اک بار ہو دس بار ہو سو بار ہو

طبعِ رنگیں سے ملا لے لوح یہ حسنِ شرف
شعر کہہ دوں جس زمیں میں وہ زمیں گلزار ہو

سمجھاؤں کس طرح دلِ امیدوار کو

۵ رنومبر ۱۹۲۲ء کو جناب پنڈت رادھے ناتھ صاحب (دیوان) کول تخلص گلشن مقیم حال الہ آباد کے اہتمام سے ایک مشاعرہ بڑے پیمانے پر ہوا باہر کے شعرا میں جناب صفی عزیز محشر ثاقب یاس صاحب لکھنوی بیخود صاحب موہانی حریق صاحب سیتاپوری باسط و جگر صاحب بسوانی ناطق و آرزو صاحب ڈپٹی کلکٹر کانپور الہ آباد سے محمود صاحب محسن تحمل فانی ماجد گدا اعظم غنی بسمل صاحبان پنڈت کرشنا کانت صاحب پنڈت برکھی ناتھ صاحب پنڈت جگموہن ناتھ صاحب شوق وغیرہ شریک تھے عزیز صاحب لکھنوی نے یاس صاحب کی شرکتِ مشاعرہ گوارا نہ کی اور مشاعرے سے بغیر اپنی غزل پڑھے ہوئے لکھنؤ واپس گئے حالانکہ یاس صاحب مشاعرے میں آئے بھی نہیں الگ کمرے میں بیٹھے رہے یہ مشاعرہ ایک بجے دن کو شروع ہوکر دو بجے رات کو ختم ہوا نہایت اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں اس پر لوگوں کا عام اتفاق ہے کہ دیوان صاحب کے دونوں مشاعروں کا جواب نہیں۔

ج

دے دیں جو حکم وہ نگہِ شرمسار کو
مضطر کرے ہزار کو یہ سو ہزار کو

شعلہ یہی شرر بھی یہی برق بھی یہی
سمجھے ہیں کیا وہ میرے دلِ بے قرار کو

لایا ہوں مے کدے سے جو بوتل بھری ہوئی
تحفے میں دوں گا میں وہ کسی روزہ دار کو

ہے رنگِ گل یہ جلوۂ گل یہ جمالِ گل
صد آفریں کرامتِ بادِ بہار کو

گرتی ہیں بجلیاں جو فلک سے زمین پر
وہ ڈھونڈھتی ہیں میرے دلِ بے قرار کو

ہو مے کشی ضرور مگر ہاں بقدرِ ظرف
اس کا خیال چاہیئے ہر بادہ خوار کو

اظہارِ ذوق و شوق پہ آئیں جو آفتیں
میں نے کیا سلام دلِ بے قرار کو

ہم اپنی اصطلاح میں اپنی زبان میں
کہتے ہیں روزِ حشر شبِ انتظار کو

آزار و غم سے ہے یہی صورت نجات کی
رکھوں سمیٹ کر دلِ بے اختیار کو

اکثر یہ جا پہنچتے ہیں ہوا کس طرف کی ہے
لے کر وہ مٹھیوں میں ہمارے غبار کو

سرمہ ہے چشم اہلِ محبت کے واسطے
مٹی نہ جانئے مری خاکِ مزار کو

جس پر ہمیں نثار نہ ہوتا تھا ہو گئے
اب کیا کہیں مشیتِ پروردگار کو

اللہ دے تو شکر کا سجدہ ادا کروں
کچھ اختیار نالۂ بے اختیار کو

وہ کہہ رہا ہے دل میں ٹھہرنے کے واسطے
کیوں کر مکان سونپ دوں بے اعتبار کو

لطفِ خلش یہی ہے کہ ملتی رہے جگہ
چھالوں کو خار میں کبھی چھالوں میں خار کو

کیا حاضرینِ بزم کے جی پر گذر گئی
اس کی خبر نہیں نگہِ شرمسار کو

یہ اضطرابِ شوق تو بلبل کا دیکھئے
وہ چاہتی ہے گود میں لے لوں بہار کو

طوفانِ اشک اگر نہ کہیں ہم تو کیا کہیں
اے نوح تیرے گریۂ بے اختیار کو

گلشن میں تم رکھو، دامن میں تم رکھو اس زمین میں بھائی تہر صاحب نے نہایت اچھے اچھے شعر کہے تھے چوں کہ یہ زمین نئی تھی اور مجھے بہت پسند آئی اس لیئے میں نے قوافی بدل کر یہ غزل کہی خدانہ خواستہ اس سے کوئی مقابلہ مقصود نہ تھا

۱۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء

ج

ہمارے دل کو لے کر شوق سے محفل میں تم رکھو
مگر جو کچھ ہو دل کی بات اس کو دل میں تم رکھو

چھری کیوں میان میں رکھتے ہو میرے دل میں تم رکھو
ضرورت ہے کہ اس بسملے کو اس محفل میں تم رکھو

یہ گھر حاضر ہے کیوں تیروں کو اس مشکل میں تم رکھو
نکالو اپنے ترکش سے ہمارے دل میں تم رکھو

جگہ تھوڑی بہت عشق و وفا کی دل میں تم رکھو
یہ کیا مشکل ہے آسانی مری مشکل میں تم رکھو

ابھی یہ جانچتا ہوں میں وفا کیا ہے جفا کیا ہے
تمھیں دل دوں گا اطمینان اپنے دل میں تم رکھو

گلہ میں ظلم کا اب کیا کروں اے داورِ محشر
وہ کہتے ہیں مری عزت بھری محفل میں تم رکھو

مجھے اظہارِ غم سے اس طرح اس شوخ نے روکا
یہ دل کا راز ہے دل میں چھپاؤ دل میں تم رکھو

جو اندازِ ستم بدلے گا تو ہم اور تڑپیں گے
ابھی تک جس میں رکھا ہے اسی مشکل میں تم رکھو

بہت اچھی یہی تدبیر ہے رفعِ کدورت کی
نہ اپنے دل میں ہم رکھیں نہ اپنے دل میں تم رکھو

یہ سمجھاتے ہیں مجھ کو ہم نشیں مرنا تو برحق ہے
مگر اپنا قدم کیوں کوچۂ قاتل میں تم رکھو

محبت کے لئے حاجت نہیں ذکرِ محبت کی
زباں سے کیوں نکالو اس کو اپنے دل میں تم رکھو

چراغِ گور بن کر غم سہوں کیوں کس مپرسی کا
جلانا ہو تو مجھ کو اپنی ہی محفل میں تم رکھو

خدا نے کیا اسی کے واسطے مجھ کو بنایا تھا
ادھر رحمت میں دل رکھے ادھر مشکل میں تم رکھو

تمھیں دل دے رہا ہوں میں تو مطلب کیا ہے اور اس کا
یہ مطلب ہے کہ میری یاد اپنے دل میں تم رکھو

ہماری بھی جگہ اپنی بھری محفل میں تم رکھو		کوئی شمعِ فروزاں جل بجھے گی دل جلائیں گے

بہالے جائے گا اے نوح طوفاں اس کو دریا کا
ابھی اپنا سفینہ دامنِ ساحل میں تم رکھو

افسانہ وہ سناؤں جواب تک سنا نہ ہو

اس طرح بہ ۲۱ر فروری ۱۹۳۲ء کو ایک بہت اچھا مشاعرہ علی گڑھ کالج میں جناب احسن صاحب مارہروی کے اہتمام سے ہوا مشاہیر شعرا میں سے طبیش و دلگیر صاحبان مارہروی اصغر صاحب گونڈوی جگر صاحب مرادآبادی اصغر صاحب مین پوری تاباں صاحب بدایونی وغیرہ وغیرہ شریک تھے گیارہ اشعار کی قید تھی اس مشاعرے کے دوسرے دن بھی غیر طرح مشاعرہ ہوا یہی شعرا موجود تھے دونوں مشاعرے آٹھ بجے رات سے شروع ہو کر ایک بجے رات کو بحسن و خوبی ختم ہوئے

بندے خلاف مجھ سے ہوں لیکن خدا نہ ہو	ج	ہنگامۂ سزا و جزا اُٹھ کھڑا نہ ہو
کل کی خبر کسی کو نہیں کیا ہو کیا نہ ہو		ممکن ہے اُن کا وعدۂ فردا وفا نہ ہو
میرا پیام شوق مجھی سے ادا نہ ہو		اے رعبِ حسن ہو مگر اتنا سوا نہ ہو
دھوکا تم اُس کو دو جو تمھیں جانتا نہ ہو		اچھی کہی کہ قدرِ محبت کریں گے ہم
پہلو میں دل ہو دل میں کوئی مدعا نہ ہو		یہ بے تکی سی بات ہے بے ربط سا خیال
مانا وہ اور کی ہو ہماری دعا نہ ہو		پہنچے تو یا خدا کبھی بابِ قبول تک
وہ اِس طرح وفا کو مری جانچتا نہ ہو		ہیں کثرتِ جفا کی شکایت کروں تو کیوں
دل میں جو تیر آئے وہ دل سے جدا نہ ہو		تاثیرِ جذبِ عشق کی خوبی یہی تو ہے
دنیا سے نامراد کوئی اُٹھ گیا نہ ہو		اب حسن دیکھتا ہے مکدر فضائے عشق
اچھا یہی سہی کبھی وعدہ وفا نہ ہو		ہاں ہاں وہ میرے صبر و تحمل کو جانچ لیں
ذرّے میں آفتابِ حقیقت چھپا نہ ہو		ہم دیکھتے ہیں دیدۂ عرفاں سے دل کو بھی
انجم بنیں چراغ فلک شامیانہ ہو		اے بے کسی عجب نہیں میرے مزار پر
بے کس وہی ہے کوئی جسے پوچھتا نہ ہو		دنیائے ذوق و شوق میں بے کس ہمیں نہیں
مٹی میں وہ غریب کہیں مل گیا نہ ہو		چھانوں گا دل کے واسطے سارے جہاں کی خاک
جب تک جبیں نیاز ہماری قضا نہ ہو		اٹھتا ہے سر اُن کے در سے تو کیا لطفِ بندگی
ساقی کو آرزو ہے کوئی پارسا نہ ہو		بہتا پھرے حرم میں بھی دریا شراب کا

اے نوح بحرِ غم میں ہمارا خدا تو ہے
تم جاؤ ناخدا نہ بنو ناخدا نہ ہو

اسیروں کی فغاں سے کس لئے صیاد برہم ہو

اس طرح پر ۱۴ مارچ ۱۹۳۲ع کو جمنا مشن ہائی اسکول الہ آباد میں جناب سراج صاحب کے اہتمام سے مشاعرہ ہوا صرف مقامی شعرا تھے باہر کا کوئی شاعر نہ تھا

ج

تمنا ہے کہ میرے دل میں ناوک کا یہ عالم ہو
ٹھہرنے کے لئے غم ہو نکلنے کے لئے دم ہو

اگر اہلِ محبت سے نہ ضبطِ آتشِ غم ہو
جہنم تو جہنم بلکہ جنت بھی جہنم ہو

تقاضائے وفا یہ ہے شہیدِ جورِ پیہم ہو
وہ دل اپنا لگائے تم سے جس کی زندگی کم ہو

جو پہلے تھا وہ در اب تک ہے آئندہ بھی کیوں کم ہو
محبت میں یہ ماضی حال مستقبل کا عالم ہو

بشر کو چاہیئے معنی شناسِ امرِ مبہم ہو
جو دم گذرے تو سمجھے کیا عجب یہ آخری دم ہو

زمانے کی طرح قانونِ حسن و عشق بھی بدلے
مزا جب ہے غمِ دل کا نیا دل ہو نیا غم ہو

عزیز و اقربا سر اپنا اپنا کس لئے پھوڑیں
کیا ہے قتل مجھ کو جس نے وہ مصروفِ ماتم ہو

ہمیں اصرار ملنے پر تمہیں انکار ملنے سے
نہ تم مانو نہ ہم مانیں نہ یہ کم ہو نہ وہ کم ہو

عجب کیا رفتہ رفتہ خود مریضِ غم سنبھل جائے
بہت ممکن ہے داغِ دل ہی زخمِ دل کا مرہم ہو

جو مٹ جاؤں گا میں تو کون انھیں دنیا میں پوچھے گا
عجب کیا رنج کو بھی رنجِ غم کو بھی مرا غم ہو

انھیں دل ہم دئے دیتے ہیں ادنا سی توجہ پر
اب اس اصول سمجھنے کا اصول اس سے اور کیا کم ہو

بلائیں جھیل لے صدمے اٹھائے رنج و غم سہہ لے
محبت کا وہ دم بھر دم بھرے جب دل میں یہ دم ہو

ہم ایسے ہجر میں یارب گذاریں زندگی کیوں کر
نہ دن سے رات ہی کم ہو نہ دن ہی رات سے کم ہو

ابھی پورا مزا اہلِ تمنا کو نہیں ملتا
مزاجِ حسن برہم ہے نظامِ عشق برہم ہو

ہم اپنے واقعاتِ زندگی پر غور کیا کرتے
یہی حکمِ خدا تھا غم زیادہ ہو خوشی کم ہو

زمانہ اب نہ ڈالے گا نظر سارے زمانے پر
خدا رکھے خدائی بھر میں تم کس بات میں کم ہو

خطِ تقدیر کا مضموں پلٹنا غیر ممکن ہے
مقدم کیا موخر ہو موخر کیا مقدم ہو

بگڑنے کی ادائیں دیکھ کر ہم وجد کرتے ہیں
پیامِ شوق سے مطلب یہی تھا کوئی برہم ہو

جمالِ لالہ و گل بے نہائے کب نکھرتا ہے
چمن کو چاہیئے شرمندۂ احسانِ شبنم ہو

کیا اظہارِ غم کس کس نے مر کر کون دیکھے گا
ابھی زندہ ہوں میں میرے ہی آگے میرا ماتم ہو

یہ کہتے ہیں بہارِ کوئے جاناں دیکھنے والے
جسے ہو خلد کی حسرت نصیب اس کو جہنم ہو

کھلا یہ فلسفہ تکلیف کا تکلیف اٹھانے پر
ملے اتنی مجھے راحت تمنا جس قدر کم ہو

ابھی بس میں زباں ہے آپ سن لیں داستاں میری
خدا جانے نظامِ زندگی کس وقت برہم ہو

زمیں دار اور لاکھوں ہیں مگر شاعر نہیں کوئی

اِسی کی وجہ سے اے نوح تم ممتازِ عالم ہو

مرے دل میں طلوعِ ماہِ کامل دیکھتے جاؤ

اس طرح پرسلون ضلع رائے بریلی میں ۳۰ اپریل ۱۹۳۲ء کو ایک مشاعرہ عزیز صاحب سلونی کے اہتمام سے ہوا الہ آباد سے شمسی عزیز غنی انور سرور نشتر سراج صاحبان حافظ صاحب غازی پوری اور ہادی صاحب مچھلی شہری وغیرہ گئے تھے لکھنؤ سے نواب جعفر علی خاں صاحب اثر و مقامی شعرا نے شرکت کی مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا

ج

جو موقع ہو تو پہلے تم مرا دل دیکھتے جاؤ
پھر اپنے دیکھتے جانے کا حاصل دیکھتے جاؤ

مری محرومیِ قسمت کا حاصل دیکھتے جاؤ
یہ حسرت ہے کہ تم حسرت بھرا دل دیکھتے جاؤ

مٹا راہِ وفا میں کس طرح دل دیکھتے جاؤ
اِدھر آؤ مآلِ عشق کامل دیکھتے جاؤ

غضب آتے فلک ٹوٹے تڑپ کر گر پڑے بجلی
یہ سب کچھ ہو مگر تم جانبِ دل دیکھتے جاؤ

بھی ہے اور صحرائے محبت میں نہیں کچھ بھی
سوادِ شامِ غم منزل بمنزل دیکھتے جاؤ

اُڑے تھے جتنے ذرے بن گئے تارے وہ گردوں کے
دکھاتے کیا ابھی خاکستر دل دیکھتے جاؤ

یہ ممکن ہے کہ حاصل ہو نہیں کچھ تجربہ مجھ سے
ابھرنا ڈوبنا اے اہلِ ساحل دیکھتے جاؤ

توجہ میں تغافل اب خلافِ وضع داری ہے
اسی دل سے ہمیشہ تم مرا دل دیکھتے جاؤ

اجازت ہم نے ان لفظوں میں پائی باریابی کی
جو آنکلے تو خیر اب رنگِ محفل دیکھتے جاؤ

پلٹ کر راہ سے بجلی گرانے کا سبب کیا ہے
یہیں نے کب کہا ہے تابِ دل دیکھتے جاؤ

ابھی کیا ہے ابھی نقشے ہزاروں اور بدلیں گے
نگاہِ غور سے تم صورتِ دل دیکھتے جاؤ

کہاں سے آگئے کون ان کو لایا فکر کیا اس کی
تم اپنے ہر قدم پر اک نیا دل دیکھتے جاؤ

اجل یوں سرفروشانِ محبت کو بلاتی ہے
کہاں جاتے ہو آؤ تیغِ قاتل دیکھتے جاؤ

ہمیشہ کام رکھنا چاہئے چشمِ عنایت سے
اگر دیکھا تو دیکھا اب مرا دل دیکھتے جاؤ

ہمیشہ حسنِ عالم سوز کا جلوہ نہیں رہتا
سحر ہی تک ضیائے شمعِ محفل دیکھتے جاؤ

مرے سینے میں ارماں تھی مرے پہلو میں پیکاں بھی
بڑا ہے ایک دل تو دوسرا دل دیکھتے جاؤ

ہزاروں آفریں اس لطفِ آئینِ شہادت پہ
نکلتا جائے دم اندازِ قاتل دیکھتے جاؤ

کبھی طوفاں اٹھا دینا کبھی سب کو ڈبو دینا
جنابِ نوح کے فطری مشاغل دیکھتے جاؤ

چہرۂ مہروش ہے ایک کاکل مشک فام دو

سخن وہی ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں

یہ دونوں طرحیں مظفرپور کے مشاعرے کی ہیں مفصل حالات (سخن وہی ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں) اس غزل کے عنوان پر ردیف نون میں دیکھیے

ج

حکم جدید الگ الگ دیجئے صبح و شام دو
ظلم اٹھاؤں غم سہوں کام ہے ایک نام دو

مستِ الست ہوگیا دیکھ کر آنکھیں آپ کی
دونوں جہاں سے کم نہیں میرے لئے یہ جام دو

دل بھی فدا کروں گا میں جانِ حزیں بھی دوں گا میں
لیجئے ایک وقت میں شوق سے آپ کام دو

میرے جگر کو دیکھ کر دل کو بھی میرے دیکھنا
تیر نگاہِ ناز کے بس ہیں یہی مقام دو

اہلِ وفا کی زندگی چین سے کب بسر ہوئی
ہم نے تو دو ہزار میں دیکھے نہ شاد کام دو

پیرِ مغاں ہے وہ سخی جس کا جواب ہی نہیں
ایک اگر طلب کیا تو ملے مجھ کو جام دو

پہلے کسی کو چاہیے چاہ کو پھر نباہیے
عشق کی مملکت میں ہیں خاص یہ التزام دو

عشق میں کب کمی ہوئی مجھ سے قصور کیا ہوا
ایک سلام کی جگہ کرتے ہیں وہ سلام دو

اسم بقائے زندگی عرف فنائے زندگی
عشق کی اصطلاح میں حسن کے ہیں یہ نام دو

شکر کوئی ہنسی نہیں صبر بھی دل لگی نہیں
راہِ وفا و عشق میں سخت ہیں یہ مقام دو

پہلی غزل سنا چکے دوسری اب سنا رہے ہیں
ایک ردیف میں کئے نوح نے انتظام دو

ج

محفل رنگ و بو میں تم دو تو یہ حکم عام دو
تو بہ شکن جو پہلے آئیں پہلے انھیں کو جام دو

عشق و وفا کا بجا بجھنا فرض ہے ناز و حسن پر
جو کسی سے ہو سکے دل کو مرے وہ کام دو

پھول کھلے ہوا چلی رنگ کھلا مہک اڑی
بادہ پلاؤ خم منگاؤ شیشہ اٹھاؤ جام دو

کوئی مٹے کوئی پسے اس سے کوئی غرض نہیں
داد خرامِ ناز کی ان کو دمِ خرام دو

تارکِ رسم و راہ سے تارکِ ذوق و شوق ہوں
جو نہ سلام لے مرا اس کو مرا سلام دو

لطف و کرم ہوں کس لئے خوگر ظلم و جور ہیں
ہیں نہیں طالبِ خوشی غم ہی مجھے مدام دو

ایسے ہجوم کے لئے چاہیے بند و بست بھی
تم مرے اقتدار میں بزم کا انتظام دو

فہم و خرد سے دور ہیں ناز و نیاز حسن و عشق
سخت کلام بھی سنو داد کبھی لا کلام دو

نوح بیانِ شوق پر کچھ وہ کہیں گے ہاں نہیں
پہلے سلام انھیں کرو بعد کو تم پیام دو

ذرا ہلکی سی جنبش پھر نگاہِ فتنہ ساماں کو

اس طرح پر ۱۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بانس بریلی کالج میں مشاعرہ ہونے والا تھا لیکن وقت پر ملتوی ہو گیا

اُڑا کر دھجیاں رسوا کروں کیا عشقِ جاناں کو
کرم اُن کا ستم بن کر لٹائے گا دل و جاں کو
مناسب ہے نہ دیکھیں ہم کبھی رنگِ حسنِ جاناں کو
یہ سمجھاتا نہیں کوئی جنونِ فتنہ ساماں کو
کہاں تک تم کفِ حسرت ملو گے دل کے ٹکڑوں پر
قفس میں بھی کھلائے پھول کیا کیا دل کے داغوں نے
کہیں ایسا نہ ہو کافر نگاہیں مفت ہی لے لیں
مجھے سوزِ محبت نے جلا کر خاک کر ڈالا
بہت ممکن ہے دیوانوں کا جی بہلے نہ جنت میں
کچھ اِس ڈھب سے تری کافر نگاہیں قتل کرتی ہیں
بنائے لذتِ غم تو کسے اچھا سمجھتی ہے
لحاظِ عشق و آدابِ وفا کی یہ زبردستی
خدا جانے نکل کر کیا غضب ڈھائے فغاں دل کی
وقارِ جوششِ وحشت کا اثر خالی نہ جائے گا
بلا میں پھنس گئے دونوں گرفتارِ بلا ہو کر
نگاہِ ساقیِ مے خانہ ہر جانب پہنچتی ہے
ہوائے شوق رہنے ہی نہ دے گی ایک مرکز پر
خدا رکھے بچھڑ کر میں دکھیں اب تک نہیں بھولا
اگر چاہیں تو مل کر آفتابِ حشر بن جائیں
اُڑیں گے ایک دن دونوں کے ٹکڑے جوشِ وحشت میں

ج

لیئے رہتا ہوں ہاتھوں ہاتھ میں اپنے گریباں کو
پہنچ جو ہیں گے وہ پیکاں کو نکالیں گے جو ارماں کو
خدا محفوظ رکھے چشمِ بد سے اِس گلستاں کو
ملا دے چاکِ دل سے وہ مرے چاکِ گریباں کو
سپردِ خاک بھی کر دو اِن اجزائے پریشاں کو
اُڑا لایا ہوں اپنے ساتھ میں رنگِ گلستاں کو
شباب آنے سے پہلے بیچ ڈالوں دین و ایماں کو
کوئی اِس کی خبر دے دے ہوائے کوئے جاناں کو
لیئے جائیں یہ اپنے ساتھ ہی اپنے بیاباں کو
مسلماں کی خبر ہونے نہیں پاتی مسلماں کو
جگہ دیں خانۂ دل میں ہم ارماں کو کہ پیکاں کو
کہیں غارت گرِ جاں ہم نہ اُس غارت گرِ جاں کو
ہوا سے میں بچاتا ہوں چراغِ بزمِ امکاں کو
گلے سے وہ لگاتے ہیں گے مرے چاکِ گریباں کو
نہ زنداں ہم کو چھوڑے گا نہ ہم چھوڑیں گے زنداں کو
چھپا کر ہم کہاں رکھ آئیں اپنے دین و ایماں کو
کریں کیا جمع ہم اپنے خیالاتِ پریشاں کو
سلامِ شوق پہنچے ساکنانِ کوئے جاناں کو
وہ کیا سمجھا ہے میرے دل کے ذراتِ پریشاں کو
جنوں ترجیح کیوں دیتا ہے دامن پر گریباں کو

جنابِ نوح ضبطِ جوششِ غم کی حد بھی ہوتی ہے
کہاں تک ہم لیئے بیٹھے رہیں گے اپنے طوفاں کو

طبع زاد ۲۸ جولائی ۱۹۳۸ء

بھکانے والے بھکائیں شوق سے اکثر ہم کو تم کو
شکرِ خدا کا چاہیئے کرنا عیش اُٹھا کر ہم کو تم کو
ربط بڑھے آپس میں ایسا چین نہ آئے دم بھر اصلا
عیش میں جا ضر یخ میں شامل چھوٹے ساتھ نہایت مشکل

ج

آنا جانا ملنا جلنا چھپ کر کھل کر ہم کو تم کو
جس کی تمنا میں ہم تم تھے وہ ہے میسر ہم کو تم کو
دقت ہو نا وک دل ناہو خنجر شب ہو نشتر ہم کو تم کو
مل نہیں سکتا سچا مونس دل سے بڑھ کر ہم کو تم کو

پھر گردوں پر بدلی چھائی بدلی میں بجلی لہرائی
پیتے جائیں دیتا جائے ساقی ساغر ہم کو تم کو

ہائے وہ دن وہ وقت وہ عالم آپس میں اخلاص وہ ہر دم
عیش کی راتیں لطف کی باتیں بھولیں کیوں کر ہم کو تم کو

یاد نہ آئے اب جیتے جی خیر اسی میں ہے دونوں کی
پچھلا ساماں گذرا عالم بھولا منظر ہم کو تم کو

ظلم و ستم کے شکوے کیسے لطف و کرم کے وعدے کیسے
لیکن حاضر رہنا ہوگا حشر میں دن بھر ہم کو تم کو

مولا سے مانگیں یہ دعائیں ہر دم لطف و تسکیں اُٹھائیں
جس میں رنج و غم نہ لکھے ہوں دے وہ مقدر ہم کو تم کو

تم نکلو کیوں دل سے ہمارے ہم نکلیں کیوں دل سے تمہارے
ڈھونڈیں بھی تو مل نہیں سکتا اور کوئی گھر ہم کو تم کو

کتنے دنوں تک بزم آرائی آپس میں پھر ہو گی جدائی
ایک جگہ رہنے ہی نہ دے گا چرخِ ستمگر ہم کو تم کو

حسرت ہو جائے یہ مصیبت ارماں ہو جائے نہ قیامت
ربط بڑھانا چاہیے باہم سوچ سمجھ کر ہم کو تم کو

ذکرِ محبت کب ہے بے جا عذرِ جفا و جور بھی اچھا
لیکن وہ ہو بات کچھ ایسی آئے باور ہم کو تم کو

کروٹ بدلی اب قسمت نے پھیرا منہ عیش و عشرت نے
پھیر ہے اُن کو ہم سے تم سے ناز تھا جن پر ہم کو تم کو

کیوں گھبراؤ کیوں گھبرائیں کیوں پچھتاؤ کیوں پچھتائیں
شوق کی غایت بس اتنی ہے رکھے مضطر ہم کو تم کو

راہِ محبت میں راحت کیا ویسی ہی یہ جیسے صحرا
کچھ نہ ملے گا صرف ملیں گے کنکر پتھر ہم کو تم کو

جو نہ بھٹکنے دے رستے سے سمجھے پیچ و خم منزل کے
چاہیے چلتا پھرتا ایسا کوئی رہبر ہم کو تم کو

کل ہی تک تھا جوشِ محبت کل ہی تک تھی چشمِ عنایت
دل کا دینا دل کا لینا آج ہے دوبھر ہم کو تم کو

عیش و خوشی پر کیا اترانا کیا کھونا کیا اُن کا پانا
رنج و الم ہی پیش آئیں گے روز فزوں تر ہم کو تم کو

آنکھوں سے اشکوں کی روانی یہ طوفان ایسی طغیانی
کیا جانے پہنچائیں کہاں تک نوح بہا کر ہم کو تم کو

طبع زاد ۲؍ جون ۱۹۲۹ء

ج

دل ہماری طرف سے صاف کرو
جو ہوا وہ ہوا معاف کرو

اہلِ گلشن بہار آ پہنچی
خار و خس سے چمن کو صاف کرو

جب ستم ہو گا پھر کرم کے بعد
تو کرم سے مجھے معاف کرو

مجھ سے کہتی ہے اُس کی شانِ کرم
تم گناہوں کا اعتراف کرو

یہ بھی عادت میں کوئی عادت ہے
جو کہو اُس کے برخلاف کرو

کیوں بجھاؤ پہیلیاں بے کار
گفتگو مجھ سے صاف صاف کرو

ایک دو تین چار پانچ نہیں
سب خطائیں مری معاف کرو

حسن اُن کو یہ رائے دیتا ہے
کام امید کے خلاف کرو

حضرتِ دل یہی ہے دیر و حرم
محفلِ یار کا طواف کرو

تم سزا دو مگر بحسبِ قصور | میں یہ کہتا نہیں معاف کرو
اس میں بھی شان پائی جاتی ہے | ہو کوئی بات انحراف کرو
سخت جانوں کا قتل کھیل نہیں | کچھ دلوں اور ہاتھ صاف کرو
تم کو قہر کرم نما کی قسم | فیصلہ میرے بر خلاف کرو
کھلتے ہیں دل کے اٹھتے ہی جوہر | جتنا اس آئینہ کو صاف کرو
دل میں ہیں خارِ آرزو لاکھوں | آؤ کانٹوں سے گھر کو صاف کرو

طورِ سینا کی سمت جائیں کلیم
نوح تم سیرِ کوہِ قاف کرو

پھر وہی ہم ہوں ہماری وہی تنہائی ہو

۲۴ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو بابو گنج ریاست بھدری ضلع پرتاب گڑھ میں بحکم جناب راجہ بجرنگ بہادر صاحب والی ریاست میری صدارت میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا مقامی شعرا میں سے جناب حکیم میاں صاحب فدا مانک پوری جناب اکبر حسین خاں صاحب امیر رئیس گڑھی الہ آباد سے سرور حفیظ سلامت شمسی سراج جدت شیدا صاحبان سلون ضلع رائے بریلی سے خمار سخاوت نشتر صاحبان وغیرہ ریاض صاحب جیوری دعا صاحب دریابادی طاہر صاحب ساکن نگیا مئی زیبا صاحب نارونی حماد صاحب کرڈی راز صاحب وجگر صاحب مرادآبادی شریک تھے یہ مشاعرہ ۹ بجے رات سے شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا اچھی اچھی غزلیں لوگوں نے سنائیں تواضع و تکریم خاطر مدارات بہت کچھ ہوئی عزیز صاحب سلونی قابل مبارکباد ہیں کہ ان کی کوشش کامیاب رہی۔

ج

عشق میں حسن کے جلووں کی جو رعنائی ہو | میرے ہاتھوں سے مکمل تری انگڑائی ہو
دل بھی اٹکا ہو طبیعت بھی کہیں آئی ہو | خوبیِ عشق اسی میں ہے کہ رسوائی ہو
ہاتھ اٹھاتے ہی فلک جس کا تماشائی ہو | کیا عجب وہ کسی مخمور کی انگڑائی ہو
کیا عجب باعثِ بربادی و رسوائی ہو | وہ طبیعت جو کہیں پہلے پہل آئی ہو
دیکھنا حسن کے جلووں کا ہنسی کھیل نہیں | جس کو بنا ہو تماشا وہ تماشائی ہو
آرزو ہے کہ برا بھی کہیں تو آپ کہیں | حسن کے ساتھ مرے عشق کی رسوائی ہو
مجمعِ حشر میں کیا ان سے کہوں راز کی بات | یہ تو جب ہو کہ میسر مجھے تنہائی ہو
جان سکتے نہیں اس رمز کو بے جان دئے | ہم جو مر جائیں تو اظہارِ مسیحائی ہو
اب جو میں نام بتا دوں تو قیامت آجائے | مجھ سے وہ پوچھتے ہیں کس کے تمنائی ہو
اے فغاں کیا کہوں کہنے میں حجاب آتا ہے | میرے ہوتے مرے جذبات کی رسوائی ہو
عاشق و عشق زمانے میں نہیں ہیں کیوں کم | ان کو یہ ضد ہے نہ سودا ہو نہ سودائی ہو

حشر میں یہ کبھی چاہے گی نہ غیرت میری
ساری دنیا ترے جلووں کی تماشائی ہو

سجدۂ عشق و وفا کی یہ نرالی تاکید
آستاں ہو کہ نہ ہو ذوقِ جبیں سائی ہو

ناوک و دل کبھی ملتے ہیں تو کس لطف کے ساتھ
جیسے اِن دونوں میں برسوں کی شناسائی ہو

دل میں آئے تو مرے دل سے نکل جائے کبھی
ہے تمنا کہ تمنا کی نہ رسوائی ہو

پھر دکھائے جو محبت اُسے دیکھے کوئی
شرط پہلی ہے یہی پہلے تمنائی ہو

ہم اِسی وجہ سے فریاد کئے جاتے ہیں
خامشی بھی نہ کہیں باعثِ رسوائی ہو

چشم بد دور فروغِ رُخِ تاباں نہ سہی
کوئی جگنو ہی چراغِ شبِ تنہائی ہو

شوقِ دیدار تو کہتا ہے کہ چلئے چلئے
اور جو حشر میں جا کر مری رسوائی ہو

پردہ داری کا تقاضا کہ نگاہیں نہ اٹھیں
خود نمائی کا اشارہ کہ تماشائی ہو

کیا کیا اور اُٹھاؤ کوئی طوفان جدید
آپ یہ چاہتے ہیں نوحؔ کی رسوائی ہو

طبع زاد

ج

روک دیتی ہیں میری آہوں کو
آفریں آپ کی نگاہوں کو

وہ چُرانے لگے نگاہوں کو
دیکھ کر اپنے داد خواہوں کو

پاسبانوں کی یہ مجال نہیں
روک لیں وہ ہماری آہوں کو

کس قدر شرمسار ہوتا ہوں
دیکھ کر اِس قدر گناہوں کو

جن نگاہوں نے تم کو دیکھا ہے
دیکھتے ہیں ہم اُن نگاہوں کو

ہو گئی رحمت گناہگاروں پر
کون پوچھے گا بے گناہوں کو

عرصۂ حشر میں بھی آئے ہیں
ساتھ لے کر وہ خیر خواہوں کو

بن گئے سب تمہارے جانب دار
ہو گیا کیا مرے گواہوں کو

کر لئے جمع ہم نے ہوش و حواس
پھر وہ تکلیف دیں نگاہوں کو

دل سے نکلیں گی دل میں بیٹھیں گی
وہ ہوا جانتے ہیں آہوں کو

خنجر و تیر ہم سمجھتے ہیں
چلتی پھرتی ہوئی نگاہوں کو

حضرتِ خضر بھی سمجھ نہ سکے
عشق کی پیچ دار راہوں کو

کیا کوئی اُن کے برخلاف کہے
ڈانٹتے ہیں مرے گواہوں کو

سیکڑوں شکلیں سیکڑوں جلوے
چین ملتا نہیں نگاہوں کو

اور مائل کیا گناہوں پر
بخش کر سیکڑوں گناہوں کو

اُن کے تیروں کو روکتا ہوں میں — روک لیں وہ تو میری آہوں کو

اُس کی رحمت سے یہ بعید نہیں
بخش دے نوحؔ کے گناہوں کو

طبع زاد

ج

شکوۂ غم کا بظاہر کوئی عنواں بھی نہ ہو — وہ پشیمان بھی ہو اور پشیماں بھی نہ ہو
خیرہ حسرت بھی نہ ہو ٹھہرے ارماں بھی نہ ہو — کیا مرے دل میں ترے تیر کا پیکاں بھی نہ ہو
ہر کسی کو وہ پریشان کئے جاتے ہیں — اور پھر چاہتے ہیں کوئی پریشاں بھی نہ ہو
دل کہاں جوش کہاں ذوق کہاں شوق کہاں — جیسے ہم ہیں کوئی یوں بے سر و ساماں بھی نہ ہو
مشکلیں ہیں مری ایسی کہ الٰہی توبہ — تم جو آساں کرو تو کوئی آساں بھی نہ ہو
اِس لئے پنجۂ وحشت نے اُڑائے پرزے — موسمِ گل میں کوئی سر بگریباں بھی نہ ہو
مذہبِ عشق و وفا مجھ کو یہ دیتا ہے صلاح — تو جو کافر نہیں ہوتا تو مسلماں بھی نہ ہو
اُن کے گھر میں کسی مہماں کا ٹھہرنا کیسا — رشک میرا تو یہ کہتا ہے کہ درباں بھی نہ ہو
وہ مرا دل ہے تو پہلو میں رہے دل کی طرح — وہ مری جان ہے تو جان کا خواہاں بھی نہ ہو
کیا غضب ہے کہ زمانے سے سدھارے کوئی — اُن کے لب پر مگر اللہ نگہباں بھی نہ ہو
کیا نظر کیجئے اُس شوخ کی بے دردی پر — ظلم بھی روز کرے اور پشیماں بھی نہ ہو
کس جگہ عمر گذارے وہ ترا خانہ خراب — جس کی پھوٹی ہوئی تقدیر میں زنداں بھی نہ ہو
حسنِ کافر کے لئے کام یہ مشکل ہے بہت — دشمنِ دیں بھی نہ ہو رہزنِ ایماں بھی نہ ہو

آپ کیا چاہتے ہیں آپ کا مطلب کیا ہے
نوحؔ دنیا میں نہ ہوں نوحؔ کا طوفاں بھی نہ ہو

۵

طبع زاد ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء

ج

کیا وادیِ عرفاں میں اک رہرو ہے پابستہ — ادراک کڑی منزل احساس کٹھن رستہ
منزل کے قریب آکر ہم بھول گئے رستہ — تقدیر کا چکر تھا تدبیر سے وابستہ
پیکاں بنا ارماں ارمان بنا پیکاں — دل میں ہیں رگیں لاکھوں رگ رگ میں ہے پیوستہ
ہیں کیا چمنستاں میں ہستی ہی مری کیسی — گل ہوں تو خزاں دیدہ بلبل ہوں تو پر بستہ

ہر لحظہ مصیبت بھی ہر وقت قیامت بھی
مرنے کو رہے زندہ کیا کوئی جگر خستہ

آگے کو قدم اپنے کیا خاک بڑھائیں ہم
مجبور مسافر پر مسدود ہوا رستہ

قدرت کے کرشموں پر تنقید کرے کوئی
اسرار مشیت سے ہر سانس ہے وابستہ

اک رشتۂ الفت میں دل سب کے بندھے دیکھے
ظالم تری محفل ہے یا ہے کوئی گلدستہ

عشاق ہی رہتے ہیں کوئی نہیں رہتا ہے
مرنے کے لئے حاضر بیٹھے کو کمر بستہ

ہم شوخ نگاہی سے بے خوف نہیں رہتے
یہ برق بلا بن کر گرتی ہے برجستہ

کیا عشق میں پہنچے گا وہ منزل مقصد تک
دو چار قدم چل کر جو بھول گیا رستہ

کس چیز کو میں دیکھوں کس بات کو میں پوچھوں
ہوں عالم حیرت میں لب بند نظر بستہ

ہم نے تری الفت میں یہ چار لقب پائے
بدبخت زبوں اختر دل ریش جگر خستہ

یا مجھ کو وہ بلوائیں یا خود مرے گھر آئیں
ارمان نکلنے کا نکلے تو کوئی رستہ

رنگینی عالم سے معمور مرا دل ہے
مے خانے میں یہ ساغر گلشن میں گل دستہ

اے نوح زمانے میں آیا نہیں کچھ بھی
طوفان اٹھانے پر رہتے ہو کمر بستہ

طبع زاد ۱۶؍ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء

ج

خورشید ٹھہرتا نہیں دن بھر سے زیادہ
کیوں کر ہو ترے روئے منور سے زیادہ

قربان کروں خلد کو میں تیرے مکاں پر
اس گھر کی سجاوٹ نہیں اس گھر سے زیادہ

شعلہ ہو کہ سیماب ہو بجلی ہو کہ آندھی
کوئی نہیں میرے دل مضطر سے زیادہ

صحرائے محبت میں کبھی دل نہ جدا ہو
پیارا ہے یہ رہزن مجھے رہبر سے زیادہ

گو کچھ بھی دل زار نہیں پھر بھی ہے سب کچھ
نشتر سے اگر کم تو ہے نشتر سے زیادہ

فریاد ستم آج بھی ہم کر نہیں سکتے
حاوی ہے کوئی داور محشر سے زیادہ

تعریف کروں کیا تری بے باک نظر کی
چلتی ہوئی چلتے ہوئے خنجر سے زیادہ

مانا کہ رہا چرخ بھی آمادۂ بیداد
لیکن ہے گلہ مجھ کو مقدر سے زیادہ

بجلی کی طرح آئے بھی آ کر وہ گئے بھی
ٹھہرے مرے پہلو میں نہ دم بھر سے زیادہ

بے چین ہی رکھے گی ہمیں آپ کی حسرت
یہ پھانس کھٹکنے میں ہے نشتر سے زیادہ

مے نوش کے لئے اور کوئی چیز نہیں ہے
دنیا میں چھلکتے ہوئے ساغر سے زیادہ

کیا ہو مرے نالوں کا اثر آپ کے دل پر
پتھر سے نہیں کم وہ ہے پتھر سے زیادہ

ہے وجہ یہی قبر میں دو گز کے کفن کی
پھیلائے کوئی پاؤں نہ چادر سے زیادہ

ہر روز نیا روز نئی صبح نئی شام
آرام سفر میں ہے مجھے گھر سے زیادہ

افسوس کہ ہے تشنگیٔ شوقِ شہادت
مقدار میں آبِ دمِ خنجر سے زیادہ

کیا جانے مرے گھر کوئی آئے کہ نہ آئے
بے تاب ہر شام ہوں دن بھر سے زیادہ

ہو جائے جو نا وقت تو رک جائیں مسافر
رہ زن ہیں رہِ عشق میں رہبر سے زیادہ

اے پیرِ مغاں رہنے بھی دے اپنا تکلف
چلّو ہے مرے واسطے ساغر سے زیادہ

لازم ہے محبت کے لئے خانہ بدوشی
بے گھر وہی اس میں ہو جو ہو گھر سے زیادہ

طوفانِ مضامین کے اٹھانے میں کوئی بھی
مشہور نہیں نوحِ سخن ور سے زیادہ

طبع زاد ۱۱ر مئی ۱۹۳۴ء

ج

ہجرِ غم میں دل کا قرینہ
لاکھوں موجیں ایک سفینہ

ٹوٹا ہے دل شق ہے سینہ
دیکھ کر اس ظالم کا قرینہ

بھیگ گئی دنیائے محبت
آیا تھا کچھ مجھ کو پسینہ

شاخیں پھوٹیں کلیاں چٹکیں
آ پہنچا پھاگن کا مہینہ

حال بھی میرا آپ نہ پوچھیں
اتنی رنجش اتنا کینہ

مرجانا تکمیلِ وفا ہیں
ہے معراج کا پہلا زینہ

میری گردن تیرا خنجر
تیری برچھی میرا سینہ

برقِ بلا یا برقِ ادا ہو
دونوں کا ہے ایک قرینہ

کیا ہو سکوں اے ہجرِ محبت
ساحل سے ہے دور سفینہ

جلتا ہوں تیری محفل میں
جنت میں دوزخ کا قرینہ

ہجر کا عالم یاد ہے مجھ کو
ایک اک دن ایک ایک مہینہ

موت کی سختی ہم نے سمجھی
ماتھے پہ نکلا جو پسینہ

شمع کے دم سے بزم منور
کہنے کو مہمانِ شبینہ

کوئی جابر کوئی رضا ہو
اک میرا اک ان کا قرینہ

مل جاؤ بھی کھل کھیلو بھی
اچھا دن اچھا ہے مہینہ

انکھیں میرے دل سے امنگیں
غرق کیا موجوں نے سفینہ

دل کو فغاں پہنچائے فلک تک
نیچی چھت ہے اونچا زینہ

پھر اٹھا طوفانِ محبت
نوح کریں تیار سفینہ

۸ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

ساقی جو دل سے چاہے تو آئے وہ زمانہ
ہر شخص ہو شرابی ہر گھر شراب خانہ

سمجھو تو اک حقیقت دیکھو تو اک فسانہ
کھوئی ہوئی جوانی گذرا ہوا زمانہ

مفہوم ظالمانہ الفاظ عاشقانہ
وہ ہے تری کہانی جو ہے مرا فسانہ

جام و سبو سے ہوگا سیراب کیا زمانہ
لے لے ثواب ساقی دے دے شراب خانہ

اتنے بڑھے مراسم مہمان و میزباں میں
پہلو سے ناوک و دل دونوں ہوئے روانہ

آرام سے وطن میں کیا دن مرے گذرتے
قسمت میں لکھ گیا تھا غربت کا آب دانہ

مرنا خیالِ حق میں معراجِ زندگی ہے
دار و رسن سے سنئے منصور کا فسانہ

فریاد کیا سنیں وہ میرے خموشِ دل کی
اک سازِ بے صدا ہے اک بے اثر ترانہ

جو اُٹھ گئے جہاں سے آئے وہ کب جہاں میں
رویا کرے خدائی تڑپا کرے زمانہ

ہیں آپ کی نظر سے دل کس طرح بچاؤں
چلنے کو ہے وہ ناوک اُڑنے کو ہے نشانہ

صیاد کے علاوہ بد خواہ باغباں بھی
اب اُٹھ گیا چمن سے بلبل کا آب دانہ

پھر دل میں ٹھن گئی ہے تجدید آرزو کی
پھر یاد کر رہا ہوں بھولا ہوا فسانہ

جوشِ جنوں کا منظر پر کیف ہو نہ کیوں کر
ذرے بنے ہیں ساغر صحرا شراب خانہ

غائب ہیں سننے والے ابتر ہے رنگِ محفل
ایسے میں کیا ترنم ایسے میں کیا ترانہ

عرفاں کی انجمن میں وہ صدرِ انجمن ہے
جس بے خودی نے لوٹا ادراک کا خزانہ

کیا اعتبار ان کا سب غیر معتبر ہیں
معشوق ہو کہ گردوں قسمت ہو یا زمانہ

راہِ طلب میں کیوں کر دل پر نہ آفت آئے
ناوقت یہ مسافر گھر سے ہوا روانہ

دل کے لیئے اُٹھائیں وہ کیوں نگاہ اپنی
ناوک نہ آنے پائے اُڑ جائے خود نشانہ

طوفاں اُٹھا تو کیوں کر کشتی بچی تو کیوں کر
اے نوح تم سناؤ وہ نوح کا فسانہ

اس زمین پر جون پور میں ۲۰ر فروری ۱۹۳۶ء کو مشاعرہ ہوا لیکن ریل نہ ملنے سے میں شریک نہ ہو سکا

ممکن نہیں دل اپنا دل بر سے ہو بیگانہ
وہ گل ہے یہ بلبل ہے وہ شمع یہ پروانہ

کیوں رندی و مستی میں لہرائے نہ مے خانہ
بہتا ہوا دریا ہے چلتا ہوا پیمانہ

وہ ابر کی سرجوشی وہ کیف وہ مے خانہ
بھیگی ہوئی راتوں میں رِستا ہوا پیمانہ

ہیں گوشۂ عزلت میں شرمندۂ وحشت ہوں
دے دے کوئی دلوا دے ویرانے کا ویرانہ

برباد وفا ہو کر مسجودِ جہاں دل ہو
آدھے میں بنے مسجد آدھے میں صنم خانہ

رنگینیِ قدرت کی برعکس یہ تصویریں
سو گل ہیں مگر عالم ہر گل کا جداگانہ

جو سامنے آجائے بدمست نہ وہ کیوں ہو
نظریں ہیں تری ساقی آنکھیں تری مے خانہ

سوزِ غمِ الفت میں تخصیص یہ مشکل ہے
پر جس کو کبھی مل جائیں بن جائے وہ پروانہ

اے دیر و حرم والو تم دل کی طرف دیکھو
کعبے کا یہ کعبہ ہے بت خانے کا بت خانہ

ہیں کوتے محبت میں کیا پائے طلب رکھوں
اسرار سے ناواقف آداب سے بیگانہ

ایسا نہیں کیا ممکن قدرت کے کرشموں سے
بت خانے میں کعبہ ہو کعبے میں ہو بت خانہ

وہ میری شکایت پر چپ ہو گئے یہ کہہ کر
دیوانے سے کیا الجھوں دیوانہ تو دیوانہ

کس کام کا وہ دل ہے خالی جو رہے غم سے
بھر کر جو چھلک جائے وہ خوب ہے پیمانہ

کیوں شمعِ سرِ محفل جل کر نہ جلا دیتی
ہر دانے کا اِک اِک پر تھا موت کا پروانہ

گل زارِ تمنا میں کیا لطف مجھے آئے
سبزہ بھی یہاں کا ہے اخلاق سے بیگانہ

دربارِ محبت کے آئین نئے دیکھے
کچھ جرم نہ ہو یا ہو ہر حال میں جرمانہ

زینت کے لئے لازم وسعت کے لئے واجب
مے خانے کو پیمانہ پیمانے کو مے خانہ

کیا ترکِ محبت پر آمادہ مرا دل ہو
اوّل تو یہ دیوانہ پھر آپ کا دیوانہ

خاصانِ الٰہی بھی محفوظ نہ تھے غم سے
چکر میں رہا کیا کیا تسبیح کا ہر دانہ

مشکل ہے یہ جیتے جی محفل تری چھٹ جائے
تو لاکھ نکلوائے آنا ہے مجھے روزانہ

قبروں کے مناظر نے کروٹ نہ کبھی بدلی
اندر وہی آبادی باہر وہی ویرانہ

اے نوحؔ سیاست کے طوفانِ حوادث میں
مسلم سے بھی رکھ یاری ہندو سے بھی یارانہ

طبع زاد

ج

اسرارِ محبت اب کیوں کر رہیں پوشیدہ
دل بھی ہے پریشاں دل دیدہ بھی ہے نم دیدہ

کچھ بھی سہی لیکن ہے وہ درد پسندیدہ
چہرے سے نہ ظاہر ہو دل میں جو ہو پوشیدہ

خواہش بھی یہ ناممکن کاہش بھی یہ پیچیدہ
تو اور تری صورت میں اور مرا دیدہ

ہر ناز سرور افزا ہر لطف نشاط آگیں
محفل میں تری آکر کیا ہو کوئی رنجیدہ

جانیں تو وہی جانیں سمجھیں تو وہی سمجھیں
ارمان مرا مبہم حسرت مری پیچیدہ

کیا صفحۂ ہستی پر ہم اپنی نظر ڈالیں
الفاظ بھی سب دھندلے کاغذ بھی یہ بوسیدہ

اے چشمِ تماشائی کر غور حقیقت پر
ممکن ہے کہ خالق ہو مخلوق میں پوشیدہ

تکلیف اٹھا کر ہم کیا طالبِ راحت ہوں
پہنچے جو محبت میں وہ غم بھی پسندیدہ

ساحل کے قریں پہنچا دریائے محبت میں — تنکے کی طرح بہہ کر میرا تن کاہیدہ
آزار و مصائب سے محفوظ نہیں کوئی — ہے باغِ محبت کا ہر پھول خزاں دیدہ
میزانِ وفا میں بھی اے دل نہ سبک ٹھہریں — منہ سے جو فغاں نکلے تو وہ بھی ہو سنجیدہ
پھر موسمِ گل آیا پھر تازہ بلا آئی — وہ جاگ اُٹھے جتنے جذبات تھے خوابیدہ
جل کر بھی ہمارا دل حسرت سے نہیں خالی — اس راکھ میں چنگاری ہے عشق کی پوشیدہ
مغموم بھی رہتا ہوں مسرور بھی ہوتا ہوں — ایک اُن کے تلوّن میں دو راز ہیں پوشیدہ
کیوں آہ مرے دل سے ہنگامِ ستم نکلی — وہ حشر بنے اُٹھ کر فتنے تھے جو خوابیدہ
کیوں کر مرے قاتل کو قاتل نہ کہے کوئی — بازو بھی توانا ہیں تلوار بھی ہے چیدہ

طوفانِ محبت میں پھنسنے کے نہیں ہرگز
معلوم رہے نم کو ہیں نوحؔ جہاں دیدہ

ی

ہماری ترجمانِ دل نگاہِ واپسیں ہوتی

۲۶ر جولائی ۱۹۱۹ء کو اس طرح پر پیرزادہ عبد الحمید صاحب دکبلی کے اہتمام سے غازی آباد میں ایک مشاعرہ ہوا علاوہ مقامی شعرا کے جناب سید محمد نوحؔ صاحب شہیر مچھلی شہری بے خود صاحب موہانی یاسؔ صاحب عظیم آبادی۔ مولانا شرف الدین صاحب موتنؔ ٹونکی باغؔ صاحب سنبھلی ندرتؔ صاحب حمیدؔ صاحب میرٹھی حضرت سائلؔ مرحوم رونقؔ صاحب شیدا صاحب شوقؔ صاحب شعلہؔ صاحب دہلوی حیرانؔ صاحب دہلوی رفیقؔ صاحب ہاپوڑی عطا صاحب بدایونی بزمؔ صاحب اکبرآبادی مجذوبؔ صاحب بہرت پوری وغیرہ باہر سے تشریف لائے تھے۔ سامعین کا مجمع چار پانچ ہزار سے زیادہ تھا چوں کہ مشاعرہ دور دن میں ختم ہوا اس باعث سے وہ حضرات جو عدیم الفرصت تھے پہلے ہی دن اپنی اپنی غزلیں پڑھ کر چلے گئے میرا نمبر دوسرے دن آیا اکثر اشعار بہت مقبول ہوئے آستیں کا قافیہ مخصوص تھا ہر شخص نے اس قافیے پر پوری توجہ سے فکر کی تھی اور اچھے اچھے شعر نکالے تھے

ق

جو میری آستیں سے دست کش وحشت کہیں ہوتی — یقیں تھا خود گریباں گیر وحشت آستیں ہوتی
ہجومِ رنج و غم میں اشک شوئی بالیقیں ہوتی — ہمارے دیدۂ تر پر جو اُن کی آستیں ہوتی
کوئی سچ کہہ رہا ہے آستیں میں ہاتھ ہوتے ہیں — ہمارے ہاتھ میں کیوں کر کسی کی آستیں ہوتی
یہ جھگڑا خود لگا رکھا ہے میرے دستِ وحشت نے — نہ ہوتے ہاتھ تو پیدا کہاں سے آستیں ہوتی
جو ٹھہرا وقت کا پابند وہ جوشِ جنوں کیسا — بہار آنے سے پہلے ٹکڑے ٹکڑے آستیں ہوتی
یہ کہہ کر رکھ دیا الزام مجھ پر دستِ وحشت نے — جو تم بھی چاہتے تو ٹکڑے ٹکڑے آستیں ہوتی

خلافِ عقل تھا جھگڑا کسی کا اپنے سر لینا
جنوں میں کیا گریباں کی محافظ آستیں ہوتی

یقیناً عالمِ وحشت میں یہ محفوظ رہ جاتا
مرے دامن سے وابستہ جو تیری آستیں ہوتی

علاجِ جوشِ وحشت کا مآل اے چارہ گر کیا تھا
نہ تیری آستیں ہوتی نہ میری آستیں ہوتی

دمِ جوشِ جنوں کس شغل میں بہلائیں دل اپنا
گریباں کو نہ ہم روتے اگر آج آستیں ہوتی

لباسِ جسم کو جوشِ جنوں سے واسطہ کیسا
جو ہوتی آستیں تو وہ بھی مارِ آستیں ہوتی

رہا ارمان دل کا دل میں فصلِ گل نہ آنے سے
جو پہلے چاک ہوتی وہ ہماری آستیں ہوتی

جو ہم تم یوں ٹہلتے تو مزا تھا سیرِ گلشن کا
تمہارے دستِ نازک میں ہماری آستیں ہوتی

اُڑے پرزے اِسی جیب و گریباں کے تو کیا حاصل
مناسب تھا مرے ہاتھوں میں اُن کی آستیں ہوتی

کبھی دستِ جنوں بڑھ کر جو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا
گریباں میں گریباں آستیں میں آستیں ہوتی

کوئی آساں تھا اشکوں کا طوفاں جذب کر لینا
کفِ دریا کی صورت نوحؔ اپنی آستیں ہوتی

یہی ہوتی تو دل جیسی ہماری بالیقیں ہوتی
محبت کی پریشانی پریشانی نہیں ہوتی

لگاوٹ بھی طبیعت میں جو تھوڑی سی کہیں ہوتی
ادا تو ہے ادا ہر بات اُن کی دل نشیں ہوتی

اگر مٹتا نہ دل اپنا تو حسرت بالیقیں ہوتی
جہاں رہنا وہیں رہتی جہاں ہوتا وہیں ہوتی

کمی کی جوشِ دل نے آہ نے میرے مقدر نے
محبت اُن کو مجھ سے کیوں نہ ہوتی بالیقیں ہوتی

اُڑا کر خاک اگر آہیں نہ کرتے تیرے دیوانے
مخالف کیوں فلک ہوتا مکدر کیوں زمیں ہوتی

ہمیں تو مار ڈالا اُن کی اِس طرزِ تغافل نے
ستم بھی اب نہیں کرتے جفا بھی اب نہیں ہوتی

نہ آتے وہ دمِ آخر تو کیا ہوتا یہی ہوتا
مری حسرت بھی میرے ساتھ پیوندِ زمیں ہوتی

زمانہ معترف اِس کا ہے دنیا اِس کی قائل ہے
اگر دو دل نہیں ملتے تو الفت بھی نہیں ہوتی

خوشی ملتی جو غم کے بعد تو کچھ لطف بھی ملتا
نگاہِ مہر سے پہلے نگاہِ خشم گیں ہوتی

اگر ملتا ہے دل سے دل تو کیا ملنے نہیں پاتا
جو کرتا ہے کوئی الفت تو کیا الفت نہیں ہوتی

حریصِ مال و دولت یہ ہوس کرتا تو کیا کرتا
نہ سونے کا فلک ہوتا نہ چاندی کی زمیں ہوتی

یہ کہہ کر نکالا ہم نے باہر اُن کو پردے سے
چھپاتے کس لئے صورت اگر صورت حسیں ہوتی

طبیعت کی تو شوخی کہہ رہی ہے پھر ڈھانے کو
مگر اِس پہ اُن آنکھوں کی حیا راضی نہیں ہوتی

مرے دل سے نظر اُن کی اشاروں میں یہ کہتی ہے
جو تو ستم آفریں ہوتا تو میں شرم آفریں ہوتی

نگہباں پاسباں درباں یہ سب موجود رہتے ہیں
نہیں ہوتی وہاں بس تو کھپت میری نہیں ہوتی

نکلنے کے لئے کیا کیا مرے دل میں تڑپتی ہے
مگر یہ آرزو کی آرزو پوری نہیں ہوتی

مزا جب تھا اُدھر وہ ہم سے کھنچتے اور اُدھر جھکتے
لڑائی بھی یونہیں ہوتی صفائی بھی یونہیں ہوتی

نگاہِ شرم گیں پر اُن کی کیوں کر لوگ مرتے ہیں
یہ وہ تلوار ہے جو میاں سے باہر نہیں ہوتی

تری کافر نظر سے عشق میں کرتا تو کیا کرتا
وہ دل کی دوست ہو کر دشمنِ ایمان و دیں ہوتی

تمھیں پر کچھ نہیں موقوف غم دینا ستم کرنا
جہاں ہم دل لگاتے ہیں یہ بلا نازل وہیں ہوتی

خوشی سے بے تامل نوحؔ قبضہ اُن کو دے دیتے
زمینِ شعر اگر ان کے علاقے کی زمیں ہوتی

دلّی میں موتی جان انداز نے اس طرح پر مجھے اپنی ایک غزل گا کر سنائی شوقؔ صاحب دہلوی کا مجھ سے اصرار ہوا اُن کے حکم کی تعمیل میں یہ غزل میں نے کہی

اِس طرف اُس طرف نظر ڈالی
ہم نے یوں عمر ختم کر ڈالی

جان اپنی ہلاک کر ڈالی
جس نے اُس شوخ پر نظر ڈالی

فصلِ گل میں ہے دید کے قابل
ہر چمن ہر نہال ہر ڈالی

کچھ بھی اب سوجھتا نہیں ہم کو
اُن کی آنکھوں پہ کیوں نظر ڈالی

دیکھ کر لطف کوئے جاناں کا
خاک ہم نے بہشت پر ڈالی

خانۂ دل اجڑ گیا اپنا
عاشقی کی بنا اگر ڈالی

ہو گیا خاتمہ مرے دل کا
آپ نے سرسری نظر ڈالی

ق

مر کے ہم نے دکھا دیا تم کو
جو کہی تھی وہ بات کر ڈالی

پتّی پتّی میں اُس کو دیکھ لیا
ڈالی ڈالی پہ یوں نظر ڈالی

پڑھ رہے تھے وہ آج اک تحریر
چھین کر میں نے چاک کر ڈالی

دل نہ تھا آئینے کے پہلو میں
کس نظر سے اُدھر نظر ڈالی

دل تو کیا چیز ہے محبت میں
جان بھی ہم نے صبر کر ڈالی

سامنا جب ہوا قیامت میں
نوحؔ نے نوحؔ پر نظر ڈالی

بڑھایا پیار جب ہم نے محبت آپ نے کم کی

۴ جنوری ۱۹۲۱ء کو الٰہ آباد میں ایک مشاعرہ جناب محمود علی خاں صاحب رئیس دریا آباد کے اہتمام سے ہوا قریب قریب مقامی شعرا سب موجود تھے میں نے یہ غزل اُسی مشاعرے میں پڑھی تھی

ق

دم لطف و کرم سوجھی کسی کو ظلم پیہم کی
خوشی کا ابر تو اُٹھا مگر بارش ہوئی غم کی

کہیں دیکھی جو صورت ہم نے دو چار اہلِ ماتم کی
نظر میں پھر گئی تصویر اپنی مجلسِ غم کی

سمجھتے ہیں مآلِ کار یہ عیش و مسرت کا
خوشی بھی اہلِ دانش کے لئے تمہید ہے غم کی

تم اپنے حسن کے اوصاف مجھ سے پوچھتے کیا ہو
اِسی عالم نے تو کایا پلٹ دی سارے عالم کی

مرے آنسو نہ کیوں گرتے نقوشِ باغِ عالم پہ
گلوں میں جذب ہو جاتی ہے اک اک بوند شبنم کی

خدا جانے دلِ بے تاب پر کیا واقعہ گذرا
کہ پیہم سانس لینے میں صدا آتی ہے ماتم کی

وہ دل جس کو سمجھتے تھے مرقع ہم مسرت کا
اب اچھی خاصی جیتی جاگتی تصویر ہے غم کی

خدا سے حشر کے دن اِس طرح جنت کو مانگوں گا
جو میں وارث ہوں آدم کا تو دے جاگیر آدم کی

جو ہوتا دفعتاً ترکِ تعلق تو غضب ہوتا
غنیمت ہے کہ رفتہ رفتہ الفت آپ نے کم کی

ہوا یہ حشر اچھا روز کے مرجانے والوں کا
کسی نے تنگ آکر اب اُٹھا دی رسم ماتم کی

مرے زخمِ جگر کا منھ ذرا سا اب نکل آیا
دکھا دی چارہ سازوں نے بڑے کیوں شکل مرہم کی

کیا سرسبز پھر اُن کو دوبارا آپ نے رو کر
جو مرجھائی ہوئی شاخیں تھیں میرے نخلِ ماتم کی

کہیں ایسا نہ ہو جل کر زمانے کو جلا ڈالے
مرے منھ سے فغاں نکلی قسم کھا کر جہنم کی

ستم ہے داغ اُس کا داغ کس کا سوزِ فرقت کا
غضب ہے آنچ اُس پر آنچ کس کی آتشِ غم کی

پھنسے ہیں کشمکش میں اہلِ دنیا کس طرف جائیں
اِدھر جنت کا دروازہ اُدھر کھڑکی جہنم کی

بہت کچھ سوچتا ہوں میں سمجھ میں کچھ نہیں آتا
محبت تم نے کم کی یا جنابِ نوح نے کم کی

پتلی ہماری آنکھ کی تصویر ہوگئی

۳۰ مارچ ۱۹۲۱ء کو اس طرح پر مشاعرہ درگاہ حضرت سید شاہ ارزاں صاحب رح پٹنہ میں جناب سید شاہ حامد حسین صاحب "حامد" سجادہ نشین کے اہتمام سے اعلیٰ پیمانے پر ہوا اطراف کے شعرا سب موجود تھے

پیدا یہ حسن و عشق میں تاثیر ہوگئی
میری شبیہ آپ کی تصویر ہوگئی

مرنے کے بعد عشق میں توقیر ہوگئی
چٹکی ہماری خاک کی اکسیر ہوگئی

ق

ترچھی نگاہ بھی کہیں تلوار بن نہ جائے
سیدھی نظر تو میرے لئے تیر ہوگئی

تم نے قدم جو رکھ کے زمیں پر اُٹھا لیا
برباد خاکِ عاشقِ دل گیر ہوگئی

یہ سوچ کر چھپے گی نہ اپنی نمودِ حسن
آئینے سے الگ تری تصویر ہوگئی

مشکل ہے اب سرِ رشتۂ الفت کا ٹوٹنا
اُن کے ہمارے بیچ میں تحریر ہوگئی

نکلی نہ تھی فغاں ابھی میری زبان سے
تلوار اُن کی آکے گلو گیر ہوگئی

کھولا تڑپ نے دردِ محبت کا ماجرا
اچھا ہوا کہ متن کی تفسیر ہوگئی

ظالم ترا مزاج تو تیرا مزاج تھا
مجھ سے خلاف خود میری تقدیر ہوگئی

جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ اُسے بھول جاتے ہیں
ہر بات اُن کی قابلِ تحریر ہو گئی

ہم نے کسی کو بڑھ کے گلے سے لگا لیا
یہ بے خودیٔ شوق میں تقصیر ہو گئی

اپنی صفت فضول تھی اپنی زبان سے
خاموش اِس لئے تری تصویر ہو گئی

دل مٹ گیا بلا سے محبت میں مٹ گیا
حاصل مجھے تو لذتِ تعزیر ہو گئی

اللہ رے میرے حسنِ تصور کے شعبدے
موجود ہر جگہ تری تصویر ہو گئی

عذرِ گناہ رحمتِ باری کے سامنے
تقصیر وار کہہ دے کہ تقصیر ہو گئی

اللہ رے یہ وہم کہ تجھ کو بھی دیکھ کر
جھٹ آئینے کی آڑ میں تصویر ہو گئی

دل دے کے ہم کو اُن سے نہ کہنا تھا حالِ دل
وہ ایک تھی یہ دوسری تقصیر ہو گئی

دل اُن کو دے دیا تو خطا ہم نے کی مگر
کیوں دوسروں سے بھی یہی تقصیر ہو گئی

ملتا نہیں وفا کا پتہ اب جہان میں
شاید وہ میری آہ کی تاثیر ہو گئی

ہم خاکِ رہ گذر ہیں ہماری بساط کیا
دو گام وہ چلے یوں ہی تعزیر ہو گئی

حیرت کو دیکھ کر مری حیرت کا آئینہ
کچھ بن گئی کچھ آپ کی تصویر ہو گئی

محشر میں آئے اور وہ آکر چلے گئے
کیوں ہم نہ پہنچے کیوں ہمیں تاخیر ہو گئی

وہ کہہ رہے ہیں سارے جہاں کو ڈبو دیا
ہاں یہ ضرور نوح سے تقصیر ہو گئی

اس غزل میں یہ خصوصیت ہے کہ ردیف ہو گئی کو ہو گئی یا بن گئی پڑھئے دونوں صورتوں میں بندش اور ترکیب وغیرہ کے لحاظ سے ہر شعر اپنی جگہ درست رہے گا

کیا چیز طبعِ عاشقِ دل گیر ہو گئی
الفت کی جیتی جاگتی تصویر ہو گئی

ادنا سا معجزہ ہے یہ رفتارِ یار کا
جو خاک اُڑی قدم سے وہ اکسیر ہو گئی

کیوں بار بار ہجر میں بدلیں نہ کروٹیں
اِک اِک گھڑی ہمارے لئے تیر ہو گئی

ہے اُن کی خاکِ در سے مری خاک کا شرف ق
اکسیر سے ملی تو یہ اکسیر ہو گئی

نکلی لہو کی بوند جو اشکوں کے ساتھ ساتھ
وہ انتہائے گریہ کی تصویر ہو گئی

بے کار جانتے تھے دعائے سحر کو ہم
منھ سے نکل کے نالۂ شب گیر ہو گئی

جب کھنچ گئی تو مر گئے عشاق سیکڑوں
کیا تیری تیغ بھی تری تصویر ہو گئی

بدلیں نگاہِ ناز نے بھی کتنی کروٹیں
نشتر سے تیغ تیغ سے یہ تیر ہو گئی

اب اور کس کو جاؤں زمانے میں ڈھونڈھنے
تیری نظیر خود تری تصویر ہو گئی

دل کش ادا نے بھی مجھے بے چین کر دیا
اچھی صدا بھی میرے لئے تیر ہو گئی

اے نوح میرے سامنے دنیا خموش ہے
دل گیر کو یہ دیکھ کے دل گیر ہوگئی

جلوۂ یار میرٹھ کے لئے ۲ر جولائی ۱۹۳۴ء

ج

آج آمد چمن میں ہے کس کی
کھل گئی ہانک سے آنکھ نرگس کی

دشمن و دوست ہوں تو یہ بھی ہو
کس سے میں گفتگو کروں کس کی

آگیا دھیان مرنے والے کا
دیکھ کر شکل اہلِ مجلس کی

میرے دل میں تو یاد آپ کی ہے
آپ کے دل میں یاد ہے کس کی

میں پھنسوں کس لئے مصیبت میں
دل بھی اُس کا ہو آرزو جس کی

محفلِ ناز میں خبر ہی نہیں
ایک مونس کو ایک مونس کی

اُن کی آنکھیں بڑی ہی قاتل ہیں
لیکن اِس پر نگاہ ہے کس کی

دل ہمارا نہ تھا کسی قابل
عشق سے بات بن گئی اِس کی

ہوگی کیا اُس کی دشمنی یارب
ہے خطرناک دوستی جس کی

حشر برپا ہے کوئے قاتل میں
کون چاہے سلامتی کس کی

بے وفا ہے کہ باوفا معشوق
عشق میں پوچھ کچھ نہیں اِس کی

اُس کے پہلو میں اُس کے دل میں رہو
دل ہو تم جس کی جان ہو جس کی

مرضِ عشق جا نہیں سکتا
صرف ہے موت ہی دوا اِس کی

حالِ دنیا کا پوچھئے اُس سے
ہو چکی ختم زندگی جس کی

چشمِ جاناں سے کچھ نہیں نسبت
بے بصارت ہے آنکھ نرگس کی

سیکڑوں داد خواہ ہیں تیرے
کوئی تھامے زبان کس کس کی

نوحؔ طوفان تم اٹھاتے ہو
ہے کوئی روک تھام بھی اِس کی

۲۵ر مارچ ۱۹۳۳ء

ج

لڑی ایسی نظر کس سے پڑی ایسی نظر کس کی
نہیں کھلتا چمن میں آگئی کیوں آنکھ نرگس کی

بدل جائیں گی آنکھیں وقت پر اک ایک مونس کی
ضرورت ہی نہ پیدا ہو ضرورت ہم کو ہے اِس کی

نہ تم مجھ پر ستم کرتے نہ میں آہیں کبھی بھرتا
سزا دینے سے پہلے سوچ لو تقصیر ہے کس کی

کوئی ترکِ وفا کا مجھ سے یوں اقرار لیتا ہے
اُسی کی تم قسم کھاؤ محبت ہو تمھیں جس کی

تمھارے عشق کے عقدے کو ہم عقدہ سمجھتے تھے
مگر اب ہو گیا معلوم یہ بھی گانٹھ ہے بس کی

وہ آجائیں وہ من جائیں وہ من کر مجھ سے مل جائیں
ارے روٹھی ہوئی تقدیر کچھ تدبیر ہے اِس کی

سمجھتا ہوں کہ دل مجھ کو پھنسا دے گا مصیبت میں
مگر یہ ہو نہیں سکتا نہ مانوں بات مونس کی

اگر بہتے ہوئے آنسو ٹھہر جائیں تو اچھا ہو
مری آنکھوں میں ہے تصویر پھر تصویر بھی کس کی

اِنھیں وجہوں سے تو رشکِ چمن میں تم کو کہتا ہوں
دہن غنچے کا قد بھی سرو کا آنکھیں بھی نرگس کی

دلِ بے تاب نے پہنچا دیا اسرارِ قدرت تک
خدا یاد آگیا مجھ کو اذیت دیکھ کر اِس کی

دلِ بے آرزو پہ مطمئن ہم ہو نہیں سکتے
اگر مفلس ہی یہ ٹھہرا تو کیسی ساکھ مفلس کی

قیامت میں یہ میرے واسطے طرفہ قیامت ہے
اِدھر دل اور اُدھر تم میں شکایت اب کروں کس کی

کہاں اب الفتِ مجنوں کہاں اب صورتِ لیلیٰ
اُسی کے ساتھ وہ بھی مٹ گئی جو بات تھی جس کی

مرے اہلِ عزا یہ جانتے تھے وہ بھی آئے گا
ہمیشہ ملتوی کرتے رہے تاریخ مجلس کی

اُٹھا طوفان اشکوں کا خدائی غرق ہوتی ہے
جنابِ نوح ایسے میں بچائیں جان کس کس کی

ہم طرح حضرت داغ دہلوی رح

۲۵ مئی سنہ ۱۹۲۱ء

کج روی بے رُخی نہیں جاتی
یہ ادا آپ کی نہیں جاتی

چھیڑ اُس شوخ کی نہیں جاتی
دشمنی دوستی نہیں جاتی

آہ کرتے تھے ہم کبھی دن رات
بات بھی اب تو کی نہیں جاتی

وہ مری جان مفت لیتے ہیں
جان تو مفت دی نہیں جاتی

کی ہے توبہ جو موسمِ گل میں
اِس کی شرمندگی نہیں جاتی

دورِ ساقی میں ہر کسی کو شراب
اِتنی ملتی ہے پی نہیں جاتی

دیکھتی ہے مری نظر وہ بات
کان سے جو سنی نہیں جاتی

دل بھی جاتا ہے جی بھی جاتا ہے
آرزو آپ کی نہیں جاتی

کیا کہا دل نکال کر دے دو
آپ کی دل لگی نہیں جاتی

اُٹھ بھی ساقی ذرا خدا کے لئے
بے پلائے تو پی نہیں جاتی

حشر میں بحث وعدۂ دیدار
ہاں نہیں آج بھی نہیں جاتی

روز جانے کو جان کہتی ہے
کیوں کسی دن چلی نہیں جاتی

مجھ کو روتے کبھی جو دیکھا تھا
اب تک اُن کی ہنسی نہیں جاتی

حضرتِ نوح ثوب ردولی سے

چھیڑ چھاڑ آپ کی نہیں جاتی

۳۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء

عشق نے قدر نہ جانی میری
ہائے میں ہائے جوانی میری

اب کہاں اگلی جوانی میری
ہو گئی ختم کہانی میری

میں ہوا اُن کی محبت میں شہید
اب کریں مرثیہ خوانی میری

اپنا قصہ تمھیں معلوم نہیں
تم سنو اس کو زبانی میری

ہم نشیں یہ نہیں باور آتا
وہ سنیں رام کہانی میری

جان دیتا تھا دل آزاروں پر
سب نے دیکھی ہے جوانی میری

مختصر یہ ہے کہ مرتا ہوں میں
یہ ہے چھوٹی سی کہانی میری

اس تغافل کا ثمرے کیا کہنا
جان کر بات نہ جانی میری

خوف ہے سب کو تری محفل میں
کون دُہرائے کہانی میری

کہہ دیا نوح سے طوفان اُٹھاؤ
آپ نے بات نہ مانی میری

حسب فرمائش شنکر صاحب الہ آبادی ۲۷ جولائی ۱۹۲۴ء

بلبل کا اُڑایا دل ناحق یہ خام خیالی پھولوں کی
ہنستی ہے تلاشی بادِ صبا اب ڈالی ڈالی پھولوں کی

یہ حسن و لطافت یہ خوشبو یہ رنگ فضا یہ جوش نمو
عالم ہے انوکھا کلیوں کا دنیا ہے نرالی پھولوں کی

مثل بلبل نکہت سے چھٹے دم بھر کو چمن ممکن ہی نہیں
ہوتی ہے تصدق پھولوں پر خوشبو رہنے والی پھولوں کی

مانا کہ لٹائے راتوں کو گلزار میں موتی شبنم نے
جب صبح ہوئی سورج نکلا تو جیب تھی خالی پھولوں کی

گلچیں کی بھی نظریں اُٹھتی ہیں ہر ہر کے کبھی بھونرے آتے ہیں
ہوا لیتے ہیں کس سے کیوں کر کب تک رکھوالی پھولوں کی

آتی ہے خزاں اب رخصت کر زندہ جو رہے پھر آئیں گے
ہم سے تو نہ دیکھی جائے گی مالی پامالی پھولوں کی

ہر برگ شجر پر خوش ہو کر گلشن میں نچھاور کرنے کو
نکہت کا خزانہ کھول دیا ہمت ہے یہ عالی پھولوں کی

پھر رت بدلی پھر ابر اُٹھا پھر سرد ہوائیں چلنے لگیں
ہو جائے پری بن جائے دلھن اب ڈالی ڈالی پھولوں کی

ہاروں میں گندھے جکڑے بھی گئے گلشن بھی چھٹا سینہ بھی چھدا
پہنچے مگر اُن کی گردن تک یہ خوش اقبالی پھولوں کی

صیاد کے گھر سے گلشن تک اللہ کبھی پہنچائے مجھے
امید نہیں میں خوش ہو کر دیکھوں خوش حالی پھولوں کی

گلگشت میں بھی چلتے پھرتے کام اس نے کیا عیاری کا
اخلاص بڑھا کر پھولوں سے ہر بات اُڑا لی پھولوں کی

معشوقوں کے دہنے بائیں عشاق کا مجمع رہتا ہے
دیکھی نہ عنادل سے ہم نے محفل کبھی خالی پھولوں کی

ہم اپنے دل میں داغوں کو یوں دیکھتے ہیں یوں سمجھتے ہیں
کرتا ہے نگہبانی جیسے گلزار میں مالی پھولوں کی

...ف کبھی حاصل تھا ہمیں وہ لطفِ چمن کے ساتھ گیا
اب کنجِ قفس میں کھنچتے ہیں تصویر خیالی پھولوں کی

...نم کے بھی قطرے گلشن میں بدمست کئے دیتے ہیں مجھے
لب ریز مئے عشرت سے ہوئی ایک ایک پیالی پھولوں کی

ہر مصرعہ تر ہے سب پیدا گل ہائے مضامیں کا جلوہ
اے نوح کہوں میں اس کو غزل یا جھول ڈالی پھولوں کی

طبع زاد ۷ / اگست سنہ ۱۹۲۴ء

ج

جو اچھے ہیں اُن کی کہانی بھی اچھی
لڑکپن بھی اچھا جوانی بھی اچھی

تری مہربانی نہ اچھی ہو کیوں کر
کہ ہے تیری نا مہربانی بھی اچھی

درِ یار سے ہم کو اُٹھنا ہے مشکل
جو ایسی ہو تو ناتوانی بھی اچھی

ترے تیر کو اپنا دل کیوں نہ دیں ہم
نشانہ بھی اچھا نشانی بھی اچھی

ہو ہو صدقِ دل کوئی سننے والا
تو واللہ جھوٹی کہانی بھی اچھی

کہیں عشق میں بدگمانی بری ہے
کہیں عشق میں بدگمانی بھی اچھی

مئے ناب کی قدر ہم جانتے ہیں
نئی تو نئی ہے پرانی بھی اچھی

نہ ہو دل میں لیکن مرے دل کے حق میں
تمہاری محبت زبانی بھی اچھی

اگر نوح کی شعر گوئی ہے بہتر
تو ہے نوح کی شعر خوانی بھی اچھی

طبع زاد ۲۴ / اپریل سنہ ۱۹۲۵ء

ابھی کم سن ہیں معلومات کتنی
وہ کتنے اور اُن کی بات کتنی

یہ میرے واسطے ہے بات کتنی
وہ کہتے ہیں تری اوقات کتنی

سحر تک حال کیا ہوگا ہمارا
خدا جانے ابھی ہے رات کتنی

یہ سر ہے یہ کلیجا ہے یہ دل ہے
وہ لیں گے خیر سے سوغات کتنی

توجہ سے کبھی سن لو مری بات
جو تم چاہو تو یہ ہے بات کتنی

طبیعت کیوں نہ اپنی مضمحل ہو
رہی یہ موردِ آفات کتنی

گلستاں فصلِ گل میں لٹ رہا ہے
خفا آئی تمہارے ہات کتنی

ہمارے دل نہ دینے پر خفا ہو
لٹاتے ہو تمہیں خیرات کتنی

کرو شکرِ ستم اُن کے ستم پر
کہ اتنی بات بھی ہے بات کتنی

جفا و قہر سے واقف نہ تھا میں
بڑھی الفت میں معلومات کتنی

جفا والے حساب اِس کا لگا لیں
وفا کرتا ہوں میں دن رات کتنی

عبادت حضرتِ زاہد کروں میں
مگر اے قبلۂ حاجات کتنی

نہیں رکتے ہمارے اشک اے نوح
یہ طوفاں خیز ہے برسات کتنی

پھیر کیسی ہے بھوسا دل میں جوان و پیر کی

۴ ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اس طرح پر بھوسا دل میں مشاعرہ ہوا تفصیلی حالات خمسوں کے سلسلے میں درج ہیں۔

ج

پوچھتے ہو کیا حقیقت عاشقِ دلگیر کی
حیرت آئینے کی دیکھو خامشی تصویر کی

اُس نظر کے ملتے ہی کب آہ نے تاثیر کی
یہ سمجھ کر تیر ہی سے روک ہوگی تیر کی

اے مصور رنگت کے ساتھ اُن کا بیٹھنا
یہ ادائے خاص گویا جان ہے تصویر کی

جب یہ عالم ہے تو کیا چھوٹیں گے دیوانے ترے
فصلِ گل آئی مرمت ہوگئی زنجیر کی

مرنے والا مر گیا غم کو دعا دیتا ہوا
موت پھر وہ موت کس کی عاشقِ دلگیر کی

اے کمان کش اس ادا نے کھینچ لی رگ رگ سے سچ
تیر سے کچھ کم نہ تھی ہچکی بھی مجھ کو تیر کی

چاہئے کچھ تو مری میت کا تم کو احترام
کھینچ لو تصویر اس مٹتی ہوئی تصویر کی

آپ نے الزام تو چوری کا مجھ پر رکھ دیا
پھیر کر دل کیوں نہیں لیتے تلاشی تیر کی

اضطرابِ شوق میں نزدیک رستا ہی نہ تھا
کچھ خطا دامن کی ہے کچھ اُن کے دامن گیر کی

کیا کہوں پلٹی فغاں لب تک پہنچ کر کس طرح
دل سے پوچھو سرگذشت اس بازگشتی تیر کی

اور اتنی دور رکھ دینے سے کیا تھا مدعا
ہاتھ پھیلا کر بلائیں یوں تری تصویر کی

ہچکیاں لیں تو گلے سے طوقِ زنداں گر پڑا
ایڑیاں رگڑیں تو کڑیاں کھل گئیں زنجیر کی

سیکڑوں بت خانے ہیں اک اک سب ہیں چاہنے
اس سبب سے بڑھ گئی قیمت تری تصویر کی

لکھ گئے اچھے برے سب اگلے پچھلے واقعات
دیکھنے ہیں چند سطریں ہیں خطِ تقدیر کی

جس مرے دل کو کبھی آہ و بکا سے کام تھا
اب وہ اک تصویر ہے خاموشی تصویر کی

رفتہ رفتہ مرمٹا دل اُس نگاہِ شوخ پر
آتے جاتے چوٹ کھائی چلتے پھرتے تیر کی

پھر آرائش تو گھر میں سب جگہ دینے لگے
اور پھر اب کیا پرستش ہو تری تصویر کی

خوفِ رسوائی سے نالے اہلِ زنداں کیا کریں
قصد ہے اونچی نہ ہو جھنکار تک زنجیر کی

خاک اڑائی غم میں یا خاکہ اڑایا آپ نے
قبر تک باقی نہ رکھی عاشقِ دلگیر کی

اے جنابِ نوح اب طوفان سے باز آیئے
مانگئے خیر اپنے دل کی دیش کی جاگیر کی

ہوس ہمیں نہ رہی اُن سے دل لگانے کی

اسی طرح پر ایک بہت بڑا مشاعرہ مرزا عثمان غنی بیگ صاحب غنیؔ نے حسن منزل الہ آباد میں ۳۰ر جنوری ۱۹۳۲ء کو کیا تھا مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہو کر صبح چھ بجے ختم ہوا اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں مجمع قریب ہزار بارہ سو آدمیوں کے تھا مقامی شعرا کے علاوہ حضرات گوہرؔ امیرؔ ذرہؔ صاحب کالپوری احسنؔ صاحب چھپراوی توبہؔ صاحب سید سراوانی حافظ صاحب غازی پوری نانکؔ صاحب لکھنوی صوفیؔ صاحب میرٹھی افسرؔ صاحب میرٹھی وغیرہ شریک ہوئے قابلؔ صاحب باندوی بوجہ اپنی پیرانہ سالی و ناگہانی علالت کے نہ آ سکے

بڑی سند ہے یہی اشک غم بہانے کی
ہٹی مٹی سی عبارت مرے فسانے کی

انھیں تلاش ہے روز اک نئے فسانے کی
کوئی سنائے تو تاریخ دل لگانے کی

ہمیشہ رٹ رہی پینے کی یا پلانے کی
مری زبان تھی کنجی شراب خانے کی

ملی یہ داد ہمیں اپنے دل لگانے کی
ترے ستم سے ہے باتیں سنیں زمانے کی

وہ میرے دل میں بھری حسرتیں زمانے کی
کہ سانس کو نہ ملی راہ آنے جانے کی

نہیں رہوں گا نہ اب زحمتیں زمانے کی
مری قضا سے سفارش ترے ادانے کی

جو کچھ کہا وہ کہا خیر اب خموش رہو
دلاؤ یاد نہ گذرے ہوئے زمانے کی

خدائی ہم سے پھری آپ برخلاف ہوئے
یہ دو سزا ہیں ملیں ایک دل لگانے کی

جو تم سنو تو شکایت کسی سے ہم نہ کریں
زمیں کی چرخ کی تقدیر کی زمانے کی

غرض یہ ہے کہ شکایت ہو یا حکایت ہو
کہیں پتے کی سنیں بات ہم ٹھکانے کی

کوئی سنے تو یہ جانے کہ جانتے ہی نہیں
وہ پوچھتے ہیں بدی کیا ہے اور کیا نیکی

مکاں ہوں یہ مبارک مکان والوں کو
ہمیں ہے فکر کسی دل میں گھر بنانے کی

وہ دل جلوں سے یہ کہتے ہیں آہ آہ کرو
ابھی ہوا نہیں پہچانتے زمانے کی

ہمارے دل میں وہ ناوک نہیں چبھوتے ہیں
بنا رہے ہیں یہ راہ اپنے آنے جانے کی

علاوہ خانہ خرابی کے اور کچھ بھی نہ ہو
یہی شناخت ہے میرے غریب خانے کی

خدا کرے کہ اُدھڑ جائے بخیۂ داغیں
بہار دیکھ لوں کلیوں کے مسکرانے کی

یہ ہم کو سانس اکھڑنے سے ہو گیا معلوم
کہ اک طرح نہیں رہتی ہوا زمانے کی

دئے ہیں جس نے مجھے داغ عشق و زخم فراق
وہی کریں گے حفاظت بھی اس خزانے کی

کھلیں گے باغ میں غنچے تو گل کھلائیں گے
وہ دے گئے انھیں تعلیم مسکرانے کی

نگاہ لطف و عنایت کا اعتبار نہیں
مزاج یار میں تاثیر ہے زمانے کی

زمین سے وہ کریں مشورہ ہٹانے کا
فلک سے رائے بھی پوچھیں ستانے کی

اُٹھائیں ہم کوئی طوفان تو بیاں بھی کریں

وہ بات پوچھتے ہیں نوحؔ کے زمانے کی

طبع زاد ۱۸ اپریل ۱۹۳۷ء

کیوں کر ہو مجھ دل سے ملاقات آپ کی
مجھ پر نگاہِ لطف وہ دن رات آپ کی

اب جانے بھی راز تھا جو کچھ وہ کھل گیا
معلوم ہو گئی ہے مجھے اوقات آپ کی

سنتے ہیں کس مزے سے برائی بھی اپنی ہم
گویا نبات بن گئی ہر بات آپ کی

بلوا کر اپنے گھر جگر و دل تو دے دئے
ہم کیا کریں اب اور مدارات آپ کی

کچھ لاگ کچھ لگاؤ کچھ اغماض کچھ کرم
پہلے پہل وہ مجھ سے ملاقات آپ کی

اللہ رے اقتدارِ محبت کا معجزہ
میری زبان تو ہے مگر بات آپ کی

رندوں سے بحث حضرتِ ناصح فضول ہے
سننے کے وہ نہیں یہ خرافات آپ کی

اقرار کر کے پھر وہی انکار کر دیا
فرمائیے رہی کہ گئی بات آپ کی

دنیا میں اب ہمارے لئے کچھ نہ چاہئے
اللہ کا کرم ہے عنایات آپ کی

اچھی کہی کہ ہم سے اب اچھا کوئی نہیں
ہاں ایسے ہی تو آپ ہیں کیا بات آپ کی

سنتے ہیں اور لوگ مگر دیکھتا ہوں میں
روز اک نیا فریب نئی گھات آپ کی

ترکِ ستم نے اور زیادہ ستم کیا
اچھی رہی تلافیِ مافات آپ کی

اے نوحؔ اہلِ دیر و حرم یہ بتائیں کیا
مقبول ہے جن کہ مناجات آپ کی

طبع زاد ۲۳ جون ۱۹۳۷ء

ج

جو نہ کریں غم خواری میری
ان کو ہو بیماری میری

رکھی رہ گئی اُن کے آگے
کچھ نہ چلی ہشیاری میری

آپ عیادت کو آتے ہیں
اچھی ہے بیماری میری

دم نکلا اُن کی الفت میں
سہل ہوئی دشواری میری

قہر تھا فصلِ گل کا آنا
اور بڑھی ہے خواری میری

سب کی خبر سناتا ہوں میں
اِس سے اُس سے یاری میری

دیکھ رہا ہوں گود میں اُن کو
خواب ہے یا بیداری میری

جاتے جاتے شاید جائے
جی لے کر بیماری میری

اور مآلِ الفت کیا ہے
ذلت دل کی خواری میری

غم ہے اپنا اپنا سب کو
کون کرے غم خواری میری

نوحؔ زمانہ خوش ہوتا ہے
سن کر خوش گفتاری میری

بڑی بنیاد کعبے کی جہاں میں نے جبیں رکھ دی

۳۱ جولائی ۱۹۲۷ء

	ج	
تمنائے شہادت میں جو قدموں پر جبیں رکھ دی		جہاں سے تیغ اٹھائی پھر سے قاتل نے وہیں رکھ دی
شراب تلخ کے بدلے جواب تلخ پر کیسا		ہمارے سامنے ساقی نے لاکر انگبیں رکھ دی
وہ ہم سے پوچھتے ہیں کیوں پتہ کھوئے ہوئے دل کا		ہماری چیز تھی ہم نے کہاں رکھ دی کہیں رکھ دی
جتایا اس طرح قاتل نے راز اپنی کدورت کا		زمیں کو کھود کر میت مری زیر زمیں رکھ دی
اگر ڈھونڈوں تو نہیں ڈھونڈوں گا پھر دل کو کوئی ڈھونڈے		پرائی چیز تھی لے کر جہاں رکھ دی وہیں رکھ دی
بہار کوچۂ جاناں کو ہم نے جب سے دیکھا ہے		جہنم میں اٹھا کر خواہش خلد بریں رکھ دی
خدا نے سر کو سودا دل کو غم بخشا محبت کا		جہاں جو چیز رکھ دینے کے قابل تھی وہیں رکھ دی
بہار آئے گی تو دست جنوں کیا قہر ڈھائے گا		ابھی سے ٹکڑے کر کے میری آستیں رکھ دی
محبت میں اڑائی خاک یوں اہل محبت نے		اٹھا کر آسماں پر کوئے جاناں کی زمیں رکھ دی
زمانے میں بھرم ہو کیوں نہ میرے خانۂ دل کا		متاع درد الفت رکھنے والے نے یہیں رکھ دی
بہر صورت غرض تھی ہم کو بت خانے کی عظمت سے		جبیں پر رکھ لیا پتھر کہ پتھر پر جبیں رکھ دی
ابھی دل سے نہ آیا تھا زباں تک مدعا میرا		بگڑ کر اس ستم گر نے گلے پر تیغ کہیں رکھ دی
تجھے دل نذر دے کر دل کا بدلہ تجھ سے کیا لیتے		یونہیں سی چیز تھی ہم نے ترے آگے یونہیں رکھ دی
سزا کچھ بھی ملے ارماں تو پورا ہو گیا دل کا		زبردستی کسی کے پاؤں پر ہم نے جبیں رکھ دی
یہ مطلب تھا کہ اشک سرخ سے بن جائیں گل بوٹے		مری خوں بار آنکھوں پر جو اس نے آستیں رکھ دی
مرے دل کی امانت کھو کر اب دل میں وہ نادم ہیں		جو رکھنی تھی تو اپنے پاس رکھتے کیوں کہیں رکھ دی

جناب نوحؔ اب طوفان حسرت مٹ نہیں سکتا
ہماری چشم تر پر اس نے اپنی آستیں رکھ دی

نوید یاس دیتی ہے مجھے ہر آرزو میری

ودیا مندر ہائی اسکول میں ۱۰ دسمبر ۱۹۲۷ء کو جناب حکیم عبد العزیز صاحب عرف حاجی جان صاحب و مسٹر کال صاحب کے اہتمام سے اس طرح پر ایک اچھا مشاعرہ ہوا علاوہ بسمل صاحب کے اور مقامی شعرا قریب قریب سب ہی جمع تھے اچھی اچھی غزلیں سننے میں آئیں

	ج	
رلا دی اے تمنا خاک میں سب آبرو میری		نکل جا اب مرے دل سے نہیں تیرا نہ تو میری
بنی تھی بات ضبط درد و غم سے چارسو میری		مگر اشکوں نے بہہ بہہ کر ڈبو دی آبرو میری

وہ کیوں پوچھیں کہ کیوں سوچیں وہ کیا جانیں کہ کیا سمجھیں
مبارک ہو مجھی کو عشق میرا آرزو میری

گراں ہوتی ہی صورت گشت کیا بازارِ عالم کا
سمجھتا ہوں کہ ہے میری گرہ میں آبرو میری

ہمیشہ اشکِ غم نکلیں سجودِ شوق سے پہلے
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے اکثر بے وضو میری

جھجھیں انکار ہے جو ملنے سے آنے سے بلانے سے
نکالیں گے وہی گن گن کر اک اک آرزو میری

اگر کوئی راستے سمجھے گا تو شاید وہ سمجھیں گے
بٹھا کر حضرتِ موسیٰ کو سنئے گفتگو میری

یہ مطلب ہے کہ اپنے ہی سے تم اپنا کرو شکوہ
وہ اک تصویر رکھ دیتے ہیں میرے روبرو میری

وہ کہتے ہیں بتا دے سوچ رکھیوں میں جواب اس کا
شکایت کیا کرے گا داورِ محشر سے تو میری

ہزار افسوس اس بے قدریٔ بازارِ الفت پر
بکی ہے کوڑیوں کے مول انمول آرزو میری

جو ٹھہرا ہیں ہی سب سمجھو تو کسی پہ کیوں نظر ڈالوں
کہ ہر صورت سے صورت ہو گئی میرے روبرو میری

ابھی میں آرزو کو دیکھ کر آنسو بہاتا ہوں
کبھی میری طرح روئے گی مجھ کو آرزو میری

بڑھاپا مرتبہ دل نے وفا نے عشق نے غم نے
انہیں بیماروں سے شہرت ہے جہاں میں چار سو میری

جدا ہے ایک سے جب ایک تو اک ساتھ کیا نکلے
تمنا اور کی حسرت تمہاری آرزو میری

وہ کہتے ہیں زمانہ مان لے ہیں تو نہ مانوں گا
یہ کیسی بات دل تیرا ہوا اس میں آرزو میری

ادھر یہ شوق ہے مجھ کو ملا دوں ان سے ہاتھ اپنا
ادھر یہ ظلم ہے کم بخت انگلی بھی نہ چھو میری

کہیں غنچے کہیں گل کیف ہیں پر کیفِ عالم ہیں
بٹی ہے چلو چلو کیا شرابِ رنگ و بو میری

حرم میں کچھ نہ ہو عزت نہ ہو واسے نوح کیا پروا
بلا سے بت کدے میں تو بہت ہے آبرو میری

طبع زاد ۹ ستمبر ۱۹۲۶ء

ج

ناز و انداز سے پھر بھی نگۂ یار اچھی
ہے یہ چلتی ہوئی پھرتی ہوئی تلوار اچھی

ہم سے تم یہ نہ کہو ظلم کی بھرمار اچھی
کہ بری بات بری اچھی ہے سرکار اچھی

نعمتِ ہر دو جہاں کی ہے تمنا کس کو
اہلِ الفت کے لئے دولتِ دیدار اچھی

عشق کا بار اٹھانا کوئی آسان نہیں
دل تو کہتا ہے کہ بیٹھے سے ہے بیگار اچھی

دیکھنا ہو تو مجھے شوخ نظر سے دیکھو
جو کلیجے میں اتر جائے وہ تلوار اچھی

ہم جسے دیکھتے ہیں وہ ہے تمہارا گاہک
اس قدر بھی نہیں اب گرمیٔ بازار اچھی

حسن کا رعب نظر کو نہیں جمنے دیتا
تم نے آنکھوں پہ اٹھائی ہے یہ دیوار اچھی

چین لیتا نہیں میرا دلِ آزار طلب
اس ترحم سے ترے ظلم کی بھرمار اچھی

اپنی آنکھوں سے چمن میں وہ اشارے جو کریں
دیکھتے دیکھتے ہو نرگسِ بیمار اچھی

تم تو سو بار ملو دل سے ملو جی سے ملو
میری قسمت ہی نہیں اسے مرے سرکار اچھی

داغِ فرقت کی ضیا چرخ نے دیکھی ہی نہیں
اُس کے تاروں سے مری شمعِ شبِ تار اچھی

کام کیوں کر نگہ شوخ سے وہ شوخ نہ لے
اچھے قاتل کے لیے چاہیئے تلوار اچھی

اب ہے کیوں میری طبیعت کا سنبھلنا مشکل
ہو چکی یہ ترے درماں سے کئی بار اچھی

آپ کیا پوچھتے ہیں آپ کے قدموں کی قسم
شوخیِ برق سے بھی شوخیِ رفتار اچھی

سامنے ہو اگر اکسیر بھی تو رُخ نہ کریں
خاک ساروں کے لیے خاکِ درِ یار اچھی

اُن کا مطلب تھا کہ تقریر کا مطلب نہ کھلے
چار باتیں جو بُری کہہ گئے تو چار اچھی

حضرتِ نوحؔ کے ارشاد میں کس کو ہے کلام
موجِ طوفانِ سخن بارشِ اشعار اچھی

طبع زاد ۱۰ ؍ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

ج

تری تند خوئی تری کینہ جوئی تری کج ادائی تری بے وفائی
بلا ہے ستم ہے غضب ہے قیامت دہائی دہائی دہائی دہائی

حقیقت نے چکمہ میں ڈالا تھا ہم کو طریقت بڑے وقت پر کام آئی
ہمہ اوست کا مسئلہ جب ہے آگے تو کیسی دوئی اور کیسی جدائی

اُدھر پاس چلمن کے موجود تھے وہ اِدھر تھے پریشان اُن کے فدائی
رہا شرم و شوخی کا دلکش تماشا نہ جلوہ دکھایا نہ صورت چھپائی

مدد کر ذرا اور اے جوشِ الفت کہ ارمان دل کا نکل جائے دل سے
کبھی جلوہ گہ تک گذر ہو ہمارا ابھی رہ گذر تک ہوئی ہے رسائی

بھرم کُھل گیا اس سے عیاریوں کا کُھلا راز بھی اِس سے مکاریوں کا
چُرایا تھا تم نے اگر دل ہمارا تو دل کو چُرا کر نظر کیوں چُرائی

اِدھر سب سے پردہ اُدھر سب میں جلوہ یہاں اور عالم وہاں اور منظر
کہیں وہ عیاں ہے کہیں وہ نہاں ہے کبھی حسن پوشی کبھی خود نمائی

جہاں میں بشر ان سے ہوئے تعلق کوئی مان لے ہم نہ مانیں گے اس کو
کہ چاروں طرف ہیں یہی چار چیزیں محبت عداوت بھلائی بُرائی

برابر ہیں دیر و حرم کے مراتب مساوی ہیں دونوں گھروں کی حقیقت
نہیں فرق کچھ بھی ہماری نظر میں وہی بت پرستی وہی جبہ سائی

جنھیں عیش و راحت کا ارماں ہوگا انھیں عیش و راحت کا ارماں ہوگا
تمھاری محبت میں ہم نے بلا سے وہ پایا نہ پایا یہ پائی نہ پائی
یہ برتاؤ کیا ہیں یہ اطوار کیا ہیں ذرا آپ سوچیں ذرا آپ سمجھیں
ہمیں پر یہ کسی روز چشم عنایت ہمیں سے کسی وقت بے اعتنائی
بہار آئے مژدہ مسرت کا لے کر دھواں دھار اُٹھیں فلک پر گھٹائیں
اِدھر جام چھلکے اُدھر توبہ ٹوٹے بہم زہد و رندی میں ہو ہاتھا پائی
اگر ہو کوئی روشناسی کا طالب تو پہلے مقلد بنے آئینے کا
کدورت سے اللہ محفوظ رکھے بڑی شے ہے دنیا میں دل کی صفائی
یہ توقیر و تحقیر میں بحث کیسی کہ ہیں دونوں باتیں خدا کی طرف سے
وہ رائی کو چاہے تو پربت بنائے وہ پربت کو چاہے تو بن جائے رائی
کسی کو رُلاؤ کسی کو جلاؤ کسی کو ستاؤ کسی کو مٹاؤ
خدائی کا غم کیا زمانے کا ڈر کیا تمھارا زمانہ تمھاری خدائی
ہزاروں بکھیڑے ہزاروں جھمیلے ہزاروں تو ہاتم ہزاروں تردد
مگر آپ آئیں تو مہمان رکھ لوں مرے دل میں اب بھی ہے اتنی سمائی
جو بندے خدا کے خدا پر نہ رکھیں تو رکھیں بھروسہ خدائی میں کس پر
بنایا انھیں اہل حاجت اُسی نے کرے گا وہی اِن کی حاجت روائی

یہ اندھیر کھاتا یہ کفرانِ نعمت زمانے کو اے نوح کیا ہو گیا ہے
خدا کے کرم سے تو بیڑا نہ ڈوبے مگر پائے شہرت تری نا خدائی

قابلِ دید ہے شہرت ترے دیوانوں کی

۹ مارچ ۱۹۳۰ء کو اس طرح پر لکھنؤ میں انجمن معراج الادب کا سالانہ مشاعرہ بہار صاحب نے کیا

کیا اُنھیں قدر چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
خاک اُڑاتے پھریں کس واسطے ویرانوں کی
اِس لئے مجھ کو تمنا نہیں پیمانوں کی
موسمِ گل میں سنبھالے گا کوئی کیا اُن کو
جوشِ وحشت میں کسی سمت نکل جاؤں گا
ہے انھیں رشک و حسد سے جو بجھانا منظور
ایک کعبے کو نہ دیکھا تو نہ دیکھ لیکن
فصلِ گل کیا گئی وہ ذوق گیا شوق گیا

ج

بھیک بھی جن کو میسر نہیں مے خانوں کی
آپ کے گھر میں ہو بھیڑ آپ کے دیوانوں کی
تیری آنکھوں میں ہے مستی کئی مے خانوں کی
پیش تر ہی سے ہو بندش ترے دیوانوں کی
ایک فہرست مرے پاس ہے ویرانوں کی
شمع پر ڈالتے ہیں خاک وہ پروانوں کی
خاک میں چھان چکا سیکڑوں بت خانوں کی
شکل بھی اب نہیں ہم دیکھتے پیمانوں کی

آتشِ عشق سے مجھ کو نہ ہو کیوں خاص لگاؤ
خاک بھی میرے عناصر میں ہے پروانوں کی

ہم نے اُجڑا ہوا گھر اپنا سجانے کے لئے
مول لیں چند تصاویر صنم خانوں کی

کہہ گئے حضرتِ زاہد مجھے لاکھوں باتیں
ورنہ تسبیح میں بھی قید ہے سو دانوں کی

مژدۂ عیش و مسرت کا اب احساس نہیں
غم نے دنیا ہی بدل دی ترے دیوانوں کی

ساقیِ بزم مجھے دیکھ کر آنکھیں نہ چُرا
آنکھیں پیمانوں سے ڈرے ڈرے انھیں پیمانوں کی

حسن کا ذکر جب آ جائے تو فریاد کریں
خاص پہچان ہے یہ عشق کے دیوانوں کی

حسبِ خواہش مجھے مے خوار پلا دیتے ہیں
کوئی تعداد مقرر نہیں پیمانوں کی

عشق کے دم سے ہوا حسن کو عالم میں فروغ
نام ہے شمع کا محفل تو ہے پروانوں کی

نوحؔ حسن پرستی کے فسانے سنئے
یہ تواریخ مکمل ہے صنم خانوں کی

کشتیاں ڈوب رہی ہیں مرے ارمانوں کی

پہلے اس طرح پر درگاہ حضرت شاہ ارزاں صاحب رح باکی پور پٹنہ میں جناب شاہ حامد حسین صاحب حامدؔ سجادہ نشین نے پھر ۴ ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو ودیا مندر ہائی اسکول الہ آباد میں جناب حکیم حاجی جان صاحب نے مشاعرہ کیا میں دونوں مشاعروں میں شریک ہوا اور دونوں مشاعرے خوب رہے

ج

خیر ایسے میں ہو کیا سوختہ سامانوں کی
شعلہ ہے شمع کا آغوش ہے پروانوں کی

ہر طرف بھیڑ نہ ہو کس لئے دیوانوں کی
دشتِ وحشت میں نمائش ہے گریبانوں کی

مے کدے میں کبھی توبہ کو جو آتے دیکھا
ایک دیوار کھڑی ہو گئی پیمانوں کی

ناز و انداز نے اُس دل کو بھی برباد کیا
جس میں آباد تھی دنیا ترے ارمانوں کی

کوندنا ابر میں بجلی کا یہ بے کار نہیں
آج تقدیر چمک جائے گی مے خانوں کی

ہم نے دیکھا نہ سلامت کبھی اِن کا دامن
گل بھی تقلید کیا کرتے ہیں دیوانوں کی

سیکڑوں رنج ہزاروں مجھے آزار دئے
کوئی گنتی نہ رہی آپ کے احسانوں کی

حشر میں اور بھی یہ حشر بپا کر دیتے
ہے الگ اس لئے ٹولی ترے دیوانوں کی

آدمیت سے ذرا بھی نہیں حوروں کو لگاؤ
موت ہے گلشنِ فردوس میں انسانوں کی

صبح کو محفلِ شب کا یہ نتیجہ دیکھا
شمعِ کشتہ کے قریں خاک تھی پروانوں کی

بڑھ گئے اہلِ جنوں خاک اُڑا کر آگے
دھجیاں رہ گئیں صحرا میں گریبانوں کی

دیکھ اے ساقیِ محفل وہ گھٹائیں اُٹھیں
رکھ سبیل آج چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

ہم کو جلنے کے لئے ہم کو پگھلنے کے لئے
دل ملا شمع کا قسمت ملی پروانوں کی

گیسوئے حسن میں پیچ اور پڑے جاتے ہیں
عید کا چاند فلک پر نظر آیا بھی نہیں

آج ہے سال گرہ عشق کے دیوانوں کی
کھڑکیاں کھل گئیں پہلے ہی سے مے خانوں کی

نوح طوفانِ ترقی کا تماشا دیکھو
آج اسکول میں محفل ہے سخن والوں کی

رہیں سرسبز یارب پتیاں نخلِ محبت کی

۱۱ر جولائی ۱۹۳۱ء کو ریلوے الہ آباد میں اس طرح پر ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں مقامی شعرا کے علاوہ ساکر صاحب بریلوی انجم صاحب اکبرآبادی عزیز صاحب سلونی رباض صاحب بجے پوری ہادی صاحب مچھلی شہری کیفی صاحب چریاکوٹی اصغر صاحب گونڈوی شفق صاحب عماد پوری توبہ جناب سید سرانوانی وغیرہ مرزا احمد جان صاحب کی کوشش سے شریک تھے یہ مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہو کر نہایت لطف و خوبی کے ساتھ ۵ بجے صبح کو ختم ہوا

ج

یہ قبل از مرگ واویلا یہ بے باکی طبیعت کی
ابھی زندہ ہوں میں لیکن انھیں ہے فکر تربت کی

محبت میں رہی تاکید یہ پاسِ محبت کی
ستم بھی وہ اگر ڈھائیں تو میں سمجھوں عنایت کی

نہ کھٹکا اس کو دوزخ سے نہ خواہش اس کو جنت کی
خدا رکھے الگ دنیا سے ہے دنیا محبت کی

تمھاری خوش خرامی سیکڑوں فتنے اٹھاتی ہے
قیامت کہہ دیا اس کو تو میں نے کیا قیامت کی

شبِ غم آہ کرتا فرطِ غم سے میں تو کیا کرتا
یہ میری رائے میں توہین تھی ضبطِ محبت کی

وجودِ اہلِ عالم جلوۂ خلاقِ عالم ہے
صفت کوئی کرے صانع کی یا تعریف صنعت کی

سجودِ شوق سے میرا سر تسلیم کیا اٹھے
تمھارا سنگِ در بھی اک کسوٹی ہے محبت کی

بگولے کس طرح اٹھتے ہیں اٹھ کر پھیل جاتے ہیں
یہ کہہ کہہ کر اڑائی خاک اس نے میری تربت کی

ہوائے شوق نے دل کو جلا کر خاک کر ڈالا
مبدل ہو گئی شعلے سے چنگاری محبت کی

ابھی سے عذر و انکارِ جفا و جور کیا کہنا
قیامت پر اٹھا رکھو یہ باتیں تم قیامت کی

جسے دیکھو اسی کا حال غم دیکھا نہیں جاتا
پڑی کس وقت بد میں ہو دنیائے محبت کی

خدائی اور بھی کیا کیا ستم ڈھاتی خدا جانے
اگر ہوتیں نہ اتنی بندشیں قانونِ قدرت کی

کہیں رستے ہی میں قاصد پڑھ نہ لے خط کھول کر میرا
لفافے پر لگا دوں مہر میں داغِ محبت کی

علاوہ دردِ دل کے اور بھی کچھ دل کو لینا تھا
حریصِ لذتِ غم نے اسی پر کیوں قناعت کی

زمانے میں ہزاروں نام کس کو یاد رہتے ہیں
بنا لیں آپ اک فہرست اربابِ محبت کی

وہ رنگِ حسن کیا ہے اک پرتو نوجوانی کا
یہ جوشِ عشق کیا ہے صرف جولانی طبیعت کی

کبھی وہ اس طرف آئے کبھی ہم اس طرف کھینچے
بڑھیں وقتاً فوقتاً بے طرح پینگیں محبت کی

اس غزل کے علاوہ ۱۵ ایک اور غزل اسی طرح پر صفحہ [illegible] میں درج ہے

جلالی تم نے یا جلوائی حاصل ایک دونوں کا
کتابت میں ملا کر لوگ اِن حرفوں کو لکھتے ہیں
اُٹھا کر غم مجھے احساسِ غم مطلق نہیں ہوتا

مری تربت میں پہنچی روشنی کب شمعِ تربت کی
حقیقت کھل گئی لفظِ محبت سے محبت کی
یہ ہے اعجازِ دل کا یہ کرامت ہے طبیعت کی

خدا جانے بچے یا غرق ہو بیڑا امیدوں کا
ملی ہے ناخدائی نوح کو بحرِ محبت کی

آج ہے اپنی خطاؤں سے پشیماں کوئی

اس طرح پر ۲۶ر نومبر ۱۹۳۱ء کو نانکشس بہرائچ میں مشاعرہ ہوا میں نے وہیں کے لئے یہ غزل کہی تھی لیکن روانگی کے دن مجھے بخار آگیا اور میں شرکت نہ کر سکا

ج

دیکھ کر دل کو مرے بے سر و ساماں کوئی — رکھ گیا ناوکِ غم بہرِ رگِ جاں کوئی
جب یہ ارماں ہے تو پورا کرے ارماں کوئی — قبلِ احسان کے کیوں مان لے احساں کوئی
پھول رکھنا بھی اہم شمع جلانی بھی محال — فاتحہ پڑھ دے سرِ گورِ غریباں کوئی
اے فغاں دل سے نکل اور دکھا دے تاثیر — مگر اِتنی کہ نہ ہو جائے پریشاں کوئی
یہ شرف صرف مجھے جامہ دری نے بخشا — ورنہ رکھتا نہیں دامن میں گریباں کوئی
ہر جگہ دیکھ لیا ڈھونڈھ لیا جانچ لیا — اپنے ڈھب کا نہیں ملتا ہمیں انساں کوئی
ہائے انداز پھر اُس دشمنِ دیں کا انداز — چاہتا ہے کہ نہ رہ جائے مسلماں کوئی
دل دیا میں نے اگر اُن کو تو خاموش رہوں — کر کے احسان جتاتا نہیں احساں کوئی
شکوۂ ظلم کی پھر تجھ کو ضرورت نہ رہے — آپ ہی آپ جو ہو جائے پشیماں کوئی
اے جنوں تجھ کو مرے عالمِ وحشت کی قسم — خاک اُڑانے سے نہ رہ جائے بیاباں کوئی
میں سمجھتا ہوں رہا کرنے کو خود آئی بہار — کھول دیتا ہے جو قفلِ درِ زنداں کوئی
وقت پر آئی ہے اور ایک ہی بار آئی ہے — عمر بھر کیوں نہ کرے موت کا ارماں کوئی
[illegible] فرشتوں کو مبارک وہ بہشتی حوریں — ہم ہیں انساں ہمیں چاہئے انساں کوئی
تو بھی کافر ترے سب محو ادا بھی کافر — کیا مسلماں کہے اپنے کو مسلماں کوئی
ہو گیا پھر مرا خوگر غم ہو جانا تو — میں پریشاں نہیں اِس سے ہے پریشاں کوئی
شکوۂ ظلم و ستم اے دلِ ناشاد نہ کر — خود ضرورت سے زیادہ ہے پشیماں کوئی
زندگی باعثِ زحمت ہے یہ مانا ہم نے — لیکن اِس پر بھی نہیں موت کا خواہاں کوئی
چادرِ گل کے چڑھانے میں کہاں تھا یہ وقار — پھینک گیا خود ہی سرِ گورِ غریباں کوئی
کل تو سب کچھ تھا مگر کل کے لئے کیا ہوگا — کر گیا آج مجھے بے سر و ساماں کوئی

جاؤں گا مثلِ نظر آؤں گا مانندِ خیال | ج | غیر ممکن ہے کہ روکے مجھے درباں کوئی

نوح سے لوگ نمائش میں خبردار رہیں
بیٹھے بیٹھے بھی اٹھا دیں نہ یہ طوفاں کوئی

طبع زاد ۱۳ مارچ ۱۹۳۲ء

تیرے گھر سے مرے ٹل جانے کی بھی خوب رہی
یہ نکلوانے نکل جانے کی بھی خوب رہی

کر کے اقرار بدل جانے کی بھی خوب رہی
یاس و امید میں چل جانے کی بھی خوب رہی

کیا عجب اور سوا مجھ کو پریشانی ہو
خوب رویوں میں بہل جانے کی بھی خوب رہی

دیکھ کر جلوہ ترا حسن ترا ناز ترا
میں سنبھل جاؤں سنبھل جانے کی بھی خوب رہی

خارِ حسرت تو مرے دل سے الگ ہو نہ سکا
ناوکِ ناز نکل جانے کی بھی خوب رہی

آتشِ غم سے عجب حال ہوا دونوں کا
شمع و پروانہ کے جل جانے کی بھی خوب رہی

ہجرِ ساقی میں پئیں گے نہ کبھی رند شراب
زہر کے گھونٹ نگل جانے کی بھی خوب رہی

محفلِ یار کا رتبہ کوئی ہم سے پوچھے
چھوڑ کر اس کو نکل جانے کی بھی خوب رہی

ہم نے بیمار کو ان کے نہ سنبھلتے دیکھا
موت آئی ہوئی ٹل جانے کی بھی خوب رہی

چاہیے کچھ نہ کچھ آزارِ محبت کا علاج
خود بخود میرے سنبھل جانے کی بھی خوب رہی

بادۂ تند میں کیا تھا اثرِ جوشِ بہار
ساغر و خم سے ابل جانے کی بھی خوب رہی

ان کی آنکھیں مری آنکھوں سے لڑی تھیں لیکن
بیچ میں دل کے مچل جانے کی بھی خوب رہی

دیکھ کر آپ کو پھر آپ میں ہم آ نہ سکے
صورتِ حال بدل جانے کی بھی خوب رہی

بزمِ محبوب کہاں گلشنِ فردوس کہاں
اہلِ الفت کے بہل جانے کی بھی خوب رہی

ہو گیا خلق میں طوفان کا قصہ مشہور
نوح کے نام نکل جانے کی بھی خوب رہی

شمع بھی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی

۱۷ جولائی ۱۹۳۲ء کو دوسرا مشاعرہ اسی جگہ اسی اہتمام سے پھر زیرِ صدارت جناب ایبٹ صاحب کمشنر گورکھپور اس طرح پر ہوا قریب قریب وہی شعرا اس میں بھی تھے جو ۱۶ جولائی ۱۹۳۲ء کو "بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے" اس طرح پر غزلیں پڑھ چکے تھے شعرا کے ٹھہرنے کا کئی جگہ انتظام تھا میں اور سائل صاحب دہلوی اور احباب الہ آباد جناب میاں صاحب یعنی سید جواد علی شاہ صاحب رئیسِ اعظم امام باڑہ اسٹیٹ کی عالی شان کوٹھی میں ٹھہرے تھے میاں صاحب اور ان کے بھتیجے فاروق صاحب کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے ہر وقت سب کے آرام و راحت و تفریح کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کئی موٹریں ہر وقت حاضر رہتی کھانے پینے میں تکلف تھا لوگ وہاں اس آرام سے رہے جیسا اپنے گھر میں

رہتے ہیں جناب عمر ماجد ہنر اثر فدا نظر قتیل فہیم صاحبان ہر وقت موجود رہے اور قریب قریب ہر وقت شعر خوانی ہوتی رہی ان حضرات نے بھی مدارات کی انتہا کر دی ایک وقت موجودہ شعرا کی دعوت جناب سید زاہد حسین صاحب (خان بہادر) و سید شاہد حسین صاحب سبز پوش اور دوسرے وقت مولوی سبحان اللہ صاحب نے نہایت تکلف سے کی بعد ختم مشاعرہ میں ایک دن اور اپنے عزیز خاص منشی اصغر علی صاحب ناروی کے ہاں ٹھہرا وہاں بھی اُس دن مقامی شعرا موجود رہے اور ریلوے اسٹیشن تک رخصت کرنے کو آئے اور میں بڑی دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا

اِس غزل کے علاوہ میری اور ایک غزل دیوان اوّل میں بھی ہے

ج

تم تو کہتے ہو نہیں رُکتی ہنسی آئی ہوئی
اُس کے دل سے کوئی پوچھے جس کی رسوائی ہوئی

یوں تو عالم شیفتۂ دنیا تمنائی ہوئی
اُن کے سر پر سے تصدق اُن کی انگڑائی ہوئی

پھر گئی اُن کی طبیعت راہ پہ آئی ہوئی
ہر تمنا میری اب ماضی تمنائی ہوئی

کیا ہمارے دل میں آئی عیش و راحت کی بہار
یہ کلی کھلی روز اوّل ہی سے مُرجھائی ہوئی

کس قدر بے لطف تھا انجام ہستی کا خیال
رُک گئی فوراً ہی ہونٹوں تک ہنسی آئی ہوئی

کیوں نہ ٹکڑے دامنِ گل کے اُڑائے فصلِ گل
دیکھ کر سودائیوں کو یہ بھی سودائی ہوئی

اللہ اللہ مے کدے والوں کا یہ حسنِ طلب
موج دل میں جب اٹھی تو اٹھ کر انگڑائی ہوئی

باغِ الفت میں مجھے بوئے وفا ملتی نہیں
یہ بھی گویا دیدۂ نرگس کی بینائی ہوئی

اے جفائے حسن اِس جدت پسندی کے نثار
میں کمر پا نہیں سکتا سزا پائی ہوئی

ناز و انداز و ادا نے گھیر رکھا ہے تمھیں
یہ خود آرائی ہوئی یا بزم آرائی ہوئی

چارہ گر اس کا یقیں مجھ کو دمِ آخر بھی ہے
وہ جو آجائیں تو پھر جائے اجل آئی ہوئی

عمر بھر مجھ کو مری قسمت نے رکھا بے قرار
کیا ہوئی مر کر اگر حاصل شکیبائی ہوئی

ہر ادائے دل شکن نے روپ بدلے سیکڑوں
جو زیادہ بڑھ گئی حد سے وہ انگڑائی ہوئی

کیا خبر مجھ کو دکھائے کیا یہ میرا دیکھنا
خوب رویوں پر نظر پڑتی ہے للچائی ہوئی

وقتِ آرائش حنا کو ڈھونڈتے پھرتے تھے آپ
اب نہ ہاتھوں سے یہ جانے پائے ہاتھ آئی ہوئی

خیر سے اُن کو بھی شکووں نے کیا بدنامِ خلق
میں سمجھتا تھا فقط میری ہی رسوائی ہوئی

کیا عجب کوئی نیا طوفان دنیا میں اٹھے
پھر طبیعت نوح کی ہے جوش پر آئی ہوئی

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی

۲۶ر فروری سنہ ۱۹۲۳ء کو اس طرح پر ڈی۔ اے۔ وی اسکول الٰہ آباد میں مشاعرہ ہوا مقامی شعرا کے علاوہ مشفق صاحب عماد پوری باغ صاحب سنبھلی کیفی صاحب چریاکوٹی بھی موجود تھے

ج

نہ رنگِ شش جہت باقی نہ حسنِ چار سو باقی
غرض سارا جہاں فانی بحمد اللہ تو باقی

ہمارے داغ ہائے عشق کو رہنے دے تو باقی
انھیں پھولوں کے دم سے ہے بہارِ آرزو باقی

کہاں پہنچا بیانِ شوق اپنا عرضِ مطلب تک
ہوئی کچھ گفتگو اُن سے رہی کچھ گفتگو باقی

دلِ ناشاد اب تازہ اُمنگیں کر چکا پیدا
جو گل مرجھا گیا اُس میں کہاں جوشِ نمو باقی

انھیں تم یادگارِ عشق سمجھو اے چمن والو
مرے دل کا ہے اب تک لالہ و گل میں لہو باقی

یہ کیا سے زخمِ دل میں پھانس بن بن کر کھٹکتی ہے
رفو گر رہ گیا شاید کوئی تارِ رفو باقی

مٹا یا اِک طرف سے سب کو اِک تیرے تغافل نے
نہیں باقی نہ دل باقی نہ دل کی آرزو باقی

نمازِ میتِ بلبل ابھی پڑھ لے کوئی کیوں کر
گلوں کو گریۂ شبنم سے کرنا ہے وضو باقی

وفورِ شوق کا مطلب سمجھ میں کچھ نہیں آتا
کہ مل کر بھی رہی ملنے کی اُن سے آرزو باقی

وداعِ صبر و عقل و ہوش پر اے آرزو خوش ہو
ہمارے خانۂ دل میں رہی اب تو ہی تو باقی

نمائش میں دیا انعام انھیں پر بادہ خواروں نے
گذشتہ دور کے جتنے بھی تھے جام و سبو باقی

مرقع مٹ گیا نقش و نگارِ عیش و عشرت کا
فقط لے دے کر اب دل میں ہے داغِ آرزو باقی

مرے دل سے نکل کر آہ نے پھونکا زمانے کو
نہیں معلوم کیوں کر رہ گیا اے چرخ تو باقی

جنابِ نوح کے اشکوں سے اٹھا نوح کا طوفاں
مگر ہے کچھ نہ کچھ اِس پر بھی جوشِ آرزو باقی

طبع زاد ۲۶ مئی ۱۹۴۳ء

ج

ڈال کر پردہ چھری قاتل نے مجھ پر تیز کی
کھل گئی سازش نگاہِ لطف قہر آمیز کی

اب مدد حاصل کروں میں آہِ درد آمیز کی
پھیر کر اُس نے نظر تلوار مجھ پر تیز کی

فطرتِ پر جوش ہر تحریک سے ہے بے نیاز
ابلقِ ایام کو حاجت نہیں مہمیز کی

گھر سے ہم نکلے جنوں میں اور داخل ہو گئے
یوں طنابیں کھنچ گئیں صحرائے وحشت خیز کی

اِس طرح تو نے بہایا بے گناہوں کا لہو
پھر وہ خونی داستاں یاد آ گئی چنگیز کی

اب مریضِ عشق سے رد پوش بھی ہونے لگے
یہ نئی صورت نکالی آپ نے پرہیز کی

اُن کے دیوانے پلٹ کر آ گئے پھر اُن کے گھر
کیا بھیانک تھی اُداسی دشت و حشت خیز کی

کون اُس کو جانتا دنیا میں شیریں کے سوا
تیشۂ فرہاد سے شہرت ہوئی پرویز کی

سخت جانی سے بھی قاتل کو ملی طرفہ مدد
تیغ رکھ کر مری گردن پر اُس نے تیز کی

حسبِ خواہش خاک اڑاؤں بھی تو یہ دشوار ہے
وسعتیں محدود ہیں صحرائے وحشت خیز کی

ہاتھ رکھ میرے دل پر چٹکیاں لینے لگے
خوب یہ سوجھی تمھیں دردِ سکوں آمیز کی

کیا خبر کیا گل کھلائے فصلِ گل میں حسنِ گل
قہر ہے اُٹھتی جوانی سبزۂ نو خیز کی

دیکھ اے ساقی پھر اٹھا ابر آ پہنچی بہار
اب لگا دے میز پر وہ چیز لاکر میز کی

دیکھیے اب کیا دکھائے جوشِ بحرِ ذوق و شوق
نوح کو خدمت ملی امواجِ طوفاں خیز کی

طبع زاد ۱۰؍جولائی ۱۹۳۳ء

کیا برقِ حسن ٹھیک سے بے ٹھیک ہوگئی
دنیا نگاہِ عشق میں تاریک ہوگئی

اب منزلِ مراد سے نزدیک ہوگئی
کوئے وفا میں ہستیِ دل ٹھیک ہوگئی

گل ہائے داغِ دل کو ہمارے نہ سونگھیے
بوئے وفا سے آپ کو تحریک ہوگئی

لازم تھا ضبطِ عشق دلِ بے قرار کو
آنکھوں سے اشک گر پڑے تضحیک ہوگئی

کیا اعتبار اپنی طبیعت کا ہم کریں
یہ ٹھیک ہوگئی کبھی بے ٹھیک ہوگئی

روشن تھی داغِ دل سے مری کائناتِ دل
محفل چراغ بجھتے ہی تاریک ہوگئی

منہ پھیر کر نظر سے کوئی دور ہوگیا
اپنی حیات موت سے نزدیک ہوگئی

پھر آگیا جہاں میں زمانہ بہار کا
پھر مے کشی کی غیب سے تحریک ہوگئی

اب ظلم و جور کا بھی سہارا نہ رہ گیا
موقوف تیرے در سے مری بھیک ہوگئی

وہ مسکرا دیے شرفِ ناز بڑھ گیا
میں رو دیا نیاز کی تضحیک ہوگئی

پوچھا کسی نے میری طبیعت کا حال کیوں
ہو کر یہ ٹھیک ٹھیک سے بے ٹھیک ہوگئی

اے نوح اپنی کشتیِ دل کی مناؤ خیر
طوفانِ ذوق و شوق سے نزدیک ہوگئی

طبع زاد ۱۵؍جولائی ۱۹۳۳ء

لے اُڑی دل کو بھی فغاں دل کی
بات پہنچی کہاں کہاں دل کی

ایسی تقدیر ہے کہاں دل کی
وہ سنیں دل سے داستاں دل کی

دل مرا ہے ادا شناسِ نظر
وہ نظر ہے مزاج داں دل کی

خامشی نے کہا فسانۂ غم
بے زبانی بنی زباں دل کی

تم سے بے درد پر نثار ہوا
شامت آئی جو ناگہاں دل کی

ضبطِ غم نے مجھے ہلاک کیا
دل میں خنجر بنی فغاں دل کی

واہ کرتے ہو آہ کرنے پر
تم سمجھتے نہیں زباں دل کی

کم نہیں یہ بھی عرشِ اعظم سے
قدر کر قدر آسماں دل کی

ہاتھ رکھا وہیں کلیجے پر
یاد آئی مجھے جہاں دل کی

کوئی کہتا ہے تم کہے جاؤ / اللہ اللہ داستاں دل کی

غم نہیں پھر اثر ملے نہ ملے / عرش تک جائے تو فغاں دل کی

زور سے سانس لے نہیں سکتا / اب یہ صورت ہے ناتواں دل کی

آپ میری زباں سے سنتے ہیں / ہو چکی ختم داستاں دل کی

کوئے جاناں میں بھی پتہ نہ ملا / اب کروں جستجو کہاں دل کی

کشتیِ عشق کے لئے اے نوحؔ
بادباں بن گئی فغاں دل کی

۲۰ر جولائی سنہ ۱۹۳۳ء

ج

میت سے تہِ مدفن دیکھی نہ ملن ساری / اسباب کو کھینچا کر چلتے ہوئے بے گاری

میرے جگر و دل میں ہے وجہِ ضیا باری / ارمان کا انگارا امید کی چنگاری

کیوں کر وہ لگاتے دل ہو جان جسے پیاری / بیمار نہیں بچتا مہلک ہے یہ بیماری

مایوس کیا اُن سے کم مائگیِ دل نے / تھوڑی سی بضاعت پر یوسف کی خریداری

زنداں سے کہیں باہر میں جا ہی نہیں سکتا / دیوار بھی ہے اونچی زنجیر بھی ہے بھاری

دیکھیں رہِ عرفاں میں کیا ہم کو دکھاتی ہے / اوہام کی سرجوشی انفاس کی بیداری

پھر جام و سبو آئے گھر کر ترے آنے سے / اے ابرِ سیہ سوجھی رندوں کو سیہ کاری

بندوں کا تو کیا چرچا اللہ نے بھی پوچھا / ناکردہ گناہی سے اچھی تھی گنہ گاری

یوں عاشقِ بے کس نے دم عشق میں توڑا ہے / ایک آہ فقط نکلی چند دانت تک ہوئے جاری

آزاد کیا مجھ کو قسمت نے تپِ غم سے / بھڑکے تو یہ شعلہ ہے دب جائے تو چنگاری

جینے کی خوشی کیا ہو مرنے کا قلق کیوں ہو / مرنے میں ہے آسانی جینے میں ہے دشواری

اے عشق اثر اتنا آزار میں پیدا کر / بیمار کو جو دیکھے اُس کو بھی ہو بیماری

کیا سوگ منائیں گے برسوں وہ مرے دل کا / چالیس دنوں ہی تک ہو کاش عزاداری

تاریکیِ قسمت بھی آئی ہے عیادت کو / بیمارِ محبت پر کیوں رات نہ ہو بھاری

اے داورِ محشر دے جنت میں جگہ مجھ کو / شرمندہ نہ رکھ یعنی رکھ شرمِ گنہ گاری

پھینکا جو محبت میں اُلٹا وہ پڑا پانسہ / تقدیر مری جیتی تدبیر مری ہاری

نظروں کے ملاتے ہی غائب جو کریں دل کو / آسان نہیں ایسے چوروں کی گرفتاری

اے نوحؔ خدا جانے طوفانِ حوادث میں
پہنچے گی کہاں بچ کر کشتی مری بے چاری

ج

بھرم کھلنے نہ پایا دل کا جانِ مبتلا نکلی
خدا نے بات رکھ لی اتفاقاً موت آ نکلی

یہ مانا آپ کی اک اک ادا دل چسپ کیا نکلی
مگر جس سے ہمارا کام نکلا وہ قضا نکلی

خدا جانے جواں ہو کر وہ کیا کیا ظلم ڈھائیں گے
اب آنکھوں میں شرارت آئی نظروں سے حیا نکلی

یہ حسن و عشق کا پیارا تصادم کیا تصادم تھا
کماں سے تیر اُدھر نکلا ادھر دل سے دعا نکلی

یہی بے ساختہ جی چاہتا ہے چاہیے دل سے
تری صورت خدائی بھر میں کیا نامِ خدا نکلی

لحاظِ بلبل و گل کب ہوا صیاد و گلچیں کو
ہوا خواہِ چمن بس ایک لے دے کر صبا نکلی

ہمیں بے موت مر جانا پڑا مرنے کی حسرت میں
نگاہِ نازِ قاتل اس قدر دیر آشنا نکلی

ہمارا دم کچھ ایسی کشمکش میں تھا دمِ آخر
عزیزوں کے بھی منہ سے جلد مرنے کی دعا نکلی

خموشی کا محل ہو یا نہ ہو خاموش رہتی ہے
تری تصویر اس معنی میں تجھ سے بھی سوا نکلی

اُڑا رنگِ اثر کب جلد تر خونِ تمنا کا
یہ مھندی دست و پا میں چھو گئی تو دیرپا نکلی

وہ قائل ہوں نہ ہوں لیکن زمانہ اس کا قائل ہے
اُسی نے گھر بنایا دل میں جو دل سے دعا نکلی

زمیں کانپی فلک ہلنے لگا وہ بھی ہوئے مضطر
نگاہِ واپسیں میری نہیں معلوم کیا نکلی

زمینِ کوئے جاناں پر فلک نے غم دیئے لاکھوں
ہمارے حق میں یہ جنت بھی دوزخ سے سوا نکلی

تلاشِ کامیابی میں امید و بیم کا عالم
نہیں معلوم کیوں کر دل سے آہِ نارسا نکلی

جنابِ نوحؔ وہ طوفان بحرِ عشق میں آیا
کہ اپنی کشتیِ امید بہہ کر دور جا نکلی

طبع زاد ۱۵ ر اپریل ۱۹۳۴ء

ج

مرے دل میں رونق نظر آئے کیوں کر مقدر میں لکھی گئی بدشگونی
ہزاروں تمنائیں لاکھوں امیدیں مگر پھر یہ بستی ہے سونی کی سونی

خدا کے کرم سے تمہاری گلی میں مجھے شوقِ کامل نے پہنچا دیا ہے
اب آئندہ جو کچھ مقدر دکھائے جماتا ہوں بستر رماتا ہوں دھونی

جو آزار و غم پیش آئیں وہ سہہ لوں بہت کچھ اسی کو غنیمت سمجھ لوں
کروں گا اگر ان سے ترکِ محبت تو اُن کی محبت مجھے ہو گی دونی

خدا سے شکایت اگر میں کروں گا تو کچھ بھی نہ ہو گا شکایت سے حاصل
قیامت میں اپنی بریت کی خاطر وہ کہہ دیں گے مجھ کو کہ یہ ہے جنونی

نہ پہلو میں دل بر نہ آغوش میں دل نہ دلبر کو الفت نہ دل کو مسرت
تمنائیں جس پر مچلتی تھیں پہلے وہی اب مری سیج رہتی ہے سونی

اڑا لے گئے دل وہ پہلو سے فوراً ادائیں دکھا کر نگاہیں ملا کر
محبت میں آئے تو کیا چین آئے ہوئی ابتدا ہی میں یہ بدشگونی

ادھر اپنے سائے سے بھی ان کو وحشت ادھر باغ و صحرا کی بھی دل میں رغبت
ترے عاشقوں کا عجب حال دیکھا جو ہے ایک دیوانہ تو اک جنونی

اگر مر گیا میں تو کیا تجھ کو حاصل کہاں تک ستم اور کب تک تغافل
کرم کر کرم کر ادھر آ ادھر آ کہ آغوش میری ہے مدت سے سونی

محبت کے رستے نہ پہچانتا تھا یہ آئینِ الفت نہ میں جانتا تھا
جو پائے طلب چلتے چلتے رکیں گے تو میری طلب ہوگی پہلے سے دونی

یہی ماحصل جوشِ وحشت کا ٹھہرا کہیں بھی نہ دیوانۂ عشق ٹھہرے
جنوں میں جسے کچھ میسر سکوں ہو مری رائے ناقص میں وہ ہے جنونی

دلِ خوگرِ غم یہی چاہتا تھا دلِ خوگرِ غم یہی چاہتا ہے
کہ حسرت فزوں ہو محبت سوا ہو مصیبت زیادہ ہو زحمت ہو دونی

انھیں کی تجلی سے پر نور آنکھیں انھیں کے نظارے سے مسرور نظریں
نہ ہوں جس میں دو چار بھی حسن والے وہ بستی ہے ویراں وہ محفل ہے سونی

عجب کیا ہمیشہ اذیت ہی جھیلو کہ آثار اچھے نہیں پائے جاتے
اٹھایا عبث تم نے طوفاں رو کر محبت میں کی نوح یہ بدشگونی

طبع زاد ۲۰ ستمبر ۱۹۳۴ء

ج

ہم دیر و حرم دیکھ چکے کون و مکاں بھی
بس ایک ہی اللہ یہاں بھی ہے وہاں بھی

کیا رازِ غمِ عشق بنا سوزِ نہاں بھی
وہ آگ ہے جس میں نہ شرر بھی نہ دھواں بھی

وہ کہتے ہیں اخفائے محبت ہے بڑی چیز
قابو میں جو دل ہو تو کروں ضبطِ فغاں بھی

جاتا تو ہوں صحرا کی طرف جوشِ جنوں میں
بالفرض نہ آرام ملا مجھ کو وہاں بھی

بے درد کہوں یا کہیں ہم درد سمجھ لوں
ایسا ہے یقیں بھی مجھے ویسا ہے گماں بھی

شکوہ کوئی آزار و ستم کا نہیں کرتا
لے کر دلِ عشاق وہ لیتے ہیں زباں بھی

ممکن تھا کہ جنت میں نہ حوروں سے بہلتے
ہم لائے چھپا کر کسی کافر کو یہاں بھی

رکھتی نہیں اظہارِ تمنا سے تعلق
دنیا میں بڑی چیز ہے گونگے کی زباں بھی

محشر میں تو ملنا نہیں دشوار کسی کا
ہم ڈھونڈ لگاتے ہوئے پہنچیں گے وہاں بھی

چلمن کو طلسم اس رخِ روشن نے بنایا
اب حسن کے انوار نہاں بھی ہیں عیاں بھی

مجروح نہ کر دے کہیں اندازِ تکلم
خنجر کی طرح چلتی ہے قاتل کی زباں بھی

محشر میں وہ بلوانے سے آتے تو ہیں لیکن
طوفان اُٹھا دیں نہ کہیں نوح یہاں بھی

طبع زاد ۲ر اکتوبر ۱۹۳۴ء

ج

جا بلا سے نہ پوچھ بات مری
کیا ترے ہاتھ ہے نجات مری

منحصر صبح پر نجات مری
ہے مگر جب ڈھلے بھی رات مری

کس طرح جی رہا ہوں حیرت ہے
اِتنے غم اور ایک ذات مری

آپ کے عشق نے شرف بخشا
کچھ نہ تھی ورنہ کائنات مری

بڑھ گیا عشق آپ کا جتنا
اُتنی کم ہو گئی حیات مری

پھر یہ باتیں نہ ہوں گی میرے بعد
غور سے سنئے بات بات مری

مرنے جینے پہ اختیار نہیں
کیا حیات اور کیا ممات مری

آپ کیوں قتل کر کے نادم ہیں
صرف اِتنی ہی تھی حیات مری

شامِ غم یہ مجھے امید نہیں
ختم ہو عافیت سے رات مری

حلق پر وہ چلے تو غم سے چھوٹوں
بس میں خنجر کے ہے نجات مری

اُس طرف خضر تاب کے منصوبے
اِس طرف عمر بے ثبات مری

اُن کے آنے سے اُن کے جانے سے
بڑھ گئی گھٹ گئی حیات مری

دیکھتا ہوں کسی کو شام و سحر
آج کل دن مرا ہے رات مری

چھین کر دل تباہ کر ڈالا
لوٹ لی تم نے کائنات مری

غرقِ طوفاں کرو نہ عالم کو
نوح تم مان جاؤ بات مری

۸ر جنوری ۱۹۳۵ء

ج

مصیبت کی حقیقت عشق میں جانی نہیں جاتی
بآسانی یہ آتی ہے بآسانی نہیں جاتی

مآلِ عمرِ فانی کی پریشانی نہیں جاتی
ہماری جان کب جائے گی یہ جانی نہیں جاتی

دلِ بےتاب کہتا ہے وہ آئیں گے وہ آئیں گے
جوابِ صاف ملنے پر بھی نادانی نہیں جاتی

مریضِ غم کا نقشہ دوریِ راحت نے یوں بدلا
کہ اب نزدیک سے بھی شکل پہچانی نہیں جاتی

خیالِ عیش و راحت قبر میں ہم راہ لایا ہوں
تن آسانی کی عادت بھی بآسانی نہیں جاتی

تڑپتے لوٹتے آخر سویرا ہو ہی جاتا ہے
مگر شامِ شبِ غم کی سحر بانی نہیں جاتی

خدا جانے مری قسمت دکھائے کیا ابھی مجھ کو
سب اطمینان دیتے ہیں پریشانی نہیں جاتی

ہم اس تعذیر کو انصافِ الفت کس طرح کہہ دیں
مصیبت دل پہ آتی ہے نظر ثانی نہیں جاتی

شکایت اُن سے کرنے کا مجھے ارمان تھا پہلے
شکایت کر کے لیکن اب پشیمانی نہیں جاتی

مےِ گلرنگ پر بے حرمتی کا داغ رہتا ہے
یہ جب تک جامۂ احرام میں چھانی نہیں جاتی

طبیعت بالیقیں آئے گی اِتنا ہم سمجھتے ہیں
کہاں آئے گی کب آئے گی یہ جانی نہیں جاتی

تغیر کا اثر پھیلا یہ رنگِ بزمِ عالم میں
کہ پہچانی ہوئی تصویر پہچانی نہیں جاتی

شبِ غم نے ہمارے ہی مکاں کو گھیر رکھا ہے
نہیں ٹلتی نہیں ہٹتی یہ دیوانی نہیں جاتی

اُدھر ناصح ابھی ہے مجبور ادھر غم خوار بھی عاجز
کسی کی بات جوشِ عشق میں مانی نہیں جاتی

محبت اور پھر ترکِ وفا مجھ سے محبت میں
یہ وہ آفت ہے جو آکر بآسانی نہیں جاتی

دلوں میں گھر بنا کر بعد کو یہ قہر ڈھاتی ہے
محبت کچھ دنوں تک پہلے پہچانی نہیں جاتی

کبھی خود عشق میں رونا کبھی اُن کو رُلا دینا
جنابِ نوحؔ کی ترکیبِ طوفانی نہیں جاتی

حرم میں گونجتی پھرتی ہے راتوں کو اذاں میری

اس طرح پر ۲۴ر جنوری ۱۹۳۵ء کو گورکھپور کالج میں مشاعرہ ہوا مقامی حضرات کے علاوہ مولانا حسرتؔ موہانی عبدالباری صاحب آسیؔ لکھنوی امینؔ صاحب سلونی شوکتؔ صاحب تھانوی بے دمؔ صاحب ناطقؔ صاحب کانپوری تبسمؔ صاحب جھانسوی نیازؔ صاحب خیرآبادی اعجازؔ صاحب فتحپوری جناب بریاںؔ صاحب الہ آبادی وغیرہ شریکِ بزم تھے مشاعرہ ۱۲۵ بجے دن سے شروع ہو کر ۱۲ بجے رات کو ختم ہوا بعد ختم مشاعرہ خان بہادر محمد ذکی صاحب و ڈاکٹر حفیظ اللہ خاں صاحب و مولوی سبحان اللہ صاحب نے باہر کے شعرا کی دعوتیں کیں اور ہر جگہ ہر شاعر نے اپنے غیر طرح کلام سے محظوظ کیا

ج

نہ کعبے میں نہ بت خانے میں بنیادِ مکاں میری
بتا اے خانہ ویرانی کہیں ہوگی کہاں میری

اصولاً اِس کو کہنی چاہیے تھی داستاں میری
مگر یہ کیا معمہ ہے بیاں تیرا زباں میری

نکل کر دل سے آہیں کب رکیں اے آسماں میری
کہ تیری تجلیوں پر بھی گری ہیں بجلیاں میری

جو دل کا مدعا ہے وہ خود اِس کو جان جائیں گے
بیانِ شوق کی زحمت اٹھائے کیوں زباں میری

مصیبت نے دیا منزل بمنزل ساتھ ہر پھر کر
شریکِ غم رہی یہ کارواں درکارواں میری

حرم ہی تک رہی محدود ہر پھر کر تو کیا حاصل
مزا جب ہے کہ پہنچے بت کدے میں بھی اذاں میری

وفورِ یاس میں عشق و وفا کو شرم آتی ہے
گلہ کس کا گلہ اُن کا زباں کس کی زباں میری

بتا دے یہ نشاں سیدھا سا کوئی برق و صرصر کو
گلستاں میں بہت اونچی ہے شاخ آشیاں میری

یہ جیسے مشورہ آپس میں کر لیتی ہوں پہلے سے
اُدھر اُٹھی نظر تیری اِدھر نکلی فغاں میری

اب ایسے میں کسی کا یاد کرنا بھی قیامت ہے
دمِ آخر نہیں دم بھر کو رکتیں ہچکیاں میری

بڑھاؤں یا گھٹاؤں عشق نالہ ہو کہ شکوہ ہو
اجارہ کیا کسی کا اِس میں دل میرا زباں میری

ہوائے شوق میں کچھ اور اسے اونچا تو ہونے دو
زمیں تک آسماں کو کھینچ لائے گی فغاں میری

مجھے کتنا زمانہ دشت سے گذرے ہوئے گذرا
زبانِ خار پر لیکن ہے اب تک داستاں میری

دفورِ شوق سے ٹکڑے گریباں کے نہیں ہوتے
اُلجھ کر رہ گئیں دستِ جنوں اب اُنگلیاں میری

اثر بچ کر کہاں جائے گا چھپ کر بچ نہیں سکتا
زمین و آسماں کو چھان ڈالے گی فغاں میری

دمِ آخر کے نامربوط اشارے یاد آئیں گے
زبانوں پر رہے گی گفتگوئے بے زباں میری

شبِ غم حال دونوں کا مرے انجم نے دیکھا ہے
تڑپتے لوٹتے گذری وہاں اُن کی یہاں میری

عجب کیا برق بن کر گر پڑے صیاد کے سر پر
جھکی جاتی ہے بارِ غم سے شاخِ آشیاں میری

سرشکِ چشم دریا بار کی موجیں قیامت ہیں
کریں گی نوح کو بھی غرقِ طوفاں خیزیاں میری

چمن میں گل کھلانے کو ہوائے خوش گوار آئی

۶ر جولائی ۱۹۳۵ء کو زیرِ اہتمام مرزا احمد جان صاحب اِس طرح پر ریلوے انسٹیٹیوٹ الہ آباد میں ۹ بجے رات سے مشاعرہ شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا مقامی شعرا قریب قریب سب موجود تھے

ج

چمن کے پھول تو ہیں پھول کانٹوں کو سنوار آئی
عروسِ رنگ و بو ہو کر زمانے میں بہار آئی

کسی جانب سے کب کوئی صدائے خوش گوار آئی
ہماری بےکسی ایک ایک مونس کو پکار آئی

ہوائے فصلِ گل رندوں کو چل پھر کر پکار آئی
چمن نے ساز چھیڑا ناچتی گاتی بہار آئی

نکھر آئی نکھار آئی سنور آئی سنوار آئی
گلوں کی زندگی لے کر گلستاں میں بہار آئی

بنگاہِ شوخ کی تقلید تھی مدِ نظر دل کو
سمجھ میں بعد مدت کے یہ وجہِ اضطرار آئی

چمن کے غنچہ و گل پر خزاں نے قہر ڈھایا تھا
حواس و ہوش کا تختہ اُلٹنے کو بہار آئی

مسلسل رنج و غم ہم نے محبت میں اُٹھائے ہیں
دل اپنا بار بار آیا طبیعت بار بار آئی

اسیرانِ قفس کو واسطہ کیا اِن جھمیلوں سے
چمن میں کب خزاں آئی چمن میں کب بہار آئی

خدا جانے کہ بت خانے میں کیا دیکھا خدائی نے
گئی تھی مطمئن لیکن وہاں سے بے قرار آئی

مشیت کو نہیں منظور دم بھر پارسا رکھنا
اِدھر کی میں نے توبہ اور اُدھر فوراً بہار آئی

بھرے پھولوں کے ساغر بادۂ شبنم سے گردوں نے
چمن میں مے کدے کاٹے کدہ لے کر بہار آئی

زمیں والے مری فریاد کی امداد کیا کرتے
فرشتوں کو بھی جا کر آسماں تک یہ پکار آئی

یہ دستورِ محبت کیا ہے آئینِ وفا کیا ہے
بھلایا جس نے مجھ کو یاد اُس کی بار بار آئی

دمِ نظارۂ مے خانہ یہ معلوم ہوتا ہے
سمٹ کر بوتلوں میں ساری دنیا کی بہار آئی

کمالِ خاص دیکھا ہم نے یہ شوقِ تصور میں
خیالِ کوئے یار آیا ہوائے کوئے یار آئی

مجھے گلشن سے اے جوشِ جنوں صحرا کو لے چل
یہاں اِس کے سوا کیا ہے خزاں آئی بہار آئی

شرف کے ساتھ اپنی تھی کشش بھی چار تنکوں میں
طوافِ آشیاں کرنے کو بجلی بار بار آئی

ہمیشہ بادہ خواروں پر خدا کو مہرباں دیکھا
جہاں بیٹھے گھٹا اُٹھی جہاں پہنچے بہار آئی

خدا جانے دلِ شوریدہ سر پہ کیا گذر جاتے
جنابِ نوح پھر طوفان اٹھانے کو بہار آئی

طبع زاد ۲۲ر جنوری ۱۹۳۶ء

ج

کم بخت کبھی جی سے گذرنے نہیں دیتی
جینے کی تمنا مجھے مرنے نہیں دیتی

مرنا بھی اگر چاہیں تو مرنے نہیں دیتی
راحت طلبی کچھ بھی کرنے نہیں دیتی

ناکامیِ تقدیر سے مجھ کو ہے شکایت
بگڑے ہوئے کاموں کو سنورنے نہیں دیتی

شکوہ تو بڑی بات ہے اُس شوخ کے آگے
بے تابیِ دل شکر بھی کرنے نہیں دیتی

دنیائے غم و عیش میں نیرنگیِ الفت
جینے نہیں دیتی مجھے مرنے نہیں دیتی

بے تابیِ دل کم ہو تو آزار بھی کم ہو
یہ زخمِ محبت کبھی بھرنے نہیں دیتی

موقع بھی جو ملتا ہے تو آشفتگیِ دل
اظہارِ تمنا مجھے کرنے نہیں دیتی

مانا کہ زمانے میں اجل سب کے لئے ہے
لیکن کبھی ناوقت یہ مرنے نہیں دیتی

بجلی کی چمک کہتی ہے پیہم کہ پئے جاؤ
بارش میں یہ توبہ مجھے کرنے نہیں دیتی

درماں تو وہ کرتے ہیں مگر میری نقاہت
ڈوبی ہوئی نبضوں کو ابھرنے نہیں دیتی

بیمارِ محبت کو مسیحا سے غرض کیا
وہ آپ کی حسرت ہے جو مرنے نہیں دیتی

ہر چند مری سانس بھی کہنے کو ہوا ہے
شیرازۂ ہستی یہ بکھرنے نہیں دیتی

مانا کہ رہِ عشق میں لاکھوں ہیں بلائیں
لیکن مری ہمت مجھے ڈرنے نہیں دیتی

امید بھی دنیائے محبت میں ہے کیا چیز
مرتا ہوں مگر یہ مجھے مرنے نہیں دیتی

خودداریِ الفت سے بھی جانِ حزیں پر
یہ ترکِ تعلق مجھے کرنے نہیں دیتی

حسرت کا تقاضا ہے کئے جاؤ تقاضا
ڈرنے کی جگہ بھی مجھے ڈرنے نہیں دیتی

اے نوح مری شورشِ دریائے محبت

بیٹھی ہوئی کشتی کو اُبھرنے نہیں دیتی

طبع زاد ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۲ء

ج

ظلم سہنے کی انتہا کر دی — ہم نے رسمِ وفا ادا کر دی
آپ کو اور کچھ نہیں آتا — دردِ دل بڑھ گیا دوا کر دی
انتہا کی خبر نہیں مجھ کو — دل نے الفت کی ابتدا کر دی
میرے آگے کبھی نہ آنا تھا — جان زحمت میں مبتلا کر دی
ہو گئی مجھ کو عشق کی معراج — زندگی حسن میں فنا کر دی
دیجئے میرے ذوق و شوق کی داد — لیجئے جان بھی فدا کر دی
دل لگاتے ہی مر مٹے عشاق — ابتدا ہی میں انتہا کر دی
تھی جو میری نشاط کی دنیا — وہ ترے قہر نے فنا کر دی
اُن کی انگڑائیوں نے ہاتھوں ہاتھ — دل کی ایک ایک رگ جدا کر دی
ہم نے کھینچی کسی کے سامنے آہ — اِس طرح شرحِ مدعا کر دی

نوح وہ فارسی میں پوچھتے ہیں
ایں چہ طوفانِ غم بپا کر دی

طبع زاد ۱۰ر مارچ ۱۹۳۹ء

ج

یا وہ گوئی سے محبت میں خموشی اچھی — بات اِتنی سی ہے لیکن ہے یہ کتنی اچھی
یہ نہ کہئے مری ہر بات بُری بھی اچھی — آپ اچھے ہیں مگر کب ہے تعلّی اچھی
ہیں جفا پر نہیں دینے کا وفا کو ترجیح — یہ بھی اچھی مری دانست میں وہ بھی اچھی
جلد مر جائے کہیں کشمکشِ غم سے چھُوٹے — نزع میں آپ نے مجھ کو یہ دعا دی اچھی
عشقِ جاں سوز مرا حسنِ دل افروز ترا — کون کہتا ہے کہ دونوں میں نبھے گی اچھی
پھر نہ ٹالے سے ٹلے ہم نہ ہٹائے سے ہٹے — جس جگہ دیکھ لی صورت کوئی اچھی اچھی
جو ترے واسطے جھیلوں وہ ستم بھی اچھا — جو ترے عشق میں آئے وہ بلا بھی اچھی
آپ کیا میری طبیعت سے خبردار نہیں — یہ محبت کی ہے سچّی یہ وفا کی اچھی
ہم نے مانا دمِ آخر وہ نہ آئیں گے مگر — اِس بُرے وقت میں جھوٹی بھی تسلّی اچھی
تیری صورت کے علاوہ کوئی صورت ہی نہیں — خوب سے خوب خوش اسلوب انوکھی اچھی
کٹ گئے یہ شبِ غم جی سے گذرنے والے — جس کے پہلو میں وہ ہوں رات اسی کی اچھی

آج کے وعدے کو کل کے لئے پھر ٹال دیا
وقت پر یہ تمھیں بے وقت کی سوجھی اچھی

عشق میں برقِ سرِ طور کی تخصیص نہیں
پھونک دے جو مرے دل کو وہ تجلّی اچھی

دل تمھیں نیم نگہ پر ہی دیئے دیتا ہوں
چیز ایسی نہ ملے گی کوئی سستی اچھی

اور کیا چاہیئے ساقی ترے مے خانے کو
جام اچھے ہوں خُم اچھا ہو صراحی اچھی

چار ہی روز میں وہ عہدِ وفا بھول گئے
پھر خبر تم نے نہ لی میری خبر لی اچھی

دیکھ کر جس کو نگاہیں کبھی نہ قابو میں رہیں
ہر ادا آپ کی اچھی ہے پھر ایسی اچھی

آپ بھی بچ گئے ساقی بھی رہے امن کے ساتھ
مل گئی نوحؔ کو طوفان میں کشتی اچھی

طبع زاد ۱۳؍ مارچ ۱۹۳۹ء

ج

دل مرا اور مدعا طلبی
حسن کی شان ہیں یہ بے ادبی

عشق میں مجھ سے ایسی بوالعجبی
اُس جفا جو سے کیا وفا طلبی

بزمِ ساقی میں آرزوئے شراب
قعرِ دریا میں جوشِ تشنہ لبی

بے وفا تند خو ستم پرور
ہو گئی انتہائے خوش لقبی

شکوۂ دوست وہ بھی محشر میں
مجھ سے ہوگی نہ ایسی بے ادبی

دیر میں بھی جھکا رہا ہوں سر
اللہ اللہ یہ خدا طلبی

پیچھے پیچھے خیالِ جرم و قصور
آگے آگے مری کرم طلبی

رہ زن و رہ نما ہمی دانم
بارگاہش مقام بوالعجبی

کہہ دیا حشر میں جو کہنا تھا
اُن سے پہلے ہوئی مری طلبی

لوگ کہتے ہیں اُن کا دیوانہ
ہو مبارک مجھے یہ خوش لقبی

کیوں نہ ہو احترام عالم میں
نوحؔ بھی ہیں خدا کے خاص نبی

۷؍ مئی ۱۹۳۹ء

ج

تیغِ نظر اُس شوخ کی خالی نہیں جاتی
پڑتی ہے کچھ ایسی کہ سنبھالی نہیں جاتی

حسرت بھی مرے دل سے نکالی نہیں جاتی
یعنی وہ تری خام خیالی نہیں جاتی

ہر دم ہے زباں پر وہی جلووں کا تقاضا
کس وقت مری آنکھ نکالی نہیں جاتی

بہتر ہے کہ ہم خود ہی گلا کاٹ لیں اپنا
قاتل سے ابھی تیغ سنبھالی نہیں جاتی

مرنے کو بھی کہتے ہیں تو مر جاتے ہیں لاکھوں
واللہ زباں آپ کی خالی نہیں جاتی

گیا روح کو ارمانِ دلِ زار سے نسبت
یہ آپ نکلتی ہے نکالی نہیں جاتی

بہتر ہے صراحی وہی رندوں کی نظر میں
پانی سے کسی دن جو کھنگالی نہیں جاتی

گو باعثِ آزار کسی کی ہے محبت
یہ پھانس مگر دل سے نکالی نہیں جاتی

خوش کام یہاں تک ہیں شہیدانِ محبت
مر کر بھی تو چہرے کی بحالی نہیں جاتی

مل جائے مجھے منزلِ مقصودِ تمنا
کیوں ایسی کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

اندازِ کرم سے روشِ قہر جدا ہے
حسرت کی طرح جان نکالی نہیں جاتی

تم اور خفا ہوگئے مری بات کو سن کر
جو دل میں ہے وہ منہ سے نکالی نہیں جاتی

اے نوح کبھی کشتیِ طوفانِ تمنا
گرداب محبت میں سنبھالی نہیں جاتی

طبع زاد ۱۵ ؍ مئی ۱۹۳۹ء

ج

بتعجیل پہنچی بتاخیر پہنچی
مگر ہر جگہ اُس کی تنویر پہنچی

نہ تدبیر پہنچی نہ تقدیر پہنچی
وہاں میرے نالوں کی تاثیر پہنچی

اثر ہو نہ ہو کچھ مگر یہ خوشی ہے
ترے کان تک میری تقریر پہنچی

جہاں پانو جوشِ جنوں نے نکالے
قدم بوس ہونے کو زنجیر پہنچی

مرے آگے آیا مقدر کا لکھا
جو بھیجی تھی تم نے وہ تحریر پہنچی

اُڑا کر مرا دل کوئی لے گیا تھا
مجھے کھینچ لینے کو تصویر پہنچی

فغاں کا ارادہ ہی میں نے کیا تھا
کہ اُن کی نظر صورتِ تیر پہنچی

بنی شعلۂ شمع دیر و حرم میں
کہاں تک مرے دل کی تنویر پہنچی

دیا طول ایسا مرے مدعا نے
کبھی خاتمے تک نہ تقریر پہنچی

روانہ وہ کرتے تو آتی یہاں تک
نہ تحریر بھیجی نہ تحریر پہنچی

ابھی میرے دل سے نہ نکلی تھیں آہیں
کہ امداد دینے کو تاثیر پہنچی

وہ اے نوح تھا بحرِ الفت کا ساحل
جہاں کشتیِ دل بتاخیر پہنچی

طبع زاد

ج

عیش و راحت نہ سہی لطف و مسرت نہ سہی
تم عداوت ہی کرو مجھ سے محبت نہ سہی

سرگذشتِ غم و آزارِ محبت نہ سہی
اور باتیں تو مری سنئے شکایت نہ سہی

قصد کرتے ہیں کہ ہم تارکِ عصیاں ہو جائیں
خوفِ دوزخ ہی سہی خواہشِ جنت نہ سہی

دل مرا اور حسینوں میں بہل جائے گا
سیکڑوں شکلیں ہیں اک آپ کی صورت نہ سہی

دل کشی قہر و غضب کی تری آنکھوں میں تو ہے
میرے دل میں اثر جذب محبت نہ سہی

مفت ملتی ہو کوئی چیز تو کیسی تاخیر
لے بھی لو تم دل بے تاب کو قیمت نہ سہی

عذر ملنے میں اگر ہے تو مجھے قتل کرو
یہ تمنا مری پوری ہو وہ حسرت نہ سہی

ہم کو مٹنے سے غرض تم کو مٹانے سے غرض
خوش خرامی تو ہے موجود قیامت نہ سہی

مائل جور تو ہیں مائل آزار تو ہیں
اک محبت ہی نہیں اُن کو محبت نہ سہی

ظلم سہہ کر بھی کیا شکر کا سجدہ میں نے
کچھ نہ کچھ اُن کو توجہ ہے مروت نہ سہی

دل ملے مفت جو تم کو تو برائی کیا ہے
بے ضرورت ہی سہی حسب ضرورت نہ سہی

نالہ و آہ کو نسبت ہے محبت سے ضرور
نالہ و آہ کوئی جزو محبت نہ سہی

اہل دل خلق ہوئے خلق میں مرنے کے لئے
تم سلامت رہو دنیائے محبت نہ سہی

پھر بھی اے نوحؔ کوئی مشغلۂ شوق رہے
تم کو طوفان اُٹھانے کی ضرورت نہ سہی

طبع زاد

ج

مصیبت عشق میں دن رات آئی
مرے آگے تمہاری بات آئی

مگر کب مسرت ہات آئی
نہ ویسا دن نہ ویسی رات آئی

ہوا جب خشک اپنا دامن تر
بھگونے کے لئے برسات آئی

ملا فرمان الفت اُن کے در سے
کہ دست آویز حسرت ہات آئی

کسی نے چٹکیاں لیں میرے دل میں
جہاں حسن و ادا کی بات آئی

رہا جس رات کا ڈر مجھ کو دن بھر
وہی پھر دن گذر کر رات آئی

ڈبو دو زہد و تقوے کو سبو میں
یہی کہتی ہوئی برسات آئی

ہمارے قتل سے تم کو ملا کیا
فقط سرخی لہو کی ہات آئی

نہیں کہتے نہیں سنتے کوئی بات
جو آئی تو اُنھیں یہ بات آئی

وہ دل لے کر نہ کیوں اترائیں دل میں
ہماری دولت اُن کے ہات آئی

اُٹھو رندو کہ پھر اُٹھیں گھٹائیں
بھرو ساغر بھری برسات آئی

جوانی نے بدل دی اُن کی دنیا
ادا آئی ادا میں گھات آئی

جناب نوحؔ خوش ہیں دل میں بے حد
کوئی توقیر تو کیا ہات آئی

طبع زاد

خوشی وجہِ سکونِ دل جسے ہوگی اُسے ہوگی — مجھے حاصل نہیں حاصل جسے ہوگی اُسے ہوگی

ہمیں پہچان دونوں کی نہیں صحرائے وحشت میں — تمیزِ جادہ و منزل جسے ہوگی اُسے ہوگی

کسی پر جان دے دینے کو دل آساں سمجھتا ہے — اِس آسانی میں بھی مشکل جسے ہوگی اُسے ہوگی

فدا کر دوں گا جان و دل کو میں دربارِ قاتل میں — یہاں پروائے جان و دل جسے ہوگی اُسے ہوگی

ہم اپنے دل میں حسنِ روئے لیلیٰ دیکھ لیتے ہیں — توجہ جانبِ محمل جسے ہوگی اُسے ہوگی

ہجومِ عام میں کہہ دیں گے جو کچھ ہم کو کہنا ہے — پریشانی سرِ محفل جسے ہوگی اُسے ہوگی

وفا والے وفا پر اپنی اپنی جان دے دیں گے — مصیبت جھیلنی مشکل جسے ہوگی اُسے ہوگی

ہم اُن کی آرزو کو زندگی اپنی سمجھتے ہیں — بلائے جان وبالِ دل جسے ہوگی اُسے ہوگی

تہِ خنجر بھی استقلال اپنا ہم نہ چھوڑیں گے — بڑی مشکل دمِ مشکل جسے ہوگی اُسے ہوگی

ابھی تو حال اپنا عشق میں فی الحال اچھا ہے — ہمیں کیا فکرِ مستقبل جسے ہوگی اُسے ہوگی

تمھیں اے نوح بحرِ غم میں کیا ڈر اس جھمیلے کا
تلاشِ کشتی و ساحل جسے ہوگی اُسے ہوگی

شاعر آگرہ کے لئے

حسن کا لطف غمِ عشق کی دنیا لے گی — آہ نکلے گی نکلتی ہی کبھی جا لے گی

چھیڑ کر تو نگہِ شوخ کو بے فکر نہ ہو — اس کا بدلا وہ کبھی اے دلِ شیدا لے گی

تم سلامت ہو تو ہم موت سے ڈرنے کا نہیں — جان لینے کو وہ آئے گی مگر کیا لے گی

جو بلا آئے گی دنیا میں محبت کی قسم — پہلے وہ جائزہ اہلِ تمنا لے گی

اِس میں آزار بھی ہے قہر بھی ہے جبر بھی ہے — عشق کا روگ طبیعت نہ مری پالے گی

کیا کہا پھر تو کہو دل نہ تمھارا لیں گے — تم نہ لوگے تو نہ لوگے اِسے دنیا لے گی

آگیا وقت کہ دنیا میں نمودار وہ ہو — اب قیامت ترے قدموں کا سہارا لے گی

پھر سرِ طور چمک کر ہیں وہ آنے والے — لطفِ دیدار کا اب چشمِ تماشا لے گی

آٹھویں دسویں بھی ملتی نہیں ظالم کی نگاہ — یہ تغافل ہے تو وہ میری خبر کیا لے گی

تذکرہ اور کرے گا کوئی امید نہیں — عشق کا نام مگر حسن کی دنیا لے گی

کیا خبر تھی مرے اوسان نہ رہ جائیں گے — امتحاں آپ کی اک چشمِ غضب ایسا لے گی

حسن کہتا ہے کہ تم عشق سے ہشیار رہو — دل اڑا لے گی نگہ جان تمنا لے گی

بحرِ آلام میں اک وہ بھی زمانہ ہوگا

نوحؔ کشتی مری ساحل کا سہارا لے گی

طبع زاد

ج

پاس و حسرت میں ہے یہ بات بڑی / حشر کے دن سے غم کی رات بڑی

عشق کا ایک ایک کام بڑا / حسن کی ایک ایک بات بڑی

دل اُڑا لے گئے ملا کر دل / کر گئے آپ مجھ سے گھات بڑی

کیا خبر صبح تک مرا کہ جیا / تھی اذیت کسی کو رات بڑی

بوالہوس اور عشق کا دعوا / منہ ہے چھوٹا مگر ہے بات بڑی

قہر ڈھانے میں آپ کی محفل / ہے قیامت سے چار ہات بڑی

زحمتِ ہجرِ یار نا محدود / رات سے دن ہے دن سے رات بڑی

قیس و فرہاد کا فسانۂ عشق / درحقیقت بڑوں کی بات بڑی

وہ کبھی روز تک یہاں سے نہ جائیں / کم سے کم اِس قدر ہو رات بڑی

کیوں نہ طوفانِ عشق نوحؔ اُٹھائیں
وہ بڑے اور اُن کی بات بڑی

غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

اس طرح پر ۱۳ اپریل ۱۹۲۱ء کو جناب سید عشرت حسین صاحب پنشنر کلکٹر خلف حضرت اکبر الہ آبادی کے دولت خانہ الہ آباد میں مشاعرہ ہوا ٹی پارٹی کے بعد عصر کے بعد شعر خوانی شروع ہو کر دس بجے رات کو ختم ہوئی معززین شہر کا میں عالی جناب سر تیج بہادر صاحب ملا صاحب کملا کانتھ صاحب ورما جج ہائی کورٹ جناب گلشن صاحب نواب صاحب مرزا احمد جان صاحب شفق صاحب عماد پوری ہادی صاحب مچھلی شہری نافذ صاحب دہلوی وغیرہ وغیرہ سب موجود رہے۔ فقط

ج

کم ہوئی اور نہ کم ہو گی مصیبت میری / چھاؤنی چھائے پڑی ہے شبِ فرقت میری

آیا دنیا میں رہا ہو گئی رحلت میری / کچھ نہ تھی اور بس اِتنی تھی حقیقت میری

میں یہ سمجھا کہیں آئی جو طبیعت میری / آج سے عشق مرا آج سے حسرت میری

خود وہ کہتے ہیں کہ ہو ترک نہ الفت میری / اب تو کھُل کھیلے گی کچھ اور طبیعت میری

کیوں نہ ہو مطمئن ایسے میں طبیعت میری / مل گئے آپ مجھے لڑ گئی قسمت میری

یہی خلقت یہی طینت یہی فطرت میری / سیکڑوں روپ بدلتی ہے محبت میری

ہو گیا صبح کی حسرت میں یہاں کام تمام / ابھی گذری نہیں آدھی شبِ فرقت میری

لطف تو جب ہے کہ یہ وضع کی پابند رہے / میرے گھر سے نہ کہیں جائے مصیبت میری

قتل ہو کر یہ ترے عشق میں اعزاز ملا / نوکِ شمشیر سے کھودی گئی تربت میری

حشر کا دن کبھی دنیا میں نمودار نہ ہو
اتنی بڑھ جائے الٰہی شبِ فرقت میری

یک بیک ظلم کا سہنا کوئی آسان نہ تھا
خوگرِ غم ہوئی برسوں میں طبیعت میری

ایک دن حشر کا دُنیا کے بکھیڑے لاکھوں
ختم ہوگی نہ حکایت نہ شکایت میری

کوچۂ یار سے آیا جو ہوا کا جھونکا
جھلملانے لگی شمعِ سرِ تربت میری

اب یہ کیا ہر کس و ناکس میں فغاں کا رونا
تم کو لازم ہے کرو مجھ سے شکایت میری

اضطرابِ دلِ مضطر نہیں دیکھا جاتا
کروٹیں لیتی ہے کیا کیا شبِ فرقت میری

شاید اب قتل میں دم بھر کی بھی تاخیر نہ ہو
جو تمنا ہے تمھاری وہی حسرت میری

مسلکِ عشق میں دونوں کے خیالات جدا
کس طرح ایک ہو دل تیرا طبیعت میری

چرخ بھی درپئے آزار مقدر بھی خلاف
ہاتھ مل کر کہیں رہ جائے نہ حسرت میری

آہِ سوزاں کا اثر عشق میں اُلٹا دیکھا
بجھ گئی آتشِ غم سے بھی طبیعت میری

بعد مرنے کے بھی دل کو نہ قرار آئے گا
اِس کی تربت سے الگ چاہیئے تربت میری

نوح ہر بحر میں طوفان اُٹھا دیتا ہوں
دیکھتے ہیں مرے احباب کرامت میری

طبع زاد یکم جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

ج

کوئی دھجی مجھے کہیں نہ ملی
ہاتھ میں آکر آستیں نہ ملی

جائے آسائش اور کوچۂ یار
مل چکی وہ اگر یہیں نہ ملی

سجدہ کرنا تھا تری چوکھٹ پر
اِس کے قابل مگر جبیں نہ ملی

عمرِ رفتہ کو ڈھونڈتا ہی رہا
یہ تھی وہ چیز جو کہیں نہ ملی

اِتنی نازک تھی انتخاب کی شرط
کوئی صورت مجھے حسیں نہ ملی

لطف کے ساتھ دن گذر جاتے
مجھ کو ایسی جگہ کہیں نہ ملی

میں رہا تاک جھانک میں لیکن
مجھ سے وہ چشمِ شرمگیں نہ ملی

شوخ آنکھوں میں دخل شرم کہاں
تھی جہاں کی یہ شے وہیں نہ ملی

دستِ وحشت کی مہربانی سے
اشکِ شوئی کو آستیں نہ ملی

عرصۂ حشر میں بھی ہو آئے
دادِ بے داد کی کہیں نہ ملی

عشقِ خوددار کس طرح جھکتا
سنگِ در سے کبھی جبیں نہ ملی

دیکھ لیتا یہیں سے میں اُن کو
کیوں مجھے چشمِ دوربیں نہ ملی

دہر میں ذکر کیا مسرت کا
ڈھونڈ ڈالا ہمیں کہیں نہ ملی

خاک ساری میں بھی رہی یہ شان
آسماں سے کبھی زمیں نہ ملی

کیا کہوں میں سبب نہ ملنے کا
مجھ سے اُن کی نظر یونہیں نہ ملی

جس سے پردے دوئی کے جل جاتے
مجھ کو وہ آہِ آتشیں نہ ملی

غرقِ دریائے عشق ہو گئے نوحؔ
تھاہ طوفان میں کہیں نہ ملی

۲۰ر جون سنہ ۱۹۴۲ء

ج

ہر طرح یوں ہے دوں ہے بے معنی
عشق بھی اک جنوں ہے بے معنی

مل گیا مژدۂ بہار مجھے
کیا یہ ہیجانِ خوں ہے بے معنی

سن رہا ہوں کہ وہ نہیں سنتے
شرحِ حالِ زبوں ہے بے معنی

وعدۂ حشر کا بھروسہ کیا
ہاں ہے بے کار ہوں ہے بے معنی

غم کی پُر اضطرار راہوں میں
جستجوئے سکوں ہے بے معنی

حسن کی ایک ایک بات فسوں
عشق کا ہر فسوں ہے بے معنی

جیسے اس کا وجود کچھ بھی نہ ہو
سرگذشت اپنی یوں ہے بے معنی

جلوۂ رخ ہے اُن کا بامطلب
اپنا سوزِ دروں ہے بے معنی

شوق کا تکملہ نہیں ہوتا
ذوقِ دُنیائے دوں ہے بے معنی

جس سے وحشت کو خود نہ وحشت ہو
اِس طرح کا جنوں ہے بے معنی

غم نے بجلی بنا دیا دل کو
امتحانِ سکوں ہے بے معنی

وہ یہ کہہ کر کبھی نہیں سنتے
حالِ سوزِ دروں ہے بے معنی

چشمِ بد دور اُن کی آنکھوں میں
سامری کا فسوں ہے بے معنی

عشقِ ناکام حسن کا قصہ
کیا کہوں کیا سنوں ہے بے معنی

نوحؔ طوفانِ بحرِ الفت میں
فکرِ ضبط و سکوں ہے بے معنی

ے

ہمارا نام ہو جاتا جو ہم کچھ کام کر جاتے

سخن سنج لکھنؤ کے لئے ۲ر جولائی سنہ ۱۹۳۶ء کو یہ غزل کہی تھی

ق

جو وہ تشریف لاتے مجھ کو مضطر اور کر جاتے
نتیجہ کیا تھا آنے کا ادھر آتے اُدھر جاتے

یہ مانا ہم نہ سمجھے آ گئی تھی موت مر جاتے
مگر اپنی طرف سے وہ تو کچھ اپنی سی کر جاتے

جو مرنا ہی لکھا قسمت میں تو ہم یوں جلد مر جاتے
کہ جیتے پھرتے ہنستے بولتے جی سے گذر جاتے

وہ میری قبر پر کیوں روز خالی ہاتھ آتے ہیں
کبھی دس بیس دن میں چار چھ دس پھول دھر جاتے

نہ آتی کیوں زباں تک بات آتی بالیقیں آتی
بھلا میں اور دب جاتا بھلا وہ اور ڈر جاتے

ہمیں آخر جلا کر سوزِ غم نے خاک کر ڈالا
لگی تھی آگ چاروں سمت جاتے تو کدھر جاتے

ترے لطف و ستم پر منحصر تھی زندگی اپنی
جو یوں ہوتا تو جی اُٹھتے جو یوں ہوتا تو مر جاتے

وہ کہیے اتفاقاً ہجر کی شب رک گئیں آہیں
ہوا چلتی تو سب اجزا مرے دل کے بکھر جاتے

ہمارے سامنے سج کو تو بن ٹھن کر نکلنا تھا
مآلِ کار کیا ہوتا یہی ہوتا کہ مر جاتے

کہیں بکتے تو ایسے چند خنجر وہ کبھی لے لیتا
جو رہتے میان ہی میں اور اپنا کام کر جاتے

ہمارے دل کے آگے یوں تھا کعبہ یوں تھا بت خانہ
ادھر کہتا ادھر جاتے ادھر کہتا ادھر جاتے

خراشِ ناخنِ غم تو مٹی تھی ایک مدت میں
جگر کے گہرے گہرے زخم کیوں کر جلد بھر جاتے

اُکھڑتا دم ہمارا اُن کے آگے یہ تمنا تھی
وہ آئے تھے تو مرنے کا تماشا دیکھ کر جاتے

وہ کہتے ہیں ڈبویا تم نے کیوں سارے زمانے کو
جو لیتے ضبطِ غم سے کام تو کیا نوح مر جاتے

گھر میں وہ پردہ نشیں ہے شور بازاروں میں ہے

تاج لاہور کے لئے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء کو یہ غزل کہی گئی

ق

پوچھ کچھ ہے بھی تو کس کی اِن دل آزاروں میں ہے
ہو جسے پیاری نہ اپنی جان وہ پیاروں میں ہے

جنسِ دل پر گفتگو کیا کیا خریداروں میں ہے
قحط جس کا ہے اُسی کی مانگ بازاروں میں ہے

اور کون اِن کے علاوہ اب طرف داروں میں ہے
درد ہم دردوں میں ہے غم میرے غم خواروں میں ہے

صاف کہہ دوں گا یہی میں تیرے بیماروں میں ہوں
وہ جو پوچھے گا کبھی تو کس کے بیماروں میں ہے

زخمِ دل کس واسطے شرمندۂ احساں نہ ہو
روزِ اول ہی سے یہ تیرے نمک خواروں میں ہے

بے گناہوں کا تو کوئی بھی نہیں پرسانِ حال
ہے وہی تقدیر والا جو گنہ گاروں میں ہے

ہیں شبِ غم کس سے رکھوں چارہ سازی کی امید
ایک دل وہ مبتلا آپ اپنے آزاروں میں ہے

پڑ گیا کچھ میل جول ایسا کہ اب کھلتا نہیں
میں طلب گاروں میں ہوں یا وہ طلب گاروں میں ہے

اے عنادل کیا نئے سر سے پھر آئی فصلِ گل
دیکھتا ہوں آج تنکا سب کی منقاروں میں ہے

یہ مرے دل کے مراتب اور یہ کم وقعتی
شمع ہے تو قبر پر ہے گل ہے تو خاروں میں ہے

اِس لئے اہلِ جفا کو وہ بُرا کہنے لگا
کوئی حُسن پائے تو جانے یہ وفاداروں میں ہے

ذوقِ الفت داغِ حسرت دردِ دل سوزِ جگر
ہو نہ ہو کوئی مرا دشمن انھیں چاروں میں ہے

کیوں شبِ غم دیکھ کر تارے نہ ہم ہوں بے قرار
آفتابِ حشر کی حدّت اِن انگاروں میں ہے

مدح خواں ساری رعیت مہرباں حکامِ وقت
نوحؔ بھی کیا کوئی معمولی زمیں داروں میں ہے

طبع زاد ۲۰ر مارچ ۱۹۲۲ء

ج

مرنے والے داغِ حسرت اپنا اپنا دے گئے
اچھے آئے اچھے تھے اچھے رہے اچھے گئے

وہ ہمارے دل کو لے کر داغِ دل کا دے گئے
کیا بتائیں کیا کہیں کیا دے گئے کیا لے گئے

عشق میں اہلِ وفا رکھتے ہیں بہت کچھ احتیاط
یہ وہ راہِ پر خطر ہے جس جگہ چوکے گئے

کیا دھرا ہے اب یہاں جس کی حفاظت میں کروں
ایک دل آغوش میں تھا وہ اسے بھی لے گئے

یہ حسابِ عمر کا اندھیر کھاتہ دیکھنا
جس قدر بڑھتے گئے ہم اُس قدر گھٹتے گئے

دل تھا اُن کا مال اِن جھگڑوں سے کیا مطلب ہمیں
بچ گیا یا مٹ گیا وہ لے گئے یا دے گئے

حشر میں تو قہر کم بختوں کی اِتنی تو ہوئی
بے خطا سے پیشتر اہلِ خطا پوچھے گئے

عشق میں شاید اُٹھایا ہو کسی نے فائدہ
ہم تو دنیا سے گئے دل سے گئے جی سے گئے

ایک ترکش اِس طرح ہم نے فراہم کر لیا
تیر جو آتے گئے دل میں اُنھیں رکھتے گئے

جلوۂ دیدار کا تو ایک حیلہ ہو گیا
وہ مرا دل لینے آئے تھے مرا دل لے گئے

مٹتے مٹتے محفلِ عالم کی رونق مٹ گئی
رفتہ رفتہ اُٹھنے والے وقت پر اُٹھتے گئے

میں رہا بے خود کچھ ایسا یہ نہ ظاہر ہو سکا
کس طرح گھر میں وہ آئے کس طرح گھر سے گئے

خلق میں پریوں نے چھینا خلد میں حوروں نے دل
ہم جہاں پہنچے وہیں اچھی طرح لوٹے گئے

ہم کو چین آتا نہیں دل کو قرار آتا نہیں
اپنے گھر تک بے بلائے اُن کے گھر تک لے گئے

شعر گوئی نے دکھا دی ہم کو دنیا بھر کی سیر
بمبئی پہنچے کبھی اے نوحؔ کلکتے گئے

طبع زاد ۲۷ر اپریل ۱۹۲۱ء

ج

وفا ہو وعدۂ دیدار ہم نہ مانیں گے
یہ جھوٹ موٹ کا اقرار ہم نہ مانیں گے

کرم پہ آپ ہوں تیار ہم نہ مانیں گے
زمانہ مان لے سرکار ہم نہ مانیں گے

دکھاؤ جلوۂ عارض اُٹھاؤ پردۂ رخ
کہ ہم ہیں طالبِ دیدار ہم نہ مانیں گے

گھڑی گھڑی یہ تمھاری نہیں نہیں کیسی
یہ روز روز کا انکار ہم نہ مانیں گے

ادھر ہے ضد یہ ہماری کہ مان لو کہنا
ادھر یہ ہٹ ہے کہ زنہار ہم نہ مانیں گے

بغل میں ساقیٔ مہوش نظر میں موسمِ گل
نبھے گی توبہ مے خوار ہم نہ مانیں گے

بھلی ہو یا ہو بری کوئی بات ہو لیکن
کبھی وہ کہتے ہیں ہر بار ہم نہ مانیں گے

ترے لئے ترے کوچے میں تیرے کہنے پر
لڑیں نہ کافر و دیں دار ہم نہ مانیں گے

ادھر زبان سے نکلے ادھر ہوئے مشہور
چھپیں گے نوحؔ کے اشعار ہم نہ مانیں گے

طبع زاد ۱۶ / مئی سنہ ۱۹۲۰ء

ج

اپنے اپنے رنگ میں یکتا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے
حسن کی مورت عشق کا پتلا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

دنیا سے کیا مطلب مجھ کو عالم سے کیا تجھ کو تعلق
میرا دل ہے تیرا شیدا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

چل کر پھر کر دیکھا بھالا جانچا پرکھا سمجھا بوجھا
سب سے اعلیٰ سب سے ادنیٰ میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

ظلم سے رکھے کام ہمیشہ دعوے کرتا جائے وفا کا
کون زمانے میں ہے ایسا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

خونِ جگر سے قول رہا یہ میرے اشکِ چشمِ تر کا
چڑھتا دریا بہتا دریا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

تو ہی تو ہے میں ہی میں ہوں عالم میں عالم سے نرالا
دنیا میں دنیا سے انوکھا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

دل نہ تجھے لینا تھا مجھ سے جان مجھے دینی تھی نہ تجھ پر
کیسا دنیا بھر میں رسوا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

کیسی عذرا کیسی لیلیٰ کیسا وامق کیسا مجنوں
اب مشہور جہاں میں کیا کیا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

یوں تو ہیں معشوق ہزاروں یوں تو ہیں لاکھوں عاشق بھی
لیکن بہتر نادر یکتا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

نوحؔ یہ باتیں مٹ جائیں گی تیرے میرے مٹ جانے سے
چاہنے والا عشق و وفا کا میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے

طبع زاد ۱۵ / اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء

ج

چین پائیں کیا ترے بیمار اٹھتے بیٹھتے
ظلم سوتے جاگتے آزار اٹھتے بیٹھتے

جب یہ ظاہر تھا کہ ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں
ہم تری محفل میں کیا بے کار اٹھتے بیٹھتے

شوق کامل ہوگا تو پہنچیں گے قصرِ یار تک
گرتے پڑتے طالبِ دیدار اٹھتے بیٹھتے

اُن کی محفل تک نہ پہنچے بن گئی یوں اپنی بات
اضطرابِ دل سے ہم سو بار اٹھتے بیٹھتے

لطف جب تھا ہر گھڑی پھرتے وہ چشمِ شوق میں
دیکھتا ہیں جلوۂ دیدار اٹھتے بیٹھتے

سیکھ کر آدابِ محفل وہ غضب ڈھانے لگے
اب ہے اک اک بات پر تکرار اٹھتے بیٹھتے

ہر طرف شکوہ ہے بے تابی کا یہ کھلتا نہیں
کس نے دیکھا کس کو لاکھوں بار اٹھتے بیٹھتے

دل بھی دیتا حکم تو گذرے تھے ایسے واقعات
تیری محفل میں نہ ہم زنہار اٹھتے بیٹھتے

بوالہوس رکھنے اگر کوئے محبت میں قدم
کان اپنے تھام کر سو بار اُٹھتے بیٹھتے

مجھ کو میری بے قراری نے نکما کر دیا
دست و پا سب ہو گئے بے کار اُٹھتے بیٹھتے

چلتے پھرتے کیا ترا دل بھی کسی پر آ گیا
بے سبب آہیں نہیں ہر بار اُٹھتے بیٹھتے

ختم ہوتی ہی نہیں زاہد یہ کیسی ہے نماز
عمر گذری تیری اے مکار اُٹھتے بیٹھتے

بیٹھتے اُٹھتے کبھی جو مجھ کو دیتے تھے دعا
کوستے ہیں اب وہی غمخوار اُٹھتے بیٹھتے

نوح کو ہوتا جو اپنے زہد و تقوے کا خیال
کیوں قریب خانہ خمار اُٹھتے بیٹھتے

باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے

الٰہ آباد میور کالج میں اس طرح پر نومبر ۱۹۲۱ء کو مشاعرہ ہوا تھا میں نے یہ غزل وہیں کے لئے کہی تھی لیکن وقت پر نہیں پہنچ سکا

ج

پہلو میں دل رہے مرے دل میں بھی تو رہے
ایسا اگر ہو تو نہ کوئی آرزو رہے

حسرت رہے امید رہے آرزو رہے
لیکن بڑا غضب ہے کہ دل میں نہ تو رہے

پہلو میں دل جو ہو تو کوئی آرزو رہے
ممکن نہیں کہ گل نہ رہے اور بو رہے

بے عزتی سے عمر جو گذری تو لطف کیا
دنیا میں کچھ رہے نہ رہے آبرو رہے

کہتا ہوں جی میں اُن سے کہے جاؤں حالِ دل
جب تک رہے زبان یہی گفتگو رہے

پہلے یہ چاہتا تھا نکل جائے آرزو
اب آرزو ہے دل میں کوئی آرزو رہے

کثرت کو چھوڑ جانبِ وحدت نگاہ کر
یعنی جو دل ہے ایک تو وہ ایک سو رہے

شکوہ ہے مجھ کو نالۂ بے اختیار کا
یہ کون چاہتا تھا پریشان تو رہے

شانہ ہو آئینہ ہو کلیجا ہو یا ہو دل
تقدیر اُس کی ہے جو ترے روبرو رہے

اے دردِ عشق کشمکشِ غم سے فائدہ
پہلو میں دل ہی دل رہے یا تو ہی تو رہے

ہم ناوکِ نگاہ کو مہمان کر سکیں
اتنا تو کم سے کم رگِ دل میں لہو رہے

لازم ہے تجھ کو آرزوں کا نکالنا
اُس دل میں کیوں رہے کوئی جس دل میں تو رہے

اے چشمِ اشکبار گناہوں سے پاک کر
جب تک مٹیں نہ داغ یونہیں شست و شو رہے

راہِ طلب میں حسنِ طلب چاہتا ہوں میں
وہ مجھ کو مل بھی جائیں مگر جستجو رہے

آیا نہ میرے دل کی سمجھ میں یہ رازِ عشق
نکلے بھی اور پھر بھی وہی آرزو رہے

یہ جوشِ اشک اور یہ سیلابِ چشمِ تر
طوفان کیوں نہ آئے جہاں نوح تو رہے

روٹھنے والے قیامت میں منائے جائیں گے

حسب فرمائش جناب خلش صاحب گیاوی ۱۴ر جنوری ۱۹۲۲ء

	ج	
اُس نے یہ کیا کہہ دیا مرقد پر اکثر آئیں گے	ج	کل ہمیں مرنا جو ہوگا آج ہی مر جائیں گے
داغِ دل امداد ضبطِ اشکِ غم سے پائیں گے		آپ باسی ہوگی تو یہ پھول کیوں مرجھائیں گے
یوں تو لاکھوں بار آنے کو یہاں وہ آئیں گے		آئیں گے بیٹھیں گے فوراً اٹھ کے جائیں گے
حالِ دنیا پر نہ اِترائے نہ ہم اِترائیں گے		آتے تھے کیا لائے تھے جاتے ہیں کیا لے جائیں گے
شکوۂ آزار و غم پر یہ سکوت اچھا نہیں		میں تو سب کچھ کہہ چکا اب وہ بھی کچھ فرمائیں گے
یہ شبِ غم دوستوں کی قصہ خوانی ہے فضول		نیند جب آئے گی ہم کو آپ ہی سو جائیں گے
آنے والے ہیں وہ قبرِ کشتۂ بیداد پر		تیر تو برسا چکے اب پھول بھی برسائیں گے
جو رہے گا زندہ وہ دیکھے گا ہم مرنے کے بعد		خاک ہوں گے خاک ہو کر خاک میں مل جائیں گے
یوں بھی ہوگا عشق میں کیا خوب اپنا فائدہ		ایک دل ہم دیں گے تو آزار لاکھوں پائیں گے
اور خوبانِ جہاں سے وہ ابھی واقف نہیں		آئینہ دیکھیں گے تو منہ دیکھ کر رہ جائیں گے
ہائے یہ دنیا کے جلسے ہائے یہ دنیا کا لطف		پہلے پہلے کچھ دنوں جنت میں ہم گھبرائیں گے
یہ سمجھ کر وہ کسی کو قتل اب کرتا نہیں		مرنے والے جتنے ہوں گے آپ ہی مر جائیں گے
اُن کا آنا ان کا جانا قہر مجھ پر ڈھائے گا		دم کی صورت جائیں گے وہ دل کی صورت آئیں گے
آخری کوشش یہی ہے اور تدبیروں کے بعد		جب نہ بن آئے گی کچھ ہم سے تو بس مر جائیں گے
باغِ ہستی میں نہیں کچھ فصلِ گل کا اعتبار		قاعدہ ہے جو کھلیں گے پھول وہ مرجھائیں گے
جب ہوں یہ الفاظ اُن کے تو نہ ہو کیوں کر یقیں		آئیں گے ہم آئیں گے ہاں ہاں ترے گھر آئیں گے
کیسی دنیا کیسی عقبیٰ کیا جہنم کیا بہشت		چین اگر قسمت میں ہے تو ہر جگہ ہم پائیں گے
کہہ گئے ملنے کو لیکن رہ گئی مبہم یہ بات		وہ یہاں آئیں گے یا مجھ کو وہاں بلوائیں گے
تین درجے ہیں بشر کے واسطے یہ تین وقت		خلق ہوں گے عیش و غم دیکھیں گے پھر مر جائیں گے
کون اُٹھتے بیٹھتے رکھے گا مرہم بار بار		زخمِ دل ناسور ہو جائیں گے تو بھر پائیں گے

غرق کر دے گا کسی دن جوشِ بحرِ ذوق و شوق
یہ ہے وہ طوفان جس میں نوح غوطے کھائیں گے

جلوۂ یار میرٹھ کے لئے ۴ر اگست ۱۹۲۲ء

	ج	
انسان ہے اک پردہ پردے میں چھپایا ہے	ج	میں اُن کو بتا دوں گا پوچھیں وہ خدا کیا ہے
لے لیں وہ مرے دل کو اقرارِ وفا کیا ہے		یہ مفت ہی ملتا ہے اچھا ہے بُرا کیا ہے
وہ ظلم ہی ڈھائے گا میں ظلم ہی جھیلوں گا		ہر درد کا درماں ہے عادت کی دوا کیا ہے

بیداد بھی ہو مجھ پہ آزار بھی ہو مجھ کو
الفت میں یہی تو ہے اور اس کے سوا کیا ہے

ظالم سے ہوئی الفت بے درد سے دل اٹکا
معلوم نہیں مجھ کو منظورِ خدا کیا ہے

اظہارِ محبت پہ اقرارِ شکایت پر
ناراض وہ کیا کیا تھا بیزار وہ کیا کیا ہے

محشر میں خموشی پر حیرت نہ مجھے کیوں ہو
دنیا میں تو وہ کافر کہتا تھا خدا کیا ہے

آغوش جو ہو خالی تو لطف نہیں ان کا
بھادوں کی بھرن کیا ہے ساون کی گھٹا کیا ہے

سو قسم کے ہنگامے آفاق میں جو دیکھیں
ہے شانِ خدا پوچھیں وہ شانِ خدا کیا ہے

طوفان اٹھے پیہم غرقاب ہوئی دنیا
اے نوح مگر اس نے یہ بھی نہ کہا کیا ہے

خورشید میرٹھ کے لئے ۳۱ مارچ ۱۹۲۲ء

ج

کیوں مستعد نہ ہو کوئی بیداد کے لئے
یہ پانچ حرف ہیں دلِ ناشاد کے لئے

بہتر یہی ہے اُس ستم ایجاد کے لئے
لے جائے میرے دل کو مری یاد کے لئے

ممکن ہے روک تھام ہو کچھ آسمان پر
جائے دعا بھی آہ کی امداد کے لئے

دنیا میں دل کو اور کوئی کام ہی نہیں
مخصوص ہے یہ صرف تری یاد کے لئے

اللہ رے حوصلہ دلِ صورت پرست کا
مرتا ہے ایک ایک پری زاد کے لئے

کیوں مجھ سے روزِ حشر وہ کہتے ہیں چپ رہو
یہ خاص دن ہے شکوۂ بیداد کے لئے

کیوں مبتلائے غم ہو ٹھہر کر بدن میں روح
پابندیاں فضول ہیں آزاد کے لئے

بہتر یہ ہے کہ دل سے نکل جائے آرزو
وسعت ہو اور ناوکِ بیداد کے لئے

ٹوٹے ہوئے پروں کا تو کچھ تذکرہ نہیں
حاضر ہے میری جان بھی صیاد کے لئے

مرنے کے بعد بھی نہ مٹا اُن کا سلسلہ
تھیں اتنی آفتیں دلِ ناشاد کے لئے

میں چاہتا ہوں رہنے دے رگ رگ میں سوزِ عشق
تھوڑا سا خون ناوکِ بیداد کے لئے

آنے دے مجھ کو آپ میں اے لطفِ بے خودی
مشتاق ہے کوئی مری روداد کے لئے

کیا ہو نشیمن و گل و بلبل کا اعتبار
یہ سب ہیں برق و صرصر و صیاد کے لئے

بے رحم ہیں جو آپ تو دیں تیوری میں بل
خنجر بھی کوئی چاہیے جلاد کے لئے

طوفان کے سبب سے نہ بھولیں گے تجھ کو ہم
اے نوح یہ بہت ہے تری یاد کے لئے

زندگی جرم ہے ہر سانس ہے تعزیر مجھے

اس طرح پر بابو کامتا ناتھ رئیس الہ آباد کے ہاں الہ آباد میں ۸ جولائی ۱۹۲۲ء کو مشاعرہ ہوا تھا میں نے یہ غزل

وہیں کے لئے کہی تھی لیکن علالت کے سبب سے شریکِ مشاعرہ نہ ہو سکا

چین کیا دے نگہِ ناز کی تاثیر مجھے
ہے یہ کیوں حکم بتاؤ کوئی تقصیر مجھے
ہر گھڑی ملتی ہے ایذا مجھے تعزیر مجھے
مجرمِ عشق اگر ہوں تو رعایت بھی نہ ہو
میں یہ سنتا تھا کہ تصویر کھنچا کرتی ہے
یہ سمجھتا ہوں جو اظہارِ وفا کرتا ہوں
وقعتِ کوچۂ جاناں سے خبردار ہوں میں
ناوکِ ناز کلیجے میں اُتر جاتا ہے
میں یہ سنتا ہوں بڑے صاحبِ تدبیر ہیں آپ
کس طرح دل مرے قابو سے نکل جاتا ہے
دل میں رکھ لوں کبھی چپکے سے جو رکھنا چاہوں

ج

ایک اک سانس ہوئی تیغ مجھے تیر مجھے
کیسی تقصیر وہ دے دیں یونہیں تعزیر مجھے
بخشوانی نہیں آتی ابھی تقصیر مجھے
بیچئے جان مری دیجئے تعزیر مجھے
کھینچتی ہے مگر اُس شوخ کی تصویر مجھے
گالیاں دے نہیں سکتی تری تصویر مجھے
ذرے خورشید ہیں مٹی بھی ہے اکسیر مجھے
چلتے پھرتے نظر آتا نہیں یہ تیر مجھے
اپنے ملنے کی بتا دیجئے تدبیر مجھے
دکھنی ہے نگہِ ناز کی تاثیر مجھے
چاہیئے آپ کی اک چھوٹی سی تصویر مجھے

ہے یقیں وہ مرے طوفان سے ڈر جائے گا
نوح کرنے دو یہ اک آخری تدبیر مجھے

طبع زاد ۱۰ دسمبر ۱۹۲۲ء

پرانی پر نئی پوشاک کو ترجیح دی ہم نے
انھیں دل نذر کر کے اپنے سر لی مفلسی ہم نے
یہی آخر ہوا مجبور ہو کر جان دی ہم نے
بسر کی تھی کچھ ان دشواریوں سے زندگی ہم نے
ابھی تک ہے تعلق اِس قدر ترکِ تعلق پر
برابر تھا اثر دونوں طرف جوشِ محبت کا
نگاہِ شوق پردے میں بھی کر جاتی ہے کام اپنا
اگر صاحب سلامت پر یہی برہم مزاجی ہے
وہی آخر ہوا وہ تند خو سن کر بگڑ بیٹھا
محبت کی کہانی کیوں مزا دیتی نہ دونوں کو
رہا پائے طلب کو مشغلہ صحرا نوردی کا
کسی دن اب وہ فرمائیں گے اپنی جان بھی دے دو

ج

کفن پا کر بدل ڈالا لباسِ زندگی ہم نے
گرہ میں جو کھری کھوٹی رقم تھی سونپ دی ہم نے
تری الفت میں اپنے ساتھ کر لی دشمنی ہم نے
جو مر کر قبر میں سوئے تو کروٹ بھی نہ لی ہم نے
جہاں وہ مل گئے رستے میں کر لی بندگی ہم نے
اٹھائیں سختیاں لاکھوں کبھی تم نے کبھی ہم نے
نہ چھپ اے چھپنے والے تیری صورت دیکھ لی ہم نے
تو اُن کی بندگی کو آج سے کی بندگی ہم نے
بیانِ شوق سے پہلے کہا تھا کیا ابھی ہم نے
سنی ہم نے کہی تم نے سنی تم نے کہی ہم نے
گذاری چلتے پھرتے چار دن کی زندگی ہم نے
اُنھیں دل نذر کر کے ایک آفت مول لی ہم نے

کوئی آزار کا شاکی کوئی بیداد کا خواہاں
تری محفل میں دیکھے ہر طرح کے آدمی ہم نے

پڑھایا اِس طرح اُن کو سبق رفعِ کدورت کا
کہ خط لکھا تو خط لکھ کر چھڑک دی خاک بھی ہم نے

خدا جانے کب آئے فصلِ گل اُس وقت تک کیا ہو
مگر ساقی کو دے دی کچھ ابھی سے پیشگی ہم نے

ہمیشہ اپنے جلوے سے کرے گا خوش کوئی کیوں کر
بہت دیکھی ہے ایسی چار دن کی چاندنی ہم نے

پیامِ شوق پر کیا ہو شکایت بد زبانی کی
یہ فرمائیں گے وہ جیسی سنی ویسی کہی ہم نے

رہا پلہ برابر عشق میں تکلیف و راحت کا
اُٹھائے غم بھی اُتنے جس قدر دیکھی خوشی ہم نے

وہ کہتا ہی رہا اے نوح تم رونے سے باز آؤ
مگر پھر بھی نہ کی طوفاں اُٹھانے میں کمی ہم نے

حسنِ یوسف کو سرِ بازار رسوا کیجئے

اس طرح پر ۲۴ فروری سنہ ۱۹۲۳ء کو جناب میر سجاد علی صاحب وکیل کے اہتمام سے راجہ پور الہ آباد میں ایک مشاعرہ ہوا تھا مقامی شعرا میں سے حضرات ماجد محمود صاحب ضامن مسیحی الہ آبادی جناب اثر صاحب و ثاقب صاحب لکھنوی و جناب وفا اکبر آبادی وغیرہ موجود تھے مشاعرہ ایک بجے دن سے شروع ہو کر نو بجے رات کو ختم ہوا سجاد صاحب نے ٹی پارٹی بھی دی تھی

ج

کیوں گلہ کیوں آہ کیوں شرحِ تمنا کیجئے
جس سے ناخوش آپ ہوں اُس کام کو کیا کیجئے

ذوقِ ایذا دے اگر امداد تو کیا کیجئے
ایک زخمِ دل میں سو ناسور پیدا کیجئے

حسن کہتا ہے کہ دل میں عشق پیدا کیجئے
دم رہے یا جائے لیکن آپ ایسا کیجئے

آئینہ دیتا ہے یہ تعلیم مجھ کو بار بار
سامنے اپنے بٹھا کر اُن کو دیکھا کیجئے

مٹ گیا ذوقِ طلب تو ہو گی کیا تکمیلِ شوق
دم میں جب تک دم رہے اُن کی تمنا کیجئے

ہے یہی تدبیر رفعِ شدتِ تکلیف کی
جبر کرنا چھوڑ دیں وہ صبر اِتنا کیجئے

کیجئے ترکِ ستم اُن سے کوئی کہتا نہیں
ہم کو سمجھاتے ہیں سب ترکِ تمنا کیجئے

ہو گیا برباد سارا انتظامِ زندگی
نزع میں کیا سنئے اب کیا کہئے اب کیا کیجئے

شکایتِ چرخِ ستمگر عشق میں ہے ناگوار
ظلم جو کچھ کیجئے مجھ پر وہ تنہا کیجئے

زور دے کر قتل کو میں آپ سے کہتا نہیں
ہو اگر ممکن تو میرا کام اِتنا کیجئے

حضرتِ خضر آپ نے چکھ کے پائی کب نجات
ہے یہی جینا تو مرنے کی تمنا کیجئے

پاس جانا پاس رہنا ہے مشکل وہ محال
بس کسی کو دور سے محفل میں دیکھا کیجئے

آپ کو رشکِ مسیحا کس طرح میں مان لوں
یہ اگر سچ ہے تو مجھ کو جلد اچھا کیجئے

مل گیا اہلِ محبت کو یہ اچھا مشغلہ
روز کھویا کیجئے دل روز ڈھونڈا کیجئے

حسن والوں سے اگر اُلفت ہوئی تو کیا ہوئی
عشق کو جس نے بنایا عشق اُس کا کیجئے

منزلِ موسیٰ طور پر جانے سے کچھ حاصل نہیں		لطف جب ہے وہ جھلک اپنے میں پیدا کیجئے

اشک باری کا انھیں اب تک یقین آتا نہیں
نوح سے کہتے ہیں وہ طوفان برپا کیجئے

وہ یہ کہتے ہیں نہیں مطلب ترے دل سے مجھے

اس ردیف و قافیہ پر ایک جنرل مشاعرہ میرٹھ میں جناب نذرت و حمید کے اہتمام سے ہو چکا تھا میں نے دو غزلیں ایک قافیہ (دل) میں لکھ کر وہاں پڑھی تھیں جو طوفانِ نوح دیوانِ دوم میں درج ہیں پھر دوسرا مشاعرہ بسمل صاحب نے اپنے مکان پر ۲۲ اپریل ۱۹۲۲ء کو بیادگار شفق مرحوم الہ آبادی الہ آباد میں کیا مقامی شعرا جناب ماجد و جناب جوہر رؤسائے شہر کے علاوہ باہر سے عزیز سلونی اور شیدا بلند شہری بھی شریک تھے اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں

ج

اب وہ درسِ عشق میں بھولے گا مشکل سے مجھے
جو ملا غم کا سبق دیباچۂ دل سے مجھے

اِن وفاؤں پر کرے گا قتل کس دل سے مجھے
کوئی دے دے چھین کر تلوار قاتل سے مجھے

دل کی موجوں نے کیا دریائے الفت میں تباہ
آشنا دیتے رہے آواز ساحل سے مجھے

ہر جگہ ہوتا ہے استقبال ہر مہمان کا
موت لینے کو بڑھے گی بزمِ قاتل سے مجھے

اُن کتابوں پر کہ جن میں درج تھے اسرارِ عشق
حاشیہ لکھنا پڑا خونِ رگِ دل سے مجھے

ماسوا کا ذکر کیا خمِ خانۂ توحید میں
کام ہے ساقی سے یا ساقی کی محفل سے مجھے

کیا توقع تھی کہ پھر ہوگا دوبارا سامنا
اے ہجومِ یاس و غم ملنے تو دے دل سے مجھے

سر لئے ہیں گود میں دیتے ہیں دامن کی ہوا
ہے یہ حال اُن کا تو ہوش آئے گا مشکل سے مجھے

بحرِ الفت میں جو اٹھی موج بل کھاتی ہوئی
لے گئی آ کر وہ ہاتھوں ہاتھ ساحل سے مجھے

اور کیا ہوگا اثر اسے اتحادِ حسن و عشق
بوئے قیس آنے لگی لیلےٰ کے محمل سے مجھے

جو اڑا ذرہ وہ پہنچا آسمانِ عشق پر
ہوگئی معراجِ غم بربادیٔ دل سے مجھے

آشنا سمجھے کہ غرقِ بحرِ الفت ہوگیا
آرہی ہے وہ صدا رونے کی ساحل سے مجھے

میں تو سمجھا تھا کہ راہِ عشق اب طے ہوگئی
پھیر لائی گردشِ تقدیر منزل سے مجھے

مٹ گیا میں بھی ہوئے غارت مرے ہم نام بھی
بد دعا کس وقت دی تھی تم نے کس دل سے مجھے

میں بھی نالاں تھی بھی شاکی ساری دنیا بھی خلاف
لیکن الفت دل کی ہے دل سے تجھے دل سے مجھے

میں ہوں پروانہ تری شمعِ رُخِ پرنور کا
بے خودی میں کیا غرض آدابِ محفل سے مجھے

جسم میں جتنی رگیں تھیں خود بخود کھنچنے لگیں
موت نے شاید پکارا کوئے قاتل سے مجھے

میں نے دیکھا پردۂ انسان میں حسنِ سرمدی
کیا بتاؤں کس نے جھانکا کس کے محمل سے مجھے

لاش پر ہوتا ہے یہ کس ہم سفر کا انتظار
دے بھی دیں مٹی نگوڑے گردِ منزل سے مجھے

کھینچ کر میں آہ کیوں کہتا یہ میری آہ تھی — آپ کی آواز آئی پردۂ دل سے مجھے

نوح بحرِ غم کی موجیں غرقِ طوفاں کر گئیں
ہاتھ دھونا ہی پڑا کشتی و ساحل سے مجھے

میری بالیں پر کوئی شرمندۂ تاخیر ہے

۲۶ اور ۲۷ مئی ۱۹۲۳ء کو جناب مولوی زین الدین صاحب کلکٹر کی ایما سے مین پوری حضرات اصغر احقر صادق فدا وغیرہ کے اہتمام سے ایک جنرل مشاعرہ ہوا تھا یہ مشاعرہ بوجہ کثرت شعرا کے تین راتوں میں ختم ہوا ایسی آرائش و زیبائش میں نے کہیں نہیں دیکھی مہمانوں کے ٹھہرنے اور آرام وغیرہ کا خاص انتظام تھا علاوہ مقامی شعرا کے ساحر صاحب برق صاحب دہلوی صوفی صاحب زار صاحب میرٹھی باغ صاحب سنبھلی ذبیح صاحب فرخ آبادی یوسف صاحب علی گڑھی۔ اختر صاحب فیروز آبادی شیدا صاحب بیدم شاہ صاحب اٹاوی رعد صاحب گوالیاری ازل صاحب شاہ جہاں پوری حافظ صاحب پیلی بھیتی دلبر صاحب صابر صاحب مارہروی بسمل صاحب جوش صاحب الہ آبادی ذرہ صاحب گوہر صاحب کان پوری بیدل صاحب وغیرہ شریک مشاعرہ ہوئے صدر جناب سائل صاحب دہلوی تھے

رج

شدت غم سے یہ حالِ عاشقِ دلگیر ہے — اس کی چلتی سانس اس کے حق میں چلتا تیر ہے
منکشف ان پر مرا حال خطِ تقدیر ہے — اس طرح گویا انہیں کے ہاتھ کی تحریر ہے
جس سے کاٹے اٹھے کلیجا اس میں وہ تاثیر ہے — آہ تو ہے تیر میری گفتگو بھی تیر ہے
یہ سراپا بے مزہ بے ربط بے تاثیر ہے — حضرتِ ناصح کی بھی تقریر کیا تقریر ہے
ہر گھڑی تیری نظر میں اک نئی تاثیر ہے — تیغ جانوں تیغ ہے یہ تیر سمجھوں تیر ہے
ہیں نہیں محفل میں لیکن وہ نگاہِ ناز ہیں — اس نظر سے مجھ سے تو اچھی مری تصویر ہے
وہ نگاہِ لطف ان ٹکڑوں کو شاید جوڑ دے — دل مرا ٹوٹا ہوا پھوٹی ہوئی تقدیر ہے
حسنِ روز افزوں نے کتنا فرق پیدا کر دیا — دیکھئے یہ آپ ہیں یہ آپ کی تصویر ہے
جرمِ الفت بخشنے میں لطف اسے آنے لگا — اب نہ ہو تقصیر مجھ سے تو بڑی تقصیر ہے
آپ تو جاتے ہیں دل کا غذ سے میں بہلاؤں کیا — کچھ نہیں تصویر میں تصویر ہی تصویر ہے
ہم جو تڑپانے سے رو کیں بھی تو کس بنیاد پر — آپ ہی کا دل یہ ہے اور آپ ہی کا تیر ہے
پند گو کچھ بھی کہے لیکن کہیں گے ہم یہی — عشق کر کے ترک کرنا عشق کی تحقیر ہے
کیوں نہ دل کو ہم کلیجے سے لگائیں بار بار — یہ تری الفت کی جیتی جاگتی تصویر ہے
ہمنشیں ہم کیا بتائیں کیا جتائیں کیا کہیں — ہر فغاں خود واقعاتِ درد کی تفسیر ہے
حسنِ فطرت دیکھنے والے توجہ تو کریں — ذرے ذرے میں اسی خورشید کی تنویر ہے
ضعف چلنے بھی نہ دے تو کیا چلوں کیا میں بھروں — پانو کی ایک ایک رگ میرے لئے زنجیر ہے

جو کھٹے میں آئینہ آئینے میں تصویر رہے		دل مرے پہلو میں میرے دل میں صورت آپ کی

عشق کی دنیا میں پہنچا ہر جگہ سیلابِ اشک
نوح کا طوفان غم طوفانِ عالم گیر ہے

غم اُٹھانے کے لئے ہم اُن کی محفل میں رہے

۱۴ اپریل ۱۹۲۳ء کو الہ آباد بھگوت باغ میں منشی سکھ دیو پرشاد صاحب بسمل الہ آبادی کے اہتمام سے ایک نہایت عمدہ مشاعرہ اس طرح پر ہوا مقامی شعرا میں حضرات محمود، ماجد، ضامن محسن قمر وغیرہ اور باہر کے مشاہیر شعرا میں سے جناب فصاحت و لیاقت و شفق صاحب و جناب اثر لکھنوی و جناب ابو الخیال گوہر و جناب ذرہ و صمد صاحب وغیرہ موجود تھے مشاعرہ نو بجے شب سے شروع ہو کر پانچ بجے صبح کو ختم ہوا

ج

ہم سے کیوں اس کی شکایت ہے کہ مشکل میں رہے
آپ ہی کا دل یہ تھا آپ اپنے ہی دل میں رہے

سخت آفت سخت زحمت سخت مشکل میں رہے
ہم نہ رہنے کی طرح دنیا کی محفل میں رہے

فکرِ دنیا خوفِ عقبیٰ کا یہی ہے مدعا
ایک ہی جان دُہری دُہری مشکل میں رہے

ایک گھر کے دو ہوں مالک ہے بکھیڑے کی یہ بات
وہ اگر دل میں رہیں تو درد کیوں دل میں رہے

بات کہتا ہوں کسی کو بد دعا دیتا نہیں
جو مجھے مشکل میں رکھے وہ بھی مشکل میں رہے

تھی ہماری زندگی تو کس طرح ہوتے ہلاک
کوئے قاتل میں بسر کی بزمِ قاتل میں رہے

لے گئی اُن کو بھی موجِ بحرِ الفت کھینچ کر
ڈوبنے کے ڈر سے جو آغوشِ ساحل میں رہے

اے ہجومِ درد و غم یہ کشمکش اچھی نہیں
سانس لینے کی بھی گنجائش ذرا دل میں رہے

قیس کی الفت نے لیلیٰ کو بھی مجنوں کر دیا
کون اب محمل میں ٹھہرے کون محمل میں رہے

اس کو گھر کی جستجو تھی دے دیا الفت نے گھر
عافیت سے اب ترا ناوک مرے دل میں رہے

اے ہوائے انقلاب انگیز تجھ سے کیا عجب
خاک دریا میں رہے گرداب ساحل میں رہے

یاس ہو امید ہو پیکان ہو ارمان ہو
جی بہلنے سے غرض ہے کوئی بھی دل میں رہے

اے مسافر ختم کرنی چاہیے یوں راہِ شوق
دوسری منزل کی حسرت پہلی منزل میں رہے

وہ نظر جس سمت اُٹھے گی اُدھر پہنچیں گے ہم
چاہتے ہیں تیر ہر پھر کر اسی دل میں رہے

میں سمجھ لوں خوں بہائے عشق مجھ کو مل گیا
دم اگر میرا نکل کر تیغِ قاتل میں رہے

نقشِ الفت ہی سہی داغِ محبت ہی سہی
کچھ نہ رہنے سے تو یہ بہتر ہے کچھ دل میں رہے

اے تصور ہم ترے ممنونِ احساں کیوں نہ ہوں
اُن کی محفل سے نکل کر اُن کی محفل میں رہے

دیکھنے کو ہیں یہ دو شکلیں مگر مقصد ہے ایک
آرزو میں دل رہے یا آرزو دل میں رہے

قیس نے صحرا بسایا کوہ کن نے کوہسار
رہ روانِ عشق اپنی اپنی منزل میں رہے

دو گھڑی بھی شوخیوں سے جو کہیں رہتے نہیں
کس طرح اتنے دنوں تک وہ مرے دل میں رہے

اور گھر میں کس طرح نبھنا یہ پردہ یہ حجاب
اس نظر سے وہ ہمیشہ خانۂ دل میں رہے

غرقِ دریائے محبت ہو گئے اور آشنا
خاک اڑاتے کو ہمیں آغوشِ ساحل میں رہے

اُن کے آنے سے بڑھی زینت دلِ پُر داغ کی
آج دونوں چاند سورج ایک منزل میں رہے

اشک آنکھوں سے نکل کر کیوں کریں دنیا کو غرق
نوح کا طوفان ہے یہ نوح کے دل میں رہے

مزارِ داغ پر آنسو پیئے وضو آئے

۴ اگست ۱۹۲۳ء کو اس طرح پر ایک مشاعرہ مجبی تولا حسین صاحب کے اہتمام سے ہوا تھا وہ میرے بلانے کو تشریف بھی لائے لیکن میں اپنی علالت سے نہ جا سکا

زبان نہ آئے کہ نشتر چبھونے تو آئے
لہو نہ ہو تو رگِ دل سے کیا لہو آئے ج

نہ غم نہ درد نہ حسرت نہ آرزو آئے
مزا جب آئے مرے دل میں تو ہی تو آئے

مری نظر میں پھرے میرے دل میں تو آئے
مجال کیا جو کبھی ذکرِ آرزو آئے

طریقِ عشق میں یوں لطفِ جستجو آئے
جو میں اِدھر سے چلوں تو اُدھر سے تو آئے

پئیں شراب تو ساغر میں کیا ذرا سی پئیں
ہمارے سامنے خم آتے یا سبو آئے

اثر ملے نہ ملے اس سے ہم کو بحث نہیں
جو آہ نکلے وہ عرشِ بریں کو چھو آئے

یہ کس خیال سے پیرِ مغاں نے حکم دیا
شراب خانے میں جو آئے باوضو آئے

وقارِ عشق پسِ مرگ اور کیا ہوتا
ہماری لاش اٹھانے کو خوب رو آئے

بیانِ شوق کروں واقعاتِ ہجر کہوں
بڑی بھلی جو کبھی اُن سے گفتگو آئے

یہ آئینہ ہے یہ ہم ہیں یہ اب نہ آپ کہیں
جسے ہو دید کا دعوےٰ وہ رو برو آئے

کروں فغاں شبِ فرقت تو دردِ دل ہو سوا
جو سانس لوں گلِ داغِ جگر کی بو آئے

فرشتے جب ہوئے داخل تو یہ خیال ہوا
مزار میں بھی ستانے کو خوب رو آئے

رہے نہ دل کبھی خالی یہی ہے شیوۂ عشق
جو ایک جائے تو ایک اس میں آرزو آئے

فراقِ ساقیِ رنگیں ادا میں ہم جو پئیں
شرابِ سرخ سے خونِ جگر کی بو آئے

جنابِ نوح بڑھا جوشِ غم تو کیا حاصل
خدا کرے کبھی طوفانِ آرزو آئے

طبع زاد ۲۸ جولائی ۱۹۲۳ء

اور کھینچ کر ابھی چل کر کیا کرے
سخت جاں ہم ہوں تو خنجر کیا کرے ج

خود جو مضطر ہو وہ مضطر کیا کرے
دل مرا دل میں ترے گھر کیا کرے

ہو چکا تجھ پر ستم کا خاتمہ
اب ستم چرخِ ستم گر کیا کرے

اُس کے گھر میں اس کے گھر کے آس پاس
کوئی جا کر کوئی رہ کر کیا کرے

ہو جو سر گشتہ گردشِ تقدیر کا
وہ خیالِ دورِ ساغر کیا کرے

میرے دل کو آپ نے تڑپا دیا
دیکھئے اب یہ تڑپ کر کیا کرے

میں کسی سے حال کہہ کر کیا کروں
کوئی میرا حال سن کر کیا کرے

پھر اُٹھا اے نوحؔ وہ طوفانِ نوح
اور جوشِ دیدۂ تر کیا کرے

اُڑتے ہی آشیاں سے گرفتار ہو گئے

اس طرح پر گورنمنٹ ہائی اسکول الہ آباد میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو طلبا نے مشاعرہ کیا میں الہ آباد میں ٹھہرا ہوا تھا وقت پر مجھے اطلاع ہوئی احباب کے اصرار سے یہ مختصر سی غزل کہی اور جا کر پڑھی مقامی شعرا کے علاوہ جناب سید محمد نوح صاحب شہیر مچھلی شہری بھی تھے

ج

پی کر شراب تارکِ پندار ہو گئے
بے ہوش ہم ہوئے تھے کہ ہشیار ہو گئے

کیوں بھول جائے وہ شبِ فرقت کی بے کسی
ہم خود ہی سوئے آپ ہی بیدار ہو گئے

دربانِ عشق نے مرے طرفہ اثر کیا
جتنے تھے چارہ ساز وہ بیمار ہو گئے

اُس نے نگاہِ لطف جو محفل میں پھیر لی
سب اپنی اپنی زیست سے بیزار ہو گئے

الفت میں دل گیا تو گیا اس کا غم نہیں
ہم اُن کے ہتھکنڈوں سے خبردار ہو گئے

اُترے تھے آسماں سے مسیحا زمین پر
اِتنے ہیں ختم آپ کے بیمار ہو گئے

اُٹھی نقابِ رخ تو نہ اُٹھی نگاہِ شوق
جلوے کسی کے مانعِ دیدار ہو گئے

پینا تو کیا شراب کو ہم نے چھوا نہیں
کیا صرف دیکھنے سے گنہگار ہو گئے

بے فکریوں نے عشق کا رستہ دکھا دیا
آزاد ہم ہوئے تو گرفتار ہو گئے

یہ کہہ گیا نگاہ سے لڑنا نگاہ کا
آپس میں میل جول کے اقرار ہو گئے

یا اب جفا کا مجھ کو نہ احساس رہ گیا
یا آپ بے وفا سے وفادار ہو گئے

سودا ہمارے دل کا چکایا نہ جائے گا
کچھ ہے گرہ میں بھی کہ خریدار ہو گئے

اے نوحؔ دوستوں کی یہ تعمیلِ حکم تھی
موزوں بُرے بھلے جو کچھ اشعار ہو گئے

اُٹھا کر لے چلے دامن میں ہم کچھ پھول گلشن سے

چمن سے آپ رہیں کچھ مری پروا نہ کریں ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء کو جناب سید حامد حسین صاحب سجادہ نشین بانکی پور کے اہتمام سے اس طرح پر مشاعرہ ہوا اور دوسرے دن ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء کو پہلے مشاعرے کے ختم ہونے پر گلشن سے دامن سے اس طرح پر لوگوں نے غزلیں پڑھیں مشاعرہ گیارہ بجے دن کو شروع ہو کر ۹ بجے شب کو ختم ہوا اس میں بھی قریب قریب وہی شعرا تھے جو پہلے دن تھے

ج

خدا رکھے اسیری پر بھی نسبت ہے جو گلشن سے
قفس میں آہ کھینچوں تو دھواں اٹھے نشیمن سے

جنوں پر کس طرح لے جاؤں چن کر پھول گلشن سے
گریباں کے بھی ٹکڑے اب گرے پڑتے ہیں دامن سے

کروں اس کا گلہ میں دل سے یا اس چشم پر فن سے
مجھے لٹوا دیا رہبر نے مل کر میرے رہزن سے

مرا جوش جنوں اب پایۂ تکمیل کو پہنچا
ملا چاک گریباں بڑھتے بڑھتے چاک دامن سے

مجھے اندیشۂ روز قیامت ہو تو کیوں کر ہو
نہ وہ آئیں گے مدفن پر نہ میں نکلوں گا مدفن سے

خدا کچھ اور بھی چمکائے تم کو بزم عالم میں
کہ نام حسن روشن ہے تمہارے روئے روشن سے

قدم رکھتے ہوئے گلشن میں اپنا جی دہلتا ہے
نشیمن کو پلٹ آتے ہیں اڑ اڑ کر نشیمن سے

جو رسوا اور کو کرتا ہے رسوا خود وہ ہوتا ہے
زلیخا کا بھی پردہ کھل گیا یوسف کے دامن سے

ادھر تعجیل مجھ کو اور ادھر تاخیر قاتل کو
رگ گردن تڑپ کر باہر آ جائے نہ گردن سے

مرا تعویذ مرقد ایک فرد دفتر غم ہے
سبق عبرت کا لیتا ہو جسے لے وہ مدفن سے

قیامت تھی کسی کے حسن عالم سوز کی بجلی
ابھی تک کچھ دھواں سا اٹھ رہا ہے دشت ایمن سے

غبار ناتواں کو بار غم اٹھنے نہیں دیتا
یہ رہ جاتا ہے مدفن ہی برابر کر مرے مدفن سے

اڑاؤں خاک پھر رزق کیوں ساری خدائی کی
مری قسمت کے دانے آپ کھنچ آئیں گے خرمن سے

وہ پھر فاتحہ آئیں تو کوئی بات کیوں پوچھیں
مری بربادیاں ہوتی ہیں ظاہر میرے مدفن سے

بتوں کی دوستی بھی اک طرح کی دشمنی ٹھہری
برہمن کو لڑا دیتی ہے اکثر وہ برہمن سے

ہماری روح نے کوئی تو ایسا غم اٹھایا تھا
نہ آئی خانۂ تن میں جو نکلی خانۂ تن سے

زہے فیاضی قدرت کمی پھر بھی نہیں ہوتی
ہزاروں پھول لے جاتا ہے گلچیں روز گلشن سے

ہوا نے خاک اڑائی چرخ نے پامال کر ڈالا
کدورت کتنی تھی دونوں کو اک بے کس کے مدفن سے

جھجھو کر تیر جب کھینچا تو گذرا یہ گماں مجھ کو
وہ دل کا حال دیکھیں گے مرے سینے کے روزن سے

بہار باغ الفت کا مزا ایک ایک نے لوٹا
مگر میں لے چلا پھولوں کے بدلے داغ گلشن سے

نظر اٹھتی بھی ہے ان کی تو وہ دل تک نہیں آتی
کبھی گرتی بھی ہے بجلی تو ہٹ کر میرے خرمن سے

ملا عشاق کی آہوں کو بے کس کی دعاؤں کو
اثر کا جس قدر حصہ بچا اس چشم پرفن سے

بہار باغ مجھ کو میری وحشت نے بنایا ہے
چلا آتا ہوں گلشن میں نکل جاتا ہوں گلشن سے

ہوائے شوق بڑھ کر کس لئے آندھی نہیں بنتی
ضرورت خاک کی جتنی ہو لے لے میرے مدفن سے

ہجوم حشر میں شاید بچھڑ جاؤ تو زحمت ہو
مرا دامن ملا کر باندھ لو تم اپنے دامن سے

جناب نوح نکلیں کی ہماری حشر میں کیوں کر
اثر کہتے ہیں جس کو وہ الگ رہتا ہے شیون سے

طبع زاد ۶ مئی ۱۹۲۴ء

ج

محبت میں نیا مجھ پر ہمیشہ جور ہوتا ہے
یہی ہوتا ہے کیا اس کے سوا کچھ اور ہوتا ہے

جوانی میں نرالا ڈھنگ انوکھا طور ہوتا ہے
یہ دن یہ سن یہ عالم یہ زمانہ اور ہوتا ہے

یہ اچھی شکل والے جب وفا سے کام لیتے ہیں
خدا جانے وہ کیسا عہد کیسا دور ہوتا ہے

وہ اپنے ظلم کرنے کا نتیجہ آپ ہی سوچیں
وہی ہوتے ہیں یا بدنام کوئی اور ہوتا ہے

نہیں معلوم کیا مرقد میں گذرے ہم یہ سنتے ہیں
فلک کے ظلم سے بڑھ کر زمیں کا جور ہوتا ہے

خدا کے واسطے اے ہم نشیں خاموش رہنے دے
جو ذکر عیش کرتا ہوں تو صدمہ اور ہوتا ہے

توقف کچھ نہیں بس آپ یہ کہہ دیں کہ مر جاؤ
ابھی مرتا ہوں میں یہ کام ابھی فی الفور ہوتا ہے

زمانے کے مصائب تو زمانے کے مصائب ہیں
جو صدمہ عشق میں ہوتا ہے وہ کچھ اور ہوتا ہے

یہ دیکھا ہم نے خود بھی اور پھر تم نے بتایا بھی
تغافل حد سے جب بڑھتا ہے تو وہ جور ہوتا ہے

جو وہ چاہیں تو کیا مشکل مقدر کا بدل جانا
ہمارا حال ابھی کچھ اور سے کچھ اور ہوتا ہے

جہاں اے نوح مجھ کو حکم دیتے ہیں وہ رونے کا
وہیں طوفان اشکوں کا بپا فی الفور ہوتا ہے

طبع زاد ۲۰ جولائی ۱۹۲۴ء

ج

چاہیے لیکن نہ اتنی خود پسندی چاہیے
دردمندوں کی بھی تم کو دردمندی چاہیے

اور اے قاتل مجھے کیا ارجمندی چاہیے
سرفروشی کے صلے میں سربلندی چاہیے

یہ بھی شان حسن ہے کیا اس سے تم واقف نہیں
خودنمائی کے علاوہ خود پسندی چاہیے

جلوۂ رخ سے وہ دیں زینت دل پر داغ کو
خانۂ تاریک میں آئینہ بندی چاہیے

گرتے پڑتے ہم پہنچ جائیں گے قصر یار تک
فکر میں وسعت ارادے میں بلندی چاہیے

ہم یہ کہتے ہیں بلا کھینچیں گے اُن کو دقت ہم
دل یہ کہتا ہے ابھی سے پیش بندی چاہیے

یہ تغافل یہ ستم یہ بے رخی اچھی نہیں
کچھ توجہ کچھ کرم کچھ دردمندی چاہیے

ہو گیا پامال دل پھر وہ ظالم مستعد
کیوں کہا میں نے کہ مجھ کو سربلندی چاہیے

کیوں نہ میں نے مالک روز ازل سے کہہ دیا
بدنصیبی کی جگہ اقبال مندی چاہیے

دل سے جل کر آگئی لب تک مری آہِ رسا ۔ عرش کو اب اور تھوڑی سی بلندی چاہیے
کیوں نہ چمکیں اوس کے قطرے کہ آپہنچی بہار ۔ ایک ایک پتی پر اب آئینہ بندی چاہیے

کشتیِ طبعِ رواں اے نوح رکتی ہی نہیں
کیا اسے بھی کوہِ جودی کی بلندی چاہیے

۲۵ر جولائی سنہ ۱۹۲۴ء

شبنم کے ہر آنسو میں بات نرالی ہوتی ہے ۔ فرشِ چمن پر قطرہ ہے برگِ شجر پر موتی ہے
پروانوں کے جلنے پر شمع بہت کچھ روتی ہے ۔ گود میں لے کر اشکوں کو خود یہ ستی بھی ہوتی ہے
لمبی چوڑی راتوں میں چین سے دنیا سوتی ہے ۔ میں قسمت کو روتا ہوں قسمت مجھ کو روتی ہے
شرحِ مصیبت کرنے پر ظلم اٹھا کر مرنے پر ۔ حسن کی دنیا ہنستی ہے عشق کی دنیا روتی ہے
پاس نہ آئے دور رہے ظلم و ستم کی گرم ہوا ۔ نخلِ وفا کے سائے میں حسرت میری سوتی ہے
صبر بہت دشوار طلب چاہ بڑی تاخیر پسند ۔ آتے آتے آتا ہے ہوتے ہوتے ہوتی ہے
چند گھڑی دل جل کر آئیں بھی چونکا ہیں بھی ۔ عشق کے دلکش منظر میں حسن کی دیوی سجتی ہے
رنج و الم کا بھی کھٹکا ظلم و ستم کا بھی دھڑکا ۔ عشق کی اوگھٹ گھاٹی میں اک سوئی چبھتی ہے
شورِ قیامت ہی اٹھ کر جلد کہیں بیدار کرے ۔ نالے نکلیا جھلتے ہیں قسمت میری سوتی ہے
خارِ تمنا تو نکلے لیکن اس کا باعث کیا ۔ دل پر ہاتھ جو رکھتا ہوں دل میں کھٹک سی ہوتی ہے
بحرِ ستم کے ساحل پر خونِ وفا کی موجوں میں ۔ قاتل ہاتھ ڈبوتا ہے تیر چھری منھ دھوتی ہے
پھر کھولوں یا حشر کہوں اور تو کوئی لفظ نہیں ۔ دل جس میں مٹ جاتا ہے وہ ساعت کیا ہوتی ہے
رنج و خوشی کے عالم میں دیکھا سارے عالم کو ۔ آدھی دنیا ہنستی ہے آدھی دنیا روتی ہے
بہتے ہیں اشک آنکھوں سے ضبطِ فغاں میں کرتا ہوں ۔ رک جاتی ہے تیز ہوا زور کی بارش ہوتی ہے
دشتِ جنوں میں اہلِ جنوں کچھ نہ کہیں خاموش رہیں ۔ صبحِ وطن کے چرچے پر شامِ غریبی روتی ہے
سوچ سمجھ سے مطلب کیا حسن و عشق کی شورش کو ۔ دل کے لینے دینے میں چھان پھٹک کب ہوتی ہے

اب طوفانِ محبت سے چھٹکارا ممکن ہی نہیں
کشتی بیچ سمندر میں مجھ کو نوح ڈبوتی ہے

۳۱ر جولائی سنہ ۱۹۲۴ء

اس ردیف و قافیہ پر لکھنؤ میں مشاعرہ ہو چکا تھا چند احباب کی غزلیں سن کر میں نے بھی یہ غزل کہی

عشق کا جب چرچا مرے دل کا فسانہ چاہیے ۔ وہ بھی چاہیں گے مگر اس کو زمانہ چاہیے
ہم نشیں فرقت کی شب شرحِ قیامت ہی سہی ۔ نیند آنے کے لئے کوئی فسانہ چاہیے

سیکڑوں نقشِ محبت سیکڑوں داغِ فراق
اور اب کیا دل کو قاروں کا خزانہ چاہیے

آج راحت کل اذیت آج غم کل انبساط
کب زمانے کے بدلنے کو زمانہ چاہیے

واقعاتِ دہر سُن کر تجربہ بڑھ جائے گا
اگلے لوگوں کے لئے پچھلا فسانہ چاہیے

اہلِ دل کو جلوۂ دیدار کی حاجت نہیں
حسن کا ایما ہے عشقِ غائبانہ چاہیے

دادِ محشر ہیں خوبانِ جہاں بھی دھوپ میں
کم سے اِن کے لئے تو شامیانہ چاہیے

حسنِ نامحدود کے جلوے سما سکتے نہیں
خانۂ آئینہ میں آئینہ خانہ چاہیے

ہم یہ کہتے ہیں کوئی لحظے میں ملتا ہے کوئی
دل یہ کہتا ہے ابھی اِس کو زمانہ چاہیے

وہ توجہ سے سنیں تو کس طرح میں چپ رہوں
گوشِ دل کے واسطے دل کا فسانہ چاہیے

اِس سبب سے کثرتِ آزار میں ہے ذکرِ عیش
جو زمانہ جا چکا پھر وہ زمانہ چاہیے

پھر بندھی جوشِ جنوں میں وحشتِ یکتائی کی دُھن
اب مجھے دو بیڑیاں اک قید خانہ چاہیے

نوحؔ کے حالات کیوں اے نوحؔ تم سنتے نہیں
جو ہو جیسا اُس کو ویسا ہی فسانہ چاہیے

طبع زاد ۲۴ر اگست سنہ ۱۹۲۴ء

کھینچ کر بزمِ جہاں میں چند نالے چل دیے
رہنے والے رہ گئے چل دینے والے چل دیے

ہیں کروں دل یا جگر کا شکوہ راہِ عشق میں
چھوڑ کر مجھ کو مرے نازوں کے پالے چل دیے

بوالہوس آتے ترے خنجر کے آگے کس طرح
امتحاں گاہِ وفا سے ڈرنے والے چل دیے

آئیے بھی تو کہہ سکا میں کچھ نہ دل کا ماجرا
مجھ سے وہ کرتے ہوئے حیلے حوالے چل دیے

کشتگانِ آرزو کے غم سے کچھ حاصل نہیں
ہاتھ اب ملتے رہو چل دینے والے چل دیے

تھا یہ اپنا واقعہ مہماں سرائے دہر میں
آئے ٹھہرے جو صلے دل کے نکالے چل دیے

دیکھنا یہ ہے نہیں پاتے کہ پا لیتے ہیں اثر
عرش کی جانب نکل کر دل سے نالے چل دیے

قصۂ پُر درد میرا کس طرح ہوتا تمام
کچھ سنا یا تھا کہ اُٹھ کر سننے والے چل دیے

یہ بھی ہے کوئی عیادت یہ بھی کوئی اجتناب
آپ بالیں سے مجھے بے دیکھے بھالے چل دیے

رازِ الفت کس طرح کھلتا پھر اہلِ بزم پر
دل ہی دل میں کھینچ کر ہم چند نالے چل دیے

کیوں جناب نوحؔ پر مجھ کو ہے اتنی برہمی
لے تری محفل سے وہ طوفان والے چل دیے

لطف بھگوت باغ میں ہیں گلشنِ کشمیر کے

یہ مشاعرہ بھگوت باغ الہ آباد میں منشی سکھ دیو پرشاد صاحب بسملؔ الہ آبادی کے اہتمام سے ۳۰ر مئی سنہ ۱۹۲۵ء کو

نو بجے شب سے شروع ہو کر سات بجے صبح کو ختم ہوا مقامی شعرا کے علاوہ جناب آزاد صاحب سہسرامی و حضرات ذرّہ گوہر مضطر مولانا عروج مولوی امیر محمد خاں صاحب امیر کانپوری اور دو تین شاعر جن کے اسمائے گرامی یاد نہیں رہ گئے شریک ہوئے تھے عام خیال ہے کہ اتنا بڑا مشاعرہ الہ آباد میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور مجھ کو بھی اتفاق ہے

ج

جانچ لے اے دیکھنے والے دلِ نخچیر کے
کتنے قطرے خون کے ہیں کتنے ٹکڑے تیر کے

جو کبھی قائل نہ تھے جذباتِ پرتاثیر کے
اب گریباں گیر ہیں وہ اپنے دامن گیر کے

لکھ دئے حالاتِ عشق و حسن پرتاثیر کے
ہر زباں میں ترجمے ہوں گے مری تقریر کے

مر گئے ہم مٹ گئے ارمان بھی تاثیر کے
دن پھرے اتنے دنوں میں نالۂ شب گیر کے

لگ گیا میری سمجھ میں عیش و غم کا فلسفہ
دیکھ کر نقشے تمھاری دو رخی تصویر کے

دیکھئے اچھا برا کیا ہو سفارش کا اثر
لے چلی تدبیر مجھ کو سامنے تقدیر کے

دیکھ کر یہ حال میرے غم کا اندازہ کرو
دل جہاں تھا اب وہاں ہیں چند پیکاں تیر کے

کیا کروں سعیِ رہائی کچھ پتہ چلتا نہیں
اس طرح جوڑے گئے دونوں سرے زنجیر کے

ہو گئی میری ہوائے شوق بھی تیری طرف
اڑ گئے دامن سے ذرّے خاکِ دامن گیر کے

کیوں خدائی پر نظر ڈالیں نہ خاصانِ خدا
ہے مصوّر بھی نہاں پردے میں اس تصویر کے

تھی بیانِ شوق پر جتنی تری ترچھی نگاہ
اتنے ہی ہیں میرے دل میں زخم گہرے تیر کے

کیا عجب طولِ اسیری ہو رہائی کا سبب
گھستے گھستے گھس گئے حلقے مری زنجیر کے

آستیں ہے جیب ہے دامن ہے اے دستِ جنوں
مل رہیں گے ہر کہیں ٹکڑے تری تقدیر کے

واقعاتِ عشق پر ڈالو نہ معمولی نگاہ
یہ تماشے دل کے ہیں یہ کھیل ہیں تقدیر کے

سب نے آنکھوں میں نگاہوں میں دلوں میں دی جگہ
سیکڑوں دل گھر بن گئے ایک آپ کی تصویر کے

کوچۂ الفت میں دی تقدیر نے مجھ کو شکست
میں چلا تھا اپنے گھر سے زور پر تدبیر کے

اہلِ زنداں یہ سمجھ لیں موسمِ گل آ گیا
گر پڑیں جب ٹوٹ کر حلقے مری زنجیر کے

دل میں آیا دل میں بیٹھا دل میں تو گھر کر چکا
لیکن اب کھلتا نہیں کیا ہیں ارادے تیر کے

کیسے آئے کیسے ہو کیسا ہے جی کیسا مزاج
بس یہی دو چار فقرے ہیں عمل تسخیر کے

میں اگر دل میں چھپاتا ہوں تو میرے جسم پر
رہ گئے بن کر ابھر آتے ہیں ٹکڑے تیر کے

خاک چھنوائی تھی الفت ہم سے کوئے یار میں
اتفاقاً چند نسخے مل گئے اکسیر کے

بے وفا کو روک کر عہدِ وفا لے ہی لیا
ہتھکنڈے ہیں کیا ہمارے دستِ دامن گیر کے

ہے عناصر پر جہاں میں جسمِ آدم کا قیام
چار رخ چار آئینے ہیں ایک ہی تصویر کے

زور دے کر دفعتاً پہلو سے کھینچوں کس طرح
دل بھی ہو گا آ گئے پیچھے دہنے بائیں تیر کے

اس ادا سے بھی تری کم التفاتی کھل گئی
اے مرے کھنچوانے والے نیم رخ تصویر کے

نوح سے وہ پوچھتے ہیں اس طرح مدت کی بات
کیا تمھیں باعث تھے اس طوفان عالم گیر کے

چین سے خوب بسر کی ترے شیدائی نے

اس طرح میں ۲۴ جنوری ۱۹۲۵ء کو نواب میاں جانی صاحب آغا میر کی ڈیوڑھی لکھنؤ پر ایک مشاعرہ بڑے پیمانے سے ہوا حضرات شمس سراج عزم قتیل وصل ثروت دانش ابر بلیغ محشر ثاقب عزیز صفی شہرت شمر بہار شفیق ناصری ظریف لکھنوی مختلف مقامات سے وشنو دل صاحب شاہ جہاں پوری ماجد ضامن الہ آبادی وغیرہ موجود تھے حضرت سائل دہلوی مدظلہ نے آخر میں اپنی غزل پڑھی میری غزل پر سامعین نے خاص طور سے داد دے کر میری حوصلہ افزائی فرمائی مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہو کر ایک بجے دن کو ختم ہوا

ج

غم نہ غمزوں نے دیئے رنج نہ رعنائی نے
دل کا ستھراؤ کیا آپ کی انگڑائی نے

مجھ کو منظر وہ دکھائے تری انگڑائی نے
ہاتھ ہی کھینچ لیا صبر و شکیبائی نے

اب ادھر جاؤں ادھر جاؤں کدھر جاؤں میں
ہر طرف سے مجھے گھیرا شب تنہائی نے

حسن دل کش جو ہوا چرخ بریں سے نازل
لے لیا ہاتھ بڑھا کر تری انگڑائی نے

اب سر طور دکھائے کیسے جلوہ کوئی
کھو دیا سب کا بھرم ایک تماشائی نے

مطمئن بھی نہ ہوا تھا دل مشتاق جمال
اتنے میں لوٹ لیا آپ کی رعنائی نے

کر چکی تھیں اسے غرقاب ادا کی موجیں
تہ نشیں دل کو ابھارا مگر انگڑائی نے

رہ گیا عالم وحشت تہ و بالا ہو کر
یوں ورق دشت کے الٹے ترے سودائی نے

یہ بھی اچھا ہے کہ وہ دل کو مرے چور کریں
ایک آئینے سے بن جائیں ہزار آئینے

اٹھ گئے ہاتھ زمانے میں ضیا پھیل گئی
دو ہلال اور دکھائے تری انگڑائی نے

مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کیا تمھیں معلوم نہیں
کس کا دل لوٹ لیا کس کی خود آرائی نے

یاس و امید کے دریا میں ڈبویا مجھ کو
مد و جزر اپنا دکھا کر تری انگڑائی نے

خضر کچھ بھی کہیں میں تو یہ کہے جاؤں گا
ان کو مرنے نہ دیا تری مسیحائی نے

صبح تک دل بھی تپ غم سے نہ جلتا کیوں کر
شرط باندھی تھی چراغ شب تنہائی نے

اب پہنچنا مری فریاد کا دشوار نہیں
چرخ کی راہ بتا دی تری انگڑائی نے

حضرت نوح ہیں اسمی ہی مشرف کیا کم تھا
چار چاند اور لگائے سخن آرائی نے

ہوا کے دوش پہ مر کر مرا غبار رہے

اس طرح یہ ۱۹ر مارچ ۱۹۲۵ء کو مین پوری میں مشاعرہ ہوا مقامی شعرا میں سے حضرات مائل فدا صادق شاد اصغر صاحبان اور باہر کے شعرا میں سے بسمل و غنی الہ آبادی جناب فصاحت لکھنوی بیدم صاحب اٹاوی جناب قمر صاحب بدایونی اور جناب احسن صاحب مارہروی جناب یاس صاحب عظیم آبادی وغیرہ شریک تھے مشاعرہ ساڑھے دس بجے شب سے شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا

ہمارے سامنے ہردم وہ گل عذار رہے
جو یہ بہار رہے تو بڑی بہار رہے

وہ کیوں نہ کہہ دیں کہ بے شک جفا شعار رہے
رہے رہے مرے لب پر جو بار بار رہے

مزا تو جب ہے کہ دل اپنا داغ دار رہے
نہ ہو بہار کا موسم مگر بہار رہے

ہم اس کمالِ غمِ عشق کے نثار رہے
کہ بے قرار ہوئے اور برقرار رہے

اثر پذیر اگر حسنِ رنگ یار رہے
جدھر نگاہ اُٹھاؤں اُدھر بہار رہے

ہم اپنے سوزِ محبت پر اشکبار رہے
پئے مزار بھی شمعِ سرِ مزار رہے

نشاط و عیش کا موقع ہمیں کبھی نہ ملا
قرار ہی کے تردد میں بے قرار رہے

چلا تو ہے دلِ پر شوق اُس گلی کی طرف
اِدھر اُدھر کے کبھی حملوں سے ہوشیار رہے

چمن میں جا بیٹھے ہیں سب چمن کے خیر طلب
کہیں نہ آئے نہ جائے یہیں بہار رہے

خراشِ ناخنِ غم نے مجھے ہلاک کیا
عجب نہیں جو منقش مرا مزار رہے

اِدھر بھی اہلِ محبت اُدھر بھی اہلِ وفا
کدھر کدھر نگہِ التفاتِ یار رہے

یہی تھا آپ کے اقرار گفتگو کا سبب
کوئی ازل سے ابد تک امیدوار رہے

جمالِ یار کے آگے رہے نگاہ مری
مری نگاہ کے آگے جمالِ یار رہے

تلافیِ ستمِ بے حساب کیا معنی
یہی بہت ہے وہ کچھ دن شرمسار رہے

جنابِ نوح کا طوفانِ شوق کم نہ ہوا
یہ ساری عمر محبت میں اشکبار رہے

ان حسینوں سے کوئی پوچھے ادا کیا چیز ہے

اس طرح یہ ۲۴ر مارچ ۱۹۲۵ء کو نمائش میرٹھ میں مشاعرہ ہوا میرا بھی قصد شرکت کا تھا لیکن علالت کی وجہ سے نہ پہنچ سکا

فکر جب ہوگی کہ ترکِ ماسوا کیا چیز ہے
خود بخود ہم جان جائیں گے خدا کیا چیز ہے

یہ کبھی ناوک وہ کبھی خنجر یہ کبھی آفت وہ کبھی قہر
آپ کی سیدھی نظر بانکی ادا کیا چیز ہے

کھینچ کر ایک ایک کو اپنی مدد پر لائے گی
یہ نہ جانو تم کہ بے کس کی دعا کیا چیز ہے

آج کہتے ہو خدائی میں کوئی مجھ سا نہیں
کل تعلّی میں یہ کہہ دو گے خدا کیا چیز ہے

کیوں نہ رکھ دیں روبرو ہم اپنے دل کا آئینہ
دیکھ لے وہ بھی ذرا اُس کی ادا کیا چیز ہے

پھر خزاں آئے گی پھر گلشن سے جائے گی بہار
چار دن کی یہ ہوا ہے یہ ہوا کیا چیز ہے

جاؤ جاؤ اور اگر منظور ہو یہ پوچھنا
آؤ مل کر میں بتا دوں مدعا کیا چیز ہے

بے تعلق ہی جو وہ ٹھہرا تو اس کے روبرو
آشنا کیا چیز ہے نا آشنا کیا چیز ہے

اب ہمیں اس کے لئے بے موت مرجانا پڑا
پوچھتے پھرتے ہیں وہ بزم عزا کیا چیز ہے

کروٹیں لیتا نہیں وہ سونے والا شام کا
یہ ہماری پچھلی راتوں کی دعا کیا چیز ہے

وہ بت کافر ہوا کچھ اور مجھ سے بدگماں
اتنے کہنے پر خدا رکھے خدا کیا چیز ہے

مدعا کیا چیز ہے اس سے تو ہوں میں باخبر
بے خبر اس سے ہوں ترک مدعا کیا چیز ہے

دیکھ لو اپنے کسی مہجور کا دم توڑنا
یہ نہ پوچھو شیوۂ عشق و وفا کیا چیز ہے

ساری دنیا مبتلا ہم مبتلا تم مبتلا
عشق کوئی سحر یا اعجاز یا کیا چیز ہے

نوح کو آزار دے کر تم نے آفت مول لی
اب نہ یہ کہنا پیمبر کی دعا کیا چیز ہے

ارمان مبارک ہوں انھیں ظلم و جفا کے

اس طرح پر مکرمی حکیم جگر صاحب کے اہتمام سے بسواں ضلع سیتاپور میں ایک مشاعرہ ہوا اسی کے لئے ۸ر جولائی ۱۹۲۵ء کو یہ غزل کہی تھی لیکن شریک نہ ہو سکا

ج

کیوں ہم نہ رہیں منتظر الطاف و عطا کے
اچھے کہ برے کچھ بھی ہوں بندے ہیں خدا کے

گنتی کے لئے اور بھی بندے تھے خدا کے
حصے میں ہمیں آئے مگر اہل جفا کے

پائے گی اثر حوصلے نکلیں گے دعا کے
ہر چیز ہے کیا چیز نہیں گھر میں خدا کے

میں جلوہ گہ ناز سے زندہ نہ پھروں گا
حسرت لئے جاتی ہے مجھے منہ میں قضا کے

دنیا سے نرالے ہیں مریضان محبت
قائل نہ دوا کے نہ دعا کے نہ شفا کے

کیا اس بت کافر وہ ترے عہد وفا ہیں
ممکن نہیں منسوخ ہوں احکام خدا کے

آزار محبت میں کبھی ہم نے نہ دیکھی
خالی گئے اچھے عمل رد بلا کے

نالے مرے تاثیر دکھائیں نہ دکھائیں
کیا ان کا بھروسہ کہ یہ جھونکے ہیں ہوا کے

مطلب تو بڑی بات ہے مطلب سے غرض کیا
معلوم نہیں آپ کو معنی بھی وفا کے

کیا شاد ہوں مرغان گرفتار قفس میں
آتے نہیں گلزار سے جھونکے بھی ہوا کے

اچھی کہی میں عید کے دن تم سے ملوں گا
ملنا ہے تو مل جائیے سب دن ہیں خدا کے

بخشی انھیں دونوں نے مصیبت سے رہائی
ممنون ہیں ہم اپنی قضا ان کی ادا کے

کہہ دو کہ سنبھالیں ملک اب چرخ بریں کو
کچھ اور ارادے ہیں مری آہ رسا کے

ہم چاہتے ہیں عشق میں اس حسن سے مرنا
یعنی جو قضا آئے تو ہم دے دیں ادا کے

ہیں ظلم اٹھا کر بھی نہ شاکی ہوں کسی کا
دستور یہ کیا خوب ہیں دنیائے وفا کے

اے پیرِ مغاں میں نہیں کونین کا طالب
دے دے مجھے دو جام مے روح فزا کے

مانا کہ مرے دل کو چرایا نہیں چھپ کر
باندھے گئے کیوں ہاتھ ترے دزدِ حنا کے

اے دیکھنے والو نگہِ غور سے دیکھو
بندوں میں بھی موجود ہیں انوار خدا کے

پہچان یہی عشق میں ہے اہلِ جفا کی
سُنتے نہیں وہ تذکرے اربابِ وفا کے

اے نوح پکارے کبھی تو کیا کوئی کہہ کر
دو چار نہیں نام بہت سے ہیں خدا کے

طبع زاد ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

خلق ہو کر آپ پر شیدا ہوئے
ہم اسی کے واسطے پیدا ہوئے

جبر سے یہ حوصلے پیدا ہوئے
اپنے شیدائی کے وہ اب شیدا ہوئے

کیوں نہ دے دیں پھر تمھیں ہم اپنی جان
ہم جو مرنے کے لئے پیدا ہوئے

ہم کو دل نے کر دیا بے اختیار
آپ پھر کیا آپ سے شیدا ہوئے

بڑھتے بڑھتے بات اُن سے بڑھ گئی
سلسلے میں سلسلے پیدا ہوئے

دیکھئے آتی ہیں کیا کیا آفتیں
بے جگہ ہم بے طرح شیدا ہوئے

وہ شبِ فرقت بلاؤں کا ہجوم
یہ سمجھ لو پھر سے ہم پیدا ہوئے

ہم سے پوچھے کوئی لطف آزار کا
جب ہوئے بے درد پر شیدا ہوئے

پھر حسینوں سے لڑی میری نگاہ
عشق کے آثار پھر پیدا ہوئے

یہ ہمارا ہے کہ اُن کا ہے قصور
جب کیا شیدا تو ہم شیدا ہوئے

اُس نے یہ پوچھا ہمارے ذکر پر
کیا جنابِ نوح پھر پیدا ہوئے

خوش رہیں دامنِ صحرا کے بسانے والے

اس طرح برمہن گانوں ضلع الہ آباد میں مشرقی صاحب نے ۱۲ر جون ۱۹۲۶ء کو مشاعرہ کیا مہمانوں کی خاطر مدارات جس پیمانے پر یہاں کی گئی بہت کم دیکھنے میں آئی ہے لیکن جن صاحبوں نے شرکت کے وعدے کئے تھے اُن میں کم لوگوں نے شرکت کی مقامی شعرا نے اپنی غزلیں پڑھیں چونکہ رضا ابن صفا آورد ماجد صاحب نہیں آسکے تھے اور افسر صاحب میرٹھی نے بھی غزل پڑھنے سے احتراز کیا اس باعث سے میں نے بھی اپنی غزل نہیں پڑھی بسمل صاحب رونق صاحب نشتر و درد صاحب الہ آباد سے اور عیش صاحب کو بلہا سے آکر شریک ہو گئے تھے یہ مشاعرہ کوئی کامیاب مشاعرہ نہیں کہا جاسکتا تین چار گھنٹے میں ختم ہو گیا

ج

لٹھ گئے اب نہیں ہم پھول چڑھانے والے
ساتویں آٹھویں دن قبر پر آنے والے

آ ادھر آ مرے پہلو میں نہ آنے والے
دور سے جلوۂ دیدار دکھانے والے

نالہ ہائے دلِ سوزاں کا نکلنا کیسا
آگ میں جل گئے خود آگ لگانے والے

میں بھی برباد ہوا قبر بھی پامال ہوئی
اب مٹائیں گے کسے میرے مٹانے والے

ہو گیا ظلم بھی توقیر مراتب کا سبب
دل میں رہتے ہیں مرے دل کے ستانے والے

نشۂ بادۂ الفت کا اترنا معلوم
ہوش میں آئیں مجھے ہوش میں لانے والے

منزلِ عیش و مسرت کا پتہ بھی نہ ملا
خاک ہم اڑاتے ہی رہے خاک اڑانے والے

رہ نوردانِ عدم اتنے پریشاں کیوں ہو
تم چلو ہم بھی کوئی دن میں ہیں آنے والے

جام پر جام ملیں پھر بھی کہ بے ہوش رہوں
گھونٹ دو گھونٹ صبوحی کے پلانے والے

روز کے ظلم کا اچھا یہ نتیجہ نکلا
خلق سے اٹھ گئے آزار اٹھانے والے

میں تجھے تیری ہی آنکھوں کی قسم دیتا ہوں
اس طرف دیکھ لے اس سمت کے جانے والے

رہنما وادیِ غربت میں کوئی بھی نہ ملا
جب ملے مجھ کو ملے راہ بتانے والے

وہ بلاتے ہیں جو ہم کو تو خوشی کیا اس کی
ہے یہ مطلب ترے گھر ہم نہیں آنے والے

دل بھی ہل جائے گا پھر دل سے یقیں ہے مجھ کو
پہلے تم آنکھیں تو ملا ہاتھ ملانے والے

شامِ غم صبحِ مسرت سے بدل جائے گی
اب کوئی دن میں یہ دن ہیں مرے آنے والے

حضرتِ نوح سے کیا آپ خبردار نہیں
کون ہاں ہاں وہی طوفان اٹھانے والے

طبع زاد ۵ ستمبر ۱۹۲۶ء

ج

دم نکلتا ہے غم نکلتا ہے
ایک کے ساتھ ایک چلتا ہے

نالہ منہ سے نہیں نکلتا ہے
بات کرتا ہوں جی دہلتا ہے

بزمِ ساقی میں جی بہلتا ہے
جام چلنے سے کام چلتا ہے

چل دیا کوئی مجھ کو دم دے کر
اب کوئی دم میں دم نکلتا ہے

موت کی آرزو میں جیتا ہوں
کام ناکامیوں سے چلتا ہے

ہم کو پہچاننا ہوا مشکل
سیکڑوں روپ وہ بدلتا ہے

ہے ضیا داغِ عشق کی دل میں
کوٹھری میں چراغ جلتا ہے

جا رہا ہوں عدم کو میں تنہا
اب چلے کون ساتھ چلتا ہے

کام چلتا ہے سانس چلنے سے
کام چلنے سے نام چلتا ہے

لالہ و گل کو دیکھ کر یہ کھلا
رنگ پر رنگ وہ بدلتا ہے

کیا تری انجمن کو حاجتِ شمع
ایک سے ایک دل میں جلتا ہے

گھر سے باہر وہ آنے والے ہیں
چاند ڈوبا ہوا نکلتا ہے

کبھی شکوہ کبھی دعا کبھی آہ
دردِ دل صورتیں بدلتا ہے

کیا مرا دل سنبھل نہیں سکتا
تم سنبھالو ابھی سنبھلتا ہے

مجھ کو پامالِ غم جو کرتا تھا
وہ میر قبر ہاتھ ملتا ہے

شب کو ہم بے کسوں کی تربت پر
آسمانی چراغ جلتا ہے

نوح طوفانِ بحرِ الفت میں
کب سفینے سے کام چلتا ہے

حضرتِ بھوساول سے مشاعرے کے موقع پر میں نے پار سال گذارش کی تھی کہ آئندہ آپ نے سالانہ مشاعرے میں شرکت کی عزت مجھے بخشیں تو کم سے کم ایک مہینہ پہلے مجھے اطلاع ملنی چاہئے لیکن انھیں اس کا خیال نہ رہا اور اس سال مشاعرے کو جب دس بارہ روز باقی رہ گئے تو مجھے اطلاع ملی چوں کہ میں مکان سے جب کہیں باہر جاتا ہوں تو بہت سے یہاں کے انتظام کرنے ہوتے ہیں لہذا میں نے شرکت سے معذرت کی اس میری معذرت پر چار پانچ تار شرکت مشاعرہ کی تاکید میں پہنچے مشاعرے کی تاریخیں حسب ذیل طرحوں پر مقرر ہو چکی تھیں۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء سلام کے لئے خاک و خوں میں جب سرِ شبیر غلطاں ہو گیا

۱۶ اکتوبر ۱۹۲۶ء غزل کے لئے کر دیا خاموش مجھ کو آپ کی تصویر نے

قصد تھا کہ اگر پہلے مشاعرے میں نہ پہنچ سکوں گا تو دوسرے مشاعرے میں شریک ہو جاؤں گا اسی خیال سے میں نے سلام نہیں کہا تھا غزل کہہ لی تھی اتنے میں محمد یوسف صاحب سکریٹری مشاعرہ میرے بلانے کے لئے خود بھوساول سے میرے وطن پہنچے اور وہاں اُن کو جب معلوم ہوا کہ میں الہ آباد میں ہوں تو وہ الہ آباد آئے اور مجھے بہت مجبور کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں پہلے مشاعرے میں بھی شرکت کروں اُن کی اس تکلیف فرمائی اور قدر دانی کو خاص طور سے میں نے احساس کیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو صبح کی میل ٹرین سے روانگی ہوئی دو ایک اسٹیشن طے کرنے کے بعد مجھ کو سلام کا خیال آیا اور فکرِ سخن میں نے شروع کر دی کشتی پہنچتے پہنچتے میں نے سلام بھی کہہ لیا رہا دن بھر اور تمام رات چل کر دوسرے روز دس گیارہ بجے دن کو بھوساول پہنچی چوں کہ محمد یوسف صاحب نے پہلے ہی سے میری روانگی کا تار دے دیا تھا اس باعث سے سیٹھ عبد اللطیف صاحب عبد الکریم صاحب حکیم صاحب سید عابد علی صاحب اختر صاحب وغیرہ وغیرہ اور چالیس پچاس احباب میرے استقبال کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے مجھ کو گاڑی سے لوگوں نے اُتارا اور بہت سے پھولوں کے ہار پہنائے پھر موٹر پر سوار کر کے انجمن حسینی کے دفتر لے گئے یہ جگہ ذرا تنگ تھی اور دور دور سے میرے جاننے والے میرے ملنے کو آتے تھے اس باعث سے میرے قیام کے لئے انجمن فلاح دارین کی خاص وسیع عمارت تجویز ہوئی اس جگہ

میں پارسال بھی رہ چکا تھا غرض وہاں سے اُٹھ کر اُسی وقت میں یہاں آ گیا اور جتنے دنوں تک رہا پھر یہیں رہا۔

۱۵؍ اکتوبر ۱۹۲۶ء ہی کو مشاعرہ تھا چاروں طرف کی ٹرینوں سے شعرائے بیاول دھولیہ مالی گانو مؤ ملکاپور کھام گانو برہان پور کھنڈوہ وغیرہ آتے رہے قریب دس بجے شب کو مشاعرے کا آغاز ہوا جناب سید عابد علی صاحب نے میری صدارت کی تحریک فرمائی اور جناب مولوی گل شبیر خاں صاحب لکچرار کی تائید پر میں تخت صدارت پر اپنی ہیچ مدانی کا عذر کرتے ہوئے بیٹھا اس سال میری پارسال کی تحریر پر لحاظ کر کے شعرا کی نشست فرش پر ایک سلسلے میں تھی اور سامعین شعرا کے بعد تھے پہلے مجھ کو پھولوں کا ہار پہنایا گیا اس کے بعد لوگوں نے کھڑے ہو کر اپنے اپنے سلام سنائے سب سے اخیر میں میری نوبت آئی اور میرے بعد مشاعرہ چار بجے صبح کو ختم ہو گیا قریب قریب سب سلام اچھے تھے اور لوگوں کو بہت کچھ اپنی جگر کاوی کی داد ملی علاوہ اوقاتِ مشاعرہ کے ہر وقت میرے پاس شعرا کا مجمع رہتا تھا ان میں جناب مشتاق صاحب ساکن کھام گانو خاص ذکر کے قابل ہیں کہ وہ مشاعرے کے بعد بھی کئی دنوں تک میرے سبب سے ٹھہرے رہے میرے سوا اور شعرا کی بھی خاطر مدارات کا خاص اہتمام انجمن کی طرف سے تھا جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے کسی کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور ہر شخص شکر گذار ہو کر واپس ہوا ہے:

بسم اللہ خاں صاحب بسمل مجھ سے اصلاح بہت دنوں سے لیتے ہیں لیکن اس وقت تک ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی اس موقع پر وہ بھی مع اپنے دو تین دوستوں کے آئے اور جہاں میں ٹھہرا تھا وہیں ٹھہرے اور اپنی یادگار میں ایک عمدہ شالی چادر مجھے دی میں ان کی اس عنایت کا ممنون ہوں۔

۱۶؍ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو اُسی پنڈال میں پہلے اغراض انجمن کے متعلق ایک میٹنگ ہوئی پھر دس بجے شب سے مشاعرہ شروع ہوا میرے تخت صدارت پر بیٹھنے کے بعد مجھ کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے مشاعر کا نام سید عابد علی صاحب پکارتے تھے اور وہ شاعر تخت کے پاس کھڑے ہو کر اپنی غزل سامعین کے سامنے پڑھتا تھا اگرچہ اس کے متعلق میں نے سال گذشتہ میں اپنے خیالات ظاہر کئے تھے کہ شاعر کو صدر کے پاس تخت پر بیٹھ کر اپنی غزل پڑھنی چاہئے لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی میں نے اپنی غزل سب سے آخر میں پڑھی طرحی غزل کے بعد حاضرین کے اصرار سے آٹھ غزلیں مجھے اور پڑھنی پڑیں اس تاریخ کے لئے ایک طلائی تمغہ اور دو نقرئی تمغے رکھے گئے تھے جو بالاتفاق رائے مجھے مرحمت کئے گئے اگرچہ میں نے لینے سے بہت کچھ انکار کیا مگر لوگوں نے نہ مانا اور مجھے قبول کرنے پڑے غرض یہ دوسرا مشاعرہ بھی صبح ہوتے ہوتے بخیر و خوبی ختم ہوا اور لوگ روانہ ہونے لگے چوں کہ ان دونوں مشاعروں پر جناب سید زوار حسین صاحب عالی مدیر اخبار البرہان ایک تفصیلی مضمون لکھ چکے ہیں جس کو لفظ بلفظ میں لکھے دیتا ہوں لہٰذا مشاعروں کے متعلق میں کچھ اپنی ذاتی رائے قائم کرنا مناسب نہیں سمجھتا ایڈیٹر صاحب کے مضمون سے سب حالات روشنی میں آ جاتے ہیں۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جناب خان بہادر قمر الدین صاحب آنریری مجسٹریٹ نے مجھ کو ٹی پارٹی دی کچھ معزز حضرات اور بھی تھے دو گھنٹے کے قریب وہاں نشست رہی اور شام کو میں جناب عبدالکریم صاحب کے صاحب زادے کی تقریب شادی میں شریک ہوا اور وہاں کی واپسی پر احباب میں بڑی دیر تک غزل خوانی ہوتی رہی۔

صاحبان دھولیہ سے اور مجھ سے قدیم مراسم ہیں پارسال بھی اِن حضرات نے دھولیہ چلنے کے لئے مجھ سے کہا تھا اور اِس سال تو ایسا مجبور کیا کہ میری ایک معذرت بھی پیش نہ گئی وہ لوگ تو ایک دن پہلے مجھ سے وعدہ لے کر چلے گئے اور میں ایک دن ٹھہر کر بہمراہی جناب اصغرؔ صاحب اور امیر احمد صاحب امجدؔ روانہ ہوا جو لوگ دھولیہ جاتے ہیں وہ املیز اُترتے ہیں چنانچہ دو ڈھائی گھنٹے میں بھوساول سے چل کر گاڑی املیز پہنچ گئی یہاں اصغرؔ صاحب نے اپنے چند دوستوں کے ذریعہ سے چاء وغیرہ کا بہت معقول انتظام کیا اور قریب گیارہ بجے دن کے املیز سے روانہ ہو کر ڈیڑھ بجے دن کو موٹر دھولیہ پہنچی حافظ عبدالشکور صاحب حافظ باطنؔ غریبؔ ماہرؔ امام الدین صاحب مولوی عبدالرحمٰن صاحب وغیرہ نے مجھ کو ایک بالاخانے پر ٹھہرایا لیکن یہ بالاخانہ میرے لئے موزوں نہ تھا اس لئے نہایت اصرار کے ساتھ مجھ کو سید محمد شفیع صاحب سکریٹری عثمانیہ کلب اپنے کلب لے گئے اور میرے آرام کا کافی خیال ہر وقت رکھتے تھے اگرچہ میری اُن کی یہ پہلی ملاقات تھی لیکن معلوم ہوتا تھا میرے قدیم ملنے والوں میں ہیں شام کو کچھ احباب اور ماسٹر محمد امین صاحب بیڑی مرچنٹ مجھ کو سیر و تفریح کے لئے ندی پر لے گئے یہ جگہ دھولیہ میں نہایت اچھی ہے اور شام کو یہاں غیر معمولی مجمع ہو جاتا ہے مغرب کی نماز میں نے یہیں پڑھی اور ایک بزرگ کے مزار پر بھی حاضر ہوا رات کو دعوت حافظ عبدالشکور صاحب کے ہاں تھی میں وہاں سے دعوت کھا کر اس وسیع میدان میں پہنچا جہاں یاروں نے ایک غیر طرح مشاعرہ کیا تھا بھیڑ سامعین کی بہت زیادہ تھی اور ہر شخص نیا جوش لے کر آیا تھا پہلے مقامی حضرات نے اپنے اپنے کلام سنائے پھر مجھ سے کہا گیا میں نے سات آٹھ غزلیں پڑھیں اگرچہ میں نے اتنی غزلیں سنائیں لیکن لوگوں کا شوق کم نہ ہوا آخرکار یہ پر لطف صحبت دو ڈھائی بجے رات کو ختم ہوئی اسی مجمع میں مجھ سے مولوی عبدالعزیز صاحب وکیل ہائی کورٹ ملے یہ نہایت خوبیوں کے آدمی ہیں بعد ختم مشاعرہ مجھے فرودگاہ تک پہنچانے آئے اور بہت دیر تک بیٹھ کر گئے قمرؔ صاحب و شوقؔ صاحب وغیرہ نے بھی بڑی مہربانی کی کہ میری آمد کا حال سُن کر پالے گانو سے دھولیہ آئے اور مجھ سے مل کر اظہار مسرت کیا صبح کو چاء وغیرہ کی دعوت منشی ابو تراب صاحب ماہرؔ کے مکان پر تھی میں وہاں گیا اور تھوڑی دیر تک ٹھہرا ماہرؔ صاحب نے اپنی یادگار میں ایک نہایت خوبصورت ریشمی رومال بطور تحفہ کے مجھے عنایت کیا جو ہمیشہ میرے پاس رہے گا باطنؔ صاحب حافظ صاحب کے ایک ہونہار شاگرد ہیں البدر کچھ دنوں پہلے انھیں کے اہتمام سے نکلتا تھا انھوں نے بھی چلتے وقت اعلےٰ قسم کے صابون کا ایک پیکٹ بڑے اصرار سے مجھے دیا اس کے بعد بھوساول کی سمت روانگی ہوئی حضرات دھولیہ اور بالخصوص حافظ صاحب باطنؔ صاحب غریبؔ صاحب ماہرؔ صاحب امام الدین صاحب مولوی عبدالرحمٰن صاحب وغیرہ نے میری خاطر مدارات کا کوئی دقیقہ حتے الوسع نہیں اٹھا رکھا میں اِس مہمان نوازی کی قدر دل سے کرتا ہوں جس دن میں روانہ ہونے کو تھا اتفاق سے درمیانی کسی مقام میں رتھ کے میلے کی تاریخ تھی اس باعث سے میں املیز ہو کر نہ واپس ہو سکا بلکہ گیارہ بجے دن کے قریب میں انار روانہ سے ریل پر سوار ہوا راہ میں املیز تک پہنچا کر اصغرؔ صاحب تو وہیں ٹھہر گئے اور میں قریب چار بجے شام کو بھوساول پہنچا احباب کو یہ یقین نہ تھا کہ میں اس قدر جلد واپس آ جاؤں گا لیکن اُن کو جب میرے آنے کی خبر ہوئی تو سب لوگ جمع ہو گئے شائقؔ صاحب ساکن گھام گانو کا بیان تھا کہ میں آپ ہی

کے سبب سے ٹھہر رہا یہاں رات کو بڑی دیر تک شعر خوانی ہوئی محمدؐ یوسف صاحب کے بڑے بھائی نے ایک تبر اور ایک فولادی قلم اور شیخ عبدالغفور صاحب مستری نے حقہ کا ایک خوب صورت ضامن اور سید صفدر صاحب نے پیتل کا نہایت عمدہ بڑا قلم دان اور سیٹھ عبداللطیف صاحب نے ایک چھابہ کیلے کے پھلیوں کا عنایت کیا جملہ احباب کھوساول بالخصوص سیٹھ عبداللطیف صاحب منشی محمدؐ یوسف صاحب میر عابد علی صاحب منشی عبدالکریم صاحب اختر صاحب حکیم عبدالقادر صاحب میرے قدیم عنایت فرما اور قدر دان ہیں ان صاحبوں نے جس قدر مجھ کو آرام پہنچانے کی کوشش کی اور میری خاطر مدارات کا خیال رکھا اس کے شکریہ کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں اللہ تعالیٰ سب کو آباد و شاد رکھے اور جلد پھر مجھ سے ملائے۔

دوسرے دن میں کھوساول سے رخصتی کے بار پہن کر قریب گیارہ بجے دن کو برہان پور پہنچا یہاں گاڑی آنے کے پہلے سے میرے استقبال کے لئے تیس چالیس حضرات موجود تھے ان سب نے مل کر مجھے پھولوں کے ہار اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنائے اور فٹن پر سوار کرا کر جناب سید سلطان علی صاحب پیرزادہ و سجادہ نشین کے دولت خانہ پر ٹھہرایا اور ہر وقت ہر ضرورت کا خیال رکھتے رہے میں ایک دن کے خیال سے یہاں آیا تھا لیکن دوستوں کے اصرار نے دو دن تک روانگی ملتوی رکھی شام کو شاہی مسجد گیا قلعہ دیکھا تاپتی کی سیر کی شہر کے حسن افزا اور نور افزا مناظر پر نگاہ ڈالی پھر جائے قیام پر واپس آیا واپسی پر بہت سے احباب شعر سننے کے لئے جمع ہو گئے تھے اس باعث سے بارہ بجے رات تک مجھے غزلیں پڑھنی پڑیں صبح سے پھر لوگ آنے لگے اور قریب قریب تمام دن میرے پاس جمگھٹ رہا سہ پہر کو سید دلاور حسین صاحب سرکل انسپکٹر نے اپنے دولت خانے پر خاص انتظام سے چائے پلوائی اور بہت کچھ مجھ سے مل کر خوش ہوئے اور بڑی دیر تک وہاں کی نشست میں شعر و سخن کا دور چلا کیا اس کے بعد سیٹھ شمس الدین صاحب اور ایک سیٹھ صاحب جن کا اسم گرامی میں اس وقت بھولتا ہوں مجھے لے کر سیدنا حکیم الدین صاحب کی درگاہ میں حاضر ہوئے وہاں میں نے زیارت کی اور پھر مسلم لائبریری آیا خیالی صاحب نے میری آمد میں ایک مختصر سی تقریر فرمائی جس کا جواب میں نے بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے دیا چونکہ عام طور سے خاص و عام کو میرے ناقص کلام کے سننے کا موقع نہ ملا تھا اس باعث سے لوگوں کا شوق دیکھتے ہوئے احباب نے اس مضمون کی ایک نوٹس چھپوا کر رؤسائے شہر کو بھیجا دی اور جا بجا گذرگاہوں پر چسپاں فرمائی۔

مجمع مکارم و اخلاق زاد عنایتہ

تسلیم نیاز بتقریب تشریف آوری ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر مولانا حضرت محمدؐ نوح صاحب نوح ناروی مد فیضہ جانشین حضرت داغ رحمۃ اللہ علیہ آج ساڑھے آٹھ بجے شب کو درگاہ شاہ برہان الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں بزم مشاعرہ منعقد ہوگی جس میں منتخب شعرا کے پڑھنے کے بعد حضرت نوح اپنا کلام فصاحت نظام گوش گذار فرما کر محظوظ و ممنون فرمائیں گے آپ کی ادب نوازیوں سے توقع ہے کہ تشریف لا کر جلسے کو رونق بخشیں گے۔

الداعی احمد ہاشم مہتمم استقبالیہ کمیٹی مشاعرہ برہان پور

اِس اشتہار کو دیکھ کر خاص و عام درگاہ شریف میں جمع ہوئے جن کی تعداد میرے خیال میں سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک تھی میں دس بجے رات کو وہاں پہنچا پہلے منتخب مقامی حضرات نے ایک ایک غزل سُنا کر حاضرین کو محظوظ کیا پھر میں نے دس بارہ غزلیں پڑھیں اگرچہ لوگوں کا اصرار اور طلبی تھا لیکن اُسی شب کو میری روانگی تھی اس باعث سے معذرت کی گئی جلسہ ختم ہونے پر ایک پُر تکلف ہار مسلمانوں نے اور دوسرا شاندار ہار ہندو صاحبان کی طرف سے جناب سیٹھ گنپت لال صاحب نے مجھے پہنا کر اپنے وسیع اخلاق اور انتہائی مہربانیوں کا ثبوت دیا میرے زمانۂ قیام میں سیٹھ احمد ہاشم صاحب سیٹھ حمید اللہ صاحب جگرؔ مولوی رفیع الدین صاحب سید سلطان علی صاحب پیرزادہ سجّادہ نشین سیٹھ شمس الدین صاحب سید تجمل حسین صاحب جوہرؔ سید دلاور حسین صاحب سرکل انسپکٹر سید زوّار حسین صاحب عالیؔ مدیر اخبار البرہان سیٹھ محمد قاسم صاحب مولانا راغبؔ صاحب مولانا حاذقؔ صاحب مولانا خیالیؔ صاحب منشی فضل حسین صاحب صابرؔ میر عنایت علی صاحب آغازؔ وغیرہ وغیرہ نے اپنا بیش قیمت وقت خراب کر کے جو میری ہر قسم کی خاطر مدارات مسافر نوازی فرمائی ہے اُس کا شکریہ میں نہیں ادا کر سکتا ہوں اور میری زبان اس کے اظہار سے قاصر ہے یہ حضرات اخلاق مجسم ہیں ان کی عنایتوں کا ایسا اثر میرے دل پر قائم نہیں ہوا ہے جس کو میں تمام عمر بھلا سکوں رات کو ریلوے اسٹیشن تک سیٹھ احمد ہاشم صاحب سیٹھ شمس الدین صاحب سید تجمل حسین صاحب جوہرؔ منشی فضل حسین صاحب صابرؔ پہنچانے آئے اور پھولوں کے ہار پہنائے اور جب تک گاڑی روانہ ہوئی برابر پلیٹ فارم پر ٹھہرے رہے یہ خاص محبت کی باتیں تھیں اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو مراتب اعلےٰ پر پہنچائے اور ان کے اخلاق میں اور زیادہ وسعت دے کہ یہ ہر صاحب فن کی یوں ہی توقیر کرتے رہیں انسان انھیں باتوں سے بے داموں غلام بن جاتا ہے مجھ کو تو سب نے مل کر اپنی خاص مہربانیوں سے ہمیشہ کے لئے مول لے لیا صبح کو گاڑی برہان پور سے روانہ ہوئی اور میں دوسرے دن بخیریت تمام الٰہ آباد سات بجے دن کو سب کی یاد اپنے دل میں لئے ہوئے پہنچ گیا یہ چند دن میری زندگی کے سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہیں کہ بہت اچھے گذرے۔ نوحؔ

چوں کہ پہلا مشاعرہ منعقدہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء محض سلام کے لئے تھا اس باعث سے اُس مشاعرے کے حالات جو البرہان کے مدیر نے لکھے ہیں وہ سلام کے سلسلے میں درج کئے گئے ہیں یہاں صرف دوسرے مشاعرہ منعقدہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۶ء کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

انجمن مجلس حسینی کا دوسرا عشقیہ مشاعرہ

از مدیر مطبوعۂ البرہان ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۶ء

منعقدہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۶ء زیر صدارت حضرت نوحؔ ناروی

مدرسۂ فلاح دارین بھوساول کے جلسے کی کارروائی رات کو نو بجے شروع ہو کر ساڑھے دس بجے ختم ہوئی اس کے ختم ہوتے ہی پنڈال کا رنگ ہی بدل گیا نہ وہ نواب صاحب رہے نہ بیرسٹر صاحب اور نہ خان بہادر صاحب دکھائی دئے باقی حاضرین و سامعین میں شعرا کا نمبر اور بڑھ گیا رہے سہے جو اِدھر اُدھر بیٹھے سمٹ کر آ گئے اِس مشاعرے کے بعد مقابلے میں کامیاب ہونے والے شعرا کو انعام دینے کے لئے ایک طلائی درجۂ اوّل اور دو نقرئی درجہ دوم و سوم کے تمغے بھی

رکھے گئے تھے اِس لئے شایقین اور سامعین کا اور بھی مجمع تھا انجمن کے سکریٹری جناب سید عابد علی صاحب نے چند ضروری ہدایت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ تمغہ کے فیصلہ کرنے کے لئے پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ یہ حضرات مشاعرہ ہو جانے کے بعد مقابلے کے کلام کو دیکھیں گے اور باتفاق رائے جن صاحب کو جو تمغہ چاہیں گے حسب درجہ عطا کریں گے اِس کے بعد طرح پر مشاعرہ شروع ہوا معزز صدر حضرت نوح مدظلہ کی نشست تخت پر گاؤ تکیہ سے تھی باقی شعرا اور سامعین فرش پر رونق بخش تھے شاعر نے کہا مطلع عرض ہے ارشاد کے جواب کے بعد جو مطلع سنایا تو واہ واہ کی صدا سے سقفِ آسمان ہل گئی اِس قدر شعرا کا طرحی کلام اِس پر رباعیات اور خمسوں اور قطعات کا اضافہ اور پھر ایک ایک شعر کو مکرر پڑھنا اور دادِ سخن کا سمیٹنا یہ کل باتیں آسان نہ تھیں قریب پانچ بجے صبح کو معزز صدر کی باری آئی ہاں ایک بات ضروری رہی جاتی ہے کہ قریب قریب تمام شعرا خراج تحسین سے مالا مال ہوئے ایک سے ایک بہتر اور اچھوتے کلام سننے میں آئے لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جناب ایمان بیاولی کا کلام مشاعرے میں خوب پھلا پھولا صدائے مرحبا اور آفریں سے حاضرین اور شعرا نے مشاعرے کو سر پر اُٹھا لیا اگر مشاعرہ یہیں ختم ہو جاتا تو بلا خوف تردید میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ کامیابی کا سہرا جناب ایمان ہی کے سر چڑھتا مگر ابھی حضرت نوح کا طوفان باقی تھا آخر یہ طوفان اُٹھا اور تمام غواصان بحرِ معنی کو مع کشتیِ ردیف و سفینۂ قوافی کو بہا لے گیا آنکھ کھلی تو ساحلِ مراد پر علاوہ نوح صاحب کے اور کوئی شناور نظر نہ آیا طرحی غزل کے سوا ممدوح نے حاضرین کی خواہش اور اصرار سے غیر طرح چار پانچ غزلیں سنائیں پھر لوگوں کے ذوق و شوق کا یہ عالم کہ اور پڑھیے اور پڑھیے اور پڑھیے آفتاب نکل آیا داد دیتے دیتے حلق میں کانٹے پڑ گئے مگر اور اور کی صدا نہ بند ہوئی آخر کار ممدوح نے خود ہی لوگوں کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے سلسلے کو بند کیا رہا تمغے کا فیصلہ تمام شعرا نے باتفاق رائے اپنی جانب سے ہر سہ تمغے کو ممدوح کی خدمت میں گذرانا اور ممدوح نے نہایت تکرار سے جبراً و قہراً یہ فرماتے ہوئے قبول فرمایا کہ یہ میرا حق نہ تھا آخر کو یہ دیکھ کر تمام جلسے کو دلی خوشی ہوئی کہ ہر سہ تمغے آپ کے سینۂ بے کینہ پر آویزاں ہیں اب یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مجلس حسینی کے دونوں مشاعرے نہایت شاندار اور کامیاب ہوئے۔

چوں کہ اس سلسلے میں برہان پور کا ذکر آ گیا ہے لہٰذا جو کچھ اخبار البرہان کے ایڈیٹر صاحب نے اپنے اخبار مطبوعہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۶ء میں درج کیا ہے اُس کا لکھنا بھی میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں کیوں کہ برہان پور کا سفر اِسی سفر سے تعلق رکھتا ہے۔

حضرت نوح ناروی اور برہان پور

بھوساول کے بعد اہلِ دھولیہ (خاندیس) نے حضرت نوح کا کچھ ایسا دامن پکڑا کہ آخر کار ممدوح کو اپنے سفینۂ قابلیت اور کشتیِ اخلاق کا رخ اِدھر کرنا ہی پڑا اہلِ برہان پور کی دعوت آپ کو بھوساول ہی میں مل چکی تھی جس کو آپ نے قبول فرما کر ایک روز کے لئے دریائے تاپتی کا تلاطم دیکھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ چنانچہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو خاص آدمی کے ذریعہ خبر ملی کہ جناب نوح کا زورقِ اخلاق بھوساول سے آج ہی برہان پور کی طرف روانہ ہو گا ہوا پر لطف و موافق تھی ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے دن کو آپ ساحلِ برہان پور یعنی لال باغ اسٹیشن پر

پہنچے منتخب معززین اور قریب قریب تمام شعرا نے اسٹیشن پر آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے معزز مہمان کو جناب سیٹھ احمد ہاشم صاحب میمن کی جانب سے جناب پیرزادہ سید شاہ سلطان علی صاحب راج پورہ کے دولت کدے پر بغرض قیام شاندار طریقے پر لے گئے یہاں معزز حاضرین نے آپ کا دوبارہ بڑا اعزازی خیر مقدم کیا شائقین اور ملاقاتیوں کی آمد و رفت شروع ہوئی انجمن بزم سخن کی جانب سے ایک کمیٹی مرتب کی گئی اس کے زیر تحت آپ کے قیام و طعام اور مشاعرہ وغیرہ کے تمام کام کاج سپرد کیے گئے ممدوح نے صرف ایک روز رہنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر اہل شہر کا اشتیاق مدنظر رکھتے ہوئے ایک روز کی اور درخواست کی گئی جس کو آپ نے باوجود قلت وقت اور ضروریات وطنی کے کشادہ پیشانی سے منظور فرمایا ۱۲ر اکتوبر کو دن میں شہر کے مشہور اور تاریخی مقامات و مزارات کی سیر و زیارت فرمائی مسلم لائبریری کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے لائبریری کی جانب سے حاضرین و ممدوح کی عطر پان اور پھولوں کے ہار سے تواضع کی گئی ہوائی تقریر کے بعد آپ نے لائبریری کو اپنا دوسرا دیوان طوفان نوح عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہمراہی جناب سیٹھ شمس الدین صاحب لائبریری میں تشریف لانے سے پیشتر درگاہ سیدنا حکیم الدین صاحب واقع شاہ درہ کی زیارت کی اور وہاں کی شان و شوکت و آراستگی کو ملاحظہ فرما کر بہت مسرور ہوئے اسی روز رات کو حضرت شاہ برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ کی عالی شان درگاہ میں غیر طرحی مشاعرہ ہوا اچھا خاصہ مجمع تھا جس میں معزز ہندو بھائیوں کی تعداد بھی کافی تھی شہر کے منتخب شعرا کے کلام سے مشاعرہ شروع ہوا آخر میں آپ نے بحیثیت صدر اپنی طوفان خیز شاعری شروع کی اور اپنے سخن کے دریا میں اہل محفل کو ڈبو دیا صدائے مرحبا و آفرین سے لوگوں نے ہر اس زمین کو جس میں آپ اشعار پڑھتے تھے آسمان پر اٹھا لیا دلچسپی اور محویت کا یہ عالم تھا کہ ہر جانب سے پھر پڑھئے پھر اور پڑھئے کی صدائیں آتی تھیں قریب دو بجے شب کو یہ جلسہ ختم ہوا اور پان اور عطر اور قیمتی ہاروں سے معزز مہمان کی خاطر کی گئی ان میں سے جناب سیٹھ گنپت لال صاحب رئیس آنریری مجسٹریٹ کا بیش قیمت ہار معزز مہمانوں نے موتیوں کے ہار سے نسبت دیتے ہوئے نہایت عزت سے زیب گلو فرمایا جو برہان پور کے ہندو مسلم اتحاد کا بہترین نمونہ تھا اس کے بعد معزز مہمان کو حاضرین نے دلی محبت و احترام سے رخصت کیا ممدوح اپنے وطن جانے کے لئے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے بزم سخن کی جانب سے چند سرگرم ممبر آپ کو گاڑی میں بٹھانے کے لیے اسٹیشن تک ہم راہ گئے

روح کاغذ میں بھی پھونکی حسن کی تاثیر نے
نقش روشن جب کوئی کھینچا مری تدبیر نے
اس نظر کے اٹھتے ہی آواز دی نخچیر نے
رنگ یہ پہلا دکھایا حسن کی تاثیر نے
جان دے دی آپ اپنی عاشق دلگیر نے
ہو گئی داخل ذرا سی کوچۂ جاناں کی خاک

ج

وہ ہنسی آئی وہ لب کھولے تری تصویر نے
پھیر دی اس پر سیاہی خامۂ تقدیر نے
مار ڈالا مار ڈالا مار ڈالا تیر نے
خود مصور ہی کا دل کھینچا تری تصویر نے
اس طرح بے موت مارا موت کی تاخیر نے
اس طرح تکمیل پائی نسخۂ اکسیر نے

لڑ گئے حلقے سے جب حلقے تو کڑیاں جل اُٹھیں ۔۔۔ آگ دے کر آگ لے لی خانۂ زنجیر نے

ہر طرف تیغِ نظر چلتی رہی پھرتی رہی ۔۔۔ عمر اپنی کاٹ دی ترکش میں تیرے تیر نے

کعبہ و بت خانہ کے سامانِ زینت اور ہیں ۔۔۔ خانۂ دل کو سجایا آپ کی تصویر نے

کیا سمجھ کر آئینے پر ڈال دی اپنی نگاہ ۔۔۔ کر دیا زخمی تمھیں کو خود تمھارے تیر نے

جس سے ہو بے پردگی پردہ ہے وہ کس کام کا ۔۔۔ منھ چھپایا آئینے میں کیوں تری تصویر نے

موت کے ارمان میں بے موت مرجانا پڑا ۔۔۔ میرے دل پر تیر مارے آرزوئے تیر نے

باعثِ تزئینِ عالم ہو گئے انوارِ حسن ۔۔۔ جان ڈالی اِس مرقع میں تری تصویر نے

پاس جانے کی تمنا میرے دل میں رہ گئی ۔۔۔ دور ہی سے کر دیا مجروح اُن کے تیر نے

اور سب کہتے رہے یہ کس لئے چپ ہو گیا ۔۔۔ داد خاموشی کی دی مجھ کو تری تصویر نے

مشتعل جس سے ہوا تھا دل میں شعلہ عشق کا ۔۔۔ گھر کو بھی پھونکا اُٹھیں اجزائے آتش گیر نے

پہلے آنکھوں میں رہی پھر میرے دل میں گھر کیا ۔۔۔ آئینے پر آئینہ بدلا تری تصویر نے

نالہ کرنے پر کیا بے تاب دل کو اور بھی ۔۔۔ اِس طرف سے اُس طرف کروٹ بدل کر تیر نے

طاقتِ جوشِ جنوں کا حال ظاہر کر دیا ۔۔۔ ٹوٹی پھوٹی ہتکڑی اینٹھی ہوئی زنجیر نے

بے بلائے آ گیا آتے ہی مالک بن گیا ۔۔۔ دل میں تیری یاد ہے یہ بھی نہ دیکھا تیر نے

مجھ کو الفت میں ہمیشہ وقت پر دھوکا دیا ۔۔۔ آہ نے فریاد نے تدبیر نے تقدیر نے

اُن کی حسرت تھی یہ مضطر ہو مجھے مضطر کیا ۔۔۔ دور سے تحریر نے نزدیک سے تقریر نے

رفتہ رفتہ عشق میں پھیلیں یہاں تک سازشیں ۔۔۔ آخر آخر مجھ سے میرے دل کو توڑا تیر نے

پوچھتے ہیں لوگ مجھ سے کیا خموشی کا سبب ۔۔۔ کر دیا چپ چاپ اک منھ بولتی تصویر نے

ظلم کرنے کے لئے اب چاہتے ہو اور کیا ۔۔۔ بخش دی اپنی جوانی تم کو چرخِ پیر نے

عیش بے مانگے اگر ملتا تو ہاں وہ عیش تھا ۔۔۔ ہاتھ پھیلا کر مجھے رسوا کیا تقدیر نے

موت آئی اُن سے پہلے موت کے بعد آئے وہ ۔۔۔ لی ہماری جان اِس تقدیم اِس تاخیر نے

آہ کیا اور آہ بے تاثیر کی تاثیر کیا ۔۔۔ باندھ رکھی تھی ہوا یوں ہی ہوائی تیر نے

کچھ نہیں کھلتا کسی پر ماجرائے سرنوشت ۔۔۔ یہ لفافہ بند رکھا کاتبِ تقدیر نے

کیوں نہ ممنونِ کرم ہو دل سے نوحِ ناروی
اُس کو عزت دی کچھ وساول میں جوان و پیر نے

تخیج زاد ۱۰/ مارچ ۱۹۲۳ء

مرے دل کو مجھ سے جدا کرنے والے | ج | وفا بھی گئے جا جفا کرنے والے

ترے ناز و انداز سے میں ہوں واقف
یہ ناوک نہیں ہیں خطا کرنے والے

مریضِ محبت کو بہلا رہے ہیں
دعا دینے والے دوا کرنے والے

نتیجہ نہ نکلے کہ نکلے وفا کا
فدا کر چکے دل فدا کرنے والے

تمھیں جاننے کی طرح جانتا ہوں
بڑے آئے مجھ سے وفا کرنے والے

پریشان کبھی ہیں پشیمان کبھی ہیں
مرے دردِ دل کی دوا کرنے والے

سلامت رہیں خوب رویانِ عالم
نہیں یہ کسی سے وفا کرنے والے

بتوں کو بتوں کی خموشی کو دیکھیں
ادھر آئیں ذکرِ خدا کرنے والے

تصور میں آنے سے انکار کیسا
وہی ہیں انوکھے حیا کرنے والے

وہ کب تک سزا دیں گے جرمِ وفا پر
خطائیں کئے جا خطا کرنے والے

قیامت میں کیسا بہم مل رہے ہیں
جفا ڈھانے والے وفا کرنے والے

پہنؔہ نوح کا اور میں کیا بتاؤں
وہی فرضِ طوفاں ادا کرنے والے

کل جہاں محو کسی کی نگہ ناز میں ہے

اس طرح پر نمائش بین یوری میں ۲۷ مارچ ۱۹۲۷ء کو مشاعرہ تھا لیکن میں رمضان شریف کے باعث شریک نہیں ہوا

ج

سن سکے تاب کہاں یہ کسی دم ساز میں ہے
درد اتنا مری سہمی ہوئی آواز میں ہے

کیا اثر سحر میں ہے کیا شرف اعجاز میں ہے
لطف دونوں کا تری اک نگہِ ناز میں ہے

فکر و تدبیر سے قدرت کا معمّہ نہ کھلا
آج تک راز کی جو بات ہے وہ راز میں ہے

نالۂ عشق مرے دل سے نہ نکلے کیوں کر
نغمۂ درد اسی سازِ خدا ساز میں ہے

پاسِ الطاف نہیں شیوۂ اخلاق نہیں
ناز ہی ناز کسی کی نگہِ ناز میں ہے

دعوئے عشق و وفا اُس کا زبانی ہی نہیں
جان دینے کی بھی ہمت ترے جاں باز میں ہے

دل بری فتنہ گری قہر طرازی کے سوا
کیا ترے ناز میں اغماض میں انداز میں ہے

توڑ کر دل وہ کریں کس لئے بے قدریِ دل
اب بھی سب کچھ مرے اس ٹوٹے ہوئے ساز میں ہے

عشق کا طور جدا رنگ جدا ڈھنگ جدا
سحر یہ سحر میں اعجاز یہ اعجاز میں ہے

سر چڑھا کر وہ نگاہوں سے گرا دیتے ہیں
میری تحقیر بھی شامل مرے اعزاز میں ہے

سب اُنھیں کہتے ہیں طوفان اٹھانے والے
گفتگو اب بھی تمھیں نوح کے اعجاز میں ہے

کس بلا کا سوز اے بلبل ترے شیون میں ہے

کیوں مرے قلب کو قرار نہیں

اِن دونوں طرحوں پر بابو ہردے رام صاحب وکیل کے اہتمام سے ۱۰؍اپریل ۱۹۲۷ء کو فتح پور میں مشاعرہ ہوا مقامی شعرا کے علاوہ بسمل صاحب، شاطر صاحب الٰہ آبادی صفدر صاحب مرزا پوری "تاباں" صاحب بدایونی جناب محی الدین خاں صاحب تحصیل دار کل ڈپٹی کلکٹر اور خود کلکٹر صاحب موجود تھے۔

ج

باہر آ جائے تو جانوں کچھ اثر شیون میں ہے
حسن ابھی پردے میں ہے جلوہ ابھی چلمن میں ہے

سر جدا کرنے سے پہلے آپ اتنا سوچ لیں
رشتۂ الفت وہ ہے جو رگ مری گردن میں ہے

اے مرے دستِ جنوں یہ ظلم تو نے کیا کیا
جو گلے میں تھا گریباں اب وہی دامن میں ہے

اللہ اللہ یہ بہارِ حسن و رنگ و بوئے حسن
کیا کہیں ہم تجھ میں گلشن ہے کہ تو گلشن میں ہے

جان دے کر اس قدر تو قرب حاصل ہو گیا
آپ مدفن پر ہیں عاشق آپ کا مدفن میں ہے

کس بنا پر خلق انھیں یوسف لقا کہنے لگی
چاک الفت کا اگر ہے تو مرے دامن میں ہے

دل ربائی دل ستانی دل فریبی دل کشی
چار اداؤں کا اثر ایک آپ کی چتون میں ہے

اے ستمگر آسماں تکلیفِ بربادی نہ کر
خود ہی وہ بجلی ہے خو دانہ مرے خرمن میں ہے

سب کا رستہ ایک لیکن سب کے مقصد مختلف
فرق گیارہ رو میں گیارہ بر میں گیارہ زن میں ہے

ایک تجلی تھی کہ چمکی اور غائب ہو گئی
خاک ہی خاک اب ہے خاک اب وادیِ ایمن میں ہے

تھی جہاں کے واسطے جو چیز وہ پہنچی وہاں
روح میری خلد میں میت مری مدفن میں ہے

اشکِ پر خوں کیا ہے تعلیمِ غم مجھ کو ملی
اب گلستاں کا خلاصہ صفحۂ دامن میں ہے

کیوں نہ الٹے سیدھے آڑے ترچھے تنکے یاد آئیں
ہم قفس میں ہیں ہمارا آشیاں گلشن میں ہے

آپ نے دیکھا ہماری اشک باری کا مآل
تھی جو آنکھوں میں کبھی دولت وہ اب دامن میں ہے

کھو رہی تھی آج مجھ سے خود مری تر دامنی
بادہ خواری کا مزہ بھادوں میں یا ساون میں ہے

دیکھ لیں تصویر وہ میری سرائے موت کی
عشق کا پھندا ابھی اینٹھی ہوئی گردن میں ہے

جو بہے آنکھوں سے آنسو وہ رکے آ کر یہیں
نوح کا طوفانِ حسرت نوح کے دامن میں ہے

طبع زاد ۱۵؍جولائی ۱۹۲۷ء

ج

تمنا تھی کہ میرے دل میں وہ تیرِ نظر بیٹھے
مگر اس گھر سے نفرت ہے تو جا کے اپنے گھر بیٹھے

رہا اپنے بھی گھر میں ہم کو پاس اُن کی اجازت کا
اُٹھے تو پوچھ کر اُٹھے جو بیٹھے پوچھ کر بیٹھے

مزا جب ہے کہ دل کے ساتھ زخمی ہو کلیجا بھی
کہیں تیرِ ادا بیٹھے کہیں تیرِ نظر بیٹھے

کوئی شکوہ کرے کیوں آگے پیچھے داہنے بائیں کا
جدھر جس کو بٹھا دے میرِ محفل وہ ادھر بیٹھے

شب فرقت ہجوم رنج و غم میں یہ خبر کس کو
سحر ہونے سے پہلے کیا دل بے تاب کر بیٹھے

ادب ملحوظ تھا ان کو بھی سرکار محبت کا
قرینے سے جگہ پر سکۂ داغ جگر بیٹھے

تصور کی مدد نے سب سے مستغنی کیا ہم کو
تماشائے دو عالم دیکھتے ہیں اپنے گھر بیٹھے

جو آئے بھی یہاں تک تو انھیں مجھ سے حجاب آیا
جو بیٹھے بھی مرے آگے تو وہ منھ پھیر کر بیٹھے

جگر بے تاب دل مشتاق تم کیا حکم دیتے ہو
ادھر بیٹھے ادھر بیٹھے کدھر تیر نظر بیٹھے

پریشاں بال اشک آلودہ آنکھیں مضمحل چہرہ
ہمارے سوگ میں یہ کیا تم اپنا حال کر بیٹھے

نہ کوچے سے اٹھاتے ہیں نہ اپنے گھر بلاتے ہیں
زمانہ ہو گیا ہم کو اسی امید پر بیٹھے

نتیجہ یہ ہوا زنداں میں اپنے سر پٹکنے کا
ابھی دیوار تک پوری نہ اٹھی تھی کہ در بیٹھے

وفور بے قراری سے یہ حال اپنا شب غم تھا
یہاں آئے وہاں پہنچے ادھر اٹھے ادھر بیٹھے

بہت اچھا ہمارا وقت گذرا ان کی محفل میں
انھیں کو دیکھ کر اٹھے انھیں کو دیکھ کر بیٹھے

کسی کی انجمن دل کا اشارہ اپنی مجبوری
گوارا کب وہاں تھا بیٹھنا ہم کو مگر بیٹھے

تماشائی اٹھا دیں گے حریم ناز کا پردہ
رہیں گے یوں ہی دن بھر رات بھر کیا عمر بھر بیٹھے

جناب نوح کے طوفان گریہ کا اثر دیکھا
گرے تھے چشم تر سے جتنے آنسو اتنے گھر بیٹھے

۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

ج

اپنے کو اہل درد رہیں کیا لیے ہوئے
بیٹھے ہیں موت کا یہ تہیہ کیے ہوئے

کہہ دے کوئی یہ ان سے چلیں وہ بھی ساتھ ساتھ
میں جا رہا ہوں دل کا جنازہ لیے ہوئے

آئے ہیں مے کدے کی طرف چند پارسا
جائیں نہ بے پلائے ہوئے بے پیے ہوئے

اول تو عشق اور وفا بھی پھر اس کے ساتھ
دونوں یہ امتحان ہیں میرے دیے ہوئے

مانا کوئی گلہ نہ سہی شکر ہی سہی
کب تک رہیں گے ہونٹ ہمارے سیے ہوئے

اے عالم خیال تجھے کیوں دعا نہ دوں
بیٹھا ہوں اپنی گود میں ان کو لیے ہوئے

کہتا ہے جھوم جھوم کر ابر بہار بھی
جاؤں گا مے کدے سے نہ میں بن پیے ہوئے

ممکن نہیں کہ دل سے مٹیں داغہائے عشق
یہ سب چراغ ہیں ترے روشن کیے ہوئے

آئے کہیں بہار کہ پھر دھجیاں اڑیں
مدت ہوئی ہے چاک گریباں سیے ہوئے

اظہار ذوق و شوق حسینوں کے روبرو
اپنے کو اہل عشق رہیں کچھ لیے ہوئے

عہد شباب کیا کوئی کیف شراب ہے
اس سن میں مست رہتے ہیں سب بے پیے ہوئے

میرے لیے نشاط و مسرت سے کم نہیں
وہ رنج و غم جو خاص ہیں ان کے دیے ہوئے

آنکھوں سے بے سبب یہ برستا نہیں لہو		تم آ رہے ہو قتل کسی کو کیے ہوئے
دورِ مے نشاط سے محروم ہی رہا		خونِ جگر کے گھونٹ ہیں میرے پیے ہوئے
اے اہلِ بزم راہ دو سر کو ادھر اُدھر		ہم آ رہے ہیں سیکڑوں ارماں لیے ہوئے

طوفانِ بحرِ غم سے نکلنا محال تھا
کشتی کو لائے نوح سہارا دیئے ہوئے

کیا کیجئے کہتے ہیں وہ سب راز نہیں سے

اس طرح پر بصدارت جناب پنڈت کیلاش ناتھ صاحب کاٹجو ایڈوکیٹ ہائی کورٹ الہ آباد ۱۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کو کائستھ پاٹھ شالہ الہ آباد میں مشاعرہ ہوا مقامی شعراء کے علاوہ ذرہ صاحب کانپوری بھی تھے مشاعرہ دس بجے شب سے شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا

نسبت ہے جو مجھ کو ترے کوچے کی زمیں سے	ج	ہیں دفن کہیں ہوں مگر اُٹھوں گا یہیں سے
ہرگز نہیں پانے کے یہ ہم اور کہیں سے		اکسیر ملے گی ترے کوچے کی زمیں سے
تم کو ہے اگر لاگ مری جانِ حزیں سے		کیوں آ کے یہاں پھینک دو اک تیر وہیں سے
کیا حشر میں آئے نئے لوگ اور کہیں سے		مُردے جو گڑے تھے وہی نکلے ہیں زمیں سے
دربار تمہارا ہو کہ سرکار تمہاری		اُٹھے گی قیامت انھیں دونوں میں کہیں سے
ہے خاص یہی وجہ اگر دور ہے اتنا		ڈرتا ہے فلک بھی ترے کوچے کی زمیں سے
سب پر نگہِ لطف ہوا ہے ساقیِ محفل		آیا ہے یہاں کوئی کہیں کوئی کہیں سے
پہنچی تو مری آہ رسا عرشِ بریں تک		اب دیکھئے جاتی ہے کہاں عرشِ بریں سے
جب کھل سے گئے اسرارِ محبت تو مزا کیا		در پردہ رہے چھیڑ کسی پردہ نشیں سے
تدبیر تو کرنے کو یہاں تک نہیں آتا		ترکیب بتاتا ہے وہ گھر بیٹھے وہیں سے
وہ کہتے ہیں تم خاک میں مل جاؤ تو پوچھوں		ہیں خاک کے رتبے کو کسی خاک نشیں سے
ہوتا ہے مجھے وہم یہ قاصد نہ ہو اُن کا		آتا ہے اگر کوئی مسافر بھی کہیں سے
بیداد وہ کرتے ہیں محبت میں ہمیں پر		پھر داد بھی بیداد کی لیتے ہیں ہمیں سے
بہتر ہے کہ خاموش رہے شورِ قیامت		وہ مجھ کو پکاریں گے تو اُٹھوں گا زمیں سے
دم بھر میں ابھی اور گھڑی بھر میں ابھی اور		یہ ڈھنگ تو کہتا ہے کہ وہ کچھ ہیں تو نہیں سے
مٹ کر بھی دلِ زار مراتب میں زیادہ		ہے چرخ بریں خلدِ بریں عرشِ بریں سے
یہ شرط بھی داخل ہوئی آدابِ وفا میں		شکوہ جو کریں ہم کوئی اُن کا تو نہیں سے
ہے نام تو سجدے کا ملاتے ہیں مگر ہم		نقشِ قدمِ یار کو تحریرِ جبیں سے

بجتے تو نہیں کان یہ میں سوچ رہا ہوں ۔ آتی ہے صدائے طرب انگیز کہیں سے

اے نوح خدا نے مرے دے کر مجھے جاگیر
آگاہ کیا شعر و سخن کی بھی زمیں سے

طبع زاد ۳۱ دسمبر ۱۹۲۷ء

دیدۂ اہلِ خرد میں کیا بساطِ دہر ہے ۔ یہ بھی دریائے فنا کی مٹنے والی لہر ہے
کم سنی ہو یا جوانی حسن کی اک لہر ہے ۔ صرف اتنا فرق ہے یہ حسن ہے وہ قہر ہے
چار دن کی زندگی پر ناز کرنا قہر ہے ۔ ڈوبنے والی کرن مٹ جانے والی لہر ہے
مجھ کو مرنا چاہیئے یا مجھ کو جینا چاہیئے ۔ اُس نگاہِ ناز میں کچھ رحم ہے کچھ قہر ہے
عشق اُن کا باعثِ تفریحِ خاطر ہی سہی ۔ شکل کوئی بھی ہو لیکن زہر آخر زہر ہے
بحرِ الفت میں کہاں تک ہم چلائیں ہاتھ پاؤں ۔ وہ بھی دریا ہے بجائے خود جو اس کی لہر ہے
بیٹھے بیٹھے بٹھائے دل بھی دشمن ہو گیا ۔ اور اب میں کیا کہوں مجھ پر خدا کا قہر ہے
اشک بہنے سے اگر رک جائیں تو معلوم ہو ۔ نہر میں گھر ہے مرا یا میرے گھر میں نہر ہے
ہیں سبق آموزِ فطرت رات دن کے واقعات ۔ دہر کی ایک ایک بات آئینہ دارِ دہر ہے
اشک شوئی کے سبب سے اِن کی وقعت بڑھ گئی ۔ دامن اب دریا ہے اپنی آستیں بھی لہر ہے
رنگ لائے گا محبت میں کسی دن خونِ دل ۔ شوق سے پیتا ہوں گو میں جانتا ہوں زہر ہے
اے نظر اُٹھ اور کر گورِ غریباں کا طواف ۔ جو نہ اُجڑے گا قیامت تک یہی وہ شہر ہے
شام آیا رات بھر ٹھہرا سحر چلتا ہوا ۔ ہر مسافر شاکیِ مہماں سرائے دہر ہے
حسرتیں نکلیں یہ اُجڑا آنگن پھر بس گیا ۔ دل بھی دنیائے محبت میں نرالا شہر ہے
زاہدوں سے دوستی رندوں کی نبھ سکتی نہیں ۔ یہ کہیں گے مے ہے امرت وہ کہیں گے زہر ہے

چار آنسو گر پڑے دنیا میں طوفان آگیا
نوح اپنی چشمِ تر کی ایک یہ بھی لہر ہے

لے چلی پھر وحشتِ دل جانبِ صحرا مجھے

اس طرح پر لکھنؤ معین الادب کا سالانہ مشاعرہ ۱۴ جنوری ۱۹۲۸ء کو بہار صاحب لکھنوی کے اہتمام سے لکھنؤ میں ہوا قریب قریب سب اساتذہ موجود تھے صفی صاحب اپنی علالت سے غزل نہ کہہ سکے اور ظریف صاحب نہ آسکے باہر کے مشاہیر شعرا میں سے باغ صاحب سنبھلی اور شفق صاحب عماد پوری اور بسمل صاحب اور اعجاز صاحب اور رضامن صاحب الہ آبادی نے شرکت کی یہ مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہو کر دس بجے دن کو ختم ہوا

ہجر کی گھڑیاں نہ دیں جس سے کوئی ایذا مجھے ۔ ج ۔ جاننے والے وہ طریقہ تو بتائے جا مجھے

یا خدا بخشا ہے تو نے دل اگر ایسا مجھے
عشق کی دنیا میں دے دے حسن کی دنیا مجھے

اس نوازش نے کیا ہر شے سے بے پروا مجھے
چاہتے ہیں آپ مجھ کو چاہیے اب کیا مجھے

اب ہوس کی آرزو اب عشق ہو کس کا مجھے
دل ملا کر مل گئے تم مل گئی دنیا مجھے

چار آنکھیں ہو گئیں تو کیا قیامت ہو گئی
میں نے دیکھا آپ کو اور آپ نے دیکھا مجھے

حکم دے جس کو جنوں وہ جائے گلشن کی طرف
میں تو کہتا ہوں مبارک ہو ترا صحرا مجھے

کیا فغاں سے میں زمانے کو تہ و بالا کروں
پاس ہے دل کا مجھے اُن کا مجھے سب کا مجھے

چشمِ ظاہر میں سے کرتا تھا اسی عالم کی سیر
دیدۂ دل نے دکھائی دوسری دنیا مجھے

دل کی مجبوری سے محشر میں بھی چپ رہنا پڑا
میں نے کیا کیا سن لیا وہ کہہ گئے کیا کیا مجھے

اُس قدر میں باوفا ہوں جس قدر تو بے وفا
مل نہیں سکتا کوئی مجھ سا تجھے تجھ سا مجھے

اب تو میں ہوں اور دل ہے اور تیری آرزو
جان جائے یا رہے اس کی نہیں پروا مجھے

طالبانِ جلوۂ دیدار بھی خاموش ہیں
حسن اُس کا پوچھتا ہے کون دیکھے گا مجھے

میرے حق میں ہے بہت کچھ یہ کرم بھی آپ کا
اوپری ہی دل سے گو پوچھا مگر پوچھا مجھے

اِس طرح تکمیل میری بے کسی کی ہو گئی
چل دیے احباب رکھ کر قبر میں تنہا مجھے

تم نہیں ملتے تو اچھا حشر دیکھا جائے گا
مل رہے گا اور کوئی تم سے بھی اچھا مجھے

بیشتر ساحل سے موجیں عشق کی لے جائیں گی
چھین کر موجوں سے لے جائے گا پھر دریا مجھے

جلوۂ دیدار کو سمجھا تجلی طور کی
برقِ حسنِ یار نے اکثر دیا دھوکا مجھے

اے کمالِ جوشِ وحشت کچھ اثر اپنا دکھا
کھینچ لوں صحرا کو میں یا کھینچ لے صحرا مجھے

پھر بندھا بیٹھے بٹھائے کوچہ گردی کا خیال
ہر قدم پر چاہیے اک مستقل دنیا مجھے

نوحؑ تیرا معجزہ میں بھولنے والا نہیں
وہ فسانہ یاد ہے طوفان و کشتی کا مجھے

دنیا نہ اُلٹ دوں تو مرا نام نہیں ہے

اس طرح میں ردیف کا آخری لفظ (ہے) زائد ہے اور اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن انجمن معراج الادب لکھنؤ نے ۲۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو یہی طرح دے کر مشاعرہ کیا چوں کہ نارسے میں دفعتاً طاعونی شکایت شروع ہو گئی اور میں کیفی اپنے گاؤں پر سب کو لے کر چلا گیا اس لئے شرکت سے معذوری رہی

رندوں کو غمِ گردشِ ایام نہیں ہے
چلو تو ہے موجود اگر جام نہیں ہے

ج

دل کچھ بھی سہی قابلِ الزام نہیں ہے
ناکام محبت ہے یہ خودکام نہیں ہے

اب دم نہیں اب کوئی دم آرام نہیں ہے
بیمار ترا صبح ہے تو شام نہیں ہے

کس پر اثرِ گردشِ ایام نہیں ہے / تکلیف کو بھی خلق میں آرام نہیں ہے
دل آپ نے لے کر جو دیا مجھ کو دل اپنا / تو یہ کوئی انعام میں انعام نہیں ہے
ہاں آپ کی محفل میں ضرور آپ کے گھر میں / آرام نہیں ہے مجھے آرام نہیں ہے
کیا خوگرِ بیداد ہوا اب دلِ مضطر / وہ شورِ فغاں کا سحر و شام نہیں ہے
ہٹ جاتے ہیں جو دل عشق و وفا میں تو بلا سے / یہ حسن کے نزدیک کوئی کام نہیں ہے
ہیں دردِ محبت میں ہوں کیا طالبِ آرام / آرام بھی کہتا ہے کہ آرام نہیں ہے
ہر وقت ترے حسنِ جہاں تاب کا جلوہ / یہ صبح وہ ہے جس کے لیے شام نہیں ہے
تحریر میں بھی اپنے کو یوں اس نے چھپایا / نامہ مجھے لکھا ہے مگر نام نہیں ہے
اربابِ وفا آپ کو مشکل سے ملیں گے / یہ خاص صفت ہے صفتِ عام نہیں ہے
اقرارِ محبت سے سروکار انھیں کیا / ہر وقت وہی صبح وہی شام نہیں ہے

طوفان اٹھانے میں تامل ہو مجھے کیوں
فرمائیے کیا نوح مرا نام نہیں ہے

طبع زاد ۱۰ فروری ۱۹۲۶ء

کیوں ہماری زبان لی تم نے / اپنے دل کی جو مان لی تم نے
دشمنی مجھ سے ٹھان لی تم نے / جان کر میری جان لی تم نے
شکوہ خود اب نہیں مجھ کو / اپنی تقصیر مان لی تم نے
شکرِ الفت کا یہ مآل ہوا / ترکِ الفت کی ٹھان لی تم نے
اب کہیں کیا ہم آرزو دل کی / پیشتر ہی سے جان لی تم نے
خود بخود مجھ پر ایک تیر چلا / ہاتھ میں جب کمان لی تم نے
ہم نہ مانیں گے اب کسی کی بات / کیا یہی بات ٹھان لی تم نے
مجھ کو لوٹا مجھے ہلاک کیا / دل لیا تم نے جان لی تم نے
کیا ہو امید مجھ کو جینے کی / قتل کرنے کی ٹھان لی تم نے
مان لوں کس طرح تمھاری بات / جو کہی میں نے مان لی تم نے؟
کیوں نہ اوروں کو بھی ہلاک کیا / بس ہماری ہی جان لی تم نے
رازِ غم کوئی کہہ نہیں سکتا / درد دے کر زبان لی تم نے

نوح طوفان پھر آ گئے نہ کہیں
اشک باری کی ٹھان لی تم نے

طبع زاد ۱۸ فروری ۱۹۳۶ء

وہ گھر سے چلے راہ میں رک گئے
اِدھر آتے آتے کِدھر جھک گئے

اگر اشک آنکھوں سے بہتے نہیں
تو معلوم مجھ کو ہوا چُک گئے

ہمیں دیر و مسجد سے کیا واسطہ
جہاں اُس کو دیکھا وہیں رُک گئے

یہ برتاؤ اُس حیلہ جو سے رہا
کھنچا کھنچ گئے ہم جھکا جھک گئے

کہاں اب وہ دل اب کہاں وہ جگر
اُٹھائی یہ ایذا کہ ہم چُک گئے

سفر میں جہاں ہم کو راحت ملی
قدم چلتے چلتے وہیں رُک گئے

نہد شاخِ پر میوہ سر بر زمیں
ملی جن کو توقیر وہ جھک گئے

یہیں مرگ اب کچھ تردد نہیں
چُکا کر مجھے رنج و غم چُک گئے

نقاہت نے اِن پر بھی ڈالا اثر
مرے اشک بہتے ہوئے رک گئے

ہم اُن سے پلٹ جائیں ممکن نہیں
جدھر جھک گئے اب اُدھر جھک گئے

وہ ملنے کو مجھ سے بڑھے تھے مگر
خدا جانے کیا سوچ کر رُک گئے

محبت نے پامالِ غم کر دیا
جو سرکش تھے اُن کے بھی سر جھک گئے

اُٹھے نوح طوفانِ اشکوں سے کیا
ہمیں رنج و افکار میں جھک گئے

طبع زاد ۱۲ مارچ ۱۹۳۶ء

ہر دم کسی حسین کا ہمیں دھیان چاہیئے
پورا نہ ہو کہ ہو مگر ارمان چاہیئے

دل کے لیے خلش یہی ہر آن چاہیئے
پہلو میں تیر تیر میں پیکان چاہیئے

احساس نیک و بد کا مری جان چاہیئے
یہ کون ہے وہ کون یہ پہچان چاہیئے

حوریں ملیں بہشت میں ہم کو تو کیا ملیں
انسان کے لئے کوئی انسان چاہیئے

مرتا رہوں کسی کی محبت میں بار بار
ہر وقت مجھ کو ایک نئی جان چاہیئے

شکوہ نکل نہ جائے کہیں شکر کی جگہ
ناکامیوں میں اس قدر اوسان چاہیئے

ابر و ہوا و باغ کی تخصیص کچھ نہیں
جس سے مجھے سکوں ہو وہ سامان چاہیئے

اِس وقت اور رنگ ہو اُس وقت اور ڈھنگ
تم کو نرالی وضع نئی شان چاہیئے

وعدہ کیا وفا کا تو وعدہ وفا بھی کر
یہ مجھ کو چاہیئے اور اسی آن چاہیئے

ہم دے رہے ہیں دل ہی اسے اپنی جان بھی
کافر یہ کہہ رہا ہے کہ ایمان چاہیئے

دنیائے ذوق و شوق میں ہیں سب طرح کے لوگ
عشق و ہوس کی آپ کو پہچان چاہیئے

ہیں گوشۂ مزار میں کیا بے قرار ہوں
اس جست و خیز کے لئے میدان چاہئے

بھولے سے بھی وطن کے مناظر نہ یاد آئیں
مجھ کو مسافرت میں یہ سامان چاہئے

دل کا سوال آج تو کرتے ہیں بار بار
کل وہ کہیں گے ہم کو تری جان چاہئے

ممکن ہے خاک اُڑانے کی سوجھے بہار میں
گلشن کے آس پاس بیابان چاہئے

وہ ہنس رہے ہیں گریۂ بے اختیار پر
اے نوحؔ تم کو نوح کا طوفان چاہئے

طبع زاد ۱۵ اپریل ۱۹۲۸ء

اہلِ غم جان سے گذرنے لگے
کچھ خیال آگیا یہ مرنے لگے

ج

اب جوانی میں پردہ کرنے لگے
وہم کیا کیا اُنھیں گذرنے لگے

دم مری آہ کا وہ بھرنے لگے
خیبر سے ذکرِ خیبر کرنے لگے

پہلے ہوتے تھے عشق میں بیمار
لوگ اب رفتہ رفتہ مرنے لگے

تھا یہ مطلب کہ اور مضطر ہوں
وہ مرے سامنے سنورنے لگے

اچھی صورت جہاں دکھائی دی
ہم وہیں ہائے ہائے کرنے لگے

آپ آتے نہیں جو پہلو میں
کیوں مرے دل کے زخم بھرنے لگے

حسن کا سحر چل گیا ہم پر
دیکھ کر اُن کو جینے مرنے لگے

حضرتِ دل خموش رہتے ہیں
یہ بھی ہم سے مزاج کرنے لگے

اے فغاں اس کو مان لوں کیوں کر
توبہ توبہ وہ مجھ سے ڈرنے لگے

میں ہوں ممنون بد زبانی کا
مجھ سے تم گفتگو تو کرنے لگے

بڑھ گئے سب سے حضرتِ زاہد
یہ فرشتوں کے پر کترنے لگے

ہم قیامت میں جی اُٹھے تو کیا
دیکھ کر پھر کسی کو مرنے لگے

اہلِ الفت کی زندگی کیا ہے
دے دیا تم نے حکم مرنے لگے

کیا قیامت قریب آ پہنچی
اپنے وعدے سے وہ مکرنے لگے

دشمنی کا تو کوئی ذکر نہیں
ہم تری دوستی سے ڈرنے لگے

حضرت نوحؔ آگیا طوفان
تیرنے والے ڈوب مرنے لگے

طبع زاد ۱۶ جون ۱۹۲۸ء

اسرارِ نہاں سامنے لائے نہیں جاتے
ج
ناسور کلیجے کے دکھائے نہیں جاتے

روٹھے ہوئے معشوق منائے نہیں جاتے
بلوائیے خود جائیے آئے نہیں جاتے

دیکھا یہ اُسی محفلِ دلکش میں تماشا
جاتے ہیں مگر لوگ بلائے نہیں جاتے

ممکن ہے کہ آئندہ عنایت کی نظر ہو
آثارِ محبت ابھی پائے نہیں جاتے

کیا اہلِ وفا کو کسی ترغیب کی حاجت
خود جلتے ہیں پروانے جلائے نہیں جاتے

فرقت کے فسانوں کو ملا درد بیاں تک
سنتا بھی ہے کوئی تو سنائے نہیں جاتے

رہتا ہے تصور ہمیں آدابِ وفا کا
پڑھ کر یہ سبق دل سے بھلائے نہیں جاتے

تجھ سے جو مرے گھر کبھی آیا نہیں جاتا
مجھ سے بھی ترے ناز اُٹھائے نہیں جاتے

کیوں کر ہو ثبوتِ غمِ آزارِ محبت
دیکھے نہیں جاتے یہ دکھائے نہیں جاتے

یا ہم نے کیا قطعِ تعلق کا ارادہ
یا محفلِ جاناں میں بُلائے نہیں جاتے

تم عارضِ گل رنگ سے برقع ہی اُلٹ دو
ہر قد پہ اگر پھول چڑھائے نہیں جاتے

جلوہ سحر و شام وہی شمس و قمر کا
قدرت کے یہ فانوس بجھائے نہیں جاتے

کیوں عرض کروں حسرتِ دیدار ہے مجھ کو
اِس کہنے سے وہ سامنے آئے نہیں جاتے

کیا وعظ کی مجلس میں مئے ناب کا چرچا
پانی کے بھی دو گھونٹ پلائے نہیں جاتے

طوفان اُٹھاؤ کبھی اشعار سناؤ
اے نوحؔ کمالات چھپائے نہیں جاتے

حسب فرمائش جانکی بائی الہ آباد
۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۶ء

ج

خم سبو شیشہ صراحی جام پیمانہ رہے
بس انہیں چھوٹوں بڑوں کے دم سے میخانہ رہے

مدعا فانوس کا یہ ہے نہ پروانہ رہے
اپنی حد میں شمع اپنی حد میں پروانہ رہے

چاہیے جوشِ جنوں میں یوں جنوں کی روک تھام
ایک دیوانے کے پیچھے ایک فرزانہ رہے

اور بھی اِن کے سبب سے حسن کی زینت بڑھی
تم رہو دنیا میں آئینہ رہے شانہ رہے

عشق کہتا ہے بڑھے یوں کفر و دیں کا اتحاد
دیر میں مسجد رہے کعبے میں بت خانہ رہے

یہ ہے اپنی مصلحت تخصیص اِس میں کچھ نہیں
جس سے تم یارانہ رکھو اس سے یارانہ رہے

کیا خبر کیا قہر ڈھائیں دو اگر ہو جائیں جمع
ایک دیوانے سے آباد ایک ویرانہ رہے

اس سے کچھ مطلب نہیں ہم کو خزاں ہو یا بہار
رقص میں توبہ رہے گردش میں پیمانہ رہے

ارتکابِ جرم پر بھی قابلِ پرسش نہیں
عافیت دل کی اِسی میں ہے کہ دیوانہ رہے

اے مرے خلّاق آشنا کیا نہیں ہوں جز و خلق
ہے جہاں سب سے وہاں مجھ سے بھی یارانہ رہے

کیا سمجھ کر یہ انوکھا حکم تم نے دے دیا
شمع محفل میں رہے لیکن نہ پروانہ رہے

شیوۂ عشق و وفا میں یہ بھی تھی اک شرطِ خاص
جو یگانہ ہو ترا وہ سب سے بیگانہ رہے

اپنے اپنے گھر سے نکلے سیر کو اہلِ جنوں
ہر قدم پر ایک صحرا ایک ویرانہ رہے

چاہیے کچھ انکسارِ انساں میں کچھ ایثار بھی
دل امیرانہ رہے صورت فقیرانہ رہے

جوشِ الفت میں نہ آیا نام کا بھی کچھ خیال
نوحؔ طوفانِ سرشکِ غم سے بیگانہ رہے

تم اگر چاہو تو صحرا بھی گلستاں ہو جائے

اس طرح پر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو لشکر گوالیار میں مشاعرہ ہوا میں جناب محمد خاں صاحب وکیل کے صاحبزادے کی شادی میں شریک تھا اس باعث سے شرکت پر احباب نے بہت مجبور کیا یہ چند شعر سرسری فکر میں کہہ لیے تھے جو میں نے پڑھ دیے مقامی شعرا میں سے حضرات تاباںؔ ضیاؔ نیرؔ قمرؔ صاحبان وغیرہ موجود تھے انھوں نے غیر طرح غزلیں پڑھیں طرح میں اور لوگوں نے نہیں پڑھیں

ج

دل جو دے کر کسی کافر کو پریشاں ہو جائے
عافیت اس کی ہے اس میں کہ مسلماں ہو جائے

وہ جو گھر جاتے ہیں تو حشر کا ساماں ہو جائے
آج خورشید بھی مغرب سے نمایاں ہو جائے

اس کی محرومیِ قسمت کا ٹھکانا کیا ہے
فصلِ گل آتی ہے جو داخلِ زنداں ہو جائے

خاک وہ شمع جلائیں گے مری تربت پر
چند ذرّے چمک اٹھیں تو چراغاں ہو جائے

رنگِ الفت میں یہ تاثیرِ وفا نے بخشی
ہم نمایاں نہ کریں آپ نمایاں ہو جائے

مجھ کو بے پردگیِ حسن تو منظور نہیں
جان میں دے دوں وہ تلوار جو عریاں ہو جائے

جینے دیتی نہیں مرنے کی تمنا مجھ کو
موت ایسے میں جو آجائے تو احساں ہو جائے

مجھ کو یہ فکر کہ مٹ جائے پریشانیِ شوق
ان کو یہ شوق کہ کچھ اور پریشاں ہو جائے

یہ زمانے میں کسی کے لیے مخصوص نہیں
چار پریاں جسے مل جائیں سلیماں ہو جائے

سازِ دل چھیڑ کے اب میری تمنا ہے یہی
پردے والا کسی پردے سے نمایاں ہو جائے

لوگ کہتے ہیں پڑھیں نوحؔ غزل اپنی ضرور
آج لشکر میں بپا پھر وہی طوفاں ہو جائے

حسبِ فرمائش عابد مسیح صاحب عابدؔ گورکھپوری

۶ فروری ۱۹۲۹ء

ج

چھم رخ سے مل کر ستانا کوئی ان سے سیکھ لے
فوراً اس کا سیکھ جانا کوئی ان سے سیکھ لے

سامنے رہتے ہیں لیکن سامنے آتے نہیں
پردے پردے میں ستانا کوئی ان سے سیکھ لے

میں سمجھتا تھا کہ ہے فتنہ اٹھانا بھی محال
ہر قدم پر حشر ڈھانا کوئی ان سے سیکھ لے

اس طرف چلمن اٹھائی اس طرف ڈالی نقاب
منھ دکھانا منھ چھپانا کوئی ان سے سیکھ لے

پھر وہی چرچا نکالا بلبل و صیاد کا
فصل گل میں گل کھلانا کوئی ان سے سیکھ لے

یہ نوازش یہ محبت یہ کرم یہ التفات
دل میں رہ کر دل بڑھانا کوئی ان سے سیکھ لے

مجھ کو حسرت رہ گئی اقرار پورا ہو گیا
جلد آنا جلد جانا کوئی ان سے سیکھ لے

پھر خبر لیتے نہیں آتے نہیں ملتے نہیں
دل چرا کر جی چرانا کوئی ان سے سیکھ لے

بیٹھتے ہیں آئینے کے روبرو منھ پھیر کر
شرم و شوخی کا سکھانا کوئی ان سے سیکھ لے

داغ فرقت بھی دیا سوز غم فرقت کے بعد
اپنے جلتے کو جلانا کوئی ان سے سیکھ لے

ہیں منانے کو اگر کہتا تو خیر اک بات تھی
بیٹھے بیٹھے روٹھ جانا کوئی ان سے سیکھ لے

جب ملے تو کہہ دیا آؤ کسی دن میرے گھر
اور پھر دل سے بھلانا کوئی ان سے سیکھ لے

اور کیا دیکھا جناب نوح میں ہم نے کمال
بس وہی طوفاں اٹھانا کوئی ان سے سیکھ لے

جلوے بہت ہیں طالب دیدار کے لئے

۱۶ مارچ ۱۹۲۹ء کو اس طرح پر جنرل مشاعرہ مظفر نگر میں سید نثار احمد صاحب قیصر ڈپٹی کلکٹر و کیلاش نرائن صاحب بے دل ایڈوکیٹ کے اہتمام سے ہوا مقامی شعرا کے علاوہ باغ صاحب سنبھلی سیماب صاحب شوخ صاحب ساغر صاحب بزم صاحب اکبر آبادی جگر صاحب مراد آبادی ساحر صاحب شید صاحب راز صاحب دہلوی قمر صاحب بدایونی محشر صاحب ناطق صاحب لکھنوی وغیرہ شریک بزم تھے چونکہ یہ مشاعرہ نمائش میں ہوا تھا اس باعث سے بڑی چہل پہل رہی نو بجے شب سے شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا

ج

کیوں روک تھام جلوۂ دیدار کے لئے
ہے پیاری پیاری شکل تری پیار کے لئے

ارشاد ایک بار تو ہو پیار کے لئے
کہتے نہیں ہم آپ سے سو بار کے لئے

ہم کو تو ہر جگہ نظر آیا جمال دوست
کیا شرط کوہ طور کی دیدار کے لئے

تشریف وہ نہ لائیں اجل ہی کو بھیج دیں
کوئی طبیب چاہئے بیمار کے لئے

پوچھیں جو وہ تو کیوں نہ کریں ہائے ہائے ہم
عنوان ہے یہ شرح دل زار کے لئے

کیا نا خدا ہے بحر محبت کوئی نہیں
اس پار بے قرار ہوں اس پار کے لئے

آئیں نہ خواب میں نہ کبھی وہ خیال میں
یہ بندوبست جلوۂ دیدار کے لئے

لازم ہے چشم شوق کو اس رخ کی دیکھ بھال
مالی ضرور چاہئے گلزار کے لئے

آتے نہیں وہ دیکھنے کو پوچھتے تو ہیں
یہ بھی بہت ہے عاشق بیمار کے لئے

رکھ دوں گا سامنے جگر و دل نکال کر
کہتا ہوں کچھ کہوں کبھی کہتا ہوں کیوں کہوں
یارب کچھ اور ذکر قیامت میں چھڑ گیا
کیسی بہار ہم تو پئیں گے خزاں میں بھی
بارِ ستم اگر نہ اٹھائیں تو کیا کریں
لطفِ بہارِ عیش گلستاں میں کچھ نہیں
بہتر ہے عشق میں وہ سب آ جائیں ایک ساتھ
ہمت کبھی کچھ اگر ہو تو دشواریاں نہیں

درکار گل جو ہوں گے انھیں ہار کے لئے
زحمت بڑی ہے واقفِ اسرار کے لئے
آئے بیٹھے ہم یہاں ترے دیدار کے لئے
موسم کی شرط کچھ نہیں مے خوار کے لئے
چھانٹا ہمیں کو عشق نے بیگار کے لئے
مخصوص ہے یہ خانۂ خمار کے لئے
جتنی مصیبتیں ہوں دلِ زار کے لئے
راہِ طلب ہے سہل طلبگار کے لئے

اے نوح جوشِ بحرِ محبت کی سیر کر
کشتی تری بنی اسی منجدھار کے لئے

طبع زاد ۱۶؍ جون ۱۹۲۹ء

ج

قبر میں ایک اک کفن اہلِ عدم کے پاس ہے
عالمِ ذوق و شوق میں سیرِ امید و یاس ہے
اپنی پسند اپنا ذوق اپنی نگاہ اپنا شوق
رنگِ بہار دیکھ کر کیوں نہ شراب میں پیوں
ترکِ ستم کرے گا کیا چاہیے شیوۂ وفا
اہلِ نیاز کی طرف دستِ طلب بڑھائے کیوں
شانِ حقیقت آج تک پردۂ راز میں رہی
مژدۂ بارشِ کرم لائی بھی فصلِ گل تو کیا
دورِ شراب چل چکا بھر گئیں سب کی نیتیں
شکوۂ ظلم اور دل اور وہ دل بھی دل مرا
دل کے سکون کا سبب گر یہ عشق بن گیا
گردشِ روزگار سے کم نہیں انقلابِ عشق
حشر میں اہلِ حشر بھی محوِ جمال ہو گئے
طول تھا ماجرائے دل کہہ نہ سکے تمام ہم
میں ہی جہان میں فقط بیکس و نامراد ہوں
باعثِ اوج بن گئی اس کے لئے فروتنی

کام جو آئے حشر تک خوب وہی لباس ہے
کوئی کہیں بحال ہے کوئی کہیں اداس ہے
دل ہے اداشناسِ حسن آئینہ روشناس ہے
باغ میں ایک ایک گل میرے لئے گلاس ہے
حسن سے التجا نہیں عشق سے التماس ہے
پہلے وہ دل میں سوچ لے دل بھی کسی کے پاس ہے
تجھ سے نظر فریب کا کون نظر شناس ہے
میرے چمن کی ہر کلی اپنی جگہ اداس ہے
ساقیِ بزم پوچھ لے اب بھی کسی کو پیاس ہے
اس کا مجھے یقین نہیں صرف ترا قیاس ہے
سیلِ سرشکِ آرزو نکلی ہوئی بھڑاس ہے
پہلے امید جس میں تھی اب وہی دل میں یاس ہے
آج نئی طرح کی بھیڑ آپ کے آس پاس ہے
آپ سے جس قدر کہا صرف وہ اقتباس ہے
کوئی کسی کے ساتھ ہے کوئی کسی کے پاس ہے
گو ہے زمین پر بسر پھر بھی فلک اساس ہے

اور کریں گے کیا بیاں اور کو آگہی نہیں — آپ مجھی سے پوچھئے کس لئے تو اداس ہے
درد کے غم نے اب ہمیں خوگرِ غم بنا دیا — شکوہ و آہ کی جگہ شکر ہے یا سپاس ہے
رنگِ نشاط پہ فدا حسنِ بہار کیوں نہ ہو — سرخ شراب ہے مری سبز مرا گلاس ہے
لطف و کرم کا آسرا ان سے کروں تو کیا کروں — جو نہ قبول ہو سکی یہ وہی التماس ہے

اب وہ سکونِ دل کہاں لطف کہاں خوشی کہاں
مجمعِ درد و یاس و غم نوحؔ کے آس پاس ہے

طبع زاد ۵ اگست ۱۹۲۹ء

صبح دم آہ رسا دیکھئے کیا کرتی ہے — ج — یہ سویرے کی ہوا دیکھئے کیا کرتی ہے
وہ شرارت یہ حیا دیکھئے کیا کرتی ہے — تیری ایک ایک ادا دیکھئے کیا کرتی ہے
سرخیِ رنگِ شفق سے نہیں کھٹکا مجھ کو — اُن کے ہاتھوں کی حنا دیکھئے کیا کرتی ہے
چارۂ دردِ محبت کا نتیجہ معلوم — ہم یہ کرتے ہیں قضا دیکھئے کیا کرتی ہے
بچ گیا کل کسی حکمت سے نشیمن اپنا — آج کی تند ہوا دیکھئے کیا کرتی ہے
میں یہ سنتا ہوں وہ مجھ سے ہیں زیادہ مضطر — اور ابھی آہِ رسا دیکھئے کیا کرتی ہے
آپ کے تیرِ نظر نے مجھے جینے نہ دیا — آپ کی تیغِ ادا دیکھئے کیا کرتی ہے
گل ہنسے دیتے ہیں غنچے بھی کھلے جاتے ہیں — جنبشِ بادِ صبا دیکھئے کیا کرتی ہے
شوقِ دل عشق بنا عشق بنا دردِ جگر — درد کی نشو و نما دیکھئے کیا کرتی ہے
مل گئی اُن کی طبیعت سے طبیعت میری — اب یہ تحریکِ وفا دیکھئے کیا کرتی ہے
تعزیت کو نہیں آتے ہیں کہ وہ آتے ہیں — مرنے والے کی دعا دیکھئے کیا کرتی ہے
سجدۂ شکر ستم ہائے ستم وائے ستم — خوئے تسلیم و رضا دیکھئے کیا کرتی ہے
سنے جو لیے درد وہ سن کر اسے ہم درد بنے — دردمندوں کی صدا دیکھئے کیا کرتی ہے
خلق میں خلق نے جھیلے ترے آزار بہت — اب سرِ روزِ جزا دیکھئے کیا کرتی ہے
پاؤں نخوت سے زمیں پر نہیں رکھتا کوئی — نوجوانی کی ادا دیکھئے کیا کرتی ہے

نوحؔ دریائے محبت میں بہے جاتے ہیں
سیلِ طوفانِ بلا دیکھئے کیا کرتی ہے

شاعر جو قدرتی ہے فطرت کا رازداں ہے

اس طرح پر کانپور میں نومبر ۱۹۳۲ء کو مشاعرہ ہوا تھا بیماری کے سبب سے میری شرکت نہ ہو سکی

برباد ہو گیا دل آباد اب کہاں ہے — ج — بگڑا ایسا کہ گھروندا اجڑا ایسا کہ مکاں ہے

بہار میں بھی آسائش اب کہاں ہے
چلے جائیں طور پہ ہم جانا ہی رائیگاں ہے
وہ عیش وہ زمانہ وہ زندگی کہاں ہے
میں کھو رہا ہوں اُن سے میں مر رہا ہوں تم پہ
میں اُن سے پھر بتاؤں وہ مجھ سے پھر یہ پوچھیں
جا کھینچ لا انہیں کو اُس سمت تک پہنچ کر
پہلے زمانہ دیکھے پھر دیکھ کر یہ سوچے
ہم کیا کریں گے مر کر ہم کیا کریں گے جی کر
وہ نزع میں نہ آئیں یا میرے پاس آئیں
لیے چین مجھ کو رکھا جس چین کی ہوس نے
کچھ ہو بلا سے لیکن تو قید تو یہ پائی
پچھلی مسرتوں کو میں یاد کر رہا ہوں

موجود ہے گلستاں مفقود آشیاں ہے
اب آگ بجھ گئی ہے صرف آگ کا دھواں ہے
جب اور آسماں تھا اب اور آسماں ہے
دیکھیں تو صرف فقرہ سمجھیں تو داستاں ہے
کیا شوق کیا تمنا کیا شکوہ کیا فغاں ہے
اے آہ تیرے آگے کیا چیز آسماں ہے
ہے ایک ہی تجلی لیکن کہاں کہاں ہے
جینا بھی رائیگاں ہے مرنا بھی رائیگاں ہے
اب وقت آخری ہے اور آخری فغاں ہے
پہلے تو وہ نہیں ہے پھر ہے بھی تو کہاں ہے
صیاد کی نظر میں میرا ہی آشیاں ہے
ہر بات ایک نوحہ ہر سانس اک فغاں ہے

اے نوح خوب تو نے اپنا یہ نام رکھا
ہر شخص پوچھتا ہے کشتی تری کہاں ہے

بادہ راحت فزا ساقی کے پیمانے میں ہے

۲۲ دسمبر ۱۹۲۹ء کو سید باسط علی صاحب حزیں کے اہتمام سے اس طرح پر فیض آباد میں مشاعرہ قرار پایا تھا۔ بسمل صاحب اور ستار صاحب بھی میرے ساتھ گئے تھے لیکن کثرت بارش سے مشاعرہ نہ ہو سکا اور بغیر غزل پڑھے ہوئے جو لوگ گئے تھے وہ سب واپس گئے۔

بادہ سرجوش کا عالم ہے مے خانے میں ہے
زندگی کا لطف اگر کچھ ہے تو مے خانے میں ہے
دور پیہم کھو رہے ہیں عہد مے خانے میں ہے
اللہ اللہ کیا نشاط طبع مے خانے میں ہے
قابل تعریف یہ تقسیم مے خانے میں ہے
پھر فریب وصل تک دینے لگی مجھ کو شراب
دل کے رنگ آرنگ ذوق و شوق کو ہم کیا کہیں
ہم اگر تا دیر سے پہنچے تو کیا تیرا قصور
چشم ساقی سے ابھی کچھ وقت پر مل جائے گی

جس کے پیمانے میں دیکھو اس کے پیمانے میں ہے
مے نہیں یہ بلکہ امرت میرے پیمانے میں ہے
چلتی پھرتی چیز چلتے پھرتے پیمانے میں ہے
دل میں پیمانہ ہے میری جان پیمانے میں ہے
جس کو جتنی پیاس اتنی اس کے پیمانے میں ہے
کل کمی یہ تھی پیاس لیکن آج پیمانے میں ہے
مختلف اقسام کی مے ایک پیمانے میں ہے
دے دے لے ساقی یہی تلچھٹ جو پیمانے میں ہے
کیوں یہ کوئی گھونٹ دو گھونٹ اپنے پیمانے میں ہے

تھا کبھی دل کو خیالِ شیشہ و جام و سبو
مے کدے کا مے کدہ اب میرے پیمانے میں ہے

جس قدر ساقی پلائے اس قدر پی لوں شراب
کیا بڑے سے خُم میں کیا چھوٹے سے پیمانے میں ہے

ابر میں بجلی جو چمکی تو انھیں لطف آ گیا
رند سمجھے آتشِ سیّال پیمانے میں ہے

کیوں نہ ہم بے خود ہوں چشمِ لطفِ ساقی دیکھ کر
وہ ہے اس میں کیف جو لب ریز پیمانے میں ہے

مے کہاں شبنم کہاں یہ اور شے وہ اور چیز
گل کے ساغر میں نہیں جو میرے پیمانے میں ہے

کس لیے عالم کو دیکھیں دل ہم اپنا دیکھ کر
مے کدے بھر کا نچوڑ اس ایک پیمانے میں ہے

بادۂ الفت سے خالی کب ہمارا دل رہا
یہ بڑی انمول شے انمول پیمانے میں ہے

نوحؔ کو دیکھا تو اُن کا معجزہ بھی دیکھ لو
ایک اک طوفان بند ایک ایک پیمانے میں ہے

طبع زاد ۲ اپریل سنہ ۱۹۳ء

غ

زیست میں کب یہ بات ہوتی ہے
قدر بعد از ممات ہوتی ہے

کیوں کہوں بے ثبات ہوتی ہے
اپنی بات اپنے ہات ہوتی ہے

آپ مجھ پر کرم جو کرتے ہیں
مختصر کتنی رات ہوتی ہے

عیش و غم اتنے اُن کو ملتے ہیں
جن کی جتنی حیات ہوتی ہے

جان دیتا ہوں میں حسینوں پر
کوئی تو ان میں بات ہوتی ہے

تیری محفل میں تیرے کوچے میں
اور دن اور رات ہوتی ہے

زندگی پر غرور کرنا کیا
زندگی بے ثبات ہوتی ہے

بیٹھ جانا کسی کا پہلو میں
دل چُرانے کی گھات ہوتی ہے

کام آتی ہے جو مصیبت میں
وہ خدا ہی کی ذات ہوتی ہے

ہیں وفا سے پلٹ نہیں سکتا
عشق کی ایک بات ہوتی ہے

عشق میں کچھ کبھی رہ نہیں جاتا
نذر سب کائنات ہوتی ہے

خاص لوگوں سے یہ سنا ہم نے
عشق میں خاص بات ہوتی ہے

کشتگانِ وفا کی لاش کے ساتھ
اچھی خاصی برات ہوتی ہے

کیا کرے اور کوئی کیا نہ کرے
چار دن کی حیات ہوتی ہے

نوحؔ کہتے ہیں حسبِ حال اشعار
ہر غزل واقعات ہوتی ہے

طبع زاد ۲۳ جون سنہ ۱۹۳ء

داغ دے دے کر مجھے گلشن سے رخصت ہو گئے
پھول جتنے تھے وہ میرے حق میں کانٹے ہو گئے

عاشقوں کی موت پر مغموم ناحق ہو گئے
تم سمجھ لو نیند ان کو آ گئی یہ سو گئے

آفریں اس بیخودیِ شوق کے انجام پر
دل کو کھو کر ہم بھی اُن کی جستجو میں کھو گئے

المدد اے اشتیاقِ منزلِ عشق المدد
جو کبھی پیچھے تھے وہ اب مجھ سے آگے ہو گئے

بے طلب جانا خلافِ عقل و ننگ عشق تھا
ہم کو قاصد بھیج کر اُس نے بلایا تو گئے

آنسوؤں کی جستجو اب کیا ہو کوئے یار میں
خاک پر گر کر مرے انمول موتی کھو گئے

تم نے ٹکڑے کر کے کیا اچھا اضافہ کر دیا
ایک دل تھا ایک دل کے سیکڑوں دل ہو گئے

مختصر الفاظ میں یہ شرحِ مرگ و زیست تھی
رات بھر جاگا کئے ہم صبح ہوتے سو گئے

اے خیالِ بے کسی اب میں کسے آواز دوں
دم رفاقت کا جو بھرتے تھے وہ رخصت ہو گئے

ابرِ رحمت نے گنہگاروں کا پردہ رکھ لیا
چار چھینٹوں ہی میں سب داغِ معاصی دھو گئے

شدتِ آثار میں اکثر ہوا یہ واقعہ
جو عیادت کو مری آئے وہ مجھ کو رو گئے

ملکِ ہستی میں کھلے ملکِ عدم کا راز کیا
اس جگہ تک وہ نہ آئے اُس جگہ تک جو گئے

شمعِ طلعت برق پیکر مہ جبیں خورشید رو
حسن روز افزوں کو پا کر آپ سب کچھ ہو گئے

اب جگر کو اپنے ڈھونڈیں یا پتہ لیں دل کا ہم
ایک تیرِ عشق میں دونوں یکایک کھو گئے

میں سمجھتا تھا کہ اب قربِ قیامت ہے مگر
حضرتِ مہدی کے بدلے نوحؑ ظاہر ہو گئے

۱۵ر اگست سنہ ۱۹۴۷ء

مزا جب ہے وفا پر دل سے وہ تیار ہو جائے
گلے میں ڈال کر بانہیں گلے کا ہار ہو جائے

عجب کیا فرطِ غم سے دل مرا بیکار ہو جائے
نفس چلتا ہوا چلتی ہوئی تلوار ہو جائے

ادا ہشیار ہو جائے نظر تیار ہو جائے
ہمیں تو جان دینی ہے کسی کا وار ہو جائے

وہ میرے دل کی ٹھنڈی سانس کیا کیا تھم کے سنبھالیں
جو لب تک آتے آتے آہِ آتش بار ہو جائے

معاذ اللہ یہ گردش تمہاری شوخ آنکھوں کی
نہ ہونا ہو جسے بیمار وہ بیمار ہو جائے

کہاں قسمت یہ خنجر کی کہاں رتبہ یہ ناوک کا
نگاہِ نازنیں جانے نگاہِ یار ہو جائے

تصرف ہے یہ عشقِ یار میں حسنِ تصور کا
جدھر اُٹھے نظر اپنی ادھر دیدار ہو جائے

زباں تک آہِ دل پہنچے کہ بدلے رنگ رخ اپنا
کسی صورت سے اُن پر عشق کا اظہار ہو جائے

حسیں کیوں اس لقب پر ایں قدر اترا کے پھرتے ہیں
جسے سرکار میں کہہ دوں وہی سرکار ہو جائے

وفا کے جوش میں کیا پوچھنا اُس کی جسارت کا
جو قبل از وقت مرنے کے لئے تیار ہو جائے

دمِ قہر و غضب مجھ پر ضرورت کیا ترحم کی کھنچے بھی تو کھنچے اتنا کہ وہ تلوار ہو جائے

کہاں کی فاتحہ کیا شمع کیا گل کیا عزاداری وہ میری قبر پر آکر فقط اک بار ہو جائے

اثر پہنچا یہاں تک انتہائے بادہ خواری کا جو مجھ کو دیکھ لے وہ بے پیئے سرشار ہو جائے

دلِ مضطر کو اپنے ہم تو جب سمجھیں دلِ مضطر ترقی کر کے یہ برقِ نگاہِ یار ہو جائے

جنابِ نوح سے کہنا یہ طوفانِ محبت کا
اگر تم غرق ہو جاؤ تو بیڑا پار ہو جائے

تلاشِ رہبرِ کامل بڑی مشکل سے ہوتی ہے

اِس طرح پر بدایوں میں ۲۸ ستمبر ۱۹۳۰ء کو مشاعرہ قرار پایا تھا میں نے غزل تو کہی لیکن وقتی مجبوریوں سے شریک نہ ہو سکا

ج

غلط کیوں کر کوئی سمجھے غلط مشکل سے ہوتی ہے وہی تو بات ہوتی ہے جو سچے دل سے ہوتی ہے

کہاں اِس دل سے ہوتی ہے کہاں اُس دل سے ہوتی ہے محبت دو دلوں میں یک بیک مشکل سے ہوتی ہے

تشفی اضطرابِ شوق میں مشکل سے ہوتی ہے بڑی بکواس مجھ سے اور میرے دل سے ہوتی ہے

فنا کے بعد دردِ دل کی دوری دل سے ہوتی ہے یہ وہ مشکل ہے جو آسان اِس مشکل سے ہوتی ہے

بدایوں کا تو کیا چرچا پرائے پھر پرائے ہیں محبت میں عداوت خاص اپنے دل سے ہوتی ہے

کوئی دیکھے نہ دیکھے قیس کی آنکھیں تو دیکھیں گی جھلک لیلےٰ کی ظاہر پردۂ محمل سے ہوتی ہے

محبت کے مراتب کو بس اہلِ دل سمجھتے ہیں کہ اِس کی ابتدا بھی انتہا بھی دل سے ہوتی ہے

ہماری رائے میں مرنا بھی کچھ وقعت نہیں رکھتا وفا ہوتی ہے تکمیلِ وفا مشکل سے ہوتی ہے

اِدھر اقرار کرنا اور اُدھر فوراً مکر جانا مجھے نفرت تمہارے وعدۂ باطل سے ہوتی ہے

حسینوں کا یہ اندازِ طلب بھی کیا حسیں نکلا خوشامد ایک دل کے واسطے سو دل سے ہوتی ہے

پہنچ جاتی ہیں آسانی سے آہیں عرشِ اعظم تک رسائی اُن کی بزمِ ناز میں مشکل سے ہوتی ہے

ہم اُن کے ظاہر و باطن میں کتنا فرق پاتے ہیں بھلائی منھ سے ہوتی ہے بُرائی دل سے ہوتی ہے

جہاں خورشید ڈوبا شمع پہنچی دل جلانے کو یہ دن بھر کے لئے رخصت تری محفل سے ہوتی ہے

یہی کعبہ محبت کا یہی بت خانہ الفت کا بہت کچھ اہلِ دل میں قدر دل کی دل سے ہوتی ہے

کہیں دریا کہیں صحرا نیا عالم نیا منظر عجب تفریحِ خاطر دوریٔ منزل سے ہوتی ہے

طریقہ بھی نہیں معلوم اطمینان دینے کا وہی اُن کی اچٹتی بات اُچٹتے دل سے ہوتی ہے

دلِ مجروحِ غم اپنا سلامت رہ سکے کیوں کر کہ بسم اللہ خنجر کی اِسی بسمل سے ہوتی ہے

قیامت کا اٹھا طوفان دریائے محبت میں
روانہ نوح کی کشتی بھی اب ساحل سے ہوتی ہے

طبع زاد ۲۷/ ستمبر ۱۹۳۰ء

گل مقصد ریاضِ دہر سے کیوں چُن نہیں سکتے
ہم اس کو کہہ نہیں سکتے تم اس کو سُن نہیں سکتے

ہمارے دل کو ہو غیروں سے کیا امیدِ دل سوزی
کہ اپنے بھی پرائی آگ میں جل بھُن نہیں سکتے

بہارِ عیش خوفِ خار غم محرومی قسمت
کھلے ہیں سیکڑوں گل اور انھیں ہم چُن نہیں سکتے

جو سچ پوچھو تو ہے شعلہ شمع سحر اچھا
یہاں اب ضعف اتنا ہے کہ سر بھی دھن نہیں سکتے

کہوں اب واقعاتِ درد و غم میں کس توقع پر
وہ سب کچھ اور سُن سکتے ہیں ان کو سُن نہیں سکتے

خوشی کی آرزو میں غم اُٹھانے کی ضرورت ہے
وہ گل بھی چُن نہیں سکتے جو کانٹے چُن نہیں سکتے

حصولِ عزت و توقیر ہے موقوف کوشش پر
ملے گی سرفرازی کیا اگر سر دُھن نہیں سکتے

پیامِ شوق دے کر کس لئے قاصد کو میں بھیجوں
وہ ایسی بات ایسے کی زباں سے سُن نہیں سکتے

خدا جانے یہ کس کے حسن کا شعلہ بھڑکتا ہے
پتنگے شمعِ محفل پر کبھی جل بھن نہیں سکتے

اُبھارے سو طرح جوشِ جنوں لیکن اس سے کیا حاصل
رہے گی ہم میں جب تک عقل تنکے چُن نہیں سکتے

دلِ ایذا پسند ایسا ملا اہلِ محبت کو
جسے یہ دیکھ سکتے ہیں اسے ہم سُن نہیں سکتے

اِدھر صرصر اُدھر بجلی پھنسے ہم کس مصیبت میں
نشیمن کے لئے بھی چند تنکے چُن نہیں سکتے

جنابِ نوح کہئے اور جو کچھ اُن سے کہنا ہو
مگر طوفان و کشتی کا وہ قصہ سُن نہیں سکتے

مے خانے میں پیمانہ ہے پیمانے میں مے خانہ ہے

اس طرح پر حبیب احمد صاحب عیش ساکن کوبلہا ار مئی سنہ ۱۹۳۱ء کو جون پور میں مشاعرہ کرنے والے تھے لیکن کسی سبب سے ملتوی ہو گیا

صورت ہو کوئی بھی دل کی مگر کب کیف سے دل بیگانہ ہے
گھٹ جائے تو یہ پیمانہ ہے بڑھ جائے تو یہ مے خانہ ہے

اخلاص ہو رندوں میں ہو ان میں تو بڑا یارانہ ہے
رکھا ہے جہاں خُم اے ساقی موجود وہیں پیمانہ ہے

کیا فہم و خرد سے دل میرا ناواقف ہے بیگانہ ہے
دیوانہ تم اس کو کہتے ہو اس واسطے یہ دیوانہ ہے

ہم نے کبھی سوزِ غم کا اثر دیکھا نہیں محفل والوں میں
جل بجھنے کو جل مرنے کو یا شمع ہے یا پروانہ ہے

جس میں ہو فراست وہ سمجھے جس کو ہو بصیرت وہ دیکھے
مسلم کے لئے دل کعبہ ہے ہندو کے لئے بت خانہ ہے

مے خوار مجھے کیوں کوئی کہے مے خانے میں آنے جانے پر
رندی سے تعلق مجھ کو نہیں رندوں سے فقط یارانہ ہے

میں چین سے بیٹھوں بیٹھ چکا غربت نے دیا ساتھ مرا
ہر سانس میں اک تحریکِ جنوں ہر گام اک ویرانہ ہے

مے کش نہ کریں رحمت اس کی میں خود واقف ایک ایک سے ہوں
یہ مینا ہے یہ ساغر ہے یہ خم ہے یہ پیمانہ ہے

بادل کی کڑک بجلی کی چمک غنچوں کی چٹک پھولوں کی مہک
افسوس ہے ایسے میں اُس پہ مے پینے سے جو بیگانہ ہے

اللہ رے بند و بستِ جنوں تقسیمِ جنوں توقیرِ جنوں
مجنوں ہے کہیں وامق ہے کہیں اک دشت میں اک دیوانہ ہے

گلشن کی فضا میں روح فزا امواج صبا بھی ہوش ربا
شبنم نے بھری مے پھولوں میں ہر پھول تجھے پیمانہ ہے

تکمیلِ وفا جس وقت ہوئی پھر نوعیت قائم نہ رہی
اک چھوٹے سے کیڑے کا لقب جل جانے سے پروانہ ہے

جتنے انسان اتنی شکلیں اطوار الگ انداز جدا
ہم دنیا کو دنیا نہ کہیں دنیا تو عجائب خانہ ہے

اے نوح اگر تم پوچھو گے تو کہہ دیں گے مے خوار یہی
تسبیح کا دانہ کچھ بھی نہیں انگور کا دانہ دانہ ہے

لوگ عاشق کو یہ کہتے ہیں کہ سودائی ہے

۱۱ر جنوری ۱۹۳۱ء کو اس طرح پر ایک جنرل مشاعرہ مسلم کلب کان پور کی طرف سے گوہر و اختر صاحبان کے اہتمام میں ہوا مقامی شعرا کے علاوہ بلیغ بہار قدیر سراج گوہر منظر شوخ شمس مہدی وغیرہ صاحبانِ لکھنؤ مظہر بزم عابد شام صاحبان اکبر آبادی بسمل شاطر عاقل الہ آبادی عزیز سلونی مجذوب صاحب میرٹھی وغیرہ وغیرہ شریک ہوتے پہلی نشست نو بجے رات سے پانچ بجے صبح تک اور دوسری دس بجے سے شام تک رہی اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں دوسری نشست میں ظریف صاحب لکھنوی اور حسرت صاحب موہانی بھی آ گئے تھے لیکن ان لوگوں نے غزلیں نہیں پڑھیں اس مشاعرے میں یہ نئی بات تھی کہ جب لکھنؤ کے لوگ غزل پڑھتے تھے تو اکبر آباد کے لوگ چپ ہو جاتے تھے اور جب اکبر آباد کے لوگ پڑھتے تھے تو لکھنؤ والے داد نہ دیتے تھے پندرہ اشعار کی قید تھی مگر اکثر غزلوں میں یہ قید قائم نہ رہی پھر دوسرا مشاعرہ انھیں قوافی و ردیف پر سکندرہ راؤ ضلع علی گڈھ میں جناب یوسف صاحب کے اہتمام سے ۲۵ر جولائی ۱۹۳۱ء کو ہوا چوں کہ بارش کا زمانہ تھا اس باعث سے بہت کم شعرا شریک ہو سکے مشاہیر شعرا میں سے صرف احسن صاحب مارہروی موجود تھے اگرچہ میری دو غزلیں پہلے سے موجود تھیں جو سفینہ نوح میں چھپ چکی ہیں لیکن میں نے دونوں مشاعروں کے لئے ذیل کی غزل پھر کہی

یوں تو ہر شوخ ادا مرکزِ رعنائی ہے
دونوں ہاتھوں سے جو لوٹے تری انگڑائی ہے

رازِ دل کہنے کو لب تک جو فغاں آئی ہے
یہ مری یاد ہے پہلی مری رسوائی ہے

دست بردارئ الفت کی تمنائی ہے
میں سمجھتا ہوں یہ جیسی تری انگڑائی ہے

دل میں صرف اُس کے تصور نے جگہ پائی ہے
کیا کہوں اس کو نہ مجمع ہے نہ تنہائی ہے

عمر بھر گریہ و زاری سے سروکار رہا
غور کرتا ہوں کبھی مجھ کو ہنسی آئی ہے

اُف ترے حسنِ فسوں ساز کا یہ حسنِ اثر
دل تو پھر دل ہے تمنا بھی تمنائی ہے

مژدۂ موسمِ گل مجھ سے چھپے کیا ممکن
کوئی یہ کان میں کہہ دے گا بہار آئی ہے

عرصۂ حشر میں کوئی نہیں پرساں میرا
بھیڑ کی بھیڑ ہے تنہائی کی تنہائی ہے

خندۂ گل سے کبھی ہم متاثر نہ ہوتے
جب ہنسایا ہے تمھیں نے تو ہنسی آئی ہے

جس کو دیکھا اُسے مشتاق تمہارا دیکھا
اپنی مقبولیت اک قسم کی رسوائی ہے

دل اٹھانے میں غضب ڈھانے میں تڑپانے میں
تجھ سے دو ہاتھ زیادہ تری انگڑائی ہے

وعدۂ روز جزا کو بھی ترے دیکھ لیا
آج سے خاتمۂ صبر و شکیبائی ہے

برق کیا برق کو سمجھے دل سوزاں میرا
جھلملاتی ہوئی شمع شب تنہائی ہے

اے قضا وقت شناسی کی تجھے قدر نہیں
خود کہاں آئی بلانے سے مرے آئی ہے

اللہ اللہ یہ عالم تری رعنائی کا
عشق کے بھیس میں خود حسن تماشائی ہے

پوچھئے بحر غم عشق کا رتبہ ہم سے
اس میں جو موج ہے وہ حسن کی انگڑائی ہے

پھر وہی طور وہی برق وہی جلوۂ حسن
کس قیامت کی یہ تجدید خود آرائی ہے

وادیٔ عشق میں دے کون مجھے نیک صلاح
اس جگہ دیکھئے جس کو وہی سودائی ہے

پھر مجھے لوگ لئے جاتے ہیں زنداں کی طرف
یہ نہیں صاف بتاتے کہ بہار آئی ہے

ختم ہو جائیں گے ہم ختم یہ ہونے کی نہیں
غم بے حد و بلائے شب تنہائی ہے

کیوں نہ اس حسن سے محفل میں ہو طوفان بپا
حضرت نوح کو یوسف کی کشش لائی ہے

جلوۂ یار کرے گا کبھی بے ہوش مجھے

۲۹ نومبر ۱۹۳۱ء کو ودیا مندر ہائی اسکول الہ آباد میں سالانہ مشاعرہ حکیم مولوی حافظ حاجی جان صاحب کے اہتمام سے اس طرح پر ہوا معزز شعرا میں ماجد صاحب الہ آبادی ہادی صاحب مچھلی شہری شفق صاحب عماد پوری دعا صاحب ڈبائیوی وغیرہ موجود تھے اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں مشاعرہ دو بجے دن سے شروع ہو کر قریب دس بجے شب کو ختم ہوا

ج

پردۂ حسن حقیقت کا رہے ہوش مجھے
چشم بینا ملے یارب لب خاموش مجھے

اپنے حصے کی بھی پلوا گئے مے نوش مجھے
ہوش یار اب نہ کرے گا کوئی ذی ہوش مجھے

بزم ساقی میں اب آنے کا نہیں ہوش مجھے
دل نے مے نوش کیا بلکہ بلا نوش مجھے

اتنے دن گذرے کہ وعدے کا نہیں ہوش مجھے
خود ہوا عہد فراموش فراموش مجھے

تھا فرشتوں کو جو لکھنا وہ فرشتوں نے لکھا
کس لئے اب نہیں کرتے یہ سبک دوش مجھے

رازدار اپنا بنانے کا نتیجہ کیا تھا
کر گئے وہ اسی ترکیب سے خاموش مجھے

فی الحقیقت نہیں دنیا میں تپ غم کا علاج
پھونک دے گی کبھی یہ آتش خاموش مجھے

خشت مے خانہ سے توبہ کو نہ رکھا ثابت
دیکھ کر جوش بہار آ ہی گیا جوش مجھے

بڑھ گیا اور بھی شبنم سے سوا کیف چمن
پتی پتی نظر آنے لگی مے نوش مجھے

زندگی اپنی سمجھتا ہے جو مر جانے کو
دینے والے نے دیا وہ دل پر جوش مجھے

شمع محفل کو بجھایا بھی جلایا بھی مگر
وہ ہمیشہ کے لئے کر گئے خاموش مجھے

آپ اگر جاتے ہیں تو جائیں تردد نہ کریں
یا خدا اس تری بخشش کا ٹھکانا کیا ہے
وہ کھلے داغ کہ تفریح قفس میں بھی رہی
آج معمول سے کچھ اور سوا دے ساقی
آپ اپنے رخِ روشن سے اٹھا دیں پردہ
بعد مدت کے اب آئے تو وہ فرماتے ہیں
ساری دنیا کے تو بخشے گئے محشر میں گناہ
کر کے اقرار بھلا دینے پر انصاف بھی کر
ہو مری سمت سے تحریک تو بے شک ہے گناہ

ہو مبارک مری اجڑی ہوئی آغوش مجھے
دے دیا شوق مجھے ذوق مجھے جوش مجھے
یاد گلگشت چمن کر گئی گل پوش مجھے
گل ملے یا نہ ملے بادۂ سرجوش مجھے
فکر کیا اس کی رہے یا نہ رہے ہوش مجھے
سب کہیں تم نہ کہو وعدہ فراموش مجھے
حکم کیا ہوتا ہے اے میرے خطاپوش مجھے
سب مجھے کہتے یا وعدہ فراموش مجھے
کیا کروں میں جو پلا دے کوئی مے نوش مجھے

نوح روکے سے بھی رکتا نہیں طوفانِ سرشک
کیا ڈبو دیں گے مرے دیدۂ پُرجوش مجھے

بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

۱۶ر جولائی ۱۹۳۲ء کو اس طرح پر آل انڈیا مشاعرہ گورکھپور میں زیر صدارت جناب مسٹر آر سی۔ ایس ہو بارٹ صاحب بہادر آئی سی۔ ایس کمشنر اعلیٰ پیمانے پر ہوا مشاہیر شعرا میں سے حضرات سائل دہلوی حسرت موہانی بلیغ زخمی فیض لکھنوی آسی گلاؤٹھوی امین سلونوی عیاں میرٹھی جگر و باسط بسوانی سالم بنارسی سنجر عظیم آبادی ثاقب کانپوری کوکب شاہ جہاں پوری ماجد بسمل بریاں شاطر الہ آبادی شمسی سکندرپوری عزیز مرزاپوری وصل بلگرامی وغیرہ موجود تھے داخلہ پاس کے ذریعہ سے تھا سامعین کی تعداد دس بارہ ہزار سے کم نہ تھی خاطر مدارات میں مقامی روسا نے بڑے حوصلے سے کام لیا اس طرح پر میری ایک اور غزل دیوان دوم میں ہے۔

خنجر خوں خوار چل کر اب نئی مشکل میں ہے
ہر کسی سے پوچھ پوچھ کس واسطے محفل میں ہے
اس طرح اور اس طرح دم ہر طرح مشکل میں ہے
کعبہ و بت خانہ کی جانب اٹھائیں کیوں نگاہ
ناوکِ بے داد شاید لے گیا ہو اپنے ساتھ
کچھ ادب کا اقتضا بھی کچھ تمہارا خوف بھی
کس کو چاہیں کس طرح ہم کس کو دیکھیں کس طرح
گھر سے باہر کا نکلنا بند ہو سکتا نہیں
رفتہ رفتہ مٹ گئے وہ سب ہمارے ذوق و شوق

رج

کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے کچھ ہمارے دل میں ہے
جلتے ہو اس کو تم جو بات جس کے دل میں ہے
تیر میں دل ہے مرا یا تیر میرے دل میں ہے
جس سے ہم نے دل لگایا وہ ہمارے دل میں ہے
آرزو کا ذکر کیسا بحث ابھی تو دل میں ہے
لا نہیں سکتے زباں تک ہم اسے جو دل میں ہے
ایک عالم ہے نظر میں ایک دنیا دل میں ہے
دل میں رکھ لیں ہم کسی کو یہ ارادہ دل میں ہے
انتہا یہ ہے کہ اب حسرت کی حسرت دل میں ہے

جس طرف اٹھیں نگاہیں اُس طرف منظر نیا
پرسشِ دردِ محبت سے محبت کھل گئی
میں فریبِ عشق سمجھوں یا اسے تدبیرِ حسن
اللہ اللہ داستانِ آرزو کا سلسلہ
وہ نگاہِ ناز کیا خون تمنا کر گئی
ذوقِ کامل نے انھیں ہر شے سے مستغنی کیا
خارِ صحرا خود کفِ پا سے الگ ہو جائیں گے

اک تمھاری شکل کو شکلوں سے میرے دل میں ہے
میرے ہی دل میں نہیں یہ آپ کے بھی دل میں ہے
ایک ہے ارمان تیرا اور سب کے دل میں ہے
کہہ چکے سب کچھ مگر پھر بھی بہت کچھ دل میں ہے
اک صدا واحسرتا واحسرتا کی دل میں ہے
اہلِ دل کے واسطے ساری خدائی دل میں ہے
آپ وہ کانٹا نکالیں جو ہمارے دل میں ہے

کیوں نہ طوفانِ سخن سے شاد ہوں اہلِ سخن
اک نیا پہلو جنابِ نوح کے ہر دل میں ہے

لائی ہے نوید بادہ کشی رندوں کو صبا مے خانے سے

۲۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو رشید الدین سلمہ کی شادی کے سلسلے میں اس طرح پر مشاعرہ بھی ہوا۔ وہی سب شعرا اس میں شریک ہوتے جو ۲۴ر کو سہرے کے مشاعرے میں تھے

پھر ابر اٹھا پھر پھول کھلے نکلے کوئی کیا مے خانے سے
یارانِ چراغِ محفل سب کہتے ہیں غرض یارانے سے
مینا و سبو کا ذکر نہیں نکلے گا سوا مے خانے سے
انکار کروں گا میں کب تک جاؤں گا بالآخر جاؤں گا
پہلے تو شرف بخشا آکر پھر خاک اڑائی ہر جانب
اے بادہ کشو لو وہ اتر پہنچا اکبر یہاں تک شمس و قمر
ناصح کی نصیحت سن سن کر ہم دیکھتے ہیں ناصح کی طرف
گردوں پہ اٹکی گھنگھور گھٹا لازم ہے تدارک توبہ کا
مسجد سے ہمارا ذوقِ طلب لایا تھا ہمیں بت خانے میں
کیا رسمِ وفا آپس میں سمجھے دونوں کے خیالات ایک نہیں
کیا چشمِ کرم بھی ساقی کی ایک ایک کو مے پلوا ہی دی
ساقی کے کرم کا یہ مطلب ساقی کے ستم کے یہ معنی
احباب چھٹے گھر بار چھٹا لے کوشش جنوں جانا ہی پڑا
ہر وقت تقاضا کرنے میں ذلت ہے بہت اے پیر مغاں
حسرت نہ رہے پھر پینے کی ارمان رہے پھر مستی کا

ج

چھلکی کبھی اُدھر پیمانے میں چھلکی کبھی اِدھر پیمانے سے
دیکھا نہیں اک پروانے کو جلتے ہیں اک پروانے سے
کتنا ہے مرا ظرف اے ساقی ناپ اس کو ذرا پیمانے سے
یاروں کے بلاوے آتے ہیں مسجد میں مجھے بت خانے سے
آباد ہوا برباد رہا صحرائے جنوں دیوانے سے
یہ چلتے ہوئے دونوں ساغر کیوں دور ہیں مے خانے سے
اُس کو بھی سمجھ لو دیوانہ اُلجھے جو کسی دیوانے سے
یوں بند کروں پیمانے میں نکلے نہ کبھی پیمانے سے
لیکن نہ یہاں بھی کوئی ملا اب جائیں کہاں بت خانے سے
حسرت ہے مجھے یارانے کی نفرت ہے مجھے یارانے سے
وہ زہد کا پیمانہ چل نہ سکا اس چلتے ہوئے پیمانے سے
بے جام لئے بے دام دئے جائے نہ کوئی مے خانے سے
خود خانہ خرابی آئی ہے لینے کو مجھے ویرانے سے
میں پھر نہ کبھی ساغر مانگوں دے دے مجھے اس پیمانے سے
جس جام میں ساقی ایسی ہو مجھ کو وہ ملے مے خانے سے

اے آتشِ الفت اور بھڑک اے شعلۂ غم اور اونچا ہو
دل شمع سے ہیں نے مانگ لیا پھین لئے پروانے سے

اے نوحؔ فقط اِک خلقت تک کیا جوشِ مے سرجوش رہا
طوفان اٹھا مستی کا وہیں چھلکی یہ جہاں پیمانے سے

حسب فرمائش دعا صاحب ۱۳ر جنوری ۱۹۳۳ء

رہ گئے وہ لطف و عیش اب یاد آنے کے لئے
جس زمانے کے لئے تھے اُس زمانے کے لئے

کم سے کم یہ چاہیئے میرے فسانے کے لئے
تم ہو سننے کے لئے ہیں ہو لسنانے کے لئے

خونِ حسرت آپ بھر دیں کھینچ کر تصویرِ دل
کوئی سرخی چاہیئے میرے فسانے کے لئے

لاش اٹھا کر دوش پر رکھ لی تو کیا احساں کیا
آپ آئے خاک میں مجھ کو ملانے کے لئے

واقعاتِ غم سے میرے درس لیں گے اہلِ عشق
چھوڑ جاؤں گا انہیں اگلے زمانے کے لئے

یوں سمجھ میں آ نہیں سکتے رموزِ عشق و حسن
ہو مفصل شرح اس مجمل فسانے کے لئے

فرقتِ ساقی میں کیا آئے گا لطفِ مے کشی
ابر تو اٹھا مگر بجلی گرانے کے لئے

خشک پھولوں پر خزاں میں قطرۂ شبنم نہیں
باغ روتا ہے گئے گذرے زمانے کے لئے

ہائے وہ تیرا ستم مجھ پر وہ میرا اضطراب
دل لگا کر لطف کیا کیا دل لگانے کے لئے

حشر میں قبروں سے اٹھوائے گئے مردے بھی سب
اہتمامِ خاص یہ میرے فسانے کے لئے

ہو گیا جوشِ جنوں کیوں شاملِ جوشِ بہار
غنچہ و گل ہی نہ تھے کم گل کھلانے کے لئے

ظلم سہنا غم اٹھانا عشق میں آساں نہیں
چاہیئے دل بھی کسی سے دل لگانے کے لئے

اللہ اللہ یہ مرے ذوقِ تماشا کا اثر
میں تماشا بن گیا سارے زمانے کے لئے

نوحؔ کو اظہارِ غم سے اس نے روکا اس طرح
وقت ہے درکار طوفانی فسانے کے لئے

طبع زاد ۵ار جنوری ۱۹۳۳ء

یہ سنتا ہوں نگاہِ یار ایسی اور ویسی ہے
مگر مجھ سے نہیں ملتی نہیں معلوم کیسی ہے

نبھے رسمِ محبت کس طرح روداد ایسی ہے
تمہارا دل نہیں ویسا طبیعت میری جیسی ہے

ستم کے شکوہ بیہم نے دونوں پر ستم ڈھایا
خجالت مجھ کو اتنی ہے ندامت تجھ کو جیسی ہے

بگڑ بیٹھے مری جانب سے غمازوں کے کہنے پر
کبھی پوچھا تو ہوتا آپ نے یہ بات کیسی ہے

تم اپنے منھ سے کیا کہتے ہو اس کہنے سے کیا حاصل
مجھے معلوم ہے خود ہی مری تقدیر جیسی ہے

بشر کو مطمئن دنیا کی نیرنگی نہیں رکھتی
کوئی لحظے میں یہ ایسی کوئی لحظے میں ویسی ہے

مآلِ آرزو کا بھی خیال آتا نہیں دل میں
شروعِ عشق سے مجھ کو پریشانی کچھ ایسی ہے

سرِ محفل جو لڑ جائیں ہم تو راز کھل جائے
دواؤں پر دوائیں سیکڑوں بدلی گئیں لیکن
زمانہ کیوں نہ مر جائے خدائی کیوں نہ مٹ جائے
تمھیں کیا تم تو راحت سے بسر کرتے ہو عمر اپنی
لڑے گی کیا مرے دل سے ملے گی کیا مرے دل سے

نگاہِ شوخ کیسی ہے نگاہِ شوق کیسی ہے
طبیعت دردمندِ عشق کی جیسی تھی ویسی ہے
جو دیکھے وہ تصدق ہو تری صورت ہی ایسی ہے
ہمیں اس کو سمجھتے ہیں ہمیں تکلیف جیسی ہے
نگاہِ شرمگیں تیری نہ ایسی ہے نہ ویسی ہے

جہاں بیٹھے وہیں طوفاں اٹھاؤ نیائے حسرت میں
تمھاری اشکباری اے جناب نوح کیسی ہے

بہار آگئی اب حوصلہ نکلتا ہے

اس طرح بربابو وشنو شنکر صاحب نے اپنے برادر زادہ درگا شنکر کی شادی میں مشاعرہ کیا کان پور کے اکثر مقامی شاعر شریک ہوئے

ج

دفورِ شوق میں دل بے طرح مچلتا ہے
کوئی ہزار سنبھالے یہ کب سنبھلتا ہے

گلہ کہ نالہ مرے دل سے کیا نکلتا ہے
زمین کانپتی ہے آسماں دہلتا ہے

تمھارے روئے منور کا واہ کیا کہنا
یہ وہ چراغ ہے جو بے جلائے جلتا ہے

بڑھا بھی نخلِ تمنا تو کیا ہوا حاصل
نہ پھولتا ہے نہ یہ نامراد پھلتا ہے

مسافرانِ رہِ عشق رک نہیں سکتے
یہ جانتے ہیں کہ چلنے سے کام چلتا ہے

جہانِ غم میں اب آئیں گے زلزلے پیہم
مریضِ عشق ترا کروٹیں بدلتا ہے

دل و جگر کو ترا تیر کر گیا مجروح
یہ ڈوبتا ہے کہیں یہ کہیں نکلتا ہے

ہزار حیف دلِ رہ نوردِ حسرت پر
جو پا نوردہ گئے تھک کر تو ہاتھ ملتا ہے

کہاں کی رسمِ محبت کہاں کی شرطِ وفا
گھڑی گھڑی میں نگاہیں کوئی بدلتا ہے

نفس کی آمد و شد وجہِ زندگی ٹھہری
ہوا میں دیکھئے کب تک چراغ جلتا ہے

ہم اپنے دل کو خدا کے سپرد کرتے ہیں
نظامِ عالمِ ہستی کا رخ بدلتا ہے

مآلِ عشق و وفا پر مری نگاہ نہیں
خیالِ ترکِ تعلق سے جی دہلتا ہے

کبھی فلک سے نہ اترا زمیں پر خورشید
ضرور دیکھ کر اُن کو یہ دل میں جلتا ہے

چبھے گا خارِ تمنا کچھ اور بھی دل میں
نکالنے سے یہ کانٹا کہیں نکلتا ہے

چراغِ عشق ہمارا چراغِ بزم نہیں
بجھائیے اگر اس کو تو اور جلتا ہے

یہ حالِ نازکِ حسرت نے کر دیا دل کا
جہاں دباؤ وہیں سے لہو نکلتا ہے

مسیح و خضر مری زیست کی دعا نہ کریں
قضا وقت کہیں ٹالنے سے ٹلتا ہے

خیالِ یار میں طوفاں اٹھاتے رہتے ہیں

جنابِ نوح کا یوں حوصلہ نکلتا ہے

اِس طرح رسمِ محبت کی ادا ہوتی ہے

۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو جب میں بانکی پور سے اپنے وطن آنے کو تھا شام کو داناپور سے شاہ محسن صاحب خلف شاہ محمد اکبر صاحب کے صاحب زادے اپنے والد کے مرسلہ میرے پاس پہنچے اور کہا کل میرا سالانہ مشاعرہ ہے والد صاحب نے شرکت کی استدعا کی ہے چوں کہ مراسم قدیمانہ تھے اِس لئے شرکت کا وعدہ کرنا پڑا اُسی دن غزل کہی اور مشاعرے میں جاکر پڑھی پٹنے سے اکرام صاحب اختر ڈاکٹر مبارک صاحب کیف نصیر صاحبان بانکی پور درگاہ سے جناب وحید انجم شمیم ارشاد مضطر حسرت عزیز بیا پور سے برق عیش صاحبان کے علاوہ مقامی شعرا بھی تھے

یوں بتدریج ادا رسمِ وفا ہوتی ہے ۔۔۔ پہلے دل آتا ہے پھر جان فدا ہوتی ہے

اُن کے آنے سے چمن کی یہ فضا ہوتی ہے ۔۔۔ پھول شرماتے ہیں پامال حنا ہوتی ہے

ایک دن وہ تھا کہ آئی تھی مرے جسم میں روح ۔۔۔ ایک دن یہ ہے کہ اب تن سے جدا ہوتی ہے

قہر کے ساتھ کرم لطف کے ہمراہ ستم ۔۔۔ دو طرف کی ترے کوچے میں ہوا ہوتی ہے

تو خدا ہے تو مجھے بخش دے اے داورِ حشر ۔۔۔ میں جو بندہ ہوں تو بندے سے خطا ہوتی ہے

آہِ پرجوش کا رُکنا مرے دل سے معلوم ۔۔۔ بند مٹھی میں کہیں تند ہوا ہوتی ہے

موت کا جرم ادا پر نہیں رکھتا کوئی ۔۔۔ جان یہ لیتی ہے بدنام قضا ہوتی ہے

اِس سبب سے کہ پیامی نہ بنائے اپنا ۔۔۔ دیکھ کر ہم کو صبا جلد ہوا ہوتی ہے

رنگ دنیائے محبت کا سمجھ لیجئے پر ۔۔۔ ہم اُدھر ہوتے ہیں جس رُخ کی ہوا ہوتی ہے

عشقِ کامل نے دکھائی یہ نرالی تاثیر ۔۔۔ بد دعا اُن کی مرے حق میں دعا ہوتی ہے

جانبِ منزلِ مقصد مجھے لے جانے کو ۔۔۔ آگے آگے کسی کوچے کی ہوا ہوتی ہے

بے طلب مجھ سے وہ ملنے کو چلے آتے ہیں ۔۔۔ دل میں گھر کرتی ہے جو دل کی دعا ہوتی ہے

حضرتِ نوح بھی کشتی کا بھروسہ نہ کریں
موجِ طوفانِ حوادث کی بلا ہوتی ہے

ایمان ہنستے بولتے۔ ناداں ہنستے بولتے اِن قوافی و ردیف میں حضرت داغ کی غزل موجود تھی میں نے قوافی بدل کر ادب کے خیال سے ۳ اپریل ۱۹۳۳ء کو یہ غزل کہی

مر بھی جائیں گے وہ خوش انجام ہنستے بولتے ۔۔۔ عمر گذری جن کی صبح و شام ہنستے بولتے

چاہتا ساقی تو خاص و عام ہنستے بولتے ۔۔۔ بے بلائے پیے ہنسائے جام ہنستے بولتے

کثرتِ غم نے کب اِن کو اِس قدر موقع دیا ۔۔۔ خاک تیرے عاشقِ ناکام ہنستے بولتے

دل لگی ہی دل لگی میں دم پہ اپنے بن گئی ۔۔۔ لے گئے وہ راحت و آرام ہنستے بولتے

یہ تو جب ہوتا کہ ہوتی کچھ اُدھر سے چھیڑ چھاڑ
خود بخود کیا عاشقِ ناکام ہنستے بولتے

واقعاتِ بلبل و گل میں خزاں میں کیا کہوں
دینے والے دے گئے آلام ہنستے بولتے

دل لگا کر جان دے دینی کوئی مشکل نہیں
عشق میں ہوتے ہیں ایسے کام ہنستے بولتے

موسمِ گل ہی نہ آیا ورنہ آتا اور لطف
بادہ کش تو بادہ کش ہیں جام ہنستے بولتے

رنج و غم کی رات گذری وقتِ نازک ٹل گیا
ہم اُٹھے لے کر خدا کا نام ہنستے بولتے

وہ بھی بد ظن ہم سے تھا محفل بھی ناخوش ہم سے تھی
کس توقع پر دلِ ناکام ہنستے بولتے

عیش و عشرت کے لئے ہے وقت کی تخصیص بھی
کس کو دیکھا کس نے بے ہنگام ہنستے بولتے

عمرِ فانی اس پر اظہارِ مسرت اور ہم
کیا بشکلِ غیر استحکام ہنستے بولتے

خوش مزاجی باعثِ آزار مجھ کو ہو گئی
مفت سر پر آ گیا الزام ہنستے بولتے

منحصر تھا بس چمن تک اپنی آزادی کا لطف
کس طرح ہو کر اسیرِ دام ہنستے بولتے

صورتِ تصویر سب ہیں تیری محفل میں خموش
لطف تو جب تھا کہ خاص و عام ہنستے بولتے

میں ہمیشہ چپ رہا یا ہر گھڑی گریاں رہا
کس نے دیکھا مجھ کو صبح و شام ہنستے بولتے

نوح سب کو یک بیک طوفان کا خوف آ گیا
لوگ سُن کر کیا تمھارا نام ہنستے بولتے

طبع زاد ۱۵؍ مئی ۱۹۳۳ء — (ج)

یہ ہم سمجھتے ہیں ہم سے پوچھو کہ دونوں چیزوں میں فرق کیا ہے
نگاہ کو برق کہتے ہو تم نگاہ سے آگے برق کیا ہے

ملا اب اک دوسرے سے ایسا تمیز ہوتی نہیں مجھے بھی
وہی جگر ہے وہی ہے ناوک جگر میں ناوک میں فرق کیا ہے

کمالِ ہستی زوالِ ہستی طلسمِ خواب و خیالِ ہستی
فنا میں ڈوبا ہے دل ہمارا بقا کی حسرت میں غرق کیا ہے

اثر نہ ہو جس کا اہلِ دل پر جسے حسیں دھیان میں نہ لائیں
وہ عشق کیا ہے وہ آہ کیا ہے وہ حسن کیا ہے وہ برق کیا ہے

مسافرانِ رہِ محبت قیودِ اطراف سے بری ہیں
غمِ شمال و جنوب کیسا تصورِ غرب و شرق کیا ہے

کسی کے اسرارِ آرزو نے کسی طرف کا ہمیں نہ رکھا
مریں تو جانیں جئیں تو سمجھیں کہ مرنے جینے میں فرق کیا ہے

نگاہ ہو یا تری ادا ہو شباب ہو یا ہو تیرا جلوہ
چمک چمک کر جو دل کو پھونکے وہی ہے برق اور برق کیا ہے

غلام و آقا کی دوستی نے اٹھا دیا پردۂ مراتب
ایاز و محمود ایک جب ہیں تو اس میں اور اُس میں فرق کیا ہے

دُرِ مقاصد ملیں گے تہ سے کہ سطحِ امواج پر نہیں کچھ
جو فکر اُبھرنے کی کر رہا ہو وہ بحرِ الفت میں غرق کیا ہے

زہے مراتب زہے بلندی زہے ترقی زہے تجلّی
جو ذرّہ ہے عشق کی گلی کا وہ حسن میں زرق برق کیا ہے

جنابِ نوحؔ آپ غور کر لیں کہ تہ کی میں بات کہہ رہا ہوں
اگر نہیں میری کشتیِ دل تو بحرِ الفت میں غرق کیا ہے

اب تک تو جس زمیں پہ رہے آسماں رہے

اس طرح میں آل انڈیا مشاعرہ میرٹھ ۲۰ اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہوا لیکن علالت کے سبب سے میں شریک مشاعرہ نہ ہو سکا

ج

سنسان کیوں مرا دلِ عبرت نشاں رہے
کوئی رہے رہے نہ رہے غم یہاں رہے

کس کام کا وہ باغ یہ عالم جہاں رہے
ہفتوں رہے بہار مہینوں خزاں رہے

زیرِ زمیں رہے کہ تہِ آسماں رہے
ہم پر مصیبتیں وہیں آئیں جہاں رہے

نالے جو ہوں بلند تو قائم کہاں رہے
رہنے کو دور دور بہت آسماں رہے

دل تو ادا سے آپ نے عاشق کا لے لیا
اب یہ بتائیے کہ تمنا کہاں رہے

بلبل کے ایک دم کے لئے تین زحمتیں
گلشن رہے بہار رہے آشیاں رہے

کیا وقتِ نزع اب مرے درماں سے فائدہ
اتنے دنوں تک آپ کہاں تھے کہاں رہے

اے دودِ آہ دل سے نکل کر بلند ہو
یہ کیا ضرور ہے کہ یہی آسماں رہے

پاسِ ادب سے کہہ نہ سکوں یہ ہے اور بات
میں خوب جانتا ہوں اُنھیں وہ جہاں رہے

اُٹھنے کو اب ہے پردۂ اسرارِ سرمدی
قابو میں دل رہے مرے بس میں زباں رہے

حسرت یہ چاہتی تھی کہ میں دل میں گھر کروں
جب رہ سکے نہ دل ہی تو حسرت کہاں رہے

صرصر کو رشک برق کو ضد باغباں کو لاگ
کیا ایسی کشمکش میں مرا آشیاں رہے

اہلِ جنوں کی عمر بسر اس طرح ہوئی
دو دن یہاں رہے کبھی دو دن وہاں رہے

اب مل گئی ہے مجھ کو جگہ کوئے یار میں
یارب یہی زمین یہی آسماں رہے

اے ذوقِ سجدہ مجھ کو بتا نیک مشورہ
وہ چاہتے ہیں سر نہ رہے آستاں رہے

قربان کیوں نہ حسنِ تصور کے جائیں ہم
وہ اپنے گھر میں بھی جو رہے تو یہاں رہے

رک جائیں اشکِ غم مری آنکھوں سے کس طرح
لازم ہے کارواں کو ہمیشہ رواں رہے

اللہ رے کسی کے شہیدوں کا مرتبہ
زیرِ زمیں بھی یہ صفتِ آسماں رہے

کیا جانے کیا کریں یہ تو ہم پرستیاں
ہم بھی وہیں مقیم رہے وہ جہاں رہے

یہ دقت کی ہے بات یہ قسمت کا فیصلہ
تیری گلی میں ہم نہ رہیں پاسباں رہے

اے نوحؔ بھول کر بھی نہ آئے تمہارے گھر
طوفان کے اثر سے وہ یوں بدگماں رہے

کیا دکھاتا ہے ہمیں چاکِ گریباں دیکھئے

اس طرح پر جناب گلشن صاحب نے سرسوتی بواس نمبر ۱ البرٹ روڈ الہ آباد میں سر تیج بہادر صاحب کے اعزاز ملنے پر بڑی شان سے ۱۱ فروری ۱۹۳۴ء کو زیر صدارت جناب سر سلیمان صاحب چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد مشاعرہ کیا پہلے نظمیں پڑھی گئیں میں نے بھی ایک نظم پڑھی مقامی شعرا کے علاوہ حضرات سائلؔ ساحرؔ برقؔ رازؔ کیفی دہلوی سیمابؔ اکبرآبادی دلؔ برقؔ شاہ جہاں پوری قمرؔ تاباںؔ بدایونی آرزوؔ صفیؔ ظریفؔ سراجؔ قدیرؔ آشفتہؔ منظرؔ نانک لکھنوی کشتہؔ گیاوی بیتابؔ خود حسرتؔ موہانی وغیرہ موجود تھے اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں ۵ بجے فوٹو لیا گیا ٹی پارٹی دی گئی مشاعرہ ۱۲ بجے دن سے شروع ہو کر ۲ بجے صبح کو ختم ہوا

ج

کب یہ ممکن ہے بہارِ باغِ رضواں دیکھئے
اُس کو سنئے اور رنگِ بزمِ جاناں دیکھئے

شوق کہتا ہے کہ برقِ حسنِ جاناں دیکھئے
دیکھنا مشکل ہو لیکن تا با مکاں دیکھئے

کیا نشاطِ زندگی کا ساز و ساماں دیکھئے
دیکھئے تو عالمِ گورِ غریباں دیکھئے

ہو اگر ذوقِ نظر تو کیا ہے جلووں کی کمی
لاکھ پردوں میں ضیائے شمعِ عرفاں دیکھئے

عالمِ جوشِ جنوں کے دونوں منظر ایک ہیں
ہاتھ میں دامن کہ دامن میں گریباں دیکھئے

وہ یہ فرماتے ہیں مجھ کو اس قدر فرصت نہیں
میں یہ کہتا ہوں مرا حالِ پریشاں دیکھئے

کیا دکھاتا ہے تماشا آستانِ یار پر
یہ ہمارا دیکھنا سوئے نگہباں دیکھئے

ہر برس معمول اپنا یہ جنوں میں ہو گیا
اس طرف آئے بہار اُس سمت زنداں دیکھئے

کیا عجب اس دیکھنے کا ہو کوئی اچھا مآل
دیکھئے پھر غور سے مجھ کو پریشاں دیکھئے

کوچہ گردی تک نہیں میرے جنوں کا انحصار
چاکِ دامن میں بھی پیوندِ گریباں دیکھئے

پوچھئے کیوں دیکھنے میں پوچھنے میں فرق ہے
میرے دل میں کتنے ہیں تیروں کے پیکاں دیکھئے

شکوۂ بیداد کرتے ہیں نہ یہ بیداد کی
ہائے کن آنکھوں سے ایماں کو پشیماں دیکھئے

میں محبت میں کھرے کھوٹے کا ضامن ہوں مگر
احتیاطاً آپ دل کو تا با مکاں دیکھئے

نوکِ پیکاں دل میں ہوتی دل جو ہوتا میرے پاس
پہلے دل کو ڈھونڈتے پھر نوکِ پیکاں دیکھئے

بے سبب وہ ذکرِ گل ہائے چمن کرتا نہیں
اس کا یہ مطلب ہے میرا رنگِ خزاں دیکھیے

میں تو زیرِ تیغ دے کر جانِ غم سے چھٹ گیا
لیکن اپنا آپ یہ اسلوبِ احساں دیکھیے

کیا خیالِ سیرِ جنت وہ بھی مر جانے کے بعد
زندگی ہی میں بہارِ کوئے جاناں دیکھیے

اس سے بڑھ کر اور ہو سکتا ہے کیا شغلِ نشاط
فصلِ گل میں بوستاں پڑھیے گلستاں دیکھیے

روشنی میں لائیے جوشِ جنوں کا واقعہ
ماہِ نو کو دیکھ کر میرا گریباں دیکھیے

بحرِ عالم میں ہے اُن کا اک یہ زندہ معجزہ
نوح کو دیکھا نہ ہو تو جوشِ طوفاں دیکھیے

دیوانہ ہے دنیا میں جو دیوانہ نہیں ہے

مرا دل توڑتے ہو میرے دل کا آسرا ہو کر

ان طرحوں پر بمبئی میں نہایت کامیاب مشاعرے ہوئے مفصل کیفیت (آسرا ہو کر) اس غزل کے عنوان میں درج ہے

ج

آدابِ غمِ عشق سے بیگانہ نہیں ہے
دیوانہ مری رائے میں دیوانہ نہیں ہے

چلتا ہوا پھرتا ہوا پیمانہ نہیں ہے
مے خانے میں کیا رہیے وہ مے خانہ نہیں ہے

کیا اُن کی محبت کا مرے دل کو یقیں ہو
دم بھر میں ہے دم بھر ہی میں یارانہ نہیں ہے

پہنچا ہوں وہاں میں کہ جہاں میری نظر میں
تفریقِ خدا خانہ و بت خانہ نہیں ہے

یہ خوب سمجھ لے کہ مرے ہاتھ میں ساقی
بھرنے سے جو بھر جائے وہ پیمانہ نہیں ہے

شمعِ سرِ محفل میں کہاں عشق کا جلوہ
سب کچھ ہے مگر فطرتِ پروانہ نہیں ہے

اب سامنے آ جائیے چلمن کو اٹھا کر
بس آپ ہیں یا ہم کوئی بیگانہ نہیں ہے

زاہد نگہِ غور سے بنیاد کو دیکھے
کعبہ بھی نہیں ہے جو صنم خانہ نہیں ہے

ساقی جو یہ ٹوٹے گا تو مشکل سے جڑے گا
پیمانِ محبت کوئی پیمانہ نہیں ہے

لایا ہوں یہاں بھی تو خیالات کی دنیا
ویرانہ مرے واسطے ویرانہ نہیں ہے

مل جائے جہاں مجھ کو وہیں پینے سے مطلب
کچھ اس میں خصوصیتِ مے خانہ نہیں ہے

تھے رات کو اے شمع ترے کتنے فدائی
اب وقتِ سحر ایک بھی پروانہ نہیں ہے

جس وقت گرے خود ہمیں ساقی نے اٹھایا
پر کیف یہ کیا لغزشِ مستانہ نہیں ہے

ارماں بھی ترے غم بھی ترا یاد بھی تیری
محفل میں ہماری کوئی بیگانہ نہیں ہے

اللہ رے تیرے رخِ پر نور کا جلوہ
وہ کون سی ہے شمع جو پروانہ نہیں ہے

گرتا ہوں ترے پاؤں پہ آزار اٹھا کر
پھر کیا ہے جو یہ سجدۂ شکرانہ نہیں ہے

اسرارِ محبت دلِ وارفتہ سے پوچھو — تم کہتے ہو دیوانہ ہے دیوانہ نہیں ہے
مے خانے میں پیمانے کے ہونے کی خوشی کیا — افسوس کہ پیمانے میں مے خانہ نہیں ہے

طوفان اُٹھا کر اِنھیں عالم کو ڈبوتا
دنیا میں کوئی نوحؔ سا دیوانہ نہیں ہے

حسب فرمائش گراموفون کمپنی کلکتہ ۱۶ رجون ۱۹۳۴ء

ہمیں عشق میں بات کی پڑ گئی ہے — کہ دل مل گیا ہے نظر لڑ گئی ہے
مرے قتل پہ یہ چھری اڑ گئی ہے — تمھاری محبت سے گلے پڑ گئی ہے
مری لاش کو دفن اس نے کیا کب — زمیں میں ندامت سے خود گڑ گئی ہے
رکی میرے لب پر فغاں دل سے چل کر — کہاں سے نکل کر کہاں اڑ گئی ہے
مرے دل سے نکلے تری یاد کیوں کر — یہ تصویر آئینے میں جڑ گئی ہے
عجب حال دیکھا تمھاری نظر کا — کبھی مل گئی ہے کبھی لڑ گئی ہے
نکالا تھا جس کو بڑی دقتوں سے — رگِ دل میں وہ پھانس پھر گڑ گئی ہے
ادا سے کہاں تک مرا دل بچے گا — قضا جان لینے پر اب اڑ گئی ہے
مری سمت سے ہو گئے وہ مکدر — خدائی خدا جانے کیا چڑ گئی ہے
شبِ ہجر کو کس طرح میں نکالوں — یہ کالی بلا میرے گھر پڑ گئی ہے
محبت ملا دے گی مٹی میں مجھ کو — کہ اُن کی نظر سے نظر لڑ گئی ہے
جفائیں سہوں گا وفائیں کروں گا — طبیعت اسی بات پر اڑ گئی ہے

خدا ہی کرے نوحؔ اب ناخدائی
مری ناؤ طوفاں میں پڑ گئی ہے

طبع نادر ۱۲ ستمبر ۱۹۳۴ء

غم ہو یا عیش جیتے جی تک ہے — زندگی شغلِ زندگی تک ہے
خوب رو ہو گا کیا کوئی ایسا — آپ کی بات آپ ہی تک ہے
دشمنی سے بھی وہ نہیں غافل — دوستی حدِ دوستی تک ہے
زندگی جب نہیں تو کچھ بھی نہیں — لطف دنیا کا زندگی تک ہے
آپ کا عشق اور میرا دل — وہ اسی تک ہے یہ اسی تک ہے
ہم تری دوستی سے کیوں نہ ڈریں — سلسلہ اس کا دشمنی تک ہے
شمع و پروانہ پھر کہاں دمِ صبح — سب یہ ہنگامہ رات ہی تک ہے

میں سمجھتا ہوں آپ کی گھاتیں
دل دہی صرف جاں دہی تک ہے

عشق سے مل چکی نجات مجھے
اب یہ آزار زندگی تک ہے

تیر نکلے ہوئے زمانہ ہوا
زخم دل میں مگر ابھی تک ہے

جان بھی جائے گی محبت میں
دل لگی کب یہ دل لگی تک ہے

حضرتِ داغؔ دہلوی کی زبان
حضرتِ نوحؔ ناروی تک ہے

سیل فنا میں زندگی بہتا ہوا حباب ہے

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مچھلی شہر ضلع جون پور میں اس طرح پر مشاعرہ ہوا مقامی شعرا کے علاوہ چند شعرائے الہ آباد بھی شریک تھے

ج

صبح کے وقت دور میں جام شراب ناب ہے
ایک ادھر آفتاب ہے ایک ادھر آفتاب ہے

دن کو یہ آفتاب ہے رات کو ماہتاب ہے
دونوں طرح جگر کا داغ عشق میں کامیاب ہے

جلوہ نما تمام شب جام شراب ناب ہے
صبح کو جو غروب ہو یہ تو وہ آفتاب ہے

آپ کے عشق کا اثر میری ہی ذات تک نہیں
کہتے ہیں جس کو اضطراب اس کو بھی اضطراب ہے

مٹ گئے اپنے ذوق و شوق اس کی خوشی منائیں ہم
دل جو نہیں نہیں سہی تیر تو کامیاب ہے

موسم گل کے آتے ہی شور اٹھا یہ ہر طرف
لاؤ کہاں شراب ہے لاؤ کہاں شراب ہے

ذکرِ خدا سے ضد انھیں صبر و رضا سے کد انھیں
مشغلۂ ثواب بھی میرے لئے عذاب ہے

دیر و حرم سے اب نکل سامنے آ جھلک دکھا
کوئی ادھر خراب ہے کوئی ادھر خراب ہے

حسنِ خیال پر ترے فخر و غرور کیا کہ دل
پہلے تو کچھ یہ ہے نہیں ہے بھی تو مثل خواب ہے

صبح نصیب ہو نہ ہو دیکھیے کیا خدا دکھائے
حالِ مریضِ شامِ غم آج بہت خراب ہے

صفر جو ایک اڑا گئے جانچ میں بھول پڑ گئی
سو ہوں ستم تو دس کہو یہ بھی کوئی حساب ہے

روز کے غم نے اس طرح خوگر غم بنا دیا
اب مجھے ترکِ اضطراب باعثِ اضطراب ہے

دل جو مٹا مٹا مٹے اس کا مجھ کو غم نہیں
ان کے حریم ناز میں روح تو باریاب ہے

دورِ نشاط اب کہاں محفلِ عیش اجڑ گئی
دیدۂ تر ہے جام گل خونِ جگر شراب ہے

عشق وہی مگر اثر دونوں طرف جدا جدا
تیرے لئے عذاب ہے میرے لئے ثواب ہے

مفت میں پند گو سے روز کون کرے مباحثہ
ترک نہ ہو گی مے کبھی صاف یہی جواب ہے

شیوۂ عشق و حسن میں طرز عمل بدل گئی
پہلے انھیں تھا احتراز اب مجھے اجتناب ہے

ماہِ صیام آ گیا جان پہ اپنی بن گئی
بند ہے مے کدے کا در کیف کا سدِّ باب ہے

پڑھنے کو نوحؔ بھی غزل آ گئے مچھلی شہر تک

سیلِ سخن میں لفظ لفظ ماہیِ زیرِ آب ہے

طبع زاد ۱۲ر نومبر ۱۹۳۴ء

میں ہوں تم ہو خنجرِ سفاک ہے
اب کوئی لمحے میں قصہ پاک ہے

ایک کے بعد اک مقام پاک ہے
پیش تر احساس پھر ادراک ہے

دل مرا آئینۂ ادراک ہے
اس میں تنویرِ خدائے پاک ہے

مر رہا ہوں اور مر چکتا نہیں
یہ سماں کس درجہ حسرت ناک ہے

خاکِ پائے یار سے ثابت ہوا
کیمیا بھی اک طرح کی خاک ہے

کیوں نہ نکلے گی تمنا قتل کی
اب تو میں ہوں اور وہ سفاک ہے

مجھ کو پھولوں سے کوئی نسبت نہیں
اُن کا دامن ہے مرا دل چاک ہے

وہ لباسِ گل نہیں جس کا جواب
آپ کی اُتری ہوئی پوشاک ہے

دشتِ غربت اور اک بے کس کی موت
واقعہ کتنا یہ عبرت ناک ہے

جوششِ وحشت کا ہوا گہرا اثر
مثلِ دامن دل بھی میرا چاک ہے

اور میرے آشیاں میں کچھ نہیں
کثرتِ خار و خس و خاشاک ہے

اُن کا شکوہ اور اُنھیں کے روبرو
دل ہمارا کس قدر بے باک ہے

کوچہ گردی سے بھی کچھ حاصل نہیں
خاک اُڑانے کا نتیجہ خاک ہے

حسنِ دل کش اور اہلِ آرزو
سیکڑوں نخچیر اک فتراک ہے

وہ کفن دے کر مجھے کہنے لگا
یہ تمھاری آخری پوشاک ہے

جسمِ خاکی کا نہیں کچھ اعتبار
خاک ہے یہ خاک ہے یہ خاک ہے

وہ نگاہِ ناز ملتی بھی نہیں
چشمِ بد دور اس قدر چالاک ہے

نوح کا طوفان اگر اُٹھتا رہا
تو سمجھ لو تم کہ قصہ پاک ہے

طبع زاد ۲۵ر فروری ۱۹۳۵ء

روداد شوق و شرحِ محبت نہ پوچھیے
بس جان جائیے مری حسرت نہ پوچھیے

کیوں کر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھیے
سب کچھ تو پوچھیے یہ مصیبت نہ پوچھیے

شاید سما سکے یہ کسی کے خیال میں
دنیائے ذوق و شوق کی وسعت نہ پوچھیے

عمرِ گراں بہا سب اسی میں گذر گئی
مجھ سے مرے گناہ کی قیمت نہ پوچھیے

جو پیش آئے مجھ کو وہ رہ کے نگاہ میں
جو ختم ہو چکی وہ حقیقت نہ پوچھیے

کعبہ بھی ہے دیر بھی طور بھی یہی
اس بے دلی سے دل کی حقیقت نہ پوچھیے

حسرت کو حسرت آئی الم کو الم ہوا
مجھ سے مرا مآلِ محبت نہ پوچھیے

دریائے عفو جوش میں آیا کچھ اور بھی
حسنِ گناہ و لطفِ ندامت نہ پوچھیے

غم جھیلنے کی داد وہ ظالم بھی دے گیا
کتنی ہمیں ہے آج مسرت نہ پوچھیے

آزار جھیل کر بھی رہا جوشِ آرزو
کیا چیز ہے کسی کی محبت نہ پوچھیے

یہ آپ کا عتاب نوازش وہ آپ کی
مجھ سے بیانِ دوزخ و جنت نہ پوچھیے

نیچی نظر ہیں آپ کی ترچھی نگاہ میں
کتنی ہے شرم کتنی شرارت نہ پوچھیے

بے تاب ہوں گے آپ بھی سن کر بیانِ عشق
دل کی وفا کی غم کی حقیقت نہ پوچھیے

یہ لطفِ غم شریک یہ قہر کرم نما
جیسی ہے مجھ پر ان کی عنایت نہ پوچھیے

مرنے کا خوف قبر کا غم حشر کا خیال
جو زندگی میں ہے وہ مصیبت نہ پوچھیے

فی الحال نوح کو ہے نئی دھن بندھی ہوئی
شعر و سخن میں حالِ نبوت نہ پوچھیے

اِن قوافی و ردیف پر جون پور ہائی اسکول میں ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء کو مشاعرہ ہوا لیکن میں عدیم الفرصتی سے شریک نہ ہوسکا

ج

حاصل ہوا یہ مجھ کو آہِ دلِ حزیں سے
تیر آپ نے لگایا آواز یہ وہیں سے

اوج و شرف بشر کو ملتے ہیں یوں یہیں سے
پہنچی وہ آسماں پر جو گرد اُڑی زمیں سے

کیا اک حسیں سے پوچھیں کیا دوسرے حسیں سے
دل ہو جہاں ہمارا آواز دے وہیں سے

اُڑنے کو سب کے ٹکڑے اُڑ جائیں گے جنوں میں
آگے رہے گا دامن دو ہاتھ آستیں سے

ہیں درد و غم کا قصہ پورا نہ کہہ سکوں گا
اندازہ آپ کرلیں سن کر کہیں کہیں سے

آخر کو رنگ لایا سیلابِ اشکِ خونیں
ٹپکا لہو جگر کا رس رس کر آستیں سے

اُس آہِ پرخطر کا راز آسماں نے سمجھا
جو ڈوب کر اثر میں نکلی دلِ حزیں سے

راہِ طلب میں دیکھی صورت یہ رہ رووں کی
پہنچا کوئی کہیں تک کوئی چلا کہیں سے

بادل بنے پہنچ کر وہ حسن کے فلک پر
جو ابخرے اُٹھے تھے الفت کی سرزمیں سے

تخلیقِ رسمِ الفت روزِ ازل ہوئی تھی
میری مصیبتوں کی ہے ابتدا وہیں سے

جوشِ جنوں کا عالم محدود کب رہا ہے
دامن میں ہاتھ اُلجھے نکلے جو آستیں سے

احباب جان کر بھی انجان بن رہے ہیں
کیا حال ہے ہمارا پوچھو یہ تم ہمیں سے

لکھنے گئے فرشتے فردِ عمل میں اُس کو
مضموں جو ہاتھ آیا میرے خطِ جبیں سے

پہلو میں دل نے رہ کر بدلے ہزار پہلو
لیکن بہت بچا میں اِس مارِ آستیں سے

لاکھوں نے دل لگایا لاکھوں نے دل دکھایا
ہے بازپرس اِس کی لیکن ہمیں تمھیں سے

کھینچی تھیں چند آہیں میں نے ترپ ترپ کر
تارے فلک سے ٹوٹے ذرّے اُڑے زمیں سے

نامِ وفا ڈبویا طوفانِ اشک اٹھا کر
کہتے ہیں نوحؔ جن کو وہ بھی ہیں کچھ یونہیں سے

طبع زاد ۵ رجون ۱۹۳۵ء

ج

ہم کسی دل میں راہ کر نہ سکے
کام اِتنا بھی آہ کر نہ سکے

اُف دلِ بے قرار کا عالم
وہ کبھی اِس پر نگاہ کر نہ سکے

ننگِ حسرت وہ ہیں جو دل دے کر
اپنی ہستی تباہ کر نہ سکے

اُن کی محفل تو اُن کی محفل تھی
حشر میں بھی ہم آہ کر نہ سکے

اِس قدر جلد تم نے دی تعذیر
عذر بھی بے گناہ کر نہ سکے

ہم کو رحمت کا اعتبار رہا
معصیت پر نگاہ کر نہ سکے

سالکِ وادیِ محبت کو
خضر بھی رو براہ کر نہ سکے

ہائے اُس ناتواں کی مجبوری
تھام کر دل جو آہ کر نہ سکے

اُس کے رخ سے اُسی کے رخ کی قسم
ہم سری مہر و ماہ کر نہ سکے

ضبطِ فریاد کو وہ کہتا ہے
اور اگر داد خواہ کر نہ سکے

حشر میں بھی اُنھیں کی جیت رہی
ہم مہیا گواہ کر نہ سکے

ابتدا نے دیئے فریب ہمیں
انتہا پر نگاہ کر نہ سکے

صرف طوفان اٹھا دیا رو کر
نوحؔ فریاد و آہ کر نہ سکے

طبع زاد ۲۰ راگست ۱۹۳۵ء

ج

سامان مرے دل میں کچھ بھی چھوڑا نہ کسی کی یاری نے
چمکی تو بالآخر چھین لیا گھر پھونک کر اِس چنگاری نے

ناکامِ محبت رہنے پر زندہ ہی نہ رہنا بہتر تھا
مشکل کو ہماری سہل کیا آسانی سے دشواری نے

لازم تھا کہ میں واقف ہوتا ساقی کے فضائل سے لیکن
اِتنی بھی نہ دی مہلت مجھ کو ہر دم کی مری مے خواری نے

آرام کے خوگر ہو گئے ہم آزار اٹھائیں اب کیوں کر
غم میں کچھ اضافہ اور کیا غم خوار تری غم خواری نے

تدبیر بہت کچھ کی لیکن تکلیفِ محبت کم نہ ہوئی
بیمار کو آخر لے ڈالا اس بڑھتی ہوئی بیماری نے

پابندِ محبت کر کے مجھے بدنام کیا چاروں جانب
نادانی نے نافہمی نے ناکامی نے ناچاری نے

عقبیٰ کے خیالات آٹھ پہر جنت کی ہوس دوزخ کا خطر
ہر وقت پریشاں ہی رکھا دنیا میں مجھے دیں داری نے

دل ہو کہ تمنا ہو دل کی ممنونِ کرم ہوں دونوں کا
الفت میں ہمیشہ ساتھ دیا اس پیار سے اُس پیاری نے

آنکھیں تو ہوئیں مسرور مگر محظوظ طبیعت ہو نہ سکی
اسرار کو پردے میں رکھا انوار کی ظاہر داری نے

ہیں راہ تمھاری الفت کی اس ضعف میں کیوں کر طے کرتا
چلنا تو کہاں اٹھنے نہ دیا بستر سے مجھے بیماری نے

گل زار میں بے سوچے سمجھے کس واسطے گرم آہیں کھینچیں
بلبل کا نشیمن پھونک دیا بلبل ہی کی آتش باری نے

موجود تھے وہ دل لینے کو تیار تھے دل ہم دینے کو
آغازِ محبت سے روکا انجام کی واقف کاری نے

طوفان اٹھا آندھی آئی آرام کوئی لحظہ نہ ملا
اے نوح ستم ڈھایا مجھ پر خود میری ہی آہ و زاری نے

(طبع زاد ۲۲ راگست ۱۹۳۵ء)

ج

آپ ہیں ہم ہیں مے ہے ساقی ہے — یہ بھی اک امر اتفاقی ہے
دل مٹا اور درد باقی ہے — کیا محبت کی خوش مزاقی ہے
عشق نے کر دیا تباہ مجھے — دل گیا صرف جان باقی ہے
بزمِ عرفاں میں ہر دلِ عارف — خود ہی مضطرب ہے خود ہی ساقی ہے
کوئی ناشاد ہو کوئی دل شاد — یہ زمانے کی بد مذاقی ہے
ہو گئیں ختم ہجر کی گھڑیاں — اور تھوڑی سی رات باقی ہے

جو نہ پیتا ہو آئے وہ بھی پیئے — فصلِ گل میں یہ حکمِ ساقی ہے
تم کو دل میرے دل کو درد پسند — اپنی اپنی یہ خوش مذاقی ہے
حسرتِ التفات و خواہشِ دید — ایک نکلی ہے ایک باقی ہے
بے پیئے نام تک نہیں لیتا — مجھ کو یہ احترامِ ساقی ہے
کثرتِ اختلاف سے یہ کھلا — اتفاق امرِ اتفاقی ہے
کہہ گئے مجھ سے وہ کہ اور جیو — ہو نہ ہو کوئی ظلم باقی ہے

غرقِ طوفانِ غم کیا سب کو
نوحؑ اچھی یہ خوش مذاقی ہے

۲۵؍ اگست ۱۹۳۵ء

ج

یوں چلے دور تو رندوں کا بڑا کام چلے — خم بڑھے شیشہ جھکے بادہ ڈھلے جام چلے
جھیل کر اہلِ جہاں صدمہ و آلام چلے — شاد کام آئے جو دنیا میں وہ ناکام چلے
بے پیئے کچھ نہیں جینے کا مزہ اے ساقی — رات دن جام چلے جام چلے جام چلے
کوچۂ عشق میں تکلیف ہی تکلیف رہی — ہم بآرام نہ آئے نہ بآرام چلے
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے اہلِ نظر بیٹھے ہیں — حسن اگر کام چلائے تو کوئی کام چلے
زندہ رہنے کے مقاصد ہیں حقیقت میں یہی — ہاتھ پاؤں اپنے چلیں کام چلے نام چلے
وادیِ عشق میں رہبر کی ضرورت کیا ہے — ہم چلیں اور ہمارا دلِ ناکام چلے
مسکراتے ہیں جو غنچے تو کھلے جاتے ہیں پھول — دورِ جام ایسے میں اے ساقیِ گلفام چلے
غیر ممکن ہے بغیر اس کے محبت کا نباہ — دل سے ملتا نہیں جب دل ہی تو کیا کام چلے
مدعا یہ ہے نکل آئے دوبارہ خورشید — کہ جہاں شام ہوئی آپ سرِ بام چلے
کیوں کہا میں نے کہ سن لیجئے رودادِ ستم — وہ بگڑ کر اٹھے دیتے ہوئے دشنام چلے

حضرتِ نوحؑ اٹھاتے ہیں جو طوفانِ سخن
شاید اس کا ہو یہ مطلب کہ مرا نام چلے

طبع زاد ۲۲؍ ستمبر ۱۹۳۵ء

ج

مجھ سے برہم نگہِ یار ہوئی جاتی ہے — یہ دل آرام دل آزار ہوئی جاتی ہے
سہل اب منزلِ دشوار ہوئی جاتی ہے — ہر نظر محرمِ اسرار ہوئی جاتی ہے
کیا دکھائے گی مجھے سوزِ محبت کا اثر — سرد خود آہِ شرربار ہوئی جاتی ہے
ناوک و خنجر و شمشیر کوئی چیز نہیں — اور ہی کچھ نگہِ یار ہوئی جاتی ہے

دور ساغر ہیں کہ ہر وقت چلے جاتے ہیں
ایک دنیا ہے کہ مے خوار ہوئی جاتی ہے

اعتبار اپنی بھی نیت کا ہمیں رہ نہ گیا
کوئی لحظے میں گنہ گار ہوئی جاتی ہے

عشق کی پھانس کو احباب نکالیں کیوں کر
یہ بھی امیدِ دلِ زار ہوئی جاتی ہے

موسمِ گل نہ رہا تو وہ چمن بھی نہ رہا
ہر کلی سوکھ کر اب خار ہوئی جاتی ہے

رحم کر رحم نگاہوں کے بدلنے والے
کیا سے کیا شکلِ دلِ زار ہوئی جاتی ہے

بادہ کش آتشِ سیال کا چھڑکاؤ کریں
نارِ دوزخ ابھی فی النار ہوئی جاتی ہے

اب مجھے شکوۂ بیداد کی حاجت نہ رہی
منفعل خود نگہِ یار ہوئی جاتی ہے

بوئے مے شیشہ و ساغر میں چھپے گی کیوں کر
پھیل کر نکہتِ گلزار ہوئی جاتی ہے

کس طرح میں تری الفت کو چھپاؤں دل میں
میری صورت سے نمودار ہوئی جاتی ہے

عرقِ شرم میں توبہ نے ڈبویا شاید
پانی پانی مے گلنار ہوئی جاتی ہے

کیا مرے منہ سے فسانہ وہ مرے غم کا سنیں
بات بات آہِ شرربار ہوئی جاتی ہے

جوشِ طوفانِ محبت نے مجھے ایسا گھیرا
مخلصی نوح کی دشوار ہوئی جاتی ہے

طبع زاد ۲۳ نومبر ۱۹۳۵ء

ہمیں جس زور پہ تھا ناز اس سے ہاتھ دھو بیٹھے
بس اب رونا ہے پیری کا جوانی کو تو رو بیٹھے

ادا و حسن پر سب اپنی اپنی جان کھو بیٹھے
وہ مر کر ہی اٹھے آ کر تری محفل میں جو بیٹھے

ترے کوچے میں آئے یا تری محفل میں جو بیٹھے
وہ دل کو صبر کر ڈالے جگر کو اپنے رو بیٹھے

اٹھایا فائدہ کیا ہم نے رہ کر بزمِ جاناں میں
یہاں بے کار بیٹھے بیٹھے ساری عمر کھو بیٹھے

رہِ عشق و وفا میں کام اطاعت سے رہا ہم کو
اٹھایا دل نے تو اٹھے بٹھایا دل نے تو بیٹھے

نتیجہ ہم نے دیکھا بھی تو یہ دیکھا محبت کا
ہمیشہ کے لئے بیٹھے بٹھائے دل کو رو بیٹھے

امیدِ مہر و الفت نے دیا مجھ کو اس طرح دھوکا
ہم آزار و ستم کے لطف سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے

درِ مقصد تو کب ہم کو ملا بحرِ محبت میں
جو باقی رہ گئی تھی آبرو وہ بھی ڈبو بیٹھے

گلوں نے بھی اڑایا رنگ میری بادہ نوشی کا
مے شبنم سے دامن اپنا اپنا سب بھگو بیٹھے

مصیبت عشق میں آئے گی تو کس پر اب آئے گی
ہم اپنے دل کو دل دینے سے پہلے ہی رو بیٹھے

کہیں عشاق بھی مرنے سے اپنا جی چراتے ہیں
چلاؤ تیر اٹھاؤ تیغ ہم تیار ہو بیٹھے

حریمِ ناز کا پردہ ادھر پورا نہ اٹھا تھا
ادھر سب طالبانِ دید عقل و ہوش کھو بیٹھے

نہیں معلوم اس میں کیا مزہ رندوں کو آتا ہے
ادھر قبلے سے ابر اٹھا ادھر دامن بھگو بیٹھے

نکل کر بے اثر اشکوں نے کھوئی آبرو کیا کیا
یہ ڈوبے خود بھی اپنے ساتھ مجھ کو بھی ڈبو بیٹھے

پہنچنے کو کسی کے تیر پہنچے تو مرے دل تک
مگر ہم کر نہ دس بیٹھے ہزاروں میں نہ دو بیٹھے

بتوں کے عشق نے ڈالا اثرؔ وہ اہلِ تقویٰ پر
سب اپنی جان کھو بیٹھے تھے یہ ایمان کھو بیٹھے

محبت میں نہ تھی حاجت انھیں طوفاں اٹھانے کی
جنابِ نوحؔ خود اپنے سفینے کو ڈبو بیٹھے

طبع زادہ ۵ دسمبر ۱۹۳۵ء

ج

نہ آہوں نے نہ کچھ میری مدد کی ملنے والوں نے
بہت کچھ سرزنش کی زہد و تقویٰ کے خیالوں نے
ڈبویا تھا مجھے دریائے غم میں حسن والوں نے

نہ مدفن بھی ان کی یاد میں یہ خاک اڑاتے ہیں
فقط دو چار صحرا پھر کر ان کو بیٹھ جانا تھا

عبورِ بحرِ غم کے شوق میں یوں زندگی گذری
کدورت اس طرح دل کی نکالی دم نکلنے پر

جو یوں ہوگا تو کیا ہوگا جو یوں ہوگا تو کیا ہوگا
وہ سب دعوے ہی دعوے تھے خدا کا قرب مشکل تھا

ہوا کا رخ یکایک پھر گیا بحرِ محبت میں
خیالِ ضبطِ غم سے بلبلاں پیہم گرے دل پر
اٹھائے اس قدر صدمے کہ دنیا سے اٹھے خود بھی

پہنچنا کیا مراد شوار تھا عرشی مراتب پر
کسی کے ہاتھ اٹھ کر ہو گئے ختم میری گردن میں
دکھایا دوزخ و جنت کا منظر بار بار ان کو

مآلِ عشق پر منھ پھیر کر رونے لگا وہ بھی
ہزار اشکوں سے بھی جس کا نکلنا غیر ممکن تھا
عدم کا راز کیا آسودگانِ خاک سے کھلتا

ہمیں پر منحصر کیا ہے اثرؔ ساقی کی آنکھوں کا
اگر ہوتا اثرؔ تو بالیقیں ملتا کہیں ملتا

جہاں وہ تھا وہاں پہنچا دیا مجھ کو خیالوں نے
مگر لوٹا حرم والوں کو بھی بت خانے والوں نے
تصدق ان خیالوں کے بچایا جن خیالوں نے
وفا کا نام زندہ کر دیا مرجانے والوں نے
زمیں سر پر اٹھالی کیوں مرے تلووں کے چھالوں نے
ڈبویا مجھ کو اشکوں نے ابھارا مجھ کو نالوں نے
دبایا خاک میں ہم کو ہمارے ملنے والوں نے
پھنسایا سو تردد میں مجھے میرے خیالوں نے
بتوں تک بھی نہ کھینچا یا مجھے اللہ والوں نے
ڈبویا میرے بیڑے کو مرے گھر کے اجالوں نے
مرا گھر پھونک کر دیکھا تماشا میرے نالوں نے
وفا کی انتہا کر دی محبت کرنے والوں نے
مگر رکھا زمیں ہی تک مجھے سطحی خیالوں نے
جہانِ شوق کو چمکا دیا ان دو اجالوں نے
ہماری سرد آہوں نے ہمارے گرم نالوں نے
نگاہِ آخری ڈالی کچھ ایسی مرنے والوں نے
نکلوایا اسی حسرت کو میرے چار نالوں نے
بنایا کچھ نہ اپنا حال ان چپ رہنے والوں نے
کیا دونوں جہاں کو مست ان دونوں پیالوں نے
زمین و آسماں کو چھان ڈالا میرے نالوں نے

جنھیں اے نوحؔ سرمایۂ ہستی سمجھتا تھا

دیکھے ہیں داغ پہ داغ اُن مرے نازوں کے پالوں نے

طبع زاد ۱۵ دسمبر ۱۹۳۵ء

بحرِ الفت میں کیا تلاطم ہے — ناؤ مفقود ناخدا گم ہے

یا خدا خیر ہو مرے دل کی — عشق سے حسن کا تصادم ہے

ذاتِ مطلق کو ڈھونڈتا ہوں میں — ذاتِ حسن صفات میں گم ہے

چشمِ حق بیں سے دیکھ اپنے کو — اور جو کچھ ہے وہ توہم ہے

اہلِ ادراک سے کوئی پوچھے — شورِ محشر میں بھی ترنم ہے

دل کے ذرے ہوا میں اڑتے ہیں — منتشر آج بزمِ انجم ہے

اے جفائے وفا نما بس بس — دل مرا قابلِ ترحم ہے

ہم چلے ہوں شراب خانے سے — ہاتھ میں جام دوش پر خم ہے

ابرِ باراں ہے یا مرا گریہ — برق ہے یا ترا تبسم ہے

کیوں ہوئی آپ کی نگاہ کرم — سو طرح کا مجھے توہم ہے

خاکسارانِ عشق جتنے ہیں — فرض اُن کے لئے تیمم ہے

تھاہ جس کی مجھے نہیں ملتی — قلزمِ آرزو وہ قلزم ہے

الله الله عشق کا طوفاں
نوح کی عقل بھی یہاں گم ہے

۲۸ فروری ۱۹۳۶ء

یارب جو ترا محو تجلی مجھے کر دے — وہ شوقِ نظر ذوقِ نظر حسنِ نظر دے

اے بے خبری تو ہی یہ ساقی کو خبر دے — پھر ہوش میں لا پھر مجھے بے ہوش وہ کر دے

یہ بھی نگہِ لطف سے کیا ہو نہیں سکتا — خالی مری جھولی ہے وہ جھولی مری بھر دے

کیوں ہو نگہِ شوق نہ ممنونِ تصور — جو بیچ میں حائل تھے وہ سب اٹھ گئے پردے

دل ہے تو اُسی کا ہے جگر ہے تو اُسی کا — اپنے کو رہِ عشق میں برباد جو کر دے

اے جوشِ محبت یہ تری ضد ہے نرالی — دل ہو کہ نہ ہو پاس اُنھیں نذر مگر دے

ساقی مجھے پینے سے غرض بحث سے کیا کام — نیت کو نہ بھر تو مرے ساغر ہی کو بھر دے

رکھتا ہوں قدم جادۂ تسلیم و رضا میں — ممکن ہے مرا ساتھ نہ دل دے نہ جگر دے

اے حسن اُٹھاؤں گا ترا ناز کہاں تک — بہتر ہے کہ مستغنیِ حسرت مجھے کر دے

ناکامِ مقاصد نہ رہیں اہلِ تمنا — تقدیر بھی تدبیر کو امداد اگر دے

بے تاب مرا دل بھی ہو پہلو میں جگر بھی
ناوک جو سہارا نہ اِدھر دے نہ اُدھر دے

اُس وقت کھلے جلوۂ دیدار کا عقدہ
خود حسن مرے دل کو اگر حکم نظر دے

پھیلے ہوئے دامن کی طرف بھی ہو توجہ
بھر دے اِسے بھر دے مرے داتا اِسے بھر دے

ہوتا ہے توہم یہ مجھے شکوۂ ستم پر
آزار بھی دیتا وہ کہیں پند نہ کر دے

یہ سچ ہے کہ دشوار نہیں دل کی حفاظت
لیکن مجھے موقع بھی تو اتنا وہ نظر دے

جس کو نگہ لطف سمجھتا ہے زمانہ
بن کر وہی خنجر کہیں سفّاکی نہ کر دے

یارب نہ رکے پھر تو کوئی کام ہمارا
سب کچھ بھی دیتا ہے کہ نالوں میں اثر دے

آداب محبت سے خبردار نہیں دل
جلوے کو یہ لازم ہے کہ تعلیم نظر دے

اے نوح قیامت ہے مری اشک فشانی
تم کو بھی یہ طوفان کہیں غرق نہ کر دے

وہ آغازِ محبت تھا یہ انجامِ محبت ہے

نمائش باندہ کے سلسلے میں پنڈت جگموہن صاحب شوقی پنشنر ڈپٹی کلکٹر و سید نصیر الدین صاحب نصیر منصف نے ۲۲ فروری ۱۹۳۶ء کو اس طرح پر مشاعرہ کیا لیکن میں علالت کے سبب سے شریک نہ ہو سکا

رج

یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہیں مجھ سے عداوت ہے
مگر اتنا سمجھ رکھو محبت پھر محبت ہے

نہ غفلت ہے نہ مہلت ہے نہ ساعت ہے نہ مدت ہے
اجل جس روز آ جائے وہی روزِ قیامت ہے

خوشی کے بعد غم تکلیفِ غم کے بعد راحت ہے
یہی آئینِ عالم ہے یہی قانونِ فطرت ہے

یہ اچھا ہے کہ مجھ کو ضبطِ دردِ غم کی عادت ہے
محبت میں گلہ کرنا بھی توہینِ محبت ہے

بہار آئی گھٹا چھائی مسرت سی مسرت ہے
اب ایسے میں نہ پینا داخلِ کفرانِ نعمت ہے

فنا کے بعد یاروں کو امیدِ لطف و راحت ہے
عدم میں کچھ نہیں ہے بس قیامت ہی قیامت ہے

خدا رکھے خدائی سے جدا رسمِ محبت ہے
کہانی کی کہانی ہے حقیقت کی حقیقت ہے

نہ دنیا ہے نہ عقبیٰ ہے نہ دوزخ ہے نہ جنت ہے
ہماری رائے ناقص میں جو کچھ ہے وہ محبت ہے

یہ اپنی ضد یہ اپنی رائے یہ اپنی طبیعت ہے
مرا گھر تجھ کو دوزخ ہے ترا گھر مجھ کو جنت ہے

سرِ راہِ عشق میں بھی سو طرح کی مجھ پر آفت ہے
قیامت تو نہیں لیکن یہ تمہیدِ قیامت ہے

کہیں ہستی میں بلوا کبھی یہ تاثیرِ الفت ہے
جو داغِ آرزو پہلے تھا اب وہ شمعِ تربت ہے

شبِ فرقت کی تنہائی کا شکوہ بے حقیقت ہے
دلِ مضطر ہے لاکھوں غم ہیں میں ہوں میری قسمت ہے

مجھے کیا امتحاں ہیں شرحِ دردِ دل کی حاجت ہے
نگاہِ نازِ جاناں خود ہی نقادِ محبت ہے

وہ کہنے لگتے نہیں کھل کر مجھے تجھ سے محبت ہے
محبت ہے تو اظہارِ محبت کی ضرورت ہے

جنابِ نوح کو بھی کشتی و ساحل کی حاجت ہے
نہیں معلوم کیا طوفانِ دریائے محبت ہے

طبع زاد ۱۴ / مئی سنہ ۱۹۳۶ء

ہیں گلے مل رہا ہوں خنجر سے ۔۔۔ عشق کے حکم حسن کے ڈر سے

آسماں سے مجھے نہیں شکوہ ۔۔۔ بلکہ شکوہ ہے آسماں گر سے

کیا عجب کم ہو اُن کی سنگ دلی ۔۔۔ پھوڑیوں اپنے سر کو پتھر سے

حشر اُٹھا کرے اُٹھانے کو ۔۔۔ ہم نہ اُٹھیں گے آپ کے در سے

اب کہاں دل میں ناوکِ دل دوز ۔۔۔ گھر کا مالک نکل گیا گھر سے

شاد کردے بدل کر اے ساقی ۔۔۔ اپنے ساغر کو میرے ساغر سے

میرے گریہ کا یہ مآل ہوا ۔۔۔ اشک باری پہ ابر وہ برسے

کیا عجب آتشِ جہنم بھی ۔۔۔ سرد ہو جائے دامنِ تر سے

اے مرے جوششِ اشکِ غم بس بس ۔۔۔ دیکھ پانی گزر گیا سر سے

موسمِ گل میں آشیاں اُجڑا ۔۔۔ چھٹ گئے ہم بھرے پُرے گھر سے

لاگ بھی کچھ ہے کچھ لگاؤ بھی ہے ۔۔۔ تیر کو دل سے تیغ کو سر سے

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا ۔۔۔ چپ ہوں افشائے راز کے ڈر سے

اُٹھنے والا ہے پھر کوئی طوفان
نوح ہشیار دیدۂ تر سے

۲۲ / مئی سنہ ۱۹۳۶ء

جہانِ آرزو بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ خودی کو جب مٹا دو تو خدا معلوم ہوتا ہے

وہ دنیا کی نظر میں بے وفا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ مگر مجھ کو نہیں معلوم کیا معلوم ہوتا ہے

کوئی بیزار کوئی مبتلا معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ یہ سارا کھیل عشق و حسن کا معلوم ہوتا ہے

اطبا بے سبب درماں سے کب پرہیز کرتے ہیں ۔۔۔ ہمارا عشق دردِ لا دوا معلوم ہوتا ہے

خدا نے دل وہ بخشا مجھ کو اپنی مہربانی سے ۔۔۔ بُرا کہنا بُرا سننا بُرا معلوم ہوتا ہے

غرور و کبر نے مل کر یہ پھیلایا اثر اپنا ۔۔۔ کہ ہر بندہ خدائی میں خدا معلوم ہوتا ہے

شبِ فرقت کی تنہائی میں دل بہلائیں ہم کس سے ۔۔۔ یہاں کب دوسرا یا تیسرا معلوم ہوتا ہے

ضیائے عشقِ کامل نے جِلا کچھ اس طرح دے دی ۔۔۔ مری صورت سے دل کا مدعا معلوم ہوتا ہے

کسی کو دم دیا مل کر کسی کا دم لیا کھینچ کر ۔۔۔ ترا خنجر بڑا چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے

زمیں کوئے جاناں کے مراتب ہم سمجھتے ہیں
یہ ٹکڑا ساری دنیا سے جدا معلوم ہوتا ہے

بشر کا زور کچھ احکامِ قدرت پر نہیں چلتا
اِسی معلوم ہونے سے خدا معلوم ہوتا ہے

بنا کن خاص اجزا سے ترا پیمانہ اے ساقی
پرانا ہو گیا لیکن نیا معلوم ہوتا ہے

فراقِ یار میں دستِ دعا اُٹھیں ضرور اُٹھیں
اثر سے فاصلہ دو ہاتھ کا معلوم ہوتا ہے

جلایا باغباں نے یا نشیمن پر گری بجلی
چمن میں کچھ دھواں اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے

قیامت میں مجھے اُن کی تمنا کھینچ لائی تھی
یہاں تو مرحلہ ہی دوسرا معلوم ہوتا ہے

خزاں کے آتے ہی بجلی گری کیا بادہ نوشی پر
جسے میں دیکھتا ہوں پارسا معلوم ہوتا ہے

کلیم و برق و کوہِ طور کی ہنگامہ آرائی
مجھے اِس میں اشارہ آپ کا معلوم ہوتا ہے

بھلا دو اور آنے بے بلائے پھر مرے گھر تک
اثر تیرا یہ اے آہ رسا معلوم ہوتا ہے

بظاہر نوح بے چارے کی حیثیت نہیں کچھ بھی
زیادہ سے زیادہ ناخدا معلوم ہوتا ہے

جوانی میں تو ہر صورت حسیں معلوم ہوتی ہے

اس طرح ہر ۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو رائے صاحب بھدری نے بابو گنج ضلع پرتاب گڈھ میں بڑے پیمانے پر مشاعرہ کیا شعرائے سلون پرتاب گڑھ رائے بریلی مانک پور و الہ آباد شریک تھے دس بجے رات سے شروع ہو کر پانچ بجے صبح کو ختم ہوا بعد میرے خطبۂ صدارت کے مشاعرے کا آغاز کیا گیا تھا

بڑی سیدھی نگاہِ شرمگیں معلوم ہوتی ہے
یہ ظالم ہے مگر ظالم نہیں معلوم ہوتی ہے

شبِ فرقت سے گھبراہٹ نہیں معلوم ہوتی ہے
یہ برسوں کی ہماری ہم نشیں معلوم ہوتی ہے

مرے دردِ محبت کا انھیں کیوں کر یقیں آئے
جگر کی چوٹ باہر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

گلہ کیا آسماں کا آسماں تو آسماں ٹھہرا
زمیں بھی دشمنِ اہلِ زمیں معلوم ہوتی ہے

جگر کی پھانس نکلی زور سے کب سانس لینے پر
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

کوئی دیکھے مری آنکھوں سے بت خانے کو اے زاہد
خدا کی شان کچھ آ کر یہیں معلوم ہوتی ہے

ادب سے بھی وہاں پائے طلب ہم رکھ نہیں سکتے
زمینِ کوئے جاناں کیا زمیں معلوم ہوتی ہے

اُدھر یہ فکر ہم پہنچیں خدا کے رازِ قدرت تک
اِدھر اپنی حقیقت بھی نہیں معلوم ہوتی ہے

یہاں تک رفتہ رفتہ چاک پہنچا اب گریباں کا
کہ دامن میں بھی ہم کو آستیں معلوم ہوتی ہے

وفا و عشق کو اسمائے فرضی ہم سمجھتے ہیں
کہیں معلوم ہوتا ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

اُڑائی خاک اتنی میں نے آہیں اس قدر کھینچیں
کہ نیچے آسماں اوپر زمیں معلوم ہوتی ہے

اُسی تیری نظر نے قتل کر ڈالا زمانے کو
جسے کہتے تھے سب ایسی نہیں معلوم ہوتی ہے

۱

بساطِ دہر پر اے زندگی کیا پاؤں پھیلاؤں
تری قسمت میں بس دو گز زمیں معلوم ہوتی ہے

جفائے دم بدم نے خوگرِ غم یوں کیا مجھ کو
مصیبت اب مصیبت ہی نہیں معلوم ہوتی ہے

نشاطِ عیش بھی تیری گئی ہیں صدمۂ غم بھی
حقیقت مرنے جینے کی یہیں معلوم ہوتی ہے

لنڈھا کر دیکھ تو یہ تو نہیں زاہد کی اے ساقی
کوئی شے مجھ کو خم میں تہ نشیں معلوم ہوتی ہے

جتانے کو محبت وہ بہت مجھ سے جتاتے ہیں
مگر معلوم کرنے پر نہیں معلوم ہوتی ہے

کلیجے سے لگا کر کیوں نہ میں رکھوں محبت کو
یہ دولت حاصلِ دنیا و دیں معلوم ہوتی ہے

خیالِ حسنِ عالم سوز میں دل کا خدا حافظ
کہیں چمکے مگر بجلی یہیں معلوم ہوتی ہے

ابھی اٹھا نہیں طوفان دریائے محبت میں
مگر اے نوح کشتی تہ نشیں معلوم ہوتی ہے

دیگر

ج

خلش کچھ دل میں کچھ دل کے قریں معلوم ہوتی ہے
یہ مٹتی ہے جہاں سے پھر وہیں معلوم ہوتی ہے

یہاں اس کی حقیقت سمجھ نہیں معلوم ہوتی ہے
نکل کر دل سے آہِ آتشیں معلوم ہوتی ہے

تمنا اُن کی حیرت آفریں معلوم ہوتی ہے
کہ دل میں ہے ٹٹولو تو نہیں معلوم ہوتی ہے

اگر نکلے گی میرے دل سے تو بہلے گا دل کیوں کر
حسینوں کی تمنا بھی حسیں معلوم ہوتی ہے

جو دنیائے محبت میں وفا کا ذکر کرتے ہیں
وہی مجھ کو بتا دیں یہ کہیں معلوم ہوتی ہے

دمِ جوشِ جنوں میں نے بکھیرا تار تار ایسا
ہزاروں ہاتھ کی ایک آستیں معلوم ہوتی ہے

وفورِ لاغری نے لاغری کی انتہا کر دی
کہ آئینہ میں شکل اپنی نہیں معلوم ہوتی ہے

زمانہ کیوں مٹاتا ہم سے کیا ضد تھی زمانے کو
تری سازش کچھ اس میں بالیقیں معلوم ہوتی ہے

خدا جانے وہ پہلے ہی سے کیوں کر جان جاتے ہیں
ہماری بات خود ہم کو نہیں معلوم ہوتی ہے

مرے دل نے حقیقت کھول دی تیرے مراتب کی
مکاں کو دیکھ کر شانِ مکیں معلوم ہوتی ہے

تری حسرت کو رہتے رہتے دل میں مدتیں گذریں
مجھے بھی اب یہ پردیسی نہیں معلوم ہوتی ہے

اڑائے کس نے یوں دامن کے ٹکڑے راہِ وحشت میں
ہمیں ہر گام پر اک آستیں معلوم ہوتی ہے

خدا محفوظ رکھے چشمِ بد سے تیغِ قاتل کو
نہا کر خون میں کتنی حسیں معلوم ہوتی ہے

لگے ہاتھوں جنوں کا ہاتھ الجھا بالیقیں الجھا
یہ کیسی آستیں میں آستیں معلوم ہوتی ہے

شبِ تاریکِ غم میں داغِ دل کی یہ ضیا باری
کہ اٹھائیسویں بھی چودھویں معلوم ہوتی ہے

ادا پھر وہ ادائے خاص کس کی نوجوانی کی
حسیں ہو یا نہ ہو لیکن حسیں معلوم ہوتی ہے

وطن میں تو نہیں لیکن بشر کو دشت غربت میں
وہ کہتے ہیں تمہارا حال ہم تم سے نہ پوچھیں گے
وبال جسم وجاں وحشت میں اپنے دست وحشت کو

فلک معلوم ہوتا ہے زمیں معلوم ہوتی ہے
پرائی بات بے پوچھے کہیں معلوم ہوتی ہے
گریباں جیب دامن آستیں معلوم ہوتی ہے

جناب نوح اب طوفان بے موقع سے کیا حاصل
نزاکت وقت کی تم کو نہیں معلوم ہوتی ہے

۳ نومبر ۱۹۳۶ء

وہ نہ آتی نہ ٹھہرتی نہ کبھی رہتی ہے
کوئی لحظہ ہمیں آرام ملے کیا ممکن
آتش عشق کا بجھنا کوئی آسان نہیں
جام پر جام لگاتار پئے جاتا ہوں
چھڑ گئی جنگ کچھ ایسی کہ الٰہی توبہ
خنجر ناز کے کھنچنے کا مجھے رنج نہیں
ہوگیا اس لئے مفہوم سمجھنا مشکل
دیکھنا حسن کا نزدیک سے آسان نہیں
ذکر فتنوں کا نہیں فتنے تو فتنے ٹھہرے

ہم یہ سنتے ہی رہے دل میں خوشی رہتی ہے
ہر گھڑی دل کی لگی ساتھ لگی رہتی ہے
یہ تو وہ آگ ہے جو دل میں دبی رہتی ہے
پھر بھی مجھ کو ہوس بادہ کشی رہتی ہے
دل ہی اب رہتا ہے یا دل کی لگی رہتی ہے
غم ہے اس کا تری تصویر کھنچی رہتی ہے
کچھ نہ کچھ آپ کی ہر بات میں نفی رہتی ہے
پاس تم رہتے ہو تو مجھ کو غشی رہتی ہے
خود قیامت ترے قدموں سے لگی رہتی ہے

بیٹھتے جب کبھی رونے کو تو اٹھتا طوفان
جوشش گریہ میں یہ اے نوح کمی رہتی ہے

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

اس طرح پر ایک غزل سفینۂ نوح میں بھی درج ہے

شروع جنوری ۱۹۳۷ء کو دہلی میں جناب پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی نے اپنا پچیسواں مشاعرہ سلور جوبلی کے نام سے کیا اس سلسلہ میں ریلوے انسٹیٹیوٹ اور گرلز کالج وغیرہ میں اور بھی مشاعرے منعقد ہوئے

روزانہ اخبار تیج ۳ جنوری ۱۹۳۷ء

بزم ادب کی سلور جوبلی کے سلسلے میں جو مشاعرہ ہوا تھا وہ کل کامیابی کے ساتھ ختم ہوگیا - یہ جلسہ چار روز تک رہا پہلے روز دن میں سنگیت سمیلن ہوا اور رات کو پہلے براڈکاسٹ پر اور اس کے بعد مجلسی طور پر سمیلن ہوا دوسرے روز پھر کوی سمیلن ہوا تیسرے دن دوپہر کے وقت سے اردو اور فارسی کا مشاعرہ شروع ہوا جس میں دور دور کے مشاہیر اور اساتذہ شریک تھے رات کو براڈکاسٹ ڈیڑھ گھنٹہ تک رہا جس میں حضرات جوش و نوح و آزاد انصاری و بزم اکبرآبادی و گلشن و ساحر و مجروح و رشید و شوقی و وفا و مدن و خنجر و حرماں و نصیر نے اپنا کلام سنایا اس کے بعد

ایک گھنٹہ تک اور نشست رہی جو جناب روشن کے پر لطف مزاحیہ کلام پر ختم ہوئی دوسرے روز دن میں اُن اساتذہ نے بھی اپنا کلام سنایا جو سابقہ شب کو ریڈیو پر سنا چکے تھے ان کے علاوہ حضرات جوش ملسیانی وادیب لکھنوی و جناب سائل دہلوی وسیماب اکبرآبادی واطہر ہاپوری وفدا گلاوٹھوری وچند دیگر اساتذہ نے بھی اپنے اپنے کلام سنائے اور بینڈ کی سلامی کے ساتھ اجلاس ختم ہوا شب کو پھر آخری نشست ہوئی جس میں حضرات راز و منجو و ماہر و دیگر اساتذہ نے اپنے اپنے کلام سنائے اور جلسہ خیر وخوبی کے ساتھ ختم ہو گیا چار دن روز جناب پنڈت راد ھے ناتھ صاحب کول المتخلص بہ گلشن لاہوری صدر تھے یہ جلسہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا جلسہ تھا کیوں کہ اُردو کے اساتذہ کے علاوہ ہندی کے اساتذہ جناب ناتھو رام صاحب مادھو رام ہر جواد ھیش مالوی ہر دلیش وغیرہ باہر سے تشریف لائے تھے مقامی شعرا میں سے بیجولال ورما اور دینا ناتھ جی دلیش دار جلی جمعیت سے مشہور حضرات شریک تھے چاروں روز کی نشست سناتن دھرم ہائی اسکول میں ہوئی حاضرین کی تعداد بہت زیادہ تھی

پھر روزانہ تیج ۶ رجنوری سنہ ۱۹۳۶ء

کل شب کو سوتنر ڈبیٹنگ کلب کے زیر اہتمام منشی لبشن دیال صاحب شاد کے دولت کدہ واقع چھتہ صوفی محلہ پیپل مہادیو میں رات کو ساڑھے نو بجے ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں بہت سے مقامی وغیر مقامی اساتذہ نے شرکت فرمائی جناب تمنا واثر واختر وطالب وصوفی وشرر ووفا وکیفی نے حاضرین کو محظوظ کیا حضرت جوش ملیح آبادی کا کلام بہت توجہ سے سنا گیا لاسٹیں کے جلنے کا جو سین حضرت جوش نے بیان کیا اُس سے حاضرین میں سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا حضرت سائل دہلوی کی غزل اپنے رنگ میں خوب تھی بالخصوص مٹی اور جھولی کے قوافی تو ایسے انوکھے انداز میں استعمال ہوئے تھے کہ نعرہ ہائے تحسین سے تمام محفل گونج اٹھی حضرات منجو و راز کا کلام بڑی دلچسپی سے سنا گیا اور ایک فلسفیانہ رنگ اور دوسرے کے رنگ تغزل کو خوب داد ملی حضرت سائل نے صرف ایک قطعہ پڑھا مگر خوب پڑھا جناب فہیم کی نظم آپ بیتی اور جگ بیتی اپنے رنگ میں لاجواب تھی حاضرین نے بہت پسند کی حضرت آزاد انصاری نے ایک خاص رنگ کی نظم پڑھی جو حسن کی مذمت میں تھی مضمون تو اتنا نازک مگر انداز بیان ایسا کہ فصاحت کے دریا بہا دیئے جناب ہمدم اکبرآبادی کی غزل ایک تو یوں ہی کامیاب تھی دوسرے ان کے پڑھنے سے کلام میں چار چاند لگ گئے جناب حیرتاں خیرآبادی کے استادانہ کلام نے حاضرین سے دل کھول کر داد لی جناب ارشدی کی غزل بھی بہت مقبول ہوئی حضرت نوح ناروی کے لئے تمام حاضرین ہمہ تن گوش تھے آپ نے ایک رباعی چند متفرق اشعار اور ایک غزل سنائی زبان کے ٹکڑے آپ کے حصہ ہیں بڑی سے بڑی بات کو سیدھے لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں جس سے لفظی ومعنوی دونوں صورتوں سے لطف اُٹھایا جا سکتا ہے آپ کے کلام کو وہ داد ملی کہ حاضرین اُچھل پڑے جناب راز نے حاضرین کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک اور غزل کی فرمائش کی یہ دوسری غزل بھی بہت پسند کی گئی آپ سے کچھ قبل پنڈت جگموہن ناتھ صاحب رینہ شوق وپنڈت برجی ناتھ صاحب شوق نے اپنے کلام سنائے تھے جن سے حاضرین نے بہت لطف لیا حضرت نوح کے بعد جناب قابل گلاوٹھوی نے جنھیں آنے میں دیر ہو گئی تھی اپنا کلام ا[illegible]

غزل پڑھی پھر جناب قمر بدایونی نے دو غزلیں پڑھیں دونوں خوب تھیں اور توبہ کی ردیف میں جو غزل تھی اُس کی تو داد نہیں دی جا سکتی جناب ماجد صاحب گڑگانوی کی پرلطف غزل پر مشاعرہ ڈھائی بجے رات کو ختم ہوا وقت کم ہونے کی وجہ سے کلب کے ممبر اور بہت سے شعرا اپنا کلام نہیں سنا سکے

ایسے میں خطا ہو کوئی تو عین خطا ہے
ہم دیکھ رہے ہیں وہ ہمیں دیکھ رہا ہے

کیا کہئے تفاوت کرم و جور میں کیا ہے
یہ عام ادا ہے وہ تری خاص ادا ہے

سب کہتے ہیں آفت ہے غمِ عشق بلا ہے
یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں کیا جانئے کیا ہے

ہوتے ہیں مرے جینے کے درماں تو ہزاروں
اے چارہ گرو مرنے کی بھی کوئی دوا ہے

ہم تذکرۂ ظلم نہ ظالم سے کریں گے
کہہ دے گا بُری بات کا چرچا بھی برا ہے

مایوس ہوئے اب مری صحت کی طرف سے
اب نزع میں کوئی نہ دوا ہے نہ دعا ہے

پھر بھی تو کسی شوخ کا جلوہ نہیں چھپتا
اطوار نئے طرز نئی رنگ نیا ہے

ہر شخص مرے بعد مجھے یاد کرے گا
جینے میں مزا کچھ نہیں مرنے میں مزا ہے

اب حال دلِ زار کا دیکھا نہیں جاتا
کہتے ہیں دعا جس کو وہ مصروفِ دعا ہے

لاتا نہیں ایمان کوئی عشق و وفا پر
یعنی وہی شاک ہے وہی کیوں کئے وہی کیا ہے

ہر حال میں شاکر ہیں ہر شکل میں راضی
آزار بھی بندوں کے لئے لطفِ خدا ہے

ڈرتا ہوں کہ فریاد نہ آجائے زباں پر
وہ ظلم کے پردے میں مجھے جانچ رہا ہے

ہیں جی نہیں سکتا ہوں اگر پی نہیں سکتا
پینا بھی روا ہے مجھے جینا بھی روا ہے

ہر وقت وہی مشورۂ ترکِ محبت
یہ چھیڑ نہیں اُن کی تو فرمائیے کیا ہے

نکلے دلِ پُرداغ سے آنسو دمِ گریہ
بھیگی ہوئی گلزارِ محبت کی فضا ہے

جو کچھ بھی ملے گا وہ خدا ہی سے ملے گا
جو کچھ بھی ملا ہے وہ خدا ہی سے ملا ہے

اے خاک بسر خاک کا تو شکر ادا کر
جس سمت وہ ہیں آج اُسی جانب کی ہوا ہے

کیا جانے کوئی بے خودیِ عشق کا رتبہ
گم ہو گئے ہم جس میں وہ عالم ہی جدا ہے

جائے نہ کبھی دل سے حسینوں کی محبت
مرتا رہے اِن پر یہی جینے کا مزا ہے

تو اس کو سمجھتا نہیں پوچھ اہلِ غرض سے
اقرار میں کیا ہے ترے انکار میں کیا ہے

پہلے یہ سمجھ لیجئے پھر شوق سے سنئے
ہر بات مری آہ ہے اور آہ رسا ہے

کیوں کہ نگہِ ناز سے محفوظ رہا دل
ناوک کی خطا ہے کہ نشانے کی خطا ہے

دل لوٹ نہ لے کیوں تری دزدیدہ نگاہی
شوخی کی یہ شوخی ہے حیا کی یہ حیا ہے

طوفانِ محبت میں کوئی بس نہیں چلتا

کشتی کی طرح نوحؔ کا دل ڈوب رہا ہے

جشنِ بسم اللہ میں شورِ مبارک باد ہے

۹ مئی ۱۹۳۷ء کو سہیل احمد عرف مکین میاں سلمہٗ کی تسمیہ خوانی کے موقع پر خاص نارہ ضلع الہ آباد میں مشاعرہ ہوا چوں کہ غیر ضلع کے شعرا موجود نہ تھے اس لئے بیشتر الہ آباد ہی کے شعرا شریک ہوئے شاعروں کے علاوہ تمام قربِ جوار کے رؤسا اور اعزا و احباب کی بھی دعوت تھی وقت پر بہت زیادہ مجمع ہو گیا لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ آٹھ ہزار سے کم آدمی نہ رہے ہوں گے ہندو مہمانوں کی دعوت کا انتظام پنڈت مہادیو پرشاد صاحب رئیس ادہن اور چودھری دیونا تھ صاحب رئیس دصانہ کے سپرد تھا اور مسلمانوں کی تواضع و تکریم مرزا احمد جان صاحب ساکن الہ آباد کے ذمہ تھی جن سے برادرانہ مراسم ہیں دو راتوں اور دو دنوں تک جلسے کا سلسلہ رہا علاوہ مشاعرے کے رقص و سرود کی محفل بھی ہوئی شعرا میں سے نظمیں اور غزلیں سرورؔ حفیظؔ غنیؔ شاطرؔ زاہدؔ اکبرؔ ہاشمیؔ سلامتؔ ذاکرؔ جوہرؔ بسملؔ انورؔ سراجؔ نظرؔ طاہرؔ رحمتؔ قاریؔ طربؔ وکیلؔ صاحبان الہ آبادی عروجؔ عزیزؔ سلونی شمسیؔ سکندر پوری توبہؔ سید سرانوانی حافظؔ غازی پوری سوگؔ بسوہاری عزیزؔ مرزا پوری سوزؔ مجیدؔ خودؔ سہیلؔ ناروی امیرؔ صمد آبادی حکیم میاں مانک پوری شادقؔ نوجوی ضمیرؔ کسوادی نے پڑھیں یہ مشاعرہ بحسن و خوبی دو نشستوں میں ختم ہوا اور شروع سے آخر تک ایک صورت یہ قائم رہا

کس قدر ہے لطف سیرِ گلشنِ ایجاد ہے
جو یہاں بستی ہے وہ اپنی جگہ صیاد ہے

ج

موسمِ گل آ گیا تو یہ کسے اب یاد ہے
پہلے بادہ بادہ ہے پھر ہر چہ بادا باد ہے

کارگاہِ خلق سے پیدا نہ کر دل بستگی
ڈھونڈھ اُس موجد کو جس موجد کی یہ ایجاد ہے

دیکھتا ہوں یہ بھی ہیں اہلِ وفا کو دیکھ کر
کون ہے ناشاد اِن میں کون اِن میں شاد ہے

حضرتِ دل پھر نکالے سے نکل سکتی نہیں
یاد رکھئے اِس کو اُن کی یاد اُن کی یاد ہے

کثرتِ اوہام میں بھی محوِ انوارِ لطیف
دل مقید ہے مگر دل کی نظر آزاد ہے

اب مجھے کچھ لطف اُن کے لطف میں آتا نہیں
خوگرِ بے داد ہو جاتا ہی اک بے داد ہے

باغِ ہستی میں بسر ہو چین سے کیا زندگی
ہر نشیمن اک قفس ہر پھول اک صیاد ہے

بے خودی میں گر پڑے ہم اُن کے پائے ناز پر
ہے تو یہ اُفتاد لیکن لطف کی اُفتاد ہے

پوچھتے ہو سب سے تم اہلِ وفا کے واقعات
کس نے کس دن جان دی کس پر یہ کس کو یاد ہے

دو ہی باتیں ہم نے دیکھیں بزمِ عشق و حسن میں
داد ہے بے داد پر یا داد پر بے داد ہے

حشر میں بھی وعدۂ دیدار پورا ہو چکا
بھولنے والے تجھے بس بھول جانا یاد ہے

اُس طرف بھی اک نگاہِ لطف اے محمل سوار
مدتوں سے قیس تیری راہ میں برباد ہے

میں نے مانا موردِ آزارِ پیہم ہو گیا
یہ شرف کیا کم ہے میرا دل تمھاری یاد ہے

وقت کی پابند ٹھہری ہر صدائے عشق بھی
رنج میں فریاد راحت میں مبارک باد ہے

اے دلِ ناکام حسرت شکر کر شکوہ نہ کر
خیر جو کچھ ہوگا آئندہ وہ دیکھا جائے گا
تو تمھاری دھن میں اب اپنا بھی دھیان آتا نہیں
مسکرانا آپ کا میرے بیانِ شوق پر
یہ سمجھتے تھے کہ مدت کر عشق میں پائیں گے چین
دیکھتا ہوں سب کو میں حسرت سے کیا کیا بار بار
ہم صفیرانِ چمن کو خود بتا دے گا چمن
وہ یہ فرماتے ہیں جھنجھلا کر مٹا دیں گے تجھے
یاس و غم نے کھینچ دی تصویرِ عشق کوہ کن
برق۔ باراں۔ باغباں۔ صیاد۔ یہ سب بے قصور

جو محبت میں ہو وہ بے داد کب بے داد ہے
اب تو ہم ہیں اور دل ہے اور تیری یاد ہے
اللہ اللہ کیا ہماری بھول ہے کیا یاد ہے
یہ نہیں معلوم ہوتا داد یا بے داد ہے
ہو گئے ہم خاک تو اب خاک بھی برباد ہے
اک سوا میرے زمانہ خوش ہے دنیا شاد ہے
کیا قفس کیا آشیاں کیا صید کیا صیاد ہے
دست بستہ میں یہ کہتا ہوں بجا ارشاد ہے
(ی) بدل کر (ہ) سے خود فریاد بھی فرہاد ہے
آشیاں میرا ہوا کے شوق میں برباد ہے

لو تیخ تکلیفیں اٹھا کر سب نے عزت دی مجھے
اِس کرم سے میں بھی خوش ہوں دل بھی میرا شاد ہے

طبع زاد ۱۰ ر جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

اور نہ ہم نے کچھ بھی جانا لیکن اتنا جان گئے
بھیس ہزاروں شکلیں لاکھوں جلووں پہ قربان گئے
اللہ اللہ اُن کا جلوہ ہم جلوے کو مان گئے
نکلے گی اب حسرت دل کی آئیں گے وہ ملنے کو
حسن و ادا نے دنیا بھر میں عشق کی بجلی دوڑا دی
دھوکا دینا شیوہ ٹھہرا خود کامی سے کام رہا
خون ہمارے دل میں ہوتا تو رہتے وہ ناوک بھی
عشق و وفا کی رسموں سے ناواقف تھے کچھ بن پڑی
دونوں کا اوسط تھا برابر حال ہمیشہ یوں ہی رہا
دل بھی لگایا غم بھی اٹھایا آہ بھی کی فریاد بھی کی
دل کے لگانے کا یہ نتیجہ نکلا اتنی مدت میں
تیغ نگاہِ ناز و ادا نے سب کی خبر کی چل پھر کر
تابِ نظر کا چرچا کیسا شوق تکلم بھی نہ رہا
ہے یہ تمھاری روز کی عادت مشکل ہے چھٹنا اس کا

ج

دنیا میں نادان آئے نادان رہے نادان گئے
اُس نے بہت اپنے کو چھپایا لیکن ہم پہچان گئے
دیکھیں تو کیا حال ہوا اپنا بے دیکھے قربان گئے
کیا کہنا میرے کہنے کا میرا کہنا مان گئے
دیر و حرم کے رہنے والے سب تیرے قربان گئے
دل لینے کو آئے تھے وہ لے کر میری جان گئے
گھر میں نہ جب کھانے کو ملا کچھ سمجھا کر مہمان گئے
دل جو گیا تو سیکھ گئے ہم جان گئی تو جان گئے
کچھ پیکان جگر میں آئے دل سے کچھ ارمان گئے
جتنے صنم تھے الفت کے ہم سب کو گردان گئے
آپ کو میں پہچان گیا اور آپ مجھے پہچان گئے
جتنے تھے مقتل میں حاضر اس کا تو ہاں مان گئے
طور پہ ایسی بجلی چمکی موسیٰ کے اوسان گئے
صبح ہوئی گھر واپس آئے شام ہوئی مہمان گئے

ظلم نہ کرتے آہ نہ کرتا بات بڑھانے ہی سے بڑھی ۔۔۔ خود بھی تھے وہ جرم و خطا میں اور مجھے بھی سان گئے
موت کی دہشت ہر لحظہ تھی جینے میں کچھ لطف نہ تھا ۔۔۔ خاک سے پیدا ہونے والے خاک جہاں کی چھان گئے

اور کبھی گرجا اور کبھی برسا دونے کی کچھ قدر نہ کی
نوح کسی ظالم کے آگے لے کر کیوں طوفان گئے

لباسِ برق میں کالی گھٹا سے کھیلنے والے

مشاعرۂ رسالہ کلیم الہ آباد

سمجھتے تھے مذاق اُن کی ادا سے کھیلنے والے ۔۔۔ ج ۔۔۔ بالآخر جان پر کھیلے قضا سے کھیلنے والے
مرے آ گئے مری ہی آہ بے تاثیر کا چرچا ۔۔۔ ہوا مجھ کو بتاتے ہیں ہوا سے کھیلنے والے
ہزاروں مر گئے ناکامیِ قسمت کو رو رو کر ۔۔۔ بہت کم ہیں حصولِ مدعا سے کھیلنے والے
منائیں گے کہاں تک خیر اپنی بزمِ قاتل میں ۔۔۔ ادا پر رنجھنے والے قضا سے کھیلنے والے
پریشانی میں بھی پھنس کر پریشانی نہیں ہوتی ۔۔۔ محبت کے بلاکش ہیں بلا سے کھیلنے والے
کسی دن آپ مٹ جائیں گے وہ کوئے محبت میں ۔۔۔ جو رہ رو ہیں تمہارے نقشِ پا سے کھیلنے والے
بساطِ عشق پر ایسا نظر کوئی نہیں آتا ۔۔۔ کہاں ہیں جان کی بازی قضا سے کھیلنے والے
دلِ پرخوں کو دیکھیں اور میری آہ کو جانچیں ۔۔۔ حنا کے روندنے والے صبا سے کھیلنے والے
بٹھا لوں میں سر آنکھوں پر تجھے رکھ لوں کلیجے میں ۔۔۔ ادھر آ اے دلِ دردآشنا سے کھیلنے والے
نہ کوئی ہے نہ کوئی تھا ہمیں ہم تھے ہمیں ہم ہیں ۔۔۔ جفا کے جھیلنے والے وفا سے کھیلنے والے
رہا ارمان دل کا دل میں غش کھا کر گرے موسیٰ ۔۔۔ بڑے آئے تجلّی خدا سے کھیلنے والے
ابھی میں ابتدائے عشق میں کچھ کہہ نہیں سکتا ۔۔۔ کھلائیں کھیل کیا مجھ کو جفا سے کھیلنے والے
ریاضِ دہر میں یوں ہم کھلے ہیں جیسے گل تر ہیں ۔۔۔ چمن میں اپنی ہی نشو و نما سے کھیلنے والے
یہ کیسا صبح کا اقرار کیسا شام کا وعدہ ۔۔۔ بناتے رات دن مکر و دغا سے کھیلنے والے
ابھی اے خونِ دل شاید نہیں معلوم قاتل کو ۔۔۔ کہ ہولی ہم بھی ہیں تیغِ ادا سے کھیلنے والے
ذرا دیکھیں نکل کر اپنے جاں بازِ محبت کو ۔۔۔ حریمِ حسن میں ناز و ادا سے کھیلنے والے

جنابِ نوح کا اسمِ گرامی تو سنا ہوگا
وہی طوفانِ امواجِ بلا سے کھیلنے والے

بتبدیلِ قافیہ: استمبر ۱۹۳۶ء

ہم اُن کے عشق میں چپ چاپ ہیں غم جھیلنے والے ۔۔۔ ج ۔۔۔ نہ منہ سے بولنے والے نہ سر سے کھیلنے والے
یہی عشق و وفا میں جان پر ہیں کھیلنے والے ۔۔۔ قیامت تک رہیں خوش آپ کے غم جھیلنے والے

دلِ وارفتۂ الفت پہ آزار و ستم کیوں ہوں
یہ چھیڑ اچھی نہیں اے اونگھتے کو ٹھیلنے والے

فقط دو چار اجزا اور اُن کی بھی حقیقت کیا
کھلونا ہی تو ہے دل توڑ ڈالیں کھیلنے والے

جو یہ سچ ہے کہ دنیا ایک صورت پر نہیں رہتی
کبھی راحت اٹھائیں گے مصیبت جھیلنے والے

خدا جانے پڑے اب جیت کہ پٹ یا نسہ محبت کا
ہم اُن سے شرط بد کر ہیں یہ بازی کھیلنے والے

ستم بھی تم کرو آزار بھی دو غم بھی پہنچاؤ
رہے زندہ تو سب کچھ جھیل ہیں گے جھیلنے والے

سنا کرتا ہوں اکثر تذکرہ میں عشق بازی کا
کبھی یہ کھیل مجھ سے کھیل تو اے کھیلنے والے

تم اپنا شیوۂ ظلم و ستم بدلو تو کیوں بدلو
مصیبت جھیل ڈالیں گے مصیبت جھیلنے والے

کسی کو ورطۂ طوفانِ غم سے نوح کیا مطلب
ہمیں ہیں بحرِ بے ساحل میں ایذا جھیلنے والے

طبع زاد ۲۷ر ستمبر ۱۹۳۶ء

ج

مری اک اک گھڑی اب موردِ غم ہوتی جاتی ہے
چراغِ زندگی کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے

نگاہِ التفات اُن کی اِدھر کم ہوتی جاتی ہے
مگر میری طرف سے چھیڑ ہر دم ہوتی جاتی ہے

ہم اُن سے کیوں کہیں آزار دینا ملتوی کر دو
طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے

وہ شاید روئے روشن سے نقاب اپنی اٹھائیں گے
بصارت طالبِ دیدار کی کم ہوتی جاتی ہے

جفائے یار کے شکووں سے کیا حاصل دلِ مضطر
یہ ہر دم ہوتی جائے گی یہ پیہم ہوتی جاتی ہے

ہزار افسوس ایسے انقلاب انگیز عالم پر
مسرت عید کی وقفِ محرم ہوتی جاتی ہے

نچوڑا تک نہیں رندوں نے اپنے دامنِ تر کو
ابھی سے سرد کیوں نارِ جہنم ہوتی جاتی ہے

سحر تک زندہ رہنے کی توقع میں نہیں کرتا
یہ کیا صورت مری شامِ شبِ غم ہوتی جاتی ہے

کسی کے ظلم اب حد سے زیادہ ہوتے جاتے ہیں
ہماری زیست کی مدت بہت کم ہوتی جاتی ہے

عنادل کا کوئی آنسو شرف یہ پا نہیں سکتا
گلوں کے دامنوں میں جذب شبنم ہوتی جاتی ہے

شہیدِ آرزو نے جان دے کر یہ صلہ پایا
ابھی تک اُن کے گھر میں مجلسِ غم ہوتی جاتی ہے

اثر زاہد کی چشمِ بد کا دیکھا تو نے اے ساقی
ہماری بادہ خواری کس قدر کم ہوتی جاتی ہے

لگاؤں کس سے دل ایسے میں حسرت ہیں کروں کس کی
مری ہر سانس پر تجدیدِ عالم ہوتی جاتی ہے

خدا جانے منایا سوگ کس نے اہلِ الفت کا
کہ اک دنیا سراسر بزمِ ماتم ہوتی جاتی ہے

حجابات اُن کے رخ سے دم بدم اب اٹھتے جاتے ہیں
تجلی مہر و مہ کی خود بخود کم ہوتی جاتی ہے

چمن کا غنچہ غنچہ ہنس دیا بلبل کے رونے پر
وفورِ شرم سے آب آب شبنم ہوتی جاتی ہے

ڈبویا تھا کبھی اے نوح جس نے ساری دنیا کو

اب اُس طوفان کی شدت بہت کم ہوتی جاتی ہے

طبع زاد ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء

ج

وہ نزاکت کی جان ہو جائے — اور بھی دھان پان ہو جائے

آپ رکھ دیجئے قدم جس پر — وہ زمین آسمان ہو جائے

پوچھتا ہے وہ درد و غم کا حال — دل میں پیدا زبان ہو جائے

مجھ کو ساقی پلا شراب ایسی — پیتے ہی دل جوان ہو جائے

غیر ممکن ہے داورِ محشر — ختم میرا بیان ہو جائے

وادیٔ عشق اور پائے طلب — دور کیوں کر تکان ہو جائے

سیکھ لے آپ سے جو طرزِ ستم — آسمان آسمان ہو جائے

کیوں مرا قتل ٹالئے کل پر — آج ہی امتحان ہو جائے

لطف تو جب ہے عشق کا قصہ — حسن کی داستان ہو جائے

بارِ غم کیا اُٹھا سکے کوئی — تیر جھک کر کمان ہو جائے

دل سے نکلے وہ بد دعا دے کر — منہدم یہ مکان ہو جائے

اے ترحم پسند و خلق نواز — میری جانب بھی دھیان ہو جائے

آپ ہیں چرخ ہے مقدر ہے — کوئی تو مہربان ہو جائے

میرے پہلو میں وہ رہے ہر دم — دل بنے اور جان ہو جائے

جو کہوں میں وہی کہے وہ بھی — اِس طرح ہم زبان ہو جائے

تم جو کہہ دو تو پھر اُٹھے طوفان
نوحؔ کا امتحان ہو جائے

اے عندلیب رخصتِ عہدِ بہار ہے

۲۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو اس طرح پر سلطان پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں مشاعرہ ہوا مہمانوں کی خاطر مدارات بڑے پیمانے پر ہوئی مقامی شعرا کے علاوہ فیض آباد پرتاب گڑھ رائے بریلی کے لوگ الہ آباد سے بسملؔ صاحب زاہدؔ صاحب جوہرؔ صاحب شاطرؔ صاحب جناب مرزا احمد جان صاحب وغیرہ شریک تھے جناب ہادیؔ صاحب بہادر کلکٹر نے بھی اپنا کلام سنایا مشاعرہ آٹھ بجے رات سے شروع ہو کر چار بجے صبح کو بحسن و خوبی ختم ہوا

ج

کیا لاجواب حسنِ دلِ داغ دار ہے — یہ ہے بہارِ باغ یہ باغِ بہار ہے

تیرِ نظر کے شوق میں دل بے قرار ہے — دیکھیں نہ دیکھیں اب یہ اُنھیں اختیار ہے

پھیلا ہوا زمیں سے فلک تک غبار ہے — جو ذرہ جس جگہ ہے وہ میرا مزار ہے

کیا کام اُس کو پرسشِ جرم و قصور سے
کچھ اور چیز رحمتِ پروردگار ہے

کیوں بے کسی مری نہیں دیتی کوئی جواب
اک شخص پوچھتا ہے یہ کس کا مزار ہے

گل ہائے داغِ عشق میں وہ تازگی نہیں
اپنی بہار اب گئی گذری بہار ہے

ساقی تری نگاہ کی تاثیر کیا ہوئی
ہم جس کو دیکھتے ہیں وہ پرہیزگار ہے

پاسِ ادب سے کام لے حد سے سوا نہ بڑھ
اے دل بہوش باش کہ یہ کوئے یار ہے

آئے وہ فاتحہ کے لئے بے نقاب آج
ہر ذرّہ مزار چراغِ مزار ہے

جس پر کسی عزیز کی چشمِ کرم نہ ہو
اپنے وطن میں بھی وہ غریب الدیار ہے

کیا آفتابِ حشر کی جانب نظر اُٹھے
آنکھوں کے سامنے رخِ پر نورِ یار ہے

اے خوش خرام قبر کو پامال اب نہ کر
یہ اک مٹی سی مری یادگار ہے

اے خضر کیا کروں ہوسِ عمرِ جاوداں
دو دن کی زندگی بھی مجھے ناگوار ہے

آزارِ بعدِ عیش کی تشریح کیا کروں
وہ تھا سرور اور یہ اُس کا خمار ہے

دنیا سے سالکانِ محبت جو اُٹھ گئے
چھایا ہوا اُفق پہ اُنھیں کا غبار ہے

جو کچھ ہوئی وہ کوچۂ محبوب میں ہوئی
ذلت بھی میری باعثِ عز و وقار ہے

اچھا ہوا کہ دفن ترے گھر میں ہم ہوئے
جو سنگِ در تھا اب وہی سنگِ مزار ہے

اے عندلیب قدرِ دلِ داغدار کر
یہ وہ چمن ہے جس کی خزاں بھی بہار ہے

میرے سوا تھے اور بہت رہروانِ عشق
جو خاک میں ملا یہ وہی خاکسار ہے

اے نوح اِس کشاکشِ آزار کو نہ پوچھ
طوفانِ غم ہے اور دلِ بے قرار ہے

طبع زاد ۲۱ اپریل ۱۹۳۷ء

اُدھر جلوۂ حسن کا دور تک ہے
ادھر پہلی زمیں ہے سنہرا فلک ہے

بہت کچھ ہمیں حور و غلماں میں شک ہے
نظر کی رسائی فقط آپ تک ہے

جو اقرار اُن کا ہے وہ بے دھڑک ہے
اسی وجہ سے تو مجھے اور شک ہے

خدا جانے کیا واقعہ پیش آئے
مجھے ہے جنوں اور ناصح کو جھک ہے

گری تھی کبھی طور کے پھونکنے کو
مگر ذکر اُس برق کا آج تک ہے

جہاں تک چلے جاؤ دشتِ جنوں میں
نہیں ہی زمیں ہے فلک ہی فلک ہے

ستم ڈھا گیا اُن کا خارِ تمنا
مرے دل کی ایک ایک رگ میں کھٹک ہے

رخِ مہر و مہ میں کوئی کچھ بتائے
مگر ہم کہیں گے انھیں کی چمک ہے

فغاں کیا کروں بے وفاؤں کے حق میں
سمجھتا ہوں میرے بھی سر پر فلک ہے

مزا خاک آئے جراحت کا مجھ کو
نمک زخمِ دل میں بقدرِ نمک ہے

یقیں ہے مرے دل کو اُن کے ستم پر
مگر وہ نوازش کریں اس میں شک ہے

نہ آنکھیں لڑائیں نہ وہ دل ملائیں
خدا جانے کیوں مجھ سے اتنی جھجک ہے

جو سوزِ محبت سے ابھرے ہیں دل میں
اُنھیں آبلوں میں غضب کی تپک ہے

زمانے میں کیا مطمئن رہ سکیں ہم
کبھی کوئی زک ہے کبھی کوئی رشک ہے

ہمارے ستانے کو اس رہ گذر میں
فلک تو فلک ہے زمیں بھی فلک ہے

اٹھائے گا پھر کوئی طوفان کیوں کر
کہ یہ معجزہ نوح کا نوح تک ہے

عاشق و معشوق میں اک راز ہے

۵؍ جون ۱۹۳۷ء کو دارا گنج الہ آباد میں اس طرح پر مشاعرہ ہوا قریب قریب مقامی شعراء سب موجود تھے اچھی اچھی غزلیں سنیں

ج

ہر صدائے عشق میں اک راز ہے
نالۂ دل غیب کی آواز ہے

حسنِ دلکش کا عجب انداز ہے
یہ کبھی جادو کبھی اعجاز ہے

اب مریضِ غم کا یہ انداز ہے
سانس اُکھڑی ہے دبی آواز ہے

آپ کی ایک ایک ادا ممتاز ہے
دوسروں کا دوسرا انداز ہے

حسن کے جلووں کو اپنے دل میں دیکھ
لن ترانی دور کی آواز ہے

اللہ اللہ وحدت و کثرت کا ربط
مختلف نغمے ہیں ایک آواز ہے

کچھ نہ کہنا بھی کسی کے سامنے
اک طرح کا انکشافِ راز ہے

دل نے پہنچایا وہاں مجھ کو جہاں
طورِ سینا فرشِ پا انداز ہے

شورِ محشر میں دل آویزی کہاں
سب کی بھرائی ہوئی آواز ہے

معنی و مطلب سے کچھ مطلب نہیں
کیا تری تقریر کا انداز ہے

کیوں نہ تڑپیں وہ مری فریاد پر
درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے

وسعتِ تنظیمِ قدرت دیکھنا
ایک دل میں دو جہاں کا راز ہے

اُن سے مل کر میں اُنھیں میں کھو گیا
اور جو کچھ ہے وہ آگے راز ہے

متحد کیوں کر ہوں دو شخصوں کے دل
مختلف ایک ایک کی آواز ہے

عشق نے دل کو پکارا اس طرح
میں یہ سمجھا آپ کی آواز ہے

پوچھنے والے ہمارے دل سے پوچھ
کیا ادا کیا ناز کیا انداز ہے

عشق میں کی جذبے نے تکمیلِ حسن
وہ لب و لہجہ بدل ڈالیں تو کیا

منہ ہمارا ہے تری آواز ہے
میری پہچانی ہوئی آواز ہے

چھیل کر طوفانِ بحرِ غم بنیں
نوح کے اشکوں میں یہ اعجاز ہے

مری نظر میں ہیں جلوے کسی زمانے کے

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو بابو گنج بھدری ضلع پرتاب گڈھ میں جناب رائے بجرنگ بہادر نے اعلیٰ پیمانے پر مشاعرہ کیا مشاہیر شعرا میں سے حضرت بسمل دہلوی جناب احسن صاحب مارہروی یوسف صاحب علی گڑھی شفق صاحب عمادپوری مولانا کیفی صاحب چریاکوٹی ریاض صاحب جیوری وفا صاحب ڈبائیوی انور صاحب شعلہ صاحب دہلوی صوفی صاحب میرٹھی زیبا صاحب ناروی قدیر صاحب وغیرہ لکھنوی عزیز صاحب سلونی علاوہ ان کے قریب قریب تمام شعرائے الٰہ آباد شریک ہوئے اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہو کر بخیر و خوبی چھ بجے صبح کو ختم ہوا

ج

مجھے اکھلتے ہیں یوں پارسا زمانے کے
کہ جیسے ہوں وہی مالک شراب خانے کے

کہیں فسوں کے کرشمے کہیں فسانے کے
تصرفاتِ خصوصی ہیں یہ زمانے کے

جو سانحاتِ محبت تھے ہر زمانے کے
حروفِ غم وہ بنے سب مرے فسانے کے

وفا سے کام نہیں ہے حسیں زمانے کے
ڈھلے ہوئے ہیں یہ سب ایک کارخانے کے

نئے طریق سے ہر شخص اس کو کہتا ہے
بہت سے ہو گئے حصے مرے فسانے کے

طبیعت آئی بلا آئی موت بھی آئی
یہ واقعات ہیں سب ایک ہی زمانے کے

جو رُت پھرے تو ہماری نظر میں کیوں نہ پھریں
بھرے بھرے خم و ساغر شراب خانے کے

کسی کا عشق چھپائے سے چھپ نہیں سکتا
پکار اٹھتے ہیں الفاظ اس فسانے کے

وہ روزِ عید ہے روزِ جزا اسے نہ کہو
ملیں گے حشر میں بچھڑے ہوئے زمانے کے

جہاں جہاں ہوں طلب گارِ حق یہاں آئیں
کہ قفل کھل گئے اب سرمدی خزانے کے

رہیں گے ہم ہیں تو یہ بھی ہم نے جان لیا
وہی قدیم دعاگو شراب خانے کے

کہاں سے آ گئے کیوں کر یہ اب اس کو نہ پوچھ
مرے فسانے میں فقرے ترے فسانے کے

ہزار بھیس ہیں کس میں تجھے تلاش کروں
بتا یہ اے مرے بہروپئے زمانے کے

وہ آئے میری طرف چاند کس طرف نکلا
بہت دنوں میں پھرے دن غریب خانے کے

دکھا دے اے قدر انداز دل کو یہ بھی کمال
چلے نہ تیر پہ پرخچے اڑیں نشانے کے

جدا جدا وہ ہوئے یاد کرنے والوں میں
الگ الگ جو ورق تھے مرے فسانے کے

چلے ہیں جانبِ مےخانہ اس امید میں ہم
کہ باکمال ملیں گے وہیں زمانے کے

طواف کرنے کو قبلے سے ابر اٹھتا ہے
یہ مرتبے ہیں ہمارے شراب خانے کے

وہ بھر بہائیں مرے دل میں حسرتوں کا لہو
نقوش ہو گئے دھندلے نگار خانے کے

کبھی یہ کہتے ہیں ڈھائے ہیں ہم نے ظلم و ستم
کبھی وہ کہتے ہیں کوتک ہیں یہ زمانے کے

سمجھ میں جب نہیں آتے تو ہم سمجھتے ہیں
شرابیوں سے مسائل شراب خانے کے

سنے جو عرش نشیں تو کہوں بھی کس سے کہوں
بلند تر ہیں مراتب مرے فسانے کے

بیانِ کشتی و طوفاں کا مشغلہ دن رات
جنابِ نوحؔ ہیں شاید اسی زمانے کے

طبع زاد ۵ / نومبر ۱۹۳۶ء

پھر نکلی خزاں پھر آئی بہار اب گلشن میں خوش حالی ہے
آراستہ پتی پتی ہے پیراستہ ڈالی ڈالی ہے

ہیں غم کا فسانہ کس سے کہوں غم خواروں سے گھر خالی ہے
کون آنے جانے والا ہے سانس آنے جانے والی ہے

رفتار تمھاری حشر نما رفتار کے فتنے قہر خدا
کہتے ہیں قیامت سب جس کو وہ بھی میری دیکھی بھالی ہے

تکلیف سوا راحت کم تر مرنا آساں جینا دوبھر
بے درد بہت ہیں دنیا میں ہم درد سے دنیا خالی ہے

ساقی کی ادائیں مستانی رندوں کی جوانی دیوانی
یہ عیشِ شراب توبہ توبہ توبہ کہیں ٹوٹنے والی ہے

دل ہوتا تو قرباں کرتے یعنی نذرِ مہماں کرتے
اس وقت یہاں وہ آئے ہیں جب ہاتھ ہمارا خالی ہے

ان کا کہہ دینا عشق برا میرا کہہ دینا عشق اچھا
کچھ اس پہ حجت ہو بھی چکی کچھ اور ابھی ہونے والی ہے

احباب تو کہتے تھے اکثر لیکن یہ کھلا تم سے مل کر
معشوقوں کی خوش خلقی پر عشاق کی خوش اقبالی ہے

کیوں کر کوئی مسرور رہے کیا دل کی کلی کم بخت کھلے
ہر ڈالی نے بنیاد ستم گل زارِ جہاں میں ڈالی ہے

ہر لحظہ ذرا مٹ جانے کا آساں نہیں راہِ عشق و وفا
کیا نقشِ قدم بن کر ابھروں انجام مرا پامالی ہے

اندیشۂ غم کرتا بھی نہیں دل ڈوبنے سے ڈرتا بھی نہیں
ہیں پست مقدر ہوں تو ہوں لیکن مری ہمت عالی ہے

وہ اگلا اصلی شوق کہاں وہ پہلا سچا ذوق کہاں
اب چاہ نہیں اک دھوکا ہے اب عشق نہیں نقالی ہے

شاخیں پھوٹیں سبزہ بھی اگا ہے جوشِ جنوں گل بھی کھلا
جس سمت نگاہیں اٹھتی ہیں ہریالی ہی ہریالی ہے

گردوں کی جفا قسمت کا ستم آزار کہاں تک جھیلیں ہم
ارماں تو لاکھوں ہیں دل میں آغوشِ تمنا خالی ہے

اے نوحؔ دمِ طوفانِ سخن جا پہنچیں پرکھیں یارانِ سخن
میں بھی ہوں مقلد دلی کا میری بھی زباں ٹکسالی ہے

طبع زاد ۶ / دسمبر ۱۹۳۶ء

عدم سے ہاتھ خالی آئے خالی ہاتھ جائیں گے
فقط اچھے برے اعمال اپنے ساتھ جائیں گے

خدا کے سامنے دونوں کے دونوں ساتھ جائیں گے
وہاں بھی آپ ہم مل کر ملاتے ہاتھ جائیں گے

زمانے کی رفاقت منحصر ٹھہری زمانے تک
نہ مرقد مرے ساتھی نہ میرے ساتھ جائیں گے

خدا جانے پہنچ کر قبر میں پھر حشر کیا ہوگا
مگر ہم اپنے مدفن تک تو ہاتھوں ہاتھ جائیں گے

دمِ رخصت بندھی ہے ہچکی یہ کیسی حضرتِ دل کو
وہ لے جائیں نہ لے جائیں ہم ان کے ساتھ جائیں گے

صبا کو آستانِ یار پر کوئی نہ روکے گا
خطوطِ شوق میرے سب اسی کے ہاتھ جائیں گے

رہِ عشق و وفا میں خضر کو پہنچے سلام اپنا
جہاں لے جائے گا دل ہم تو دل کے ساتھ جائیں گے

زمانے میں یہی دو کام تھے اوّل سے آخر تک
کہ مٹھی باندھے آئے اور کھلے ہاتھ جائیں گے

نہیں آسان ارمانوں کا فوراً ہی مٹا دینا
یہ دل کے ساتھ آئے ہیں یہ دم کے ساتھ جائیں گے

فنا کے بعد دنیا میں دوبارہ کون آئے گا
ہم اُن سے کیا زمانے سے اٹھا کر ہاتھ جائیں گے

علاوہ اشکِ باری کے انھیں کیا اور آتا ہے
وہاں طوفان لے کر نوح اپنے ساتھ جائیں گے

جہاں کا ذرّہ ذرّہ آج کل رشکِ گلستاں ہے

۱۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو اس طرح پر گولڈن جوبلی یونیورسٹی میور کالج الہ آباد میں مشاعرہ ہوا مقامی شعرا کے علاوہ تاباں صاحب بدایونی ناقد صاحب دہلوی جناب احسن صاحب مارہروی جناب گلشن صاحب رئیس لاہور مولانا شفق صاحب عماد پوری وغیرہ شریک تھے ڈاکٹر لیڈی سروجنی نائیڈو صاحبہ نے بھی ایک انگریزی کی نظم پڑھی مشاعرہ دو بجے دن سے شروع ہو کر دس بجے رات کو ختم ہوا پھر دوسرا مشاعرہ اسی زمین پر پٹنہ میں سید حامد حسین صاحب نے بھی کیا۔ یہ بھی خوب رہا۔

ج

جنوں مغموم سودا شرمگیں وحشت پشیماں ہے
نہیں معلوم کس کے ہاتھ میں کس کا گریباں ہے

ہمارے خانۂ دل میں ہجومِ یاس و حرماں ہے
اگر سمجھو تو ہے آباد اگر دیکھو تو ویراں ہے

طریقِ زندگی میں کون غمخوارِ دل و جاں ہے
کہ مجھ سے دو قدم آگے مری عمرِ گریزاں ہے

نہ حسرت جوشِ وحشت کی نہ فصلِ گل کا ارماں ہے
جو خود ہی چاک ہو جاتا ہے وہ میرا گریباں ہے

یہ فرضی رکھ لیے دو نام دستورِ محبت نے
حقیقت میں مرا دل ہے نہ ارماں ہے نہ پیکاں ہے

مسافر شکر کر طے ہو گئیں راہیں مصیبت کی
بس اب کیا ہے چلا چل دو قدم پر بزمِ جاناں ہے

محبت نے سجایا یوں نمائش گاہِ وحشت کو
کہیں ہے قیس کا دامن کہیں میرا گریباں ہے

کھلائے پھول اتنے کثرتِ داغِ محبت نے
مرا دل ہے گلستاں میں مرے دل میں گلستاں ہے

سناؤں حالِ بربادی کسے دنیائے وحشت میں
یہاں بس میں ہی میں ہوں یا بیاباں ہی بیاباں ہے

خدا کا نام لے کر میں اب اُن سے عشق کرتا ہوں
کوئی کہتا ہے مشکل ہے کوئی کہتا ہے آساں ہے

چلو یوں ہی سہی مجھ پر جفائیں تم کیے جاؤ
اگر جینا نہیں آساں مر جانا تو آساں ہے

جنوں کو بیچ میں اک حدِ فاصل میں سمجھتا ہوں
اُدھر ہے چاکِ دامن اور اِدھر چاکِ گریباں ہے

تمھیں تو اتحادِ ناوک و دل کی خبر ہوگی
بتاؤ کون ان میں میزباں ہے کون مہماں ہے

دل و جاں بیچ کر شاید متاعِ عشق ہاتھ آئے
اگر اس مول پر یہ مال مل جائے تو ارزاں ہے

جہاں تک ہاتھ پھیلاؤ وہاں تک پھیلتا جائے
نہیں معلوم کتنی وسعتِ چاکِ گریباں ہے

نظر محتاط ہو دل مطمئن ہو جذب صادق ہو
یہی عرفاں ہے میری رائے میں کیا او رعرفاں ہے

خدا جانے جنوں میں پہلے کس پہ آفتیں آئیں
کہ دامن ہاتھ بھر ہے اور مٹھی بھر گریباں ہے

زمانہ ہو گیا اب اس گئے گذرے زمانے کو
فقط اک نوح باقی ہیں نہ کشتی ہے نہ طوفاں ہے

طبع زاد یکم جنوری ۱۹۳۶ء

ج

کسی کے رازِ الفت کو عیاں ہم کر نہیں سکتے
رہے یا دم نکل جائے فغاں ہم کر نہیں سکتے

گلہ ہم کر نہیں سکتے فغاں ہم کر نہیں سکتے
غرض اپنے کو رسوائے جہاں ہم کر نہیں سکتے

زمین و آسماں سے واسطہ ہر وقت رہتا ہے
مگر شرحِ زمین و آسماں ہم کر نہیں سکتے

جو گذرے غم انھیں تم مختصر لفظوں ہی میں سن لو
بڑھا کر واقعہ کو داستاں ہم کر نہیں سکتے

کبھی آندھی اڑا دے گی کبھی بجلی جلائے گی
قفس میں انتظامِ آشیاں ہم کر نہیں سکتے

وہ مختاری کہ ہے دونوں جہاں پر اقتدار اپنا
یہ ناچاری کہ عذرِ این و آں ہم کر نہیں سکتے

رہِ الفت میں اٹھنا بیٹھنا چل کر قیامت ہے
کبھی تقلیدِ گردِ کارواں ہم کر نہیں سکتے

وہ عالم حسنِ صورت کا یہ صورت رازِ الفت کی
نہاں تو کر نہیں سکتا عیاں ہم کر نہیں سکتے

یہاں تک بدگمانی کا اثر پھیلا محبت میں
خود اپنے دل کو اپنا رازداں ہم کر نہیں سکتے

عزیز و دوست پوچھیں آپ پوچھیں چارہ گر پوچھیں
جو دل کا حال ہے اس کو بیاں ہم کر نہیں سکتے

اٹھا رکھا ہے اک اک پارسا نے آسماں سر پر
حرم میں بیٹھ کر یادِ بتاں ہم کر نہیں سکتے

ہزاروں مرنے والوں کے ہزاروں غم اٹھائے ہیں
کریں بھی تو شمارِ رفتگاں ہم کر نہیں سکتے

وفا و عشق میں حد ہو گئی اس پردہ داری کی
تمھارا حال تم سے بھی بیاں ہم کر نہیں سکتے

بظاہر اس طرح لطف و کرم سے کام لیتا ہے
کہ اس پہ ظلم ڈھانے کا گماں ہم کر نہیں سکتے

انھیں کے سر کو اکثر جھکتے دیکھا تیری چوکھٹ پر
جو کہتے تھے سجودِ آستاں ہم کر نہیں سکتے

کسی پر کیوں مریں کیوں غم سہیں کیوں آفتیں جھیلیں
نشاطِ زندگی کو رائیگاں ہم کر نہیں سکتے

جنابِ نوح دل کے واسطے نالے کی حاجت ہے
سفینے سے جدا یہ بادباں ہم کر نہیں سکتے

طبع زاد ۳۰ جنوری ۱۹۳۶ء

ج

اب یہ تاثیر عشق صادق ہے | جو مخالف تھا وہ موافق ہے
شانِ معشوق آنِ عاشق ہے | حسنِ کامل سے عشقِ صادق ہے
کوچۂ یار اور گلشنِ خلد | نقل یہ اصل کے مطابق ہے
ناوک و دل کا راز کھل نہ سکا | کون معشوق کون عاشق ہے
اللہ اللہ کرشمۂ الفت | دل ہی مخلوق دل ہی خالق ہے
مر بھی جاؤں گا خاک بھی ہوں گا | اُن کا ایک ایک حکم ناطق ہے
بلبلِ زار اُڑائے گُل چھرّے | اب چمن کی ہوا موافق ہے
کیوں نہ مرجائیں ہم محبت میں | جان دہی ایک رسم سابق ہے
دیکھئے کیا ہو دیکھنے کا مآل | حسنِ عذرا ہے چشمِ وامق ہے
جان دینے سے یہ ہوا حاصل | ہر جگہ ذکرِ خیرِ عاشق ہے
جو قیامت میں بھی نہ پورا ہو | وہ حسینوں کا عہدِ واثق ہے
عین الف شین قاف دیکھتے ہیں | یوں انھیں جستجوئے عاشق ہے
عشق کے خاص جاں نثاروں میں | قیس ہے کوہکن ہے وامق ہے
غم بھی کھانے کو وہ نہیں دیتے | اب ہمارا خدا ہی رازق ہے
لوگ آکر جہاں میں بھول گئے | یاد کس کو وہ عہدِ سابق ہے
باعثِ مرگ و زیست میرے لئے | شوقِ کامل ہے ذوقِ صادق ہے
میں سمجھتا ہوں لاشریک اس کو | خود ہی معشوق خود ہی عاشق ہے

حضرتِ نوح آپ کا طوفان
فتنۂ حشر کے مطابق ہے

طبع زاد ۱۵؍ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء

ج

رہِ طلب میں بنے وہ نشتر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے
چبھے جو کانٹے قدم قدم پر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے
کہیں نہ تھک کر رُکے کوئی دم طوافِ بزمِ حبیب میں ہم
ملے ہیں دیر و حرم بھی اکثر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے
جو حسرتِ جلوہ تھی کسی کی تو خاک اُڑائی نہ کیوں گلی کی
ہمیں لگانا تھا روز چکر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

اگر بُلاتا بھی اپنے گھر میں تو ہم کو رکھتا نہ وہ نظر میں
بحالِ مضطر بشکلِ ابتر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

ہوئے پریشان سب مسافر نہ نکلی صورت کوئی بالآخر
جو راہ مسدود تھی تو کیوں کر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

نظر تھی گہری کہاں کسی کی یہ راہِ الفت میں کیا خبر تھی
چبھیں گے ناوک چلیں گے خنجر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

وہ عشقِ صادق کی پاک منزل وہ کعبہ و دیر کے مراحل
ملے تھے رستے میں ہم کو دو گھر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

ہجوم تھا مے کدے میں ایسا کہ دور کا انتظام کیسا
جو راہ پاتے تو جام و ساغر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

رہا جو گردش کا ساتھ ہر دم تو کیوں نہ پرکار بن گئے ہم
لگاتے تیری گلی کا چکر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

جو ہم کو منظور تھی حفاظت تو دور رہنے کی تھی ضرورت
ادا سے بچ کر نظر سے چھپ کر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

پھرا کئے آپ رہ گذر میں کبھی نہ ٹھہرے ہمارے گھر میں
کرم یہ کرنا تھا بندہ پرور اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

تلاشِ منزل بُری بلا تھی نہ تھی جو قہر و غضب تو کیا تھی
جگہ جگہ ہم نے کھائی ٹھوکر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

لگا رہے ہیں فضول چکر جھکا ہیں سر اُن کے سنگِ در پہ
ہم آزمائیں کبھی مقدر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

مریضِ الفت کا دم نکلتا نہ کچھ بھی تگ و دو کا زور چلتا
وہ ہاتھ رکھے ہوئے جگر پر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

چُرا ہیں کیوں آپ نے نگاہیں کہ ہو گئیں بند دل کی راہیں
مزا تو جب تھا یہ تیر اکثر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

کہیں ہو آنا کہیں ہو جانا مگر ہے بہتر یہیں جمانا
ہمیں ٹھہرنا تمہارے در پر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

مقامِ قربِ خدا تھا مشکل مگر نہ تھی اُن کو فکرِ منزل
ملے جنھیں نوحؔ سے پیمبر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

طبع زاد ۲۰ ر اگست ۱۹۳۶ء

جہاں لکھا ہوا لفظِ گریباں دیکھ لیتا ہے
وہیں دستِ جنوں بڑھ کر سیاہی پھیر دیتا ہے

کسی قاتل کے خوش کرنے کو اپنا دل جو دیتا ہے
وہ راحت بیچ کر گویا جراحت مول لیتا ہے

زمانہ افترا پردازیوں سے کام لیتا ہے
ذرا سی بات ہوتی ہے بہت سا طول دیتا ہے

جہانِ عشق میں شرطِ وفا کی داد دیتا ہے
جگر جلتا ہے دل حسرت سے ٹھنڈی سانس لیتا ہے

نظر دوڑا رہا ہوں میں نظر آتا نہیں پھر بھی
خدا جانے کہاں سے دل مجھے آواز دیتا ہے

دلِ پرسوز کی آہیں کبھی بڑھنے نہیں دیتیں
دھواں اُٹھ کر مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے

طریقِ عشق میں ہر گام پر وہ ظلم ہوتے ہیں
مرا نقشِ قدم بھی ساتھ میرا چھوڑ دیتا ہے

دلِ مضطر کو اظہارِ وفا کی یہ نئی سوجھی
فغاں کرتا ہے پہلے پھر تمھارا نام لیتا ہے

حقیقت آپ اپنے حسن کی ایک ایک سے پوچھیں
ہمیں کیا جان دیتے ہیں زمانہ جان دیتا ہے

فرشتے حشر تک انجام جس کو دے نہیں سکتے
خدا ہر بندۂ ناچیز سے وہ کام لیتا ہے

چراغِ آرزو سے میں ہمیشہ دور رہتا ہوں
جلاتا ہے جو اس کو یہ اسی کو پھونک دیتا ہے

وفا کیسی جفا کیسی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں
نہ کوئی جان دیتا ہے نہ کوئی جان لیتا ہے

بیانِ درد و غم کی مجھ کو زحمت یوں نہیں ہوتی
وہ میرے دل کا حال اپنے ہی دل سے پوچھ لیتا ہے

یہ دو برعکس باتیں بیشتر اک ساتھ ہوتی ہیں
جسے وہ قول دیتا ہے اُسے دھوکا بھی دیتا ہے

تمھارا خنجرِ خوں خوار چل کر پھر نہیں رُکتا
جو چل جاتا ہے موقع تو یہ ہولی کھیل لیتا ہے

وطن کو یاد کر کے میں بہت روتا ہوں غربت پر
کوئی پردیس میں جب دیس کی دُھن چھیڑ دیتا ہے

مرے گھر تک نہیں آتا نہیں آتا نہیں آتا
بہانہ ڈھونڈنے والا بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے

ادھر بھی تیر سے چھوٹے نگاہِ لطف ساماں ہو
خدا کا واسطہ تجھ کو دلِ ناکام دیتا ہے

ذرا اے لوٹنے والے نظر کر اس جسارت پر
کسی کا دل زبردستی بھی کوئی چھین لیتا ہے

جنابِ نوحؔ دل پر عشق میں کچھ بس نہیں چلتا
سفینہ ڈوب کر طوفانِ غم کا ساتھ دیتا ہے

ہمارے لب پہ کیوں ہر دم تمھارا نام آتا ہے

اس طرح پر گورنمنٹ ہائی اسکول سلطان پور میں ۳ ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو مشاعرہ ۸ بجے رات سے شروع ہو کر ۳ بجے رات کو ختم ہوا مشاہیر شعرا میں سے جناب نجم احسن صاحب پرتاب گڑھی آسی صاحب لکھنوی شوکت تھانوی عزیز

مرزاپوری مولانا شمسی سکندرپوری قدرت الٰہ آبادی عزیز سلونی وغیرہ موجود تھے لیکن بے ترتیبی سے مشاعرہ کامیاب نہیں ہوا اس غزل کے علاوہ میری اور ایک غزل طوفان نوح میں بھی ہے

ج

مرے لب پر بوقتِ شکوہ یہ الزام آتا ہے
کسی کا نام لیتا ہوں انھیں کا نام آتا ہے

وہ فرماتے ہیں مجھ سے کون کس کے کام آتا ہے
رہوں زندہ جو یہ سن کر بھی تو الزام آتا ہے

فغاں کے ساتھ میرے لب پہ اُن کا نام آتا ہے
انھیں بھی وہ نہیں آتا مجھے جو کام آتا ہے

مرا جذبِ سرور انگیز میرے کام آتا ہے
جہاں ہوتا ہوں میں کھنچ کر وہاں تک جام آتا ہے

نمودِ زندگی سے واسطہ کیا وہ ہر فانی کو
رہِ ہستی میں پہلے نیستی کا نام آتا ہے

مری تردامنی پر پارسائی کیوں نہ صدقے ہو
نہا کر بادۂ کوثر سے مجھ تک جام آتا ہے

شبِ فرقت شریکِ سوزِ غم کوئی نہیں ہوتا
جلانے کے لیے مجھ کو چراغِ شام آتا ہے

شریکِ درد و غم کوئی اگر نکلا تو یہ نکلا
کلیجا ہی ہمارے منھ کو صبح و شام آتا ہے

سکوں کا ذکر کیسا شدتِ دردِ محبت میں
کسی کے نام آنے پر ہمارے نام آتا ہے

اگر مانگوں تو مے خانہ مجھے دے دے مرا ساقی
زباں سے کچھ نہ کہنے پر بھی لب تک جام آتا ہے

کلیجا رہ گیا محفوظ دل میں چھپ گیا ناوک
نگاہِ شرمگیں کو بھی ادھورا کام آتا ہے

پتنگے بھی جلیں گے اب شریکِ سوزِ غم ہو کر
مجھے رونے کو بالیں پر چراغِ شام آتا ہے

مہِ خورشید برق و شمع سے کیوں کر نہ جی بہلے
مری آنکھوں کے آگے وہ بدل کر نام آتا ہے

خدا رکھے خدائی خوب رویوں سے نہیں خالی
کسی خود کام ہی پر کیوں دلِ ناکام آتا ہے

یہی میں جانچتا رہتا ہوں ساقی تیری محفل میں
کہاں سے جام چلتا ہے کہاں تک جام آتا ہے

شبِ فرقت عجب کیا اور بڑھ جائے لگی دل کی
تپِ غم گود میں لے کر چراغِ شام آتا ہے

نگاہِ شرمگیں میں شوخیوں کو تم جگہ دے دو
کمی کرتا ہے خنجر میرے سر الزام آتا ہے

سمجھنا تم اگر چاہو گے تو خود ہی سمجھ لو گے
فلک سے پہلے بے دردوں میں کس کس کا نام آتا ہے

یہ کہہ کر جان دے دی ایک جانبازِ محبت نے
وہ خوش قسمت ہے جو اس معرکے میں کام آتا ہے

وقارِ مے کدہ جاتا نہیں دربارِ شاہی تک
یہاں جمشید ہی لے کر خود اپنا جام آتا ہے

جنابِ نوح کیوں طوفان اشکوں کا اٹھاتے ہو
کہ جوششِ غم سے ضبطِ عشق پر الزام آتا ہے

طبع زاد ۲۰ر جنوری ۱۹۳۹ء

ج

اُن کے مکان تک مرے جانے کی دیر ہے
من جائیں گے ذرا سے منانے کی دیر ہے

ملنے میں بس نگاہ ملانے کی دیر ہے
میرے قریب آپ کے آنے کی دیر ہے

عہدِ وفا پر اُن کو پس و پیش اِس قدر / کچھ بھی نہیں زبان ہلانے کی دیر ہے
انصاف ظلم و جور کا محشر پہ اُٹھ رہا / اب صرف میرے حشر اُٹھانے کی دیر ہے
دل آپ کا ملے گا مرے دل سے جلد تر / جو کچھ ہے وہ نگاہ ملانے کی دیر ہے
مر جائیں گے سب اپنے گلے کاٹ کاٹ کر / تلوار ہی کسی کے اُٹھانے کی دیر ہے
مقبول ہو گی عشق میں فوراً دعائے مرگ / بیمارِ غم کو ہاتھ اُٹھانے کی دیر ہے
یہ جان لو کہ خاک ہوئی کائناتِ عشق / نالوں کو دل میں آگ لگانے کی دیر ہے
سب کہہ رہے ہیں روٹھ کر اب کیا منیں گے وہ / میں کہہ رہا ہوں میرے منانے کی دیر ہے
حوریں ملیں گی خلد میں خدمت کے واسطے / اہلِ وفا کو جان سے جانے کی دیر ہے
پھر ہم وہی پھر آپ وہی پھر مزے وہی / پہلی سی رسم و راہ بڑھانے کی دیر ہے
روزِ جزا بھی شکوۂ غم بھول جاؤں گا / ظالم کو میرے سامنے آنے کی دیر ہے
ممکن نہیں کہ آپ کے دل پر اثر نہ ہو / مجھ کو مآلِ عشق سنانے کی دیر ہے

اے نوحؔ غرقِ غم ہو سفینہ نشاط کا
طوفانِ اشکِ غم کو اُٹھانے کی دیر ہے

طبع زادہ، فروری ۱۹۳۹ء

ج

کسی سبب سے طریقِ نظر نہ دیکھ سکے / وہ دیکھتے تھے جدھر ہم اُدھر نہ دیکھ سکے
جنوں میں یادِ وطن کا اثر نہ دیکھ سکے / جو گھر سے نکلے ہم اپنا تو گھر نہ دیکھ سکے
اب اِس سے اور سوا حالِ زار کیا ہوگا / وہ مجھ کو دیکھنے آئے مگر نہ دیکھ سکے
انھیں میں شومیِ قسمت سے ایک ہم بھی تو ہیں / فغاں جو کر کے فغاں کا اثر نہ دیکھ سکے
کسی کا حسن کہاں ہم کہاں نگاہ کہاں / چلے تو دیکھنے کو اور اگر نہ دیکھ سکے
یہ حسنِ یار کی معجز نمائیاں دیکھو / نظر کے سامنے آئے نظر نہ دیکھ سکے
وہ برق کیا جو دوبارہ نہ طور پر چمکی / وہ حسن کیا جسے ہم دیکھ کر نہ دیکھ سکے
بڑھے جو رشک یہاں تک تو لطفِ رشک بھی ہو / جگر کو دل مرے دل کو جگر نہ دیکھ سکے
وہ اِس لحاظ سے ہیں اِس قدر حجابوں میں / کسی طرح بھی کسی کی نظر نہ دیکھ سکے
یہ قہر اور بھی بختِ سیاہ نے ڈھایا / ہم اپنے گھر میں انھیں جلوہ گر نہ دیکھ سکے
ہمارے عیش کے دن جلد ہو گئے رخصت / یہ خواب وہ تھا جسے عمر بھر نہ دیکھ سکے
اُدھر حجاب رہا اور اِدھر لحاظ رہا / ہم اُن کے حسن کو ا مختصر نہ دیکھ سکے
درازیِ شبِ فرقت کا ماحصل تھا یہی / جو شام دیکھ چکے وہ سحر نہ دیکھ سکے

بس اک جھلک تھی جو فوراً ہی ہو گئی غائب وہ اپنی آہ ہے اپنی فغاں ہے اپنی دعا	کلیم بھی تو اُسے طور پر نہ دیکھ سکے نہ سن سکے کبھی جس کا اثر نہ دیکھ سکے

یہ جان لو کہ نہ دیکھا جہان میں کچھ بھی
جناب نوح کا طوفان اگر نہ دیکھ سکے

تم جو آجاؤ تو دنیا مری دنیا ہو جائے

اس طرح پر ۱۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو گوالیار میں دتا صاحب کے اہتمام سے مشاعرہ ہونے والا تھا لیکن ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے سے تصادم ہو جانے پر ملتوی ہو گیا

چاہتا ہوں یہ اثر عشق میں پیدا ہو جائے	ج	جو مجھے دیکھ لے مضطر وہ مجھی سا ہو جائے
میں مروں اور جیوں عشق میں ایسا ہو جائے		اس کے معنی یہ ہیں قاتل ہی مسیحا ہو جائے
بے دلی ہی سے علاجِ دلِ شیدا ہو جائے		جس طرح بھی ہو یہ اچھا غرض اچھا ہو جائے
معترف تو بھی اگر عشق و وفا کا ہو جائے		پھر تو میرا دلِ شیدا دلِ شیدا ہو جائے
کیوں نہ ایسے میں اب اظہارِ تمنا ہو جائے		مجھ سے وہ کہتے ہیں جیسا کہو ویسا ہو جائے
اے فغاں دل سے نکل کر یہ دکھا دے مجھ کو		پہلی دنیا نہ رہے دوسری دنیا ہو جائے
صنعتِ صانعِ قدرت نظر آ جاتی ہے		جو تجھے دیکھ لے قائل وہ خدا کا ہو جائے
وہ مری ماہیتِ دل کا بدلنے والا		چاہتا ہے کہ یہ کعبہ بھی کلیسا ہو جائے
داد خواہی کی تمنا تو رہی ایک طرف		مجھ سے اُن سے نہ کہیں حشر میں جھگڑا ہو جائے
حسن کے ناز جدا عشق کے انداز جدا		ہے یہ مشکل مری دنیا تری دنیا ہو جائے
نشتر و ناوک و خنجر کی تخصیص نہیں		جو مرے دل میں رہے پھر مرے دل کا ہو جائے
دینے والے نے فقط دل کو یہ قدرت دی ہے		ابھی گلشن ابھی صحرا ابھی دریا ہو جائے
کچھ دنوں کے لئے ممکن ہے سنبھلنا لیکن		غیر ممکن ہے کہ بیمارِ غم اچھا ہو جائے
وعدۂ حشر کو اپنے نہ بھلا دے کوئی		ایک بار اور دلِ زار تقاضا ہو جائے
روز کی کشمکشِ غم سے بنے کیوں دم پر		دل ہمارا نہیں ہوتا تو انہیں کا ہو جائے
ہاں ابھی تو مجھے رہتا ہے تصور تیرا		کیا عجب ہے یہی بڑھ کر کبھی سودا ہو جائے
میں جو دنیا میں کسی چیز کی خواہش نہ کروں		خود بخود غیب سے ہر چیز مہیا ہو جائے
وہ طریقہ کوئی خود دار بتا دے مجھ کو		منھ سے میں کچھ نہ کہوں طرح تمنا ہو جائے
اے اجل عشق میں آنا تو اس انداز کے ساتھ		کام بن جائے مرا نام وفا کا ہو جائے
فیصلہ کرنے کی زحمت وہ اٹھائیں یارب		یاس و امید میں ایسا نہ کبھی جھگڑا ہو جائے

خاک اُڑانے کی کمی کیا ترے دیوانوں کو
جس جگہ پانو یہ رکھ دیں وہی صحرا ہو جائے

ٹھہرو ٹھہرو مرے دل میں ابھی ٹھہرو ٹھہرو
دیکھو دیکھو نہ کہیں خونِ تمنا ہو جائے

اِس سبب سے ہے محبت میں خموشی بہتر
شکر لب تک نہ پہنچ کر کہیں شکوا ہو جائے

آپ کے وعدۂ فردا کا بھروسہ کس کو
نہیں معلوم گھڑی بھر میں ابھی کیا ہو جائے

حضرت نوحؑ اٹھا دیں کوئی طوفانِ جدید
ایک بار اور گذشتہ وہ تماشا ہو جائے

طبع زاد ۱۱؍جون ۱۹۳۹ء

ج

ظلم کے سانچے میں عمر تیرے ڈھلتے ہی رہے
ہم تڑپتا ہی یہ تیر چلتے ہی رہے

غم اٹھا کر وادیِ حسرت میں چلتے ہی رہے
ہر قدم پر ہم نیا قالب بدلتے ہی رہے

کیا ٹھکانا عشق کی محفل میں اِس تاثیر کا
حسن کے جلووں سے دل سب کے پگھلتے ہی رہے

گلشنِ عالم کا رنگِ بے ثباتی دیکھ کر
تھے جو پتے وہ کفِ افسوس ملتے ہی رہے

لطف اِس جلدی میں کیا ملتا ہمیں دیدار کا
وہ نکل کر چھپ گئے ارماں نکلتے ہی رہے

انقلابِ دہر نے کب مطمئن ہونے دیا
ہر گھڑی نقشے زمانے کے بدلتے ہی رہے

محفلِ عالم کی رونق میں کمی ممکن نہیں
چل بسے مے خوار لیکن دور چلتے ہی رہے

چارہ سازوں سے بھی درماں کچھ نہ اِن کا ہو سکا
گہرے گہرے زخم دل کے خون اگلتے ہی رہے

وادیِ الفت میں دیکھی ہم نے کب منزل کی شکل
گر پڑے گر کر اُٹھے اُٹھ کر سنبھلتے ہی رہے

بیٹھ کر آغوش میں کس دن بجھائی دل کی آگ
اُن کو جلنا تھا مری صورت سے جلتے ہی رہے

ہیں جنھیں سرمایۂ ضبط و سکوں سمجھا کیا
چٹکیوں سے وہ مرے دل کو مسلتے ہی رہے

آرزوئے قتل میں شامل نہ تھی تاخیرِ شوق
ہم نے یوں ہی جان دے دی وہ سنبھلتے ہی رہے

جب نگاہِ ناز اُٹھی تو حشر برپا ہو گیا
سیکڑوں فتنے تری چتون میں پلتے ہی رہے

شمعِ سوزاں کس لئے کرتی نہ پروانوں کی قدر
یہ پرائی آگ میں کم بخت جلتے ہی رہے

دشتِ غربت میں دیا ہر دم نفس نے خوب ساتھ
یہ بھی چلتا ہی رہا ہم رو بھی چلتے ہی رہے

چشمِ تر سے رازِ جوشِ حسرت و غم کھل گیا
ضبط کرنے پر بھی کچھ آنسو نکلتے ہی رہے

لے کے آئیں غرقاب کرنے کے لئے امواجِ غم
نوحؑ طوفانِ محبت میں سنبھلتے ہی رہے

طبع زاد ۲۰؍جون ۱۹۳۹ء

ج

شرم و شوخی کی کہانی ہائے ہائے
اُف یہ تیری نوجوانی ہائے ہائے

تھا ابھی سب کچھ ابھی کچھ بھی نہ تھا
مٹتے مٹتے قبر بھی اب مٹ گئی
حسن تیرا رنگ میں بھیگا ہوا
کیا مجال اُن سے کہیں اسرارِ دل
دل کے مٹ جانے سے کیسی مٹ گئی
دفعتاً اُن پر طبیعت آ گئی
مر رہے ہیں خضر جینے کے لئے
خاک ہو جائے ابھی جل کر زباں
خوب تر ہے خوب رویوں کا شباب
قتل گاہِ ناز میں دو دو غضب
آپ پر مرتا بھی تھا مرتا بھی ہوں

واقعاتِ عمرِ فانی ہائے ہائے
مرنے والے کی نشانی ہائے ہائے
جوش میں ڈوبی جوانی ہائے ہائے
یہ ہماری بدگمانی ہائے ہائے
حسرتوں کی راج دھانی ہائے ہائے
یہ بلائے ناگہانی ہائے ہائے
ذوقِ عمرِ جاودانی ہائے ہائے
سوزِ الفت کی کہانی ہائے ہائے
اور پھر تیری جوانی ہائے ہائے
سرفروشی سرگرانی ہائے ہائے
ایک جلنے کی کہانی ہائے ہائے

تم نے اس طوفان کو دیکھا نہیں
نوح اشکوں کی روانی ہائے ہائے

بے ہوش ہے بے ہوش ہے ہشیار نہیں ہے

اس طرح پر یونین کلب درا گنج الہ آباد میں ۳ جنوری ۱۹۴۳ء کو مشاعرہ ہوا مقامی شعرا نے اچھی اچھی غزلیں پڑھیں جناب گلشن صاحب رئیس لاہور نے بھی شرکت فرمائی اراکین انجمن بالخصوص منشی اندر نراین صاحب و منشی بھگوتی پرشاد صاحب نے خاطر مدارات کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا مشاعرہ میری صدارت میں ۳ بجے دن سے شروع ہو کر دس بجے رات کو ختم ہوا۔

محکومِ ادا آہِ دلِ زار نہیں ہے
بیکار ہے دل کے لئے باکار نہیں ہے
بخشے گئے سب حشر میں الطافِ خدا سے
اے دردِ جگر اور خدا کے لئے بڑھ جا
میں بارِ غمِ دوست اٹھاؤں گا خوشی سے
لایا مجھے مقتل کی طرف شوقِ شہادت
کیوں کر ترے اقرار کو اقرار سمجھ لوں
مے خانے کے آداب زمانے سے جدا ہیں
جینے کو سمجھتا ہو جو مر جانے سے اچھا

ج

قبضے میں تمھارے یہی تلوار نہیں ہے
وہ تیر جو اس پار سے اس پار نہیں ہے
اب کوئی گنہگار گنہگار نہیں ہے
مائل مری جانب نگہِ یار نہیں ہے
یہ فرضِ محبت کوئی بیگار نہیں ہے
اب میں نہیں یا آپ کی تلوار نہیں ہے
اک بار اگر ہاں ہے تو سو بار نہیں ہے
ہشیار یہاں وہ ہے جو ہشیار نہیں ہے
تہذیبِ وفا سے وہ خبردار نہیں ہے

پرمست ہوا دل تری بدمست نظر سے
کہنے کو یہ مے خوار ہے مے خوار نہیں ہے

ہیں انجمن ناز میں یوں سب سے الگ ہوں
گویا مجھے اُن سے بھی سروکار نہیں ہے

بگڑی ہوئی تقدیر کے کاموں کا بنانا
دشوار مجھے ہے مجھے دشوار نہیں ہے

جب تک تھا دلِ زار وہ پہلو میں نہیں تھے
اب وہ ہیں تو پہلو میں دلِ زار نہیں ہے

بے قدری دل حسن کے بازار میں دیکھو
ہے مال مگر کوئی خریدار نہیں ہے

کیا دشت میں دل خوگرِ آزار کا بہلے
اب حسبِ تمنا خلشِ خار نہیں ہے

یا یہ ہے نمائش اُنھیں اپنی نہیں منظور
یا یہ ہے کوئی طالبِ دیدار نہیں ہے

اے نوح غمِ عشق میں اشکوں کو بہا کر
طوفان اُٹھانا مجھے دشوار نہیں ہے

طبع زاد

ج

وہ مجھے قتل کر کے ڈال گئے
سب دلوں کی کسر نکال گئے

کیا وہ آ کر مجھے سنبھال گئے
اور بھی زحمتوں میں ڈال گئے

میری آئی ہوئی کو ٹال گئے
نزع میں وہ مجھے سنبھال گئے

پاس آنے میں تھا حجاب اُنھیں
دور سے مجھ کو دیکھ بھال گئے

اور میری فغاں سے کچھ نہ ہوا
ایک اچٹتی نظر وہ ڈال گئے

کس صفائی سے اپنے وعدے کو
عرصۂ حشر میں وہ ٹال گئے

کوچہ گردی سے مجھ کو روک دیا
بیڑیاں پاؤں میں وہ ڈال گئے

پالیا میں نے مدعا اُن کا
بات مطلب کی صاف ٹال گئے

ابر کے ٹکڑے جو اُٹھے ساقی
ساغر و خم کو وہ کھنگال گئے

چھین دینا تو خیر مشکل تھا
وہ ستانا بھی بھول بھال گئے

مل گیا مجھ کو دردِ دل کا صلہ
کم سے کم وہ نظر تو ڈال گئے

حضرتِ نوح کی وہ ہمدردی
ڈوبتا تھا مجھے سنبھال گئے

طبع زاد

ج

مجھ کو نباہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے
دنیا میں چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

یہ بھی ہے ایک صورتِ اظہارِ آرزو
دل کو کراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

مشکل ہے چار روز بھی اُن سے نباہنا
لیکن نباہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

کیسا گلہ کسی ستم بار بار کا
ہردم سراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

پوچھے ہمارے دل سے کوئی چاہ کا مزا
دن رات چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

بیمارِ غم کو دردِ جگر کی ہے آرزو
یعنی کراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

وعدہ وہ کر کے پوچھتے ہیں چاہیئے کچھ اور
وعدہ نباہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

پوچھیں گے وہ کبھی جو مرے دل کا مدّعا
کہہ دوں گا چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

شاید یہی سبب ہو تری التفات کا
مجھ کو کراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

دنیا میں خوب چیز ہے دنیا کا اتفاق
باہم نباہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

مانا سراہنے سے وہ ہوتے ہیں بدگماں
پھر بھی سراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

مجھ کو تو چاہنے کے سوا چاہیئے نہ کچھ
اُن کو نہ چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے مجھ کو کراہنا
گویا کراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

اے نوحؔ عشقِ یار میں طوفاں کا ذکر کیا
بس تم کو چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیئے

طبع زاد

نہ وہ ہم ہیں نہ وہ زمانہ ہے
دو ہی جملوں کا یہ فسانہ ہے

فصلِ گل ہے شراب خانہ ہے
یہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہے

آ گئے ہو تو اب چلے بھی چلو
دو قدم پر غریب خانہ ہے

دل کو لوٹے نہ کیوں نگاہ تری
درد و غم کا یہی خزانہ ہے

قیس کا عشق اور میرا عشق
یہ حقیقت ہے وہ فسانہ ہے

نقشِ الفت بھی داغِ حسرت بھی
خانۂ دل نگار خانہ ہے

عشق میں لطفِ زندگی کیسا
عشق تو موت کا بہانہ ہے

دل نہیں دل میں وہ نگاہ نہیں
تیر ہے تیر کا نشانہ ہے

شیوۂ حسن و عشق کیا کہیئے
یہ جدا سب سے کارخانہ ہے

دوستوں ہی سے مجھ کو اُنس نہیں
دشمنوں سے بھی دوستانہ ہے

کیا کہوں کہہ گئے وہ کیا مجھ کو
وقت ہے بخت ہے زمانہ ہے

خرمنِ دہر میں یہ پھوٹ پڑی
منتشر ایک ایک دانہ ہے

جس میں سرمایۂ نشاط نہیں
وہ ہمارا غریب خانہ ہے

تم جدھر پھیر دو اُدھر پھر جائے
حکم کا منتظر زمانہ ہے

جوشِ طوفانِ اشک سے لبریز
حضرتِ نوحؑ کا فسانہ ہے

شعرائے گوالیار نے میری صدارت میں اس طرح پر مشاعرہ کیا تھا

ج

یوں نمایاں اثرِ الفت کامل ہو جائے
لطف آجائے ترا دل جو مرا دل ہو جائے

گردشِ بخت بھی غربت میں جو شامل ہو جائے
دور مجھ سے مری منزل کسی منزل ہو جائے

لطفِ آزارِ محبت مجھے حاصل ہو جائے
دل کا ہر قطرۂ خوں اپنی جگہ دل ہو جائے

ہم تجھے تیری روانی کی قسم دیتے ہیں
اب جو ہونا ہو وہ اسے خنجرِ قاتل ہو جائے

دل لگانا تو ہے میرے لئے آسان بہت
جی چھڑانا کسی ظالم سے نہ مشکل ہو جائے

میں یہ کہتا نہیں تجھ سے ستم و جور نہ کر
ایسے غم ہوں کہ مرا دل متحمل ہو جائے

حضرتِ قیس ابھی اور کوئی کام نہیں
آئیے تذکرۂ لیلیٰ و محمل ہو جائے

خنجر و تیغ اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں
دیکھ لیں جس کی طرف آپ وہ بسمل ہو جائے

یہ ترے حسنِ پُرانوار سے کچھ دور نہیں
شمعِ محفل بھی جو پروانۂ محفل ہو جائے

وہ دمِ نزع عیادت کے لئے آتے ہیں
ڈر رہا ہوں کہیں مرنا بھی نہ مشکل ہو جائے

ہم بڑی دور سے آئے ہیں امیدیں لے کر
اس طرف بھی نظر اے بانیِ محفل ہو جائے

ڈر وہیں تک ہے جہاں تک یہ نظر آتا ہے
دور کشتی سے مری منظرِ ساحل ہو جائے

حسرت اس پر ہے جو رہ جائے ادا سے محفوظ
قسمت اس کی ہے جو اس تیغ سے بسمل ہو جائے

اس ستم گر کو اک ایسی بھی ادا آتی ہے
تیغ دل پر نہ چلے قتل مرا دل ہو جائے

لاغریِ قیس کی ٹھہرے نہ جنوں میں بے کار
اس قدر جسم گھلے پردۂ محمل ہو جائے

انتہا دشت نوردی کی وہ جانے کیوں کر
ابتدا ہی میں جو پابندِ سلاسل ہو جائے

میں ترے تیر کو دل میں تو جگہ دوں لیکن
زور سے سانس کا لینا بھی نہ مشکل ہو جائے

ڈوبنے والے خدا پر جو بھروسہ کر لیں
ناخدا پھر یہی منجدھار انھیں ساحل ہو جائے

وادیِ عشق میں یہ حسن کا پھیلا ہے اثر
آپ جس ذرّے کو دل کہہ دیں وہی دل ہو جائے

امتحاں گاہِ وفا ہے کسی سفاک کا گھر
جو نہ کامل ہو نہ وہ جائے جو کامل ہو جائے

حضرتِ نوحؑ پہ ایمان نہ لائیں کیوں کر
اپنی کشتی کا جو رخ جانبِ ساحل ہو جائے

حسبِ فرمائش عزیزی زیبا صاحب نادری

ج

نگاہیں وہ دریچوں میں کسی انداز کے پردے
بنیں گے پردہ در لیکن حریمِ ناز کے پردے

نئے انداز کا پردہ نئے انداز کے پردے
گرے اکثر اُٹھے اکثر حریمِ ناز کے پردے

حریمِ ناز کے جلوے تو ڈھائیں گے غضب کتنا
ستم کرتے ہیں جب اتنا حریمِ ناز کے پردے

یہ میرا اٹھنا بے کار ہے جلووں کی حسرت میں
اٹھا کر مجھ کو اٹھیں گے حریمِ ناز کے پردے

جو سمجھو تو بہت کچھ ہیں نہ سمجھو تو نہیں کچھ بھی
حریمِ ناز کے جلوے حریمِ ناز کے پردے

بندھے اس شکل سے شاید ہوا اہلِ محبت کی
الٹ دے اے فغاں بڑھ کر حریمِ ناز کے پردے

جوانی میں ہوا اب شوق اس کو خود نمائی کا
کریں گے پردہ داری کیا حریمِ ناز کے پردے

چڑھا دو چادریں تم کشتگانِ غم کی قبروں پر
کسی مصرف میں تو آئیں حریمِ ناز کے پردے

ہوئے ہیں واقفِ اسرارِ انداز و ادا کیا کیا
حریمِ ناز میں رہ کر حریمِ ناز کے پردے

یہ سچ ہے ہر کسی میں خاص کچھ اوصاف ہوتے ہیں
بنے کب ساز کے پردے حریمِ ناز کے پردے

ہوا طوفانِ غم اے نوحؔ سب کو غرق کر دے گا
سلامت رہ نہیں سکتے حریمِ ناز کے پردے

طبع زاد

ج

نہ میری سنتی ہے کچھ بھی نہ اپنی کہتی ہے
کھنچی کھنچی تری تصویر مجھ سے رہتی ہے

طبیعت اس لئے اپنی اداس رہتی ہے
وفائیں کر کے ہمیشہ جفائیں سہتی ہے

حیا کا جبر کب اُن کی نگاہ سہتی ہے
یہ تیغ میان میں بھی چلتی پھرتی رہتی ہے

ہم اپنی جانِ حزیں پر نہ کیوں غرور کریں
وہ کیا سہے گا کوئی جو ستم یہ سہتی ہے

دمِ اخیر تو سن لیں وہ داستاں میری
زباں اب نہیں کہتی نگاہ کہتی ہے

ہمیں کچھ اور نہیں حالِ آرزو معلوم
یہ دل میں ہوتی ہے پیدا یہ دل میں رہتی ہے

یہ سوچ کر کوئی پیہم ستم نہیں کرتا
طبیعت اس کو ذرا سہتے سہتے سہتی ہے

خطا معاف دغا ناز فتنہ گر عیّار
ہم اس کو کیا کہیں دنیا جو تم کو کہتی ہے

بغیرِ حکمِ خدا کوئی مر نہیں سکتا
تمام عمر اجل ساتھ ساتھ رہتی ہے

خدا کرے وہ نہ سمجھیں معاملہ دل کا
مری زبان کچھ اپنی زباں میں کہتی ہے

اٹھا جو حسن کا پردہ تو یہ کھلا مجھ پر
نگاہِ شوق ہی بجلی کی آنچ سہتی ہے

الٰہی بحرِ وفا کا مآل کیا ہوگا
خدائی یاس و تمنا کی رو میں بہتی ہے

مجھے غضب میں مری بدظنی نے ڈال دیا
یہ گھڑ کر ایک نئی بات روز کہتی ہے

امید و یاس کے حالات اور کیا کہئے
وہ دور رہتی ہے یہ میرے پاس رہتی ہے

وہ کہتے ہیں کہ سلاسل نہ ٹوٹنے پائے
ہماری وحشتِ دل یہ کڑی بھی سہتی ہے

کسی کے رنج و مصائب کا ذکر کیا اے نوحؔ
ہماری ناؤ بھی طوفانِ غم میں بہتی ہے

طبع زاد

مرے دل پر ستم ڈھاؤ جو باز آؤ سنورنے سے
تمھارا کچھ نہ کچھ کرنا ہے اچھا کچھ نہ کرنے سے

ملے فرصت بھی اتنی رات دن بننے سنورنے سے
تعلق کیا کسی کو میرے جینے میرے مرنے سے

قیامت میں رہا مجبور ہیں فریاد کرنے سے
دبا ہوں اُن کے دبنے پر ڈرا ہوں اُن کے ڈرنے سے

کبھی کہتا ہوں اپنی جان دے دوں میں حسینوں پہ
کبھی کہتا ہوں میں کیا فائدہ بے موت مرنے سے

انھیں تک تھا سکونِ زندگی بھی کچھ اسیری میں
ملا کیا تجھ کو اے صیاد میرے پر کترنے سے

فنا ہونا ہی بحرِ عشق میں معراجِ عاشق ہے
خدا محفوظ رکھے ڈوب کر مجھ کو اُبھرنے سے

دمِ آخر وہ بالیں پر عبث مغموم ہوتے ہیں
خدائی میں کمی ہو جائے گی کیا میرے مرنے سے

یہ کیسا حکم آنا بیٹھنا محفل میں چپ رہنا
یہ کیسی بات مجھ کو روکتے ہو بات کرنے سے

پریشاں خاطری نے باندھ رکھی تھی ہوا اپنی
بچاتا دل کے شیرازے کو میں کیوں کر بکھرنے سے

طریقِ عشق میں اُن کو قدم رکھتے نہیں دیکھا
خدا جانے جنابِ خضر کیوں ڈرتے ہیں مرنے سے

ہوا کچھ اور اُن کو حوصلہ آزار ڈھانے کا
ہمارے ضبط کرنے پر ہمارے صبر کرنے سے

رہِ عشق و وفا میں پیروِ نقشِ قدم ہو کر
سبق لیتے ہیں مٹ جانے کا ہم اپنے اُبھرنے سے

اٹھائے سیکڑوں طوفان دریائے محبت میں
جنابِ نوحؔ کیوں ڈرنے لگے ہم ڈوب مرنے سے

رات دن اِک شکوۂ بیداد سوتے جاگتے
آہ اُٹھتے بیٹھتے فریاد سوتے جاگتے

شکوۂ آزار صبح و شام سے کیا فائدہ
چاہیے شکرِ ستم ایجاد سوتے جاگتے

جو نہ دن کو پاس آیا جو نہ ٹھہرا رات کو
ہے اُسی کا دھیان اُسی کی یاد سوتے جاگتے

اس میں کیا تخصیص دن کی شرط ہے کیا رات کی
کچھ نہ کچھ ہوتی رہے بیداد سوتے جاگتے

بدگمانی بھی قفس میں بن گئی وجہِ کرم
دیکھ لیتا ہے مجھے صیاد سوتے جاگتے

عشق میں ہم نے نہ دیکھا اور کچھ اس کے سوا
ظلم ہنستے بولتے بیداد سوتے جاگتے

ظلم اُٹھتے بیٹھتے کرتے ہیں وہ بھی صبح و شام
میں ہوں جن کا تابعِ ارشاد سوتے جاگتے

ہر گھڑی لڑنا جھگڑنا لڑ جھگڑ کر روٹھنا
بس یہی رہتا ہے اُن کو یاد سوتے جاگتے

سہہ رہا ہوں سو طرح کے جور میں شام و سحر
کہہ رہا ہوں ہر چہ بادا باد سوتے جاگتے

رات دن عیش و مسرت میں بسر کی زندگی
غیب سے مجھ کو ملی امداد سوتے جاگتے

نوحؔ میں ہوں اور ہر دم ذکرِ داغؔ دہلوی
یاد آتے ہیں مجھے اُستاد سوتے جاگتے

کسی کی یاد مرے دل میں آئی جاتی ہے

تحصیل سلون ضلع رائے بریلی میں ۲۷ فروری ۱۹۴۳ء کو اِس طرح پر تحصیل دار متھرا صاحب نے ایک شاندار مشاعرہ کیا شعرائے پرتاب گڑھ و جائس و لکھنؤ و رائے بریلی شریک ہوئے الہ آباد سے مرزا احمد جان صاحب رونقؔ صاحب سراجؔ صاحب متینؔ صاحب وغیرہ بھی گئے تھے خاطر مدارات میں تحصیل دار صاحب نے نہایت حوصلے سے کام لیا تمام رات مجمع ایک صورت سے قائم رہا مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہو کر چار بجے صبح کو ختم ہوا

ج

کوئی کشش بھی محبت میں پائی جاتی ہے
یہ آگ خود نہیں لگتی لگائی جاتی ہے

گھڑی گھڑی مجھے صورت دکھائی جاتی ہے
کچھ آ گئی ہے طبیعت کچھ آئی جاتی ہے

ہنسی بھی داورِ محشر کو آئی جاتی ہے
کس اہتمام سے بگڑی بنائی جاتی ہے

یہ بے کسی غمِ الفت میں پائی جاتی ہے
اجل بھی خود نہیں آتی بُلائی جاتی ہے

نگاہِ ناز کا عقدہ سُلجھ نہیں سکتا
حیا کے ساتھ شرارت بھی پائی جاتی ہے

یہ اُن کے وعدۂ باطل کا لطف تو دیکھو
مرے ہی سر کی قسم مجھ سے کھائی جاتی ہے

حیا نے روح یہ تصویرِ یار میں پھونکی
ہم اُس کو دیکھیں نہ دیکھیں لجائی جاتی ہے

خدا کے واسطے عذرِ جفا کوئی نہ کرے
وہ بھولی بات مجھے یاد آئی جاتی ہے

یہی سمجھ لو کہ مجھ کو تمہاری چاہ نہیں
کہیں یہ چوٹ بھی دیکھی دکھائی جاتی ہے

یہ ذلتِ مے کوثر ارے خدا کی پناہ
جنھوں نے پی نہیں اُن کو پلائی جاتی ہے

اجل کے شوق میں اے روح بے قرار نہ ہو
ٹھہر ٹھہر کوئی دم میں وہ آئی جاتی ہے

یہ ڈر رہا ہوں کہیں آسمان پھٹ نہ پڑے
شہیدِ ناز کی تربت مٹائی جاتی ہے

وہ امتحانِ وفا لیں گے اب یہ کیوں نہ کہوں
یہ کیوں کہوں مری ہمت بڑھائی جاتی ہے

کبھی کبھی ستم اِک ساتھ ہوتے رہتے ہیں
نئی نئی مجھے تہمت لگائی جاتی ہے

قصوروار ہمیں دل کہے قصور معاف
کچھ اس میں آپ کی سازش بھی پائی جاتی ہے

فغاں کا دل سے تعلق فغاں سے دل کا لگاؤ
اسی مکان میں بجلی بنائی جاتی ہے

وہ دن گئے کہ انھیں جب حجاب آتا تھا
اب اُٹھتے بیٹھتے چلمن اُٹھائی جاتی ہے

نگاہِ لطف کہاں ہم کہاں وہ شوخ کہاں
تصورات کی دنیا بسائی جاتی ہے

زہے ستم کوئی جس دن ستم نہیں کرتا
مری طرف سے توجہ دلائی جاتی ہے

وہ کہہ رہے ہیں کہ آتی نہیں ادا مجھ کو
یہی ادا مرے دل میں سمائی جاتی ہے

فلک پہ ابر برسنے کو اب اُٹھے نہ اُٹھے
شراب میں مری توبہ نہائی جاتی ہے

وہ اور ہیں کوئی بے داد بھی نہیں کرتے
خصوصیت یہ مجھی سے جتائی جاتی ہے

جواب تو نہیں ملتا مجھے سوالوں کا
ادھر اُدھر کی پہیلی بجھائی جاتی ہے

اُٹھے گا عشق میں طوفان بالضرور کوئی
جناب نوحؑ سے کشتی منگائی جاتی ہے

مشاعرہ پرتاب گڑھ

ج

ہجوم حشر میں کھولے ذلیل و خوار مجھے
یونہیں سہی انھیں لفظوں سے تو پکار مجھے

مذاقِ عشق نے بخشا یہ افتخار مجھے
کہو کہو نہ کہو تم وفا شعار مجھے

وہ فاتحہ کو جو آئے تو دل نے پہنچایا
تہِ مزار تڑپ کر سرِ مزار مجھے

بتاؤں گا کہ اسے بے قرار کہتے ہیں
خدا نے عشق میں رکھا جو برقرار مجھے

زبان سے نہیں کہتے تو کوئی بات نہیں
وہ اپنے دل میں سمجھتے ہیں جاں نثار مجھے

پہنچ گیا جو یہاں تک تو کیا خوشی اس کی
خدا کرے کہ مبارک ہو بزمِ یار مجھے

مری جراحتِ غم وجہِ التفات نہیں
اگر ہو دل تو کہیں بھی وہ دل فگار مجھے

نشاط و عیش و مسرت کا حق ادا نہ ہوا
فریب دے گئی رنگینیِ بہار مجھے

فسانۂ غمِ فرقت بھی کہہ نہیں سکتا
بنا گئے وہ محبت کا راز دار مجھے

جگر کے داغ بھی سرسبز ہوتے جاتے ہیں
بہار نے یہ دکھائی نئی بہار مجھے

ستم سہے گا وفا میں کرے گا چاہے گا
خدا نے دل جو دیا بھی تو ہونہار مجھے

ہزار بار انھیں دیکھوں ہزار بار کہوں
دکھا دو جلوۂ حسن ادا ایک بار مجھے

وہ جبر کرنے پہ آئیں تو جبر کر نہ سکیں
اسی قدر کہیں مل جائے اختیار مجھے

وقار دل کا محبت میں اُٹھ گیا ایسا
نہ اعتبار مجھے ہے نہ اعتبار مجھے

کسی سے دل کا لگانا وبالِ جاں ٹھہرا
ہزار رنج ملے بلکہ سو ہزار مجھے

جو تیر آپ کے ترکش میں ہے ابھی موجود
دکھائی دیتا ہے وہ بھی جگر کے پار مجھے

سمجھ گئے کہ نہ دے گا جواب یہ کچھ بھی
پکارتے ہیں وہ آ کر سرِ مزار مجھے

دعا کے بعد جگر تھام کر فغاں بھی کروں
وہ کہہ رہے ہیں ذرا زور سے پکار مجھے

نہیں کہ باعثِ محبت میں کیا اٹھیں طوفان
جناب نوحؑ نہیں اس کا اعتبار مجھے

ازل سے افسانۂ قیامت کسی کی زلف دراز میں ہے

اِس طرح پر الہ آباد میں ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کو عالی جناب آنریبل جسٹس تیج نرائن صاحب مُلّا ہائی کورٹ نے مشاعرہ منعقد فرمایا حکام ہائی کورٹ اور قریب قریب سب مقامی شعرا موجود تھے آغا علی خاں صاحب کی تحریک سے بیگم صاحبہ اختر بھی شریک ہوئیں عالی جناب سر تیج بہادر صاحب شروع سے آخر تک رونق افروز رہے یہ مشاعرہ تین بجے دن سے شروع ہو کر دس بجے رات کو ختم ہوا دوران مشاعرہ میں ٹی پارٹی بھی تھی پھر دوسرا مشاعرہ اسی طرح پر دھولیہ ضلع مغربی خاندیس میں اثر صاحب کے اہتمام سے ۲۷ مئی ۱۹۴۵ء کو ہوا

(ج)

جدا جدا سب کے ہیں مقاصد طلسم فطرت کا راز ہیں ہے
جو کیمیا گر ہیں بات رکھی کہاں وہ آئینہ ساز میں ہے

کوئی جو سمجھے تو خاک سمجھے کہ لطف کیا سوز و ساز میں ہے
حجاب میں حسن ہے تمہارا ابھی مرا عشق راز میں ہے

خدا کے سجدے بتوں کے آگے پھر ایسے سجدے کہ سر نہ اُٹھے
عجب طرح کی ہماری نیت نئی طرح کی نماز میں ہے

غضب ہوئی وسعتِ شبِ غم بتائیں کیا اس کو خضر سے ہم
درازیِ ہجر کا خلاصہ اُنھیں کی عمرِ دراز میں ہے

کوئی مٹے کوئی ظلم ڈھائے کوئی دعا دے کوئی ستائے
ہمیں سمجھتے ہیں خوب اُس کو جو فرق ناز و نیاز میں ہے

خدا کے طالب بتوں سے مِل کر خدا سے ملتے رہے برابر
جو میں نے جانچا تو فی الحقیقت عجب حقیقت مجاز میں ہے

فلک کا دامن خدا بچائے کہیں نہ اُس پر بھی آفت آئے
مرا گریباں تو پہلے ہی سے جنوں کے دستِ دراز میں ہے

مسرت آخر مصیبت اوّل رہِ محبت کو دیکھتا چل
کرشمۂ ارضی و سماوی اِسی نشیب و فراز میں ہے

اگر وہ آئیں کبھی یہاں تک تو لائیں ہم آہ کو زباں تک
بس ایک آوازِ آخری اب دلِ شکستہ کے ساز میں ہے

ہمارا سر کس لئے نہ جھکتا کہ تھا شہادت کا ہم کو سودا
جو دامنِ تیغ بہ ادا ہو بڑا ثواب اُس نماز میں ہے

گذر گیا عالمِ جوانی جو تھی حقیقت بنی کہانی
وہ رنگ اگلا وہ ڈھنگ پچھلا نہ سوز میں ہے نہ ساز میں ہے

خبر کسی کی کسی کو کیا ہو یہ بات جب ہو کہ دل ملا ہو
ہمارا جینا ہمارا مرنا ہمارے ہی امتیاز میں ہے

جفائے پیہم سے ہاتھ اٹھاؤ خموشیوں پر مری نہ جاؤ
یہ جان لو تم اثر کا دامن دعا کے دستِ دراز میں ہے

تم اس کو سجدوں کا جذب جانو ہمارے حسنِ کشش کو مانو
جو سنگِ در میں کبھی شرف تھا وہ اب جبینِ نیاز میں ہے

ہمارے گھر تک ترا نہ آنا منانے سے اور روٹھ جانا
کوئی تو ہے وجہ بے رخی کی کوئی تو راز احتراز میں ہے

بہت دنوں تک الگ رہے تھے ملے تو مل کر کبھی نہ بچھڑے
اسے سمجھتے ہیں ناوک و دل مزا جو ناز و نیاز میں ہے

خدا کو ڈھونڈا بہت بشر نے خرد نے ادراک نے نظر نے
مگر نہ پایا سراغ اس کا جو راز میں تھا وہ راز میں ہے

حقیقتِ جلوہ سب سے عالی روش انوکھی ادا نرالی
نہیں ہے کچھ بھی مگر جو سمجھو تو ساری خوبی مجاز میں ہے

وہاں پڑھیں تو خیال اپنا یہاں پڑھیں تو کمال اپنا
ثواب کعبے سے بھی زیادہ صنم کدے کی نماز میں ہے

مزاجِ محبوب آسماں پر سرِ نیاز اپنا آستاں پر
مآلِ الفت کے تجربہ کا اسی نشیب و فراز میں ہے

کہاں وہ کشتی کہاں وہ طوفاں کہاں وہ اے نوح ساز و ساماں
مزا اگر کچھ ہے زندگی کا تو اب ہوائی جہاز میں ہے

ج

اہلِ زمیں نے پائی راحت نہ آسماں سے
جائیں وہیں پلٹ کر آئے تھے یہ جہاں سے

دلوائے امن مجھ کو آزارِ جاں ستاں سے
ایک ایک آہ مل کر ایک ایک آسماں سے

دونوں کو آگہی ہو آپس کی داستاں سے
کہئے مری زباں میں سنئے مری زباں سے

بجلی نے کچھ نہ سمجھی نوعیت آشیاں کی
آئے تھے چند تنکے وہ بھی کہاں کہاں سے

قانونِ عشق ہم نے لے کر بنا لیا ہے
کچھ اپنی داستاں سے کچھ اُن کی داستاں سے

صیاد کے قفس میں عمر اپنی ختم کر دی
پھر آشیاں نہ دیکھا نکلے جو آشیاں سے

میں خوب جانتا ہوں دل خوب جانتا ہے
کرتے ہیں آپ حیلے دیتے ہیں آپ جہاں سے

محشر میں اپنی اپنی عشاق کہہ رہے ہیں
روداد غم مکمل ہوگی مرے بیاں سے

کہنے کو کہہ رہا ہے دل حسن کا فسانہ
میں چاہتا ہوں سننا یہ آپ کی زباں سے

میں جادۂ محبت طے کر رہا ہوں تنہا
منزل سے مجھ کو مطلب کیا کام کارواں سے

مرنے کے بعد پاؤں یہ اوج خاک ساری
اڑ کر غبار میرا اونچا ہو آسماں سے

ناوک کو جیسے تم نے رستہ بتا دیا ہو
بیٹھا ادھر جگر میں نکلا ادھر کماں سے

ہم مے کدے کی جانب جھکتے تو کیا برا تھا
لیتے ہیں لوگ سودا چلتی ہوئی دکاں سے

میں قولِ عشق دے کر پھر جاؤں توبہ توبہ
جو کہہ دیا زباں سے وہ کہہ دیا زباں سے

کیوں داورِ قیامت سن کر نہ غور کرتا
قصہ مرا الگ تھا اوروں کی داستاں سے

اے تیغ تو بہت ہے پیاسی مرے لہو کی
ظاہر ہوا یہ تیری سوکھی ہوئی زباں سے

دل میں وہ فرض کر لیں اک پاسباں ہے یہ بھی
مجھ کو اٹھا رہے ہیں کیوں اپنے آستاں سے

میں اس کی جستجو میں دل اس کی آرزو میں
پہنچا کہاں کہاں تک پلٹا کہاں کہاں سے

اے نوح کامیابی ہو یا نہ ہو خبر کیا
طوفان اٹھا رہے ہیں ہم نالہ و فغاں سے

طبع زاد

ج

کبھی یہ کام کرنا ہے کبھی وہ کام کرنا ہے
مگر جینے کا حاصل کیا بالآخر ہم کو مرنا ہے

شہیدانِ محبت پر عبث الزام دھرنا ہے
ہزاروں مرنے والے مر گئے ہم کو بھی مرنا ہے

سبک سارانِ ساحل کس لئے مغموم ہوتے ہیں
ابھی دریائے غم میں ڈوب کر مجھ کو ابھرنا ہے

قرینے عشق کے اچھے نظر آتے نہیں مجھ کو
یہ صورت ہے گذر کی تو کبھی جی سے گذرنا ہے

محبت چھٹ نہیں سکتی محبت مٹ نہیں سکتی
اسی میں ہم کو جینا ہے اسی میں ہم کو مرنا ہے

مری شرطِ وفا پر اس سے اور الزام آئے گا
تمھارے ظلم کا شکوہ بھی کرنا ظلم کرنا ہے

محبت کی سند تو کم سے کم یوں ہاتھ آئے گی
کسی پر کیوں نہ مر جائیں جو اک دن ہم کو مرنا ہے

فدا کے سامنے آنے میں ناحق دیر کرتے ہیں
پس روزِ جزا بھی کیا انھیں بننا سنورنا ہے

ہم اس ڈر سے زباں پر ظلم کا شکوہ نہیں لاتے
تمھیں بدنام کرنا حسن کو بدنام کرنا ہے

مری نظارہ بازی نے کیا کیا سبک مجھ کو
نگاہوں کا لڑانا بھی نگاہوں سے اترنا ہے

رہیں دشت و چمن میں کس طرح ہم مطمئن ہو کر
وہاں ذروں سے دبنا ہے یہاں خاروں سے ڈرنا ہے

وہ بخشے یا نہ بخشے حشر میں یہ اختیار اس کو
مگر اپنے گناہوں سے ہمیں اقرار کرنا ہے

نشاطِ زندگی کا ذکر کیا دنیائے فانی میں
یہ سن کر ہم مرے جاتے ہیں اک دن ہم کو مرنا ہے

محبت میں جفا دیکھی ستم دیکھے غضب دیکھا
کسی سے دل لگا کر اپنے دل کو صبر کرنا ہے

امید و یاس نے مجھ کو پھنسایا کس مصیبت میں
نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں نہ جینا ہے نہ مرنا ہے

غریقِ بحرِ غم ہو جاؤں یا بچ کر نکل جاؤں
بہر صورت جنابِ نوحؔ مجھ کو پار اُترنا ہے

طبع زاد

دل نہ رہا وہ ہم نہ رہے وہ بے جا ہی بے جا کہئے
بھولی بسری پچھلی باتیں کیا سنئے اب کیا کہئے

دست نگر مے خانے میں کس واسطے ساقی کا کہئے
اپنے دل کو جام سمجھئے حسرت کو صہبا کہئے

کیوں نہ مجھے بے مثل سمجھئے کیوں نہ مجھے یکتا کہئے
دنیا میں یہ ہو آئی ہے اچھے کو اچھا کہئے

اشک بھی نکلے درد بھی اُٹھا روئے بھی ہم تڑپے بھی
اُن کے عشق میں دل کے ہاتھوں جو کچھ گذری کیا کہئے

سودائی مجنوں دیوانہ شرط انھیں لفظوں کی نہیں
جیسا آئے آپ کے جی میں آپ مجھے ویسا کہئے

آپ ملیں وعدے پر اپنے اہلِ وفا سے محشر میں
اس کو بھی حیلہ ہی سمجھئے اس کو بھی دھوکا کہئے

ایسا موقع ہاتھ آ جائے ہم کو یہ اُمید نہیں
وہ جو کہیں مل جائیں تو کیا کیا سنئے کیا کیا کہئے

قصۂ غم سے پہلے روکا پھر وہ بولا جھنجلا کر
آپ اگر کہتے ہیں تو میں سنتا ہوں اچھا کہئے

خاک اُڑاتی ہے چشمِ تر میں اشکوں کا اب نام نہیں
اس کے معنی ہم یہ سمجھے دریا کو صحرا کہئے

عشق میں ہم نے سب کچھ دیکھا عمر انھیں میں ختم ہوئی
جان ہے دل ہے عیش ہے غم ہے قصہ کس کس کا کہئے

دو ہی باتیں عشق میں دیکھیں دو ہی باتیں عشق میں ہیں
جانِ دلِ شیدا سنئے یا حالِ دلِ شیدا کہئے

حالِ دلِ مضطر کا اپنے ایسا تھا لب ریزِ الم
کہہ نہ سکے ہم سن نہ سکے وہ اس کے علاوہ کیا کہئے

آپ اگر گننا چاہیں تو کیوں کر ہم گنوائیں انھیں
جمع ہیں دل میں لاکھوں ارماں دل کو اک دنیا کہئے

دیکھے تو کوئی ضد اُن کی اس ضد پہ حیران ہوں میں
جھوٹے وعدے کو وہ اپنے کہتے ہیں سچا کہئے

ممکن ہے وہ اس کو سن لیں یہ بھی ممکن ہے نہ سنیں
حالِ دلِ مضطر کا اپنے کچھ بھی نہ کہئے یا کہئے

رُک جائے طوفانِ محبت نوحؔ یہ کچھ آسان نہیں
آنکھوں میں ہیں اشک بہت ہر اشک کو اک دریا کہئے

شاعر آگرہ کے لئے ۲۱ دسمبر ۱۹۴۱ء

اس کی بھی خبر تجھے اے حیلہ ساز ہے
تو جس کو پوچھتا ہے وہ تیرا ہی راز ہے

قاتل مرے نیاز کا وہ مستِ ناز ہے
صورت یہ ہے تو ناز کے قابل نیاز ہے

سرگرمِ لطفِ عام جو وہ کینہ ساز ہے
ہے اس میں راز اور کوئی خاص راز ہے

محشر میں بے سبب یہ مری خامشی نہیں
وقفہ ہے کم فسانۂ الفت دراز ہے

کانٹوں کا ذکر کیا نہیں گرد و غبار بھی / مالکِ عدم کی راہ مسافر نواز ہے

دیکھا ہلالِ عید کو جب آسمان پر / سمجھا اُسے بھی ہیں کہ تری تیغِ ناز ہے

پاتا ہوں لطف اور سوا ہیں عتاب میں / یعنی تری جفا بھی نوازش طراز ہے

دو چار دن پڑھی تو نہ دس بیس دن پڑھی / اے اہلِ میکدہ کوئی یہ بھی نماز ہے

جام و سبو بھی سامنے ساقی بھی روبرو / جو پاکباز اب رہے وہ پاکباز ہے

رہ رو کے واسطے نہیں رہبر کے واسطے / ہر گام پر خیالِ نشیب و فراز ہے

اے آرزوئے دید توجہ سے کام لے / جلووں ہی کے حجاب میں وہ جلوہ ساز ہے

کہہ دوں تو کھینچ لائے حقیقت کو سامنے / میرا مجاز وہ ہے جسے یہ مجاز ہے

مانگے خدا سے کیوں نہ دعا دردمندِ عشق / سب چارہ ساز ہیں وہ مگر کارساز ہے

اے نوح دورِ کشتی و طوفاں گذر گیا
اب آسماں ہے اور ہوائی جہاز ہے

طبع زاد ۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء

ج

برتاؤ کچھ ایسے تم رکھو جس کو بہتر دنیا جانے / اچھے کی یہ ہے پہچان اچھی اچھا سمجھے اچھا جانے

روتا ہے یہ میری حسرت میں گریہ کا اثر اتنا جانے / ہیں آنسو کو قطرہ سمجھوں وہ قطرے کو دریا جانے

دم بھر ہیں یہ کچھ دم بھر میں یہ کچھ رہتا نہیں اک صورت پر / ہے بے خبر اسی کی عالم ہیں جو عالم کو دھوکا جانے

اسرارِ محبت سے واقف اربابِ جہاں میں کوئی نہیں / کیا شے ہے وفا کیا چیز جفا اس کو تیرا شیدا جانے

قسمت سے کبھی موقع جو ملے تو کس لئے ہیں خاموش رہوں / ممکن ہی نہیں بے عرض کئے مطلب وہ مرے دل کا جانے

پردے ہیں جو تم ہر وقت رہو تو اس صورت سے کیا تم کو / دنیا دیکھے دنیا سمجھے دنیا مانے دنیا جانے

یہ پہلا فرض محبت میں ہے دل کے لگانے والے کا / جینے کی تمنا ہی نہ کرے مرجانے کو اچھا جانے

آنکھوں میں سمایا تھا پہلے پھر دل میں بنا تا گھر اپنا / جانے تو وہی اس کو جانے کوئی یہ طریقہ کیا جانے

جس کو نہ غم و آزار و الم ہر سمت سے گھیرے رہتے ہوں / دنیائے وفا و الفت میں وہ اپنے کو تنہا جانے

ہیں رازِ تمنا کہہ سن کر کیوں جان کو زحمت میں ڈالوں / دل جانے یا الفت جانے سر جانے یا سودا جانے

الزام نہ رکھو تم مجھ پر ملزم نہ مجھے تم ٹھہراؤ / جو کچھ بھی دلِ شیدا نے کیا اُس کو تو دلِ شیدا جانے

کیا عیش و مسرت کا ماتم کیا لطفِ گذشتہ کا چرچا / اک خوابِ پریشاں دیکھا تھا انسان اُسے ایسا جانے

انداز و ادا ہی کو جانا تو کچھ نہ محبت میں جانا / کیا واقعہ سے دل پر گذری اس کو بھی دلِ عذرا جانے

رودادِ محبت ہم اپنی بے تاب ہیں جس سے کہنے کو / تشریحِ تمنا کیا سمجھے وہ معنیٔ حسرت کیا جانے

بدلی اُٹھی بجلی چمکی آمادہ پلانے پر ساقی / توبہ نہ ٹوٹے یا ٹوٹ جائے میں کیا جانوں تقوے جانے

کہتا ہے برا کہہ لینے دوں یہ سوچ سمجھ کر چپ ہی رہوں
خود اچھا ہو تو اپنی طرح وہ اور کو بھی اچھا جانے

اے نوح محبت کی موجیں بے ڈوبیں یاس و حسرت میں
حالات مری غرقابی کے طوفاں جانے دریا جانے

حسب فرمائش برادر عزیز سید محمد اختر صاحب اختر نگینوی ۲۳ مئی ۱۹۴۲ء

مجھ سے ملتا ہے کوئی مجھ کو خوشی ہوتی ہے
روز ہوتی نہیں صورت یہ کبھی ہوتی ہے

آپ کی چشم عنایت جو کبھی ہوتی ہے
دل تو پھر دل ہے خوشی کو بھی خوشی ہوتی ہے

وہ جلائیں نہ جلائیں مجھے جلنے سے غرض
سچ تو یہ ہے کہ بری دل کی لگی ہوتی ہے

شیوۂ لطف کہاں وعدۂ دیدار کہاں
کچھ نہ کچھ آپ کی ہر بات میں نفی ہوتی ہے

لذت جور ابھرنے نہیں دیتی مجھ کو
شکر کرتا ہوں تو اس میں بھی کمی ہوتی ہے

دن چڑھے پھر انھیں کھلتے نہ دوبارہ دیکھا
رات بھر کے لئے پھولوں کی ہنسی ہوتی ہے

تم بتا دو کبھی مل کر مجھے معلوم نہیں
کس کو کہتے ہیں خوشی کیسی خوشی ہوتی ہے

آگیا روز جزا اے دل انصاف طلب
پرسش ظلم و ستم ان سے ابھی ہوتی ہے

لاکھ تدبیر کرو ہوش کا آنا مشکل
بے خودی میں بھی عجب شان خودی ہوتی ہے

کیا بجھائیں گے مرے اشک اسے چھینٹے دے کر
دل جلانے کے لئے دل کی لگی ہوتی ہے

پردۂ لطف میں بھی آپ ستم ڈھاتے ہیں
ہو کوئی شکل مگر بات وہی ہوتی ہے

دفعتاً ہم نے نہ گھٹتے نہ تو مٹتے دیکھا
رفتہ رفتہ غم الفت میں کمی ہوتی ہے

پہلے یہ جانئے پھر دل میں جو آئے کہیے
اچھی بات اچھی بری بات بری ہوتی ہے

آپ کی شان تغافل سے یہ امید نہ تھی
غم بھی ملتا ہے جو مجھ کو تو خوشی ہوتی ہے

اپنے ہاتھوں سے پلائی تو پلاتے جاؤ
اب کہیں دور مری تشنہ لبی ہوتی ہے

ہار کر قول وفا کیوں نہ پریشان رہوں
ہر طرح عشق میں جیت آپ ہی کی ہوتی ہے

ربط الفت کے سوا اور اسے کیا کہتے ہیں
دیکھ کر خوش انھیں ہم کو بھی خوشی ہوتی ہے

جوش الفت میں وہ طوفان اٹھا دیتے ہیں
حضرت نوح سے تقصیر یہی ہوتی ہے

خیام لاہور کے لیے ۲۶ جون ۱۹۴۲ء

تمہیں سے جدا روح کیا ہو رہی ہے
تہِ قبر خلقت پڑی سو رہی ہے

مری چشم تر خون دل رو رہی ہے
کہاں کی کمائی کہاں کھو رہی ہے

شب ہجر تکلیف وہ ہو رہی ہے
کہ شبنم مرے حال پر رو رہی ہے

یہ ممکن نہیں دل سے حسرت جدا ہو
رہے گی ہمیشہ وہی جو رہی ہے

دہل جاؤ گے جس سے تم وہ قیامت
مری آہ کی گود میں سو رہی ہے

مصیبت کی دنیا مسرت کا عالم
ادھر ہنس رہا ہے ادھر رو رہی ہے

نکل جائے دم آہ دل سے نہ نکلے
یہ کیوں ضبطِ غم کا بھرم کھو رہی ہے

ستم کرنے والے کرم کر رہے ہیں
محبت کی دنیا نئی ہو رہی ہے

اگر آپ ٹھکرائیں تو جاگ اٹھے
مری قبر میں زندگی سو رہی ہے

محبت میں کیا تذکرہ آبرو کا
گئی تو گئی یہ رہی تو رہی ہے

تڑپ کر دوبارہ وہ تڑپائیں مجھ کو
مرے دردِ دل میں کمی ہو رہی ہے

پسِ مرگ پرساں نہیں اور کوئی
فقط بے کسی قبر پر رو رہی ہے

تری تیغ کا رنگ نکھرے نہ کیوں کر
مرے خون سے ہاتھ منہ دھو رہی ہے

شبِ ہجر آتی نہیں نیند مجھ کو
خدا جانے وہ بھی کہاں سو رہی ہے

برستے ہیں کیا دل سے ارمان نکلیں
کہ بارش ترے ظلم کی ہو رہی ہے

مری سیلِ اشکِ محبت کو دیکھو
سیاہی شبِ ہجر کی دھو رہی ہے

شبِ غم میں دل کو تو بیدار پایا
مگر وہ ہے تقدیر جو سو رہی ہے

بھروسہ تھا جس کشتیِ دل کا ہم کو
وہ اے نوح غرقابِ غم ہو رہی ہے

طبع زاد ۱۰ اگست سنہ ۱۹۴۲ء

ج

برے بھلے کا مرے اس کو امتیاز تو ہے
کچھ اور ہو کہ نہ ہو کم سے کم یہ ناز تو ہے

جھکا ہوا کسی در پر سرِ نیاز تو ہے
نئی طرح کی سہی یہ مگر نماز تو ہے

بلا سے بادہ و ساغر مجھے ملیں نہ ملیں
مری نظر میں تری چشمِ مستِ ناز تو ہے

ہزار بار ہوئے ایسے تجربے مجھ کو
کہو ہزار میں کہہ دوں وہ حیلہ ساز تو ہے

نظر تو کہتی ہے ملنے میں مجھ کو عذر نہیں
مزاج کہتا ہے ان کا کہ احتراز تو ہے

بہشت کے لئے مرنا قبول کون کرے
بہشت میرے لئے ان کی بزمِ ناز تو ہے

کھلے گی کیا دلِ مشتاق پر حقیقتِ دوست
نظر کے سامنے اک پردۂ مجاز تو ہے

خدا کرے کہ مری شکل سے نہ ظاہر ہو
کسی کا دردِ محبت بھی ایک راز تو ہے

یہ مانتا ہوں کہ سامانِ انبساط نہیں
اس انجمن میں مگر ذکرِ سوز و ساز تو ہے

عجب نہیں کہ بچھڑ کے یہ ہوش بھی نہ رہے
نشاط و غم کا ابھی مجھ کو امتیاز تو ہے

کسی کی شکل پسند آئے یا نہ آئے مگر
یہ ہے ضرور مرا دل نگاہ باز تو ہے

سنو سنو نہ سنو تم یہ اختیار تمھیں
مرا فسانۂ عشق و وفا دراز تو ہے

مرے سوا کوئی اسرارِ حسن کیا جانے
یہ تیرا ناز نہ کرنا بھی ایک ناز تو ہے

کسی کا خارِ تمنا ہو یا ہو نشترِ عشق
جو میرے دل سے نہ نکلے وہ دل کا راز تو ہے

حرم میں بھی مجھے آزادیاں نصیب کہاں
کچھ اور ہو نہ ہو پابندیِ نماز تو ہے

زہے نصیب جو پامالِ کوئے دوست ہوا
مری نظر میں وہ پامال سرفراز تو ہے

زمانہ کچھ کہے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا
جنابِ نوحؔ کے طوفاں میں کوئی راز تو ہے

طبع زاد ۴ر اکتوبر ۱۹۴۲ء

ج

جہانِ عشق میں کب وقت کی تقلید ہوتی ہے
گلے جس دن وہ ملتے ہیں اسی دن عید ہوتی ہے

اِدھر تائید ہوتی ہے اُدھر تردید ہوتی ہے
ہمارے عشق پر کس حسن سے تنقید ہوتی ہے

نظر کو پہلے پہلے آرزوئے دید ہوتی ہے
کسی پر دل کے آنے کی عجب تمہید ہوتی ہے

بیانِ دردِ غم سننے میں اب لطف آچلا ان کو
کہے جاؤ کہے جاؤ یہی تاکید ہوتی ہے

نشاطِ عیش کی لذت جلن والے اٹھاتے ہیں
ہمیں غربت میں کیا معلوم کیسی عید ہوتی ہے

جنوں میں قیس کا اعزاز تھا موقوف صحرا تک
مرے عشق و وفا کی ہر جگہ تقلید ہوتی ہے

خوشی پاکر بھی اہلِ عقل و دانش خوش نہیں رہتے
کہ دنیا میں مسرت رنج کی تمہید ہوتی ہے

ہزاروں حسرتیں دل میں نکلنے کو مچلتی ہیں
خوشا وقتے نظر جب محوِ لطفِ دید ہوتی ہے

یکایک ہر نفس کے ساتھ دنیا کا بدل جانا
ہماری زندگی کی اس طرح تجدید ہوتی ہے

بیانِ شوق و شرحِ غم کو کب سچا سمجھتے ہیں
وہاں اچھی بری ہر بات پر تنقید ہوتی ہے

بہم مل بیٹھنے کا وقت دن بھر تو نہیں ملتا
ہمیشہ مے کشوں میں رات ہی کو عید ہوتی ہے

کبھی پہروں میں اپنا پردۂ رخ وہ اٹھاتے ہیں
بڑی مشکل سے پوری آرزوئے دید ہوتی ہے

سمجھنا چاہئے ہم کو بھی ان حرماں نصیبوں میں
جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کیوں کر عید ہوتی ہے

بڑی ہی غور سے وہ جی لگا کر اس کو سنتے ہیں
مری روداد غم ناقابلِ تردید ہوتی ہے

اگر پیتا ہوں تو مے خوار پینے بھی نہیں دیتے
نہیں پیتا تو پینے کے لئے تاکید ہوتی ہے

غلط بھی لوگ سنتے ہیں یقیں بھی لوگ کرتے ہیں
جنابِ نوحؔ کے طوفان پر تنقید ہوتی ہے

تمت بالخیر